سالنامہ

اوراق

وزیر آغا

سجاد نقوی

رجسٹرڈ ایل نمبر ۷۶۸۲

فون لاہور ۳۷۰۷۲۶
سرگودھا ۲۳۸۱

مولانا صلاح الدین احمد کی یاد میں

ماہنامہ

اوراق

لاہور

سالنامہ

جنوری فروری ۱۹۸۰ء

مدیران

وزیر آغا

سجاد نقوی (اعزازی)

جلد: ۱۵
چندہ سالانہ

شمارہ ۱، ۲

مقامِ اشاعت

دفتر اوراق، چوک اُردو بازار، لاہور

ترتیب اوراق

مضامین

نظم، سلام، رُباعی، گیت

افسانے

طویل نظم

انشائیے

غزلیں

سفر نامے

غزلیں

بحث و نظر

ایک انٹرویو

اس کتاب میں

کتابوں کی باتیں

آپس کی باتیں

انشائیہ

سر ورق: اسلم کمال
خطاطی: تمکین شیرازی

مقام اشاعت	مطبع	طابع	ناشر
چوک اُردو بازار لاہور	مکتبہ جدید پریس لاہور	رشید احمد چوہدری	وزیر آغا

پہلا ورق

(۱)

پابلو نرودا کی خود نوشت سوانحمری پڑھیں تو یوں لگتا ہے جیسے ساری دنیا کے ادبا کی ایک ایسی الگ برادری ہے جس میں خوشی اور غم، محبت اور نفرت، ایک ساتھ مرنے اور ایک ساتھ جینے کے دائمی رشتے قائم ہیں — اس طور کہ چلی کا ایک شاعر جب کوئی نظم لکھتا ہے تو اس کی صدائے بازگشت سپین، فرانس، روس اور جاپان تک میں سنائی دیتی ہے اور رومانیہ یا پولینڈ کے کسی شاعر کا کوئی مجموعہ چھپتا ہے تو میکسیکو اور برازیل اور کیوبا تک میں اس کے چرچے ہوتے ہیں۔ یہ ادبا نہ صرف ایک دوسرے سے خط و کتابت کرتے ہیں —————— بلکہ ایک دوسرے کے ملکوں میں بھی آتے جاتے ہیں اور اکثر و بیشتر کسی نہ کسی بہانے کسی نہ کسی جگہ مل بیٹھتے بھی ہیں۔ تجربات اور نظریات اور محسوسات میں ایک دوسرے کو شریک کرتے ہیں اور جب کہیں کوئی واقعہ ہوتا ہے تو ان سب کے دل ایک ہی تال پر دھڑکنے لگتے ہیں۔

پابلو نرودا کی خود نوشت سوانحمری پڑھیں تو یوں لگتا ہے جیسے اردو زبان کے ادبا اس برادری میں شامل ہی نہیں ہیں، جیسے اُردو زبان — نام کی کوئی زبان صفحۂ خاک پر موجود ہی نہیں اور بات بھی ٹھیک ہے۔ ہم اُردو والے پوری دنیا کی ادیب برادری سے کٹے ہوئے ہیں۔ حالانکہ جب ہمارا کوئی ادیب یورپ یا امریکہ میں سیر و سیاحت یا کسی بین الاقوامی سیمینار میں شرکت کے لئے جاتا ہے تو سارا عرصہ دیارِ غیر میں مقیم اپنے بھائی بندوں کی تلاش ہی میں مصروف رہتا ہے۔ ہم شاید ازل ہی سے ایک دائمی HOME SICKNESS کے مریض ہیں کہ اپنوں سے کٹ کر زیادہ دیر تک خوش نہیں رہ سکتے۔ یہ اچھی بات تو ہے کیونکہ اس سے انسان اپنی جڑوں سے منقطع نہیں ہوتا مگر اس کا نقصان یہ ہوا ہے کہ ہم عالمی ادیب برادری کی مین سٹریم MAIN STREAM سے بالکل کٹ گئے ہیں۔ اس وقت ہماری حالت اُس قطعۂ آب کی سی ہے جس میں کنول تو موجود ہوں مگر جو سمندروں اور دریاؤں سے منقطع ہو کر محض ایک تالاب کی حیثیت اختیار کر گیا ہو۔

مگر قصور کس کا ہے؟ پچھلے چالیس پچاس برس میں اُردو ادب نے بے پناہ ترقی کی ہے۔ افسانہ، انشائیہ، سفر نامہ، تنقید اور بالخصوص نظم میں ہماری زبان کے ادب کا معیار کسی طور بھی دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کے معیار سے کم نہیں۔ قابلِ تعریف بات یہ ہے کہ اردو کے جدید ادبا نے دنیا بھر کے علوم سے استفادہ کیا ہے اور کسی بھی نظریاتی، علمی یا ادبی یافت کو محض غیر ملکی ہونے کی بنا پر مسترد نہیں کیا۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس وقت اُردو ادب اسلوب ہی نہیں مواد کے اعتبار سے بھی جدیدیت کا حامل ہے اور بیسویں صدی کے ہر دم وسیع ہوتے ہوئے ذہنی اور احساسی آفاق سے خود کو ہم آہنگ کرنے میں کامیاب ہے۔ اس سب کے باوجود کیا یہ عجیب بات نہیں کہ باقی دنیا کے ادبا کو اس بات کی خبر تک نہ ہو کہ ہم بھی اس کرۂ ارض پر موجود ہیں، ہمارے پاس بھی اعلیٰ ادب کا ایک قابلِ فخر خزانہ ہے اور ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں؟ کیا ہوا اگر بعض اشتراکی ممالک نے چند ترقی پسند اُردو شاعروں اور افسانہ نگاروں کی اکا دکا تخلیقات اپنی زبانوں میں منتقل کر لیں کیونکہ یہ سب کچھ تو ایک خاص منصوبے کے تحت کیا گیا ہے۔ دیکھنا تو یہ ہے کہ کیا ہمارا ادب پوری دنیا کے سامنے پیش کیا جا سکا؟ لطف کی بات یہ ہے کہ کھیل کے میدان میں تو ہم بین الاقوامی برادری کے ایک معزز رکن ہیں اور ہمارے کھلاڑیوں کو دنیا کے بہترین کھلاڑیوں سے شخصی سطح پر ملنے کے لاتعداد مواقع بھی ملے ہیں لیکن ہمارے ادیب عالمی ادبی برادری سے یکسر کٹے ہوئے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ اس میں سب سے زیادہ قصور ہماری ان اکادمیوں اور اداروں کا ہے جنہوں نے ہر دور میں سرکاری امداد تو حاصل کی، اُردو ادب کو دنیائے ادب میں متعارف کرانے کی کبھی ضرورت محسوس نہ کی۔ ہمارے یہاں زیادہ تر یک طرفہ ٹریفک ہی دیکھنے میں آیا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ دو طرفہ ٹریفک کا آغاز ہو تاکہ ہم بھی عالمی ادبی برادری میں شامل ہو سکیں۔ اس سلسلے میں ہماری تجویز یہ ہے کہ فوری طور پر افسانوں، نظموں، انشائیوں اور سفر ناموں کے مجموعے ANTHOLOGIES انگریزی میں ترجمہ کر کے باہر بھیجے جائیں۔ اس کے بعد اُردو کے اہم ادبا اور شعرا کو متعارف کرایا جائے۔ اس ضمن میں ہمارے سفارت خانے بھی ایک اہم خدمت

سرانجام دے سکتے ہیں۔

کسی بھی ملک کا ادب اس کی ثقافت اور تہذیب کا مظہر ہوتا ہے۔ جب ہم اپنا یہ جوہر دوسرے ممالک کو بھیجیں گے تو اپنے ملک کی خوشبو کو پھیلانے کا اہتمام کریں گے۔ بصورتِ دیگر اگر خوشبو محض ایک جگہ جمع ہوتی رہی تو گھٹن ہو کر بدبو میں تبدیل ہو جائے گی۔ اس سے پہلے کہ ایسا ہو ہمارے علمی اور ادبی اداروں کو چاہیئے کہ وہ مردانہ وار سامنے آئیں اور اس سلسلے میں اپنا فرض بطریقِ احسن ادا کریں۔

وزیر آغا

(۲)

اوراق' میں 'سوال یہ ہے' کے تحت علم و ادب کے نئے نئے گوشے منظرِ عام پر آتے رہے ہیں۔ زیرِ نظر شمارے میں ہر چند روائتی انداز سے 'سوال یہ ہے' کی بحث قارئین کو پڑھنے کے لئے نہیں مل رہی مگر شاید اس کمی کو ہمارا مضمون 'طلاقِ تثلیث' کسی حد تک پورا کر دے۔ اس سلسلے میں ہمیں یارانِ نکتہ داں سے بجا طور پر یہ توقع ہے کہ وہ بھی اس علمی بحث میں حصہ لیں گے اور ہمیں اپنی آرا سے نوازیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ 'اوراق' کا آئندہ شمارہ 'سوال یہ ہے' کے تحت اس ساری بحث کو سمیٹ لے۔

گذشتہ دنوں اُردو زبان و ادب کی کئی ممتاز اور معتبر شخصیتیں ہم سے بچھڑ گئیں۔ ان میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، سہیل عظیم آبادی، رضیہ سجاد ظہیر، پریم وار برٹنی اور اطہر صدیقی چند ایسے نام ہیں جن سے اُردو زبان و ادب کو بہت کچھ ملا ہے۔ مولانا مودودی مرحوم کا ہر چند ادب، میدان نہیں تھا۔ مگر انہوں نے اپنی دینی و مذہبی تحریروں میں جو اسلوب روا رکھا ہے وہ سراسر تخلیقی تھا اور مولانا کو بلاشبہ صاحبِ طرز انشا پرداز ثابت کرتا ہے۔ سہیل عظیم آبادی اور رضیہ سجاد ظہیر اُردو افسانہ کے اہم نام تھے اور انہوں نے اُردو ادب کو زندہ رہنے والی کہانیاں عطا کی ہیں۔ اسی طرح اطہر صدیقی اُردو شاعری میں مقامِ بلند کے حامل تھے۔ ادارہ اوراق ان مرحومین کے لئے اللہ تبارک تعالیٰ سے مغفرت کی دعا کرتا ہے۔

دسمبر ۱۹۷۹ء کا آخری ہفتہ سرگودھا کے ادبا پر بہت بھاری گذرا ہے۔ وہ اس طرح کہ سرگودھا کے ایک بزرگ شاعر نہایت ہی مختصر علالت کے بعد اس جہانِ فانی سے رحلت فرما گئے ہیں۔ سید وزیر حسین شیرازی جو سرگودھا کی شعری محفلوں کے روحِ رواں اور بجا طور پر سرگودھا کے بابائے اُردو سمجھے جاتے تھے ان کے انتقال سے سرگودھا کے علمی و ادبی اور سماجی حلقوں کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا ہے۔ مرحوم جہاں ایک قادر الکلام شاعر تھے وہاں بے حد خلیق، شفیق اور وضع دار انسان بھی تھے۔ اس وضع داری کا یہ عالم تھا کہ ان کی 'بیٹھک' مولانا آزاد کے 'فقیر کا تکیہ' کا منظر پیش کرتی تھی۔ وزیر حسین شیرازی نے وفات سے ایک روز قبل اپنی وفات کا یہ تاریخی مصرعہ ارشاد فرمایا تھا ؎

خُلد میں کس شان سے اب دیکھ جاتے ہیں وزیر

۱۹۷۹ء

ادارۂ اوراق جہاں وزیر حسین شیرازی مرحوم کی مغفرت کے لئے دست بدُعا ہے وہاں ان کے سعادت مند صاحبزادگان جناب کلبِ عباس (جو اوراق کے خوش نویس ہیں) اور افضل عباس کے لئے دُعاگو ہے کہ اللہ تبارک تعالیٰ انہیں صبرِ جمیل عطا فرمائے۔

سجّاد نقوی

خلیل الرحمٰن اعظمی

دُعا

اے مرے سن و سال کے حاصل
میرے آنگن کے نو دمیدہ گلاب
میرے معصوم خواب کے ہم شکل
میری مریم کے سایۂ شاداب
صبحِ تخلیق کا سلام تجھے،
زندگی تجھ کو کہتی ہے آداب

اے مقدس زمیں کے شعلۂ نو
تُو فروزاں ہو ان فضاؤں میں
میرے سینے کی جو امانت ہیں،
جو مری نارسا دُعاؤں میں
اس طرح مُسکراتی ہیں جیسے
نغمگی دُور کی صداؤں میں،

مجھ کو اجداد سے وراثت میں
وہ خرابے ملے کہ جن میں رہا
عمر بھر پائمال و خاک بسر
میرا حصہ رہا غمِ فردا
مجھ کو میرے لہو میں نہلا کر
جس نے قیدِ حیات میں رکھا

اے مری روحِ فن کے عکسِ جمیل
تجھ کو میری سی زندگی نہ ملے
جو نہ میں ہو سکا وہ تُو ہو جائے
کاش تُو میرا جانشیں نہ بنے
میں تصور میں بھی جہاں نہ گیا
اُن دیاروں میں تیرا نام چلے

ڈاکٹر سید عبداللہ

اُردو ادب۔ چند اصُولی باتیں

اس مقالے کی تحریک، شمیم احمد کی کتاب ۲ + ۲ = ۵ کے مطالعہ سے ہوئی۔ میں نے اس کتاب کے ریاضیاتی فارمولے کو اوّل اوّل تعجب بلکہ قدرے تشویش کی نظر سے دیکھا مگر جوں جوں بڑھتا گیا، مجھے محسوس ہوتا گیا کہ شمیم احمد کی اکثر باتیں انوکھی سہی مگر قابلِ توجہ بلکہ ایک خاص حد تک قابلِ قبول بھی ہیں۔ اس سے مجھے خیال آیا کہ اپنے ادب کو سمجھنے اور اس کی اگلی منزلوں تک رہنمائی کے لئے کسی نئی اصولیات (پرنسپیا لٹریا) کی ضرورت ہے۔

اس اثنا، ماہنامہ "افکار" کراچی کی اشاعتِ دسمبر ۱۹۷۹ء میں میں نے پروفیسر مجنوں گورکھپوری کا ایک "مہمان" اداریہ پڑھا، جس میں انہوں نے مدلل ثابت کیا کہ اس وقت اُردو ادب بے جہت جا رہا ہے اور اب اُردو میں عملاً کوئی ادبی تحریک موجود نہیں۔ اس ضمن میں رسالہ "احتساب" لاہور کے پہلے دو پرچوں کے مضامین سے اور اس کے بعد رسالہ "معاصر" کی ضخیم اشاعت سے استفادہ کیا۔ ان دونوں رسالوں میں لمحۂ رواں کے ادب کا جائزہ لیا گیا ہے۔ دونوں پرچوں میں بعض اچھے مضامین شائع ہوئے ہیں، نظمیں غزلیں، افسانے وغیرہ بھی عمدہ ہیں۔ (خصوصاً "معاصر" میں ایک خاص بات یہ دیکھی کہ پرانے مقالات بھی ہیں تاہم وہ بھی ٹھیک ہیں اور گاہے گاہے بازخواں کے زمرے میں آتے ہیں)۔ مجھے ان رسالوں کو دیکھ کر اس وجہ سے خوشی ہوئی کہ اس سے، اہلِ ادب کی جواں ہمتی کا پتہ چلتا ہے۔ ملک میں ادبی جرائد (اوراق، نقوش، فنون وغیرہ) اور بھی ہیں، ان میں جس حد تک میں مطالعہ کر سکا اچھا ادب شائع ہوتا ہے، اس لئے میں سمجھ نہ سکا کہ محترم مجنوں صاحب نے اتنی مایوسی کا اظہار کیوں کیا؟ لیکن موصوف جیسے فاضل نقاد اور عالم کی بات کو، سرسری طور سے رد بھی نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اپنے ادب کے بارے میں مایوسی کا احساس مجنوں صاحب تک محدود نہیں، کثیر تعداد میں ایسے پڑھے لکھے لوگ اور بھی ہیں جو اپنے ادب سے خوش معلوم نہیں ہوتے۔

اس صورتِ حال میں میرا یہ خیال اور بھی پختہ ہو گیا ہے کہ مستقبل کے ادب کے لئے کسی سمت نمائی کی واقعی ضرورت ہے۔ جو چند باتیں میرے خیال میں آئی ہیں وہ پیش کی جا رہی ہیں۔

ادب پر اعتماد بحال کیا جائے:۔

پہلی حقیقت جسے تسلیم کرنے کے سوا چارہ نہیں، یہ ہے کہ ہمارے ملک میں لوگوں میں ادب سے بیزاری کا ایک رجحان پیدا ہو گیا ہے جسے روکنا چاہیے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ادب کے منصب کے بارے میں لوگوں میں شعور پیدا کیا جائے اور اذہان و قلوب پر یہ

نقش ثبت کیا جائے کہ ادب انسانی فطرت کے لحاظ سے ایک برحق سلسلۂ عمل ہے جو انسانی وجود کا ایک حصہ ہے۔ اتنی بدیہی بات کو پیش کرنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی ہے کہ ادب کے متعلق پاکستان میں ایک عجیب قسم کی غلط فہمی پھیل رہی ہے اور وہ یہ کہ ادب ایک بے فائدہ مشغلہ ہے، اس غلط فہمی کو دور کرنا لازمی ہے۔

اس وقت مغرب کا بھی ایک ذہین طبقہ...... جو سائنسی علوم سے بہرہ ور اور سائنس کی فتوحات سے متاثر و مرعوب ہے، سائنس ہی کو واحد ہمہ گیر اور قابلِ اعتنا اکتساب سمجھتا ہے، یہ سائنس زدہ طبقہ اگر ایک طرف مذہب کو بے بنیاد تخیل و توہم سمجھتا ہے تو دوسری طرف ادب کو بھی زائد المیعاد اور بیکار مشغلہ قرار دیتا ہے۔

مغرب میں مذہب کے متعلق تو یہ رویّہ عام ہے اگرچہ سائنسی فتوحات کے غلط استعمال سے بیزار ہو کر مذہب، بلکہ توہماتی طلسمات و نیرنجات (او کلٹ ازم) کی طرف عود بھی ہوتا جاتا ہے اور متعدد مفکر مذہب کی یقینیات کی سفارش پھر کرنے لگے ہیں تاہم ابھی تک عام خیال مثبت طور پر مذہب کے حق میں نہیں ہوا، لیکن ادب سے بیزاری سمجھ میں نہیں آتی۔ اگرچہ یہ بیزاری اتنی عام نہیں ہوئی پھر بھی یہ کہنا غلط نہیں کہ محسوسات و مبصرات میں پھنسا ہوا مغربی جدید ذہن جزواً ادب (شعر و شاعری، افسانہ، ناول وغیرہ) کو محض خیال بافی قرار دے کر اسے کارِ بیکاراں کہتا ہے۔ پچھلے ہی سال، انگریزی رسالہ ڈائیلاگ میں دو تین مضمون نظر سے ایسے گزرے جن میں یہ معترضانہ سوال کیا گیا تھا کہ کیا ناول کی اب بھی گنجائش ہے، یا کیا دنیا کو شعر و شاعری کی اب بھی ضرورت ہے؟

ادھر پاکستان میں بھی ایک خشک طبقہ ایسا ہے جو (بڑی حد تک ادیبوں کے ایک خاص گروہ کے تعصبات سے متوحش ہونے کی وجہ سے) ادب کو طغیانِ نفس، داخلی کجروی اور غیر اخلاقی معاشرتی نظریات کا وسیلۂ تبلیغ خیال کرتا ہے...... بلکہ فی الحقیقت اس سارے مشغلے کو ہی غیر سنجیدہ کام سمجھتا ہے حالانکہ برصغیر میں واضح اور مثبت طور سے ادب (خصوصاً شاعری) نے بڑا تعمیری، قوم ساز اور تاریخ ساز کردار ادا کیا ہے۔

مذکورہ بالا غلط فہمی کے اسباب کچھ بھی ہوں اس وقت پاکستان میں یہ بدگمانی یا کج خیالی کچھ بڑھتی ہی جا رہی ہے جس کی ذمے داری ایک حد تک (جیسا کہ مناسب موقع پر تصریح کی جائے گی، خود ادیبوں پر بھی ہے جن کے بعض اقوال و خیالات کے باعث ادب سے بیگانگی اور اجنبیت کی فضا پیدا ہو گئی ہے۔

ان وجوہ سے ہمارے ادبی منشور کی اہم شق یہ بھی ہونی چاہیے کہ اس مغالطے کو دور کر کے یہ ثابت کیا جائے کہ ادب فی نفسہٖ (اپنی ذات میں) انسان کا فطری خاصہ بھی ہے اور اس کے ساتھ ہی یہ اس کا فطری حق بھی ہے۔ اب یہ اجنبیت کیسے دور کی جائے۔ اس کے لئے درج ذیل چند سفارشات شاید مفید ثابت ہوں۔

پہلا اہم اصول:۔

سطورِ بالا میں کی گئی گفتگو کی روشنی میں، ادب کی ایک اہم نگہداشت یہ ہونی چاہیے کہ اس کی صداقت کا یقین دلوں میں پیدا ہو اور اس کا خلوص ثابت کیا جائے تاکہ وہ اجنبیت اور بیگانگی ابھرنے نہ پائے جو اس وقت موجود ہے، اسے محض پروپیگنڈہ، تعصب یا بے خبری نہ سمجھا جائے کہ اس وقت ادب اور ملک کے عوام کے درمیان خاصا فاصلہ اور خلیج حائل ہے، ادبی رسالے کیوں نہیں بکتے اس لئے کہ پڑھنے والوں کی اکثریت کے لئے ادب میں پہلی سی کشش نہیں۔ اس تاثر پر ناراض ہونے کے بجائے اس صورتِ حال کا تجزیہ کر کے، اس کے اسباب

کو سمجھنے کی مخلصانہ کوشش کرنے کی ضرورت ہے، بلاشبہ ڈائجسٹوں اور اخبارات کے ادبی ضمیموں نے رسائل کی مانگ ختم کر دی ہے لیکن یہ وجہ کافی نہیں، کچھ اسباب اور بھی ہیں جو وزنی بھی ہیں مثلاً ایک یہ کہ ادب خواں طبقے کا بڑا حصہ اپنے ادب کو خلوص و صداقت سے خالی محسوس کرتا ہے:

خلوص و صداقت کے ضمن میں، اعتراض یہ کیا گیا ہے کہ ہمارا ادب بہت سی بنیادوں پر اجنبی تصورات و نظریات (بلکہ غیر ملکی زندگی) کی ترجمانی کرتا ہے اور کوئی ادب اس وقت تک اپنا ادب نہیں سمجھا جا سکتا جب تک اس میں اپنے ملی یا قومی وجود کے قدرتی اور فطری احساسات منعکس نہ ہوں ......

وجود تیرا خودی غیر کی معاذ اللہ   دوبارہ زندہ نہ کر کاروبار لات و منات

مذکورہ بالا اعتراض پورا درست نہ سہی پورا غلط بھی نہیں۔ ہم جسے نیا ادب کہتے ہیں وہ فورٹ ولیم کالج کے انگریز ناقدوں اور مشیروں کے اشارے یا انداز تربیت سے اُبھرا .... اس ادب کو آپ ایک طرح کا بے ضرر تحرک کہہ سکتے ہیں لیکن کسے انکار ہوگا کہ یہ تحریک بھی فعل غیر کا نتیجہ تھی، جس نے اُردو ادب کے مزاج اور رُخ کو روایت سے موڑنے کی کوشش کی جو ان معنوں میں محدود تھی کہ اس کا دائرہ اسلوب تک محدود رہا پھر اس میدان میں، محمد حسین آزاد اور حالی متحرک نظر آئے۔ آزاد نے شاعری میں سپاٹ پن بھر دیا۔ اگرچہ اپنی نثر میں شاعری کی رنگینی پیدا کی۔ حالی نے پیروئ مغربی طرز کا نعرہ لگایا مگر یہ باتیں کسی کو بُری نہیں لگتیں کیونکہ یہ روایت کے احترام کے ہمراہ چلتی رہیں لیکن جوں جوں ہیئت سے آگے بڑھ کر جدت کے نام سے مطالب و معانی اور تصورات و نظریاتِ غیر کا غلبہ ہوتا گیا، ایک طرح کی بیگانگی کا عنصر ادب میں پیدا ہوتا گیا اور بیرونی مغربی تحریک اپنی قدرتی حدوں سے بڑھ کر خود فروشی اور خود فراموشی تک جا پہنچی۔ ترقی پسند تحریک ملکی آزادی کے نعرے کی وجہ سے مقبول ہوئی تھی مگر آزادی کے بعد اس میں بھی کچھ نہ رہا کیونکہ وہ بھی صرف نظریاتِ غیر کے پرچار کے لیے ہو کر اپنے قومی وجود سے نہ صرف بے تعلق ہوگئی بلکہ اس سے لگڑی بگڑی رہی لہٰذا بے اثر ہوتی گئی، اس کے متوازی دوسری تحریکیں بھی عوام کی سمجھ میں نہ آسکیں۔

یہاں اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ کسی غیر روایت سے استفادہ کرنا کیا واقعی اتنا شنیع فعل ہے کہ اس کی وجہ سے کوئی ادب بالکل بیکار ہو جائے؟۔

یہ سوال واقعی بہت اہم ہے، در جواب اس کا یہ ہے کہ استفادہ ایک قدرتی سلسلۂ عمل ہے لیکن یہ عمل خودی کو بیچنے اور اسے بالکل معدوم کرنے کے مترادف نہیں۔ اگر استفادے سے خودی کو کوئی گزند نہیں پہنچتا تو استفادہ استحکام خودی کا باعث ہو سکتا ہے۔ اگر اس سے خودی ضعیف یا معدوم ہوتی ہے تو یہ استفادہ نہیں رہتا، انہدام خودی کا وسیلہ بن جاتا ہے۔

میں نے اس بحث میں اقبال کی اصطلاح خودی دانستہ استعمال کی ہے مگر معترض کہہ سکتا ہے کہ پاکستانی ادب کے حوالے سے خودی کے معنی کیا ہیں؟ جواب یہ ہے کہ اقبال کے نزدیک، پاکستان ایک ایسی قوم کا ملک ہے جو ملتِ اسلامیہ کا حصہ ہے۔ یہ ملت اپنا الگ وجود رکھتی ہے، مکانی طور سے یہ جہاں بھی ہوگی اس کا تعلق اسی وجود سے ہوگا، یہ وجود چند منفرد عقیدوں اور چند رویہ ہائے زندگی سے متعلق ہے جو دوسری ہر قوم سے جدا ہیں۔ یہ عقیدے ایک طرف فرد کا خدا سے گہرا رابطہ پیدا کرتے ہیں پھر دوسری طرف اس رابطے کی قوت سے معاشرتی اعمال و روابط میں انسانیت، اخوت، ہمدردی اور انصاف کے جذبے پیدا کرتے ہیں۔

تقریباً بارہ سو برس تک ان عقیدوں پر عمل ہوا جس سے ایک تہذیبی اخلاق اور معاشرتی نظام وجود میں آیا جس کی انفرادیت کو مخالف بھی تسلیم کرتے ہیں۔ ہمارے موجودہ بحث میں خودی کے معنی، مذکورہ بالا عقیدوں اور معاشرتی و اخلاقی رویّوں کا گہرا شعور اور ان سے گہری وابستگی کا جذبہ ہے۔ اگر پاکستانی ادب ان عقیدوں، جذبوں اور رویّوں کا ترجمان اور ان کے استحکام کا خواہش مند ہے تو ہم کہیں گے کہ وہ ابھی تک اپنے وجود کو مانتا ہے اگر نہیں ہے تو ہم کہیں گے کہ ہمارا ادب بے وجود اور متعلق بغیر ہے۔

بہر حال بیگانگی کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ روایت کے کمزور پڑ جانے کے بعد ہمارا ادب وابستہ بہ غیر ہوتا گیا اور اسی کو میں نے خلوص و صداقت کی کمی کہا ہے اور اسی کی وجہ سے ہمارے ادب اور عوام کے درمیان خلیج حائل ہو گئی ہے۔

دوسرا اصول:-

پاکستانی ادب (بشمول اُردو ادب) و خیری امتیاز اس امر سے بھی متعین ہونا چاہیے کہ اس میں ایمانیات کو بھی ایک مؤثر مقام حاصل ہو۔ ایمانیات سے مراد وہ حقیقتیں ہیں جو نفسِ انسانی میں موجود ہیں مگر کسی سائنسی طریقے سے ان کی تصدیق نہیں کی جا سکتی مثلاً اہلِ کشف کا تجربہ ہے کہ باطن میں کوئی ادراک ایسا بھی ہے جو کسی خالق کی ہستی کا یقین دلاتا رہتا ہے، یہ ادراک امرِ ذوقی ہے اس کا وجدان تو ہوتا ہے مگر اس کو بیان کر کے ثابت نہیں کیا جا سکتا۔

اسی طرح نفسِ انسانی میں ایک اخلاقی وجدان بھی ہے جو نیک و بد میں داخلی طور سے امتیاز کرتا ہے، اسی لئے اہلِ نظر اخلاقیات کو امرِ اضافی قرار نہیں دیتے بلکہ فطرتِ انسانی کی ایک مطلق قدر مانتے ہیں۔ غرض الہامی حقیقتوں کا انکار، پاکستانی ادب کی ماہیتِ اولیٰ کے خلاف ہے۔ حقیقی پاکستانی ادب میں اس وجدان کی موجودگی اسے اہلِ ملک کے قلوب کے لئے قابلِ قبول بنائے گی۔

تیسرا اصول:-

از بسکہ ادب ایک معاشرتی سلسلۂ عمل ہے یعنی یہ صرف فرد کا مسئلہ نہیں بلکہ فرد کا فرد یا افراد سے تخاطب کا معاملہ ہے اس کے لئے کسی قاری یا سامع (آرٹ میں ناظر) کا ہونا ضروری ہے اس لئے پاکستانی ادیب پر لازم ہے کہ وہ ان تمام معاشرتی اخلاقیات کا احترام کرے جو اس ملک کے کروڑوں انسانوں کے نزدیک واجب الاحترام ہیں۔ ادب یا آرٹ میں آزادیٔ اظہار کے یہ معنی نہیں کہ وہ ان معاشرتی روایتوں کی تضحیک کرے جو کروڑوں انسانوں کے لئے مقدس ہیں۔ غرض ادب ہر حال میں ایک سوشل معاملہ ہے، اسے کسی ایک فرد یا چند افراد کی صوابدید پر نہیں چھوڑا جا سکتا......، اس کا معیار یہ ہے کہ پورا معاشرہ یا اس کی غالب اکثریت اس کے اظہارات کی تصدیق کرے، معاشرے کے تسلیم شدہ ذوق و عقیدہ کے برعکس، چند آدمیوں کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنی ذوقی یا اخلاقی رائے کو پورے معاشرے کی رائے کہیں یا زبردستی اس پر ٹھونس دیں۔ ادیب کو پورے معاشرے کے ذوق اور عقیدہ کا احترام کرنا پڑے گا۔

چوتھا اصول:-

ادب میں حرکت، تغیر اور استفادہ کے اصولوں کا تجزیہ کر کے، ان بنیادوں کا فیصلہ کیا جائے جن کے تحت ملی وجود کو گزند پہنچائے بغیر، نئے خیالات اور نئے عناصر اپنے ادب میں شامل کئے جا سکیں، محض تقلید اور نقالی سے بڑے اور عمدہ بلکہ حقیقی ادب کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔ پاکستان کے ادیب جب مغربی دنیا کی شدید تیز رفتاری اور سریع الحرکتی کا ذکر کرتے ہیں تو خاصا تعجب ہوتا ہے، غالباً وہ مغرب کی سریع الحرکتی کو اپنے خیال میں اپنی ہی تیز رفتاری سمجھتے ہیں.... جس طرح فٹ بال کا کوئی تماشائی کھلاڑیوں کے ساتھ

ذہناً خود بھی دوڑ رہا ہو۔ پاکستان میں ادیبوں کی سریع الحرکتی، دراصل بین الاقوامیت کے ایک ایسے تصور کے تابع ہے جس میں صرف ایک ہی قوم رواں دواں ہے، باقی لوگ (اور ہم) فٹ بال کے مذکورہ بالا تماشائی کی مانند ذہناً دوڑ رہے ہیں لیکن حقیقتاً یہ جمود ہے حرکت نہیں۔ جمود کے معنی کیا ہیں؟ جمود، اس ہٹ دھرمی کو کہتے ہیں جو مخالف دلائل کے وزنی و حقیقی ہونے کے باوجود، تبدیلی کا ضروری ناگزیر عمل قبول نہ کرے۔ ٹھوس اشیاء، متحجرات کی مانند اندرونی حرکت اور تبدیلی سے محروم ہو۔

پاکستانی ادیب کہنے کو بہت تغیر پسند اور حرکت پسند ہے لیکن غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اس کی حرکت صرف خیالی اور متعلق بہ غیر ہے۔ اس کی حرکت، اپنی ماہیت کی نامیت سے متعلق نہیں۔ وہ کچھ ایسی ہی ہے جیسے کوئی شخص کسی پتھر کو ایک جگہ سے اٹھا کر دوسری جگہ رکھ دے یا پاؤں کی ٹھوکر سے، اسے جنبش میں لے آئے اور سمجھے کہ یہ کارنامہ پتھر نے انجام دیا ہے۔

یوں کہ پاکستانی ادیب، اپنے وجود و نامیت کا تو مدعی ہے لیکن اس کے زیر اثر اپنے وجود کے طبعی تقاضوں کے مطابق حرکت میں نہیں آتا۔ یہ دوسروں کی حرکت کو اپنی حرکت سمجھتا ہے۔ اس کی حرکت کسی فاعلِ خارجی سے وابستہ ہے، وہ اپنے وجود طبعی کے قوانین کو نہیں مانتا ...... وہ غیر کے فعل اور واسطے کے بغیر ذرہ برابر بھی متحرک نہیں ہوتا اس کی تغیر پذیری، مصنوعی، غیر قدرتی اور متعلق بہ غیر ہے۔

پانچواں اصول:۔

ادب کی قوت زبان کی قوت سے وابستہ ہے۔ جس ملک میں زبان کو بطور ایک حقیقتِ واقعی کے تسلیم ہی نہ کیا جاتا ہو یا اس کے تہذیبی تخلیقی اثرات کو نظر انداز کر کے ہر اس آدمی کو ادیب سمجھ لیا جاتا ہو جو کسی ادبی صنف کی خارجی شکل اختیار کر کے کچھ تحریریں پیش کر دیتا ہو مگر زبان کی دسترس اور ذوقی تربیت سے محروم ہو اس میں ادب ایک قوت کس طرح بن سکتا ہے۔

پاکستان میں زبان کو لطافتوں اور حقائق و معانی کے بلیغ ترجمان ادارے کے طور پر فی الحقیقت ماننا ہی کوئی نہیں۔ زبان کو ادب تک پہنچانے کے لئے بڑی طویل لسانی و ذوقی تربیت کی ضرورت ہوتی ہے مگر کوئی بتلائے کہ وہ پاکستان میں کہاں ہوتی ہے۔

چھٹا اصول:۔

چھٹا اصول یہ ہے کہ ادب کو تجارتی، کاروباری اور صنعتی ادارہ بنانے کی تنظیمی کوششیں نہ کی جائیں۔ اسی طرح ذاتی تشہیر کے نئے نئے طریقوں کو ترک کر کے ادب کو براہِ راست قاری تک پہنچنے کی اجازت دی جائے۔

ساتواں اصول:۔ دکھ اور شفقت کا مسئلہ

ہمارے قریب ترین ادب میں ایک خاص خلا محسوس ہوتا ہے اور وہ یہ کہ اس کا عمومی رویہ یا تو اجتماعی غم و اضمحلال ہے جس کا تعلق اکثر بھوک سے ہے یا پھر ادیب کے ذاتی آشوب کی رودادیں ہیں۔ انسان (فرد) بحیثیت فرد کا غم اور اس سے ذاتی ہمدردی اور شفقت کا رویہ مفقود ہے۔ سچے ادب میں ہر غم زدہ انسان سے شفقت و غمگساری کا عنصر لازم ہے لیکن دردمندی کا یہ مسلک قلوب سے متعلق ہے مگر ہمارے یہاں قلوب کی تربیت اب نہیں ہوتی۔ خدا تعالیٰ کی رحمت کا تصور انسان کی چارہ سازی کرتا ہے۔ رحمت کے تصور سے وہ قلوب بھی تسکین پا سکتے ہیں جن کا مداوا خارجی طور سے ممکن نہیں مگر مغربی افکار کے جدید ترین دور میں اس کی اہمیت و افادیت کو تسلیم نہیں کیا جاتا۔ اسی وجہ سے ہمارے ادیب بھی اس تصور سے پہلو بچا کے نکل جاتے ہیں۔

آٹھواں اُصول:- انسانیت اعلیٰ کا نیا تصوّر

میں نے ابتدا میں ادب کو پاکستانیات میں محدود کردینے کا ذکر جس طرح کیا ہے اس سے یہ غلط فہمی ہو سکتی ہے کہ میں ادب کو پاکستانیت تک محدود رکھنا چاہتا ہوں۔ میری گزارش ہے کہ مجھے غلط نہ سمجھا جائے۔ میں ادب کو مقام و مکان سے اُٹھا کر آفاق تک پہنچانے کا قائل ہوں لیکن میں مغرب کے مادہ پرستانہ ہیومنزم کا قائل نہیں۔ مذکورہ ہیومن ازم گھوم پھر کر پھر اقوام و افرادِ مغرب کی خود غرضی میں مرکوز ہو جاتا ہے۔ ہمیں تو اس انسان دوستی کی ضرورت ہے جو رب اللعالمین نے ہمیں سکھائی ہے۔ ہمارے آئندہ کے ادب میں ہمیں انسانیتِ اعلیٰ کے اصول کو اپنانا چاہیے جو مشرق و مغرب اور عرب و عجم سے بالا ہو۔

یہ ہیں وہ چند اصول اور اشارے جن سے آئندہ کا اُردو (پاکستانی) ادب تعمیر ہو سکتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ہم اپنے ادب میں عناصر کو جذب کرلیں تو وہ بیگانگی دور ہو سکتی ہے جو اس وقت ہمارے ادب اور عوام کے درمیان سدِ راہ بنی ہوئی ہے۔

شوالک کا سُلگتا ہوا جنگل

سید ضمیر جعفری

صاحبِ "علامت" سے ہماری صاحب سلامت پر چالیس سے کچھ اُوپر برسوں کی مدت گزر چکی ہے۔ اس عرصے میں، اختر کے علم کا وزن بڑھا ہے اس کا اپنا وزن نہیں بڑھا۔ جیسا ہلکا پھلکا ۱۹۳۶ء میں، اسلامیہ کالج لاہور میں دیکھا تھا ویسا ہی آج دیکھ رہے ہیں۔ غزل دوہری ہو گئی، خود وہی اکہرے کا اکہرا ہے۔ وقت تو دبے پاؤں نہیں گزرتا، اختر ہی دبے پاؤں گزرا ہو گا۔

اختر کا آبائی وطن — ہوشیار پور — کوہستانِ شوالک کے دامن میں واقع ہے۔ ان پہاڑوں پر نہ جانے کیسے بادل برستے ہیں کہ اس کی ترائی سے جو اہم شاعر اٹھا خواہ وہ ملک الشعراء غلام قادر گرامی ہو یا حفیظ ہوشیار پوری (حتیٰ کہ سوہن لال ساحر بھی) اس نے خصوصیت سے غزل کو وسیلۂ اظہار بنایا اور اس کمالِ سپردگی سے اس صنعت کو اپنایا کہ غزل ان کی پہچان اور وہ غزل کی آبرو بن گئے۔ اس طویل مدت میں غزل پر کئی بحران آئے۔ ایک مرحلے میں تو ایسا لگا کہ جیسے مغربی طرز کی نظمِ جدید کے ساتھ "نثری شاعری" میں غزل کا بازو ہی اتر گیا ہو۔ اس پر کئی شاعروں نے غزل کا دامن چھوڑ دیا۔ مگر اختر آج تک پوری گرم جوشی سے غزل کے پرچم کو بلند رکھے ہوئے ہے۔ غزل نے بھی اس کی صحبت کا جواب صحبت سے دیا۔ اور اختر کو اس طرح اپنے میں جذب کیے رکھا، جس طرح سندر ناریں مرد کو اپنے ہاتھ کی ایک انگلی سے لپیٹ لیتی ہیں۔

اختر ہوشیار پوری کی غزل نے اپنی آنکھیں اختر شیرانی کی رومانی نظم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کھولی تھیں جو بجائے خود اس کی خود اعتمادی اور خود آگہی کی علامت ہے ورنہ ان دنوں اختر شیرانی کا اسلوبِ سخن نوجوان نسل کے حواس پر اس ہمہ گیری سے مسلط تھا کہ قریباً ہر نوجوان شاعر، شعر کہنے سے پہلے اختر شیرانی کی سلمیٰ کی پیروی میں اپنے لئے کسی حُسنیٰ، لُبنیٰ، لیلیٰ، نجمہ، رُوحی وغیرہ کا انتظام کر لیتا تھا۔ معلوم نہیں تابش صدیقی کی حُسنیٰ اب کس حال میں ہے، میری نجمہ تو کبھی کی "فیڈ آؤٹ" (FADE - OUT) ہو چکی۔ اختر چاہتا تو وہ بھی کسی ریحانہ یا سلطانہ کو سلمیٰ کا غرارہ پہنا کر اپنی غزل میں لا بٹھاتا، مگر اس نے غزل میں کسی غیر عورت کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا۔ جوانی تو جوانی، پختہ سالی کے مرحلوں میں بھی جب دانائی بعض اوقات نادانی کا سہارا لینے پر مجبور ہو جاتی ہے، اختر نے کبھی کسی عورت کو کم از کم کسی ایسی دل بہ دست عورت کو اپنی غزل میں داخل نہیں ہونے دیا جو مردانہ وار آگے بڑھ کر مرد کی کلائی تھام لے۔ ایک بات بہرحال واضح ہے کہ اس شاعر نے اپنی فکری جہت اور شعری آدرش کو جوانی ہی میں پہچان لیا تھا۔

اختر ہوشیار پوری کی غزل کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اختر ہوشیار پوری کی غزل معلوم ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ میں اپنا نظر کی اس صحبت میں، اختر کے اشعار پیش کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کر رہا۔ اس کے رنگ اور ذائقے سے کون واقف نہیں جو اپنی آمانہ

ذہن فنِ معار بن جاتا ہے جو وقت کی چاپ سُن سکتا ہے۔ اختر کی اس خوبی نے اس کی غزل کو متحرک کر دیا ہے۔ وہ اپنے شعر کو مینڈک کی طرح بیری یا کیکر کی چھاؤں میں نہیں رہنے دیتا۔ اس کو ایک سیال جذبے کے مانند رواں رکھتا ہے۔ وہ دوڑتا بھی ہیں اور سوتا بھی نہیں۔ اپنی غزل کے کردار کے بارے میں اس کا طرزِ عمل بالکل واضح ہے۔ اس کی غزل جوتوں سے میخ نہیں نکالتی، دل میں چبھے ہوئے کانٹے نکالتی ہے۔ اچھے استاد کی طرح وہ رائے نہیں دیتی، ذہن کو بیدار کرتی ہے۔ بھاپ کم روشنی زیادہ — روشنی بھی ایسی روشنی کہ اگر اس کی مشعل بجھ جائے تو آزادی، انصاف، امن، قانون — حرفِ بے معنی ہو کر رہ جائیں۔ انسان سانس تو لے، سر نہ اٹھا سکے۔ آنکھیں کھلی بینائی بند۔ اس کی غزل کپاس کا جگمگاتا ہوا کھیت نہیں ہے۔ وہ بھیگے ہوئے درختوں کا ایک سلگتا ہوا جنگل ہے۔

۱۹۳۶ء میں جب ہم اسلامیہ کالج لاہور میں داخل ہوئے وہ کالج سے نکل کر لاء کالج میں داخل ہو رہا تھا مگر وہ وہاں سے جا کر بھی وہاں سے گیا نہ تھا۔ اس کا زیادہ وقت اسلامیہ کالج کے کریسنٹ ہوسٹل ہی میں گزرتا جہاں اس کا چھوٹا بھائی اکرام قمر مقیم تھا جو کالج کے نامور لیڈروں میں شمار ہوتا تھا۔ اسلامیہ کالج لاہور اس زمانے میں، لیڈر، شاعر، طلبا کا گڑھ بلکہ علی گڑھ تھا۔ شاعروں میں تابش صدیقی اور اختر ہوشیارپوری کالج کے ملک الشعرا مانے جاتے تھے۔ یہ دونوں کالج کے میگزین "کریسنٹ" کے مدیر رہ چکے تھے، جو کسی طالب علم کے لئے اتنا بڑا اعزاز تھا کہ اگر ان کے داڑھی ہوتی تو ہم ان کو علامہ نجیب آبادی کا ہم پلّہ سمجھنے لگتے۔ اختر سے ہماری جس پہلی تقریب میں ملاقات ہوئی وہ اسلامیہ کالج، کو اور اسلامیہ کالج اس کو الوداع کہہ رہے تھے۔ اختر نے اس موقع پر ایک نظم بھی پڑھی تھی جو بعد میں "کریسنٹ" میں شائع ہوئی۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں

الوداع اے مخزنِ علم و ادب، جانِ عمل
الفراق اے اہلِ بزم و درس گاہ بے بدل،
تُو ترقی کے لئے اِک بازوئے پرواز ہے
ساز میں تیرے جمالِ زندگی کا راز ہے
تجھ میں کھلتے ہیں تمدن کے رموزِ بے مثال
نطق تجھ سے سیکھتا ہے آکے فنِ قیل و قال
فلسفہ لیتا ہے تجھ سے آکے رفعت کا سبق
تیرے کمروں میں اُٹھتی ہے وفا داری ورق
سامنے اک اجنبی سارا ستہ پاتا ہوں میں
تُو پھلا پھولا رہے کالج مگر جاتا ہوں میں

اختر نے بعد میں قومی ضرورت کے تحت نظمیں بھی لکھی ہیں، لیکن میرے خیال میں یہ اس کی آخری نظم ہے جو اس نے ذاتی ضرورت کے تحت لکھی تھی۔

تابش اور اختر کی یہ جوڑی کالج میں جتنی مشہور تھی، اتنی ہی ان کی باہمی دوستی ضرب المثل تھی۔ وہ ہم عمر شاعروں کے مابین

مروّت و مفاہمت کا یہ چلن کہ قدم قدم پر ایک دوسرے کے لئے راستہ چھوڑتے چلے جائیں، بظاہر حیرت انگیز تھا۔ مگر باہمی رواداری کے علاوہ انہوں نے دراصل امریکہ اور روس کی طرح اپنے اپنے حلقۂ اثر کی حد بندی بھی کر رکھی تھی۔ تابش نثر کا بادشاہ تھا، اختر غزل کا۔ بی اے کے نونہالوں کی طرح پرورش لوح و قلم تابش کے سپرد تھی اور ایف اے کے شیر خواروں کی نوک پلک اختر سنوارتا تھا۔ اختر کی ایک بات اور یاد آگئی کہ غزل کے بعد اُن کو جو چیز سب سے زیادہ عزیز تھی، وہ سائیکل سواری کا شوق تھا۔

کالجوں سے نکلنے کے بعد جب ہماری نسل دفتروں میں داخل ہونے لگی تو اختر اور میں شملے میں اکٹھے ہو گئے بلکہ کچھ عرصہ تک اختر، خورشید علی بٹ، عزیز ملک اور یہ خاکسار ایک ہی مکان میں "رانڈی وال" رہے ہم سب کی چارپائیاں ایک دوسرے کے برابر بچھی ہوتی تھیں۔ اس عرصے میں اختر اور اختر کی غزل کو بہت قریب سے، دوسری چارپائی پر کروٹیں بدلتے دیکھنے کا موقع ملا۔ شہرت میں اس کی پیش رفت ہر چند ڈرامائی نہ تھی مگر فن پر اس کی قدرت حیرت انگیز تھی۔ اس کی ہر نئی غزل پہلی غزل سے زیادہ مضبوط، منجھی ہوئی، اور سیل خوردہ ہوتی۔ سیل خوردی سے میری مراد زندگی کی مٹی اور دھوئیں میں سموئی ہوئی۔ الفاظ کا چناؤ، چاؤ اور ریاضت کا غماز تھا۔ وہ پہلے لفظ کا منہ دھلاتا، پھر اس کی آواز سنتا، پھر اس کو اس احتیاط سے شعر میں باندھتا کہ پنکھڑی بھی پکڑی جائے اور ریچھا بھی ٹیڑھا نہ ہونے پائے۔ جُڑواں تراکیب اس کے ہاں آتی ہیں۔ مگر سیون کا حاشیہ نظر نہیں آتا۔ اختر جس وقت لحاف کھینچ کر منہ ڈھانپ لیتا، ہم سمجھ جاتے کہ فکرِ سخن کے غوطے میں ڈوب گیا۔ شملے کے مناظر کے بارے میں اس نے بعض سدا بہار شعر، لحاف میں لیٹے لیٹے کہے۔ یوں شملہ اس کو ناپسند تھا کیونکہ شملے اور بائیسکل کے تعلقات خوشگوار نہ تھے۔ ہم چاروں تصنیف و تالیف کا کام ایک دوسرے کے سامنے کیا کرتے۔ اختر کو میں نے شعر کہتے وقت کبھی بے چینی سے ٹہلتے یا شور مچاتے، جزع فزع کرتے نہیں دیکھا۔ وہ شعر خاموشی سے کہتا تھا۔ جیسے معمول کو دل کی سلیٹ پر لکھ کر پھر کاغذ پر اتار لیتا ہو۔ اس کی غزل میں محبت تو تھی مگر عورت نہ تھی لیکن یہ بات تعجب سے سنی جائے گی کہ اُس وقت کے ہندوستان میں اس وقت کی بعض نوخیز شاعرات، اختر ہوشیارپوری سے اصلاح لیتی تھیں۔ ان میں سے ایک ایم اے، بی ٹی لڑکی جو کل ہند پیمانے پر مشہور ہونے کے بعد اچانک غائب ہو گئی، پوری کی پوری غزلیں ان سے لکھواتی تھی۔ ہم نے خود اختر کے نام اُس ساحرہ کے خط دیکھے ہیں۔ لکھا ہوتا۔ "اے آسمانِ ادب کے اخترِ تابندہ۔ ایک غزل بغرضِ اصلاح بھیج رہی ہوں ایک ہفتے کے اندر اندر مل جائے۔ ذرا سانولے سلونے شعر ہوں، جو قلب کو گرما دیں اور روح کو تڑپا دیں"۔ غزل دیکھی تو دو قافیے لکھے تھے فروزاں اور چراغاں۔ جس طرح حضور نظام دکن استاد جلیل کو چند اشارے لکھ دیا کرتے تھے کہ ان خطوط پر غزل بنا دیجئے۔ اختر کو چاہیئے کہ کبھی اس کہانی کو اپنے قلم سے بھی لکھ ڈالیں۔ ہم کہیں گے تو شرارت ہوگی۔

اختر کو ہم نے ایک مرنجاں مرنج اور با اعتماد دوست پایا۔ وعدہ مشکل سے کرتا، مگر پکا کرتا تھا۔ بات زیرِ لب اور دھیمی ہوتی۔ فن و فکر میں جس کا وقار جتنا بڑھ رہا تھا اتنا ہی اس کا انکسار بڑھ رہا تھا جیسے وہ صبح کو اٹھتے ہی اپنے آپ سے پوچھتا ہو کہ میرے نہ ہونے سے کون سے کام بند ہو جائیں گے۔ شملے میں ادیبوں کی دو تین ٹولیاں آپس میں دست و گریباں رہتی تھیں۔ ایک ٹولی ہماری تھی۔ تاہم معرکہ آرائی میں نہ صرف یہ کہ دوستوں کے ساتھ ساتھ رہتا بلکہ ہراول میں ہوتا۔ اپنے لئے اس نے کبھی کسی مقام پر جاہ کی چاہ نہیں کی۔ اس کے چھبیلے چھبیلے محفلوں کو روشن کرنے والے ہوتے مگر سوچ اور احتیاط کا ایک پردہ سا بھی اس کی شخصیت پر تنا رہتا تھا۔ وہ شادی شدہ نہیں تھا مگر شادی شدہ لگتا تھا۔ میں سوچتا ہوں کہ اس کے مجموعۂ کلام کی اشاعت میں تاخیر کا سبب کہیں اس کی یہی خصوصیات تو نہیں ہوئیں۔ سوچ، احتیاط، انکسار میرے نزدیک اس کی عظمت کا ستون بھی یہی تین چیزیں ہیں۔ میں تو اس کی بائیسکل کو بھی سلام کرتا ہوں، جو شاید اس وقت بھی باہر سڑک پر کھڑی ہو۔

جنگلی

بلراج کومل

کرشن ادیب کی شخصیت اس نظم کے مانند ہے جس میں تفصیلات نہایت غلیظ ہوتی ہیں لیکن نظم مجموعی طور پر خوبصورت ہوتی ہے۔ اس کی مقبولِ عام تصویر کچھ اس قسم کی ہے:

کرشن ادیب آوارہ گرد ہے
بے کاری اس کا مستقل پیشہ ہے
درجنوں لڑکیوں سے عشق کر چکا ہے۔
پہلے دوسروں کے شعر سنایا کرتا تھا۔ اب بہت سالوں سے اپنے شعر سناتا ہے
وغیرہ!!

کرشن ادیب کی یہ تصویر جزئیات کے اعتبار سے سراسر غلط نہیں ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ آوارہ گرد ہی نہیں بلکہ جہاں گرد ہے۔ بے کاری اس کا مستقبل پیشہ ہے اور وہ درجنوں لڑکیوں سے عشق بھی کر چکا ہے اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ وہ پچھلے کئی برس سے اپنے شعر سنا رہا ہے۔ کرشن ادیب کی اس تصویر میں یاروں نے کچھ رنگ ضرورت سے زیادہ ہلکے کر دیئے ہیں، اور کچھ ضرورت سے زیادہ گہرے کر دیئے ہیں۔ باقی تصویر بظاہر حقیقت کے کافی قریب ہے لیکن کرشن ادیب، تصویر کے پردے میں عریاں ہونے کے باوجود مکمل طور پر عریاں نہیں ہے۔ وہ اس ہیولے کی طرح ہے جو ہزار صورتیں اختیار کرتا ہے!

کرشن ادیب نے اپنی مقبولِ عام تصویر کو قبولِ عام کی سند دلانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا ہے۔ اپنی زبان سے اپنے دوستوں، واقف کاروں اور مداحوں کو اپنی آوارگی وجہاں گردی، بے سروپا زندگی کے واقعات سنائے ہیں اور ترمیم و اضافہ کے ساتھ سنائے ہیں۔ اُن سے اپنے کارناموں کی داد طلب کی ہے۔ جنس اور نقد — دونوں صورتوں میں جھولیاں بھر بھر کر وصول پائی ہے۔

اس کی زندگی کا سفر بڑا پُر پیچ اور طویل ہے۔ بچپن میں وہ سکول جانے کی بجائے خوبصورت چہروں سے عشق کرنے میں مصروف رہا کچھ اور بڑا ہوا تو ایک شوگر مل میں مزدوری کرنے لگا۔ وہاں سے لوٹا تو پنجاب کے مختلف شہروں میں جاکر لوہاروں کی بھٹیوں پر ہتھوڑے چلانے کا کام کرتا رہا اور پھر دہلی میں آکر سنکڑوں پیشے اختیار کئے لیکن بدقسمتی کہ اُسے کسی پیشے نے اختیار نہیں کیا۔ تعلیم کے زیور سے آراستہ ہونے کے لئے اس نے پنجاب یونیورسٹی سے "ادیب" کا امتحان پاس کیا جو خوش قسمتی سے بعد ازاں بطور تخلص (بلکہ محض تخلص کے طور پر ہی) اس کے لئے کارآمد ثابت ہوا۔ اس کی زندگی میں آج تک کوئی ایسا واقعہ ظہور پذیر نہیں ہوا جس کی وجہ سے اُسے مروجہ

اخلاق اور سماجی مقام بخشا جا سکے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس نے اپنی سیاہ تصویر کی کمپوزیشن بگاڑنے سے احتراز کیا ہو کیونکہ اس کے فن کار ہونے میں آج تک اس کے دشمنوں کو بھی شک نہیں ہوا۔

کرشن ادیب سے میری پہلی ملاقات ۱۹۴۸ء میں ہوئی تھی۔ اردو بازار دہلی میں وہ ساحر لدھیانوی کے ساتھ تھا۔ ساحر کی وساطت سے اس کے ساتھ میرا تعارف ہوا۔ میں کرشن ادیب سے مل کر بڑا متاثر ہوا کیوں کہ اس کا حلیہ ساحر سے بھی زیادہ شاعرانہ تھا۔ دوسری ملاقات فیروزپور میں ہوئی جہاں وہ بن بلائے مہمان کی طرح میرے مکان پر آ گیا اور رات بھر اپنے تازہ ترین عشق کی المناک داستان سنانے کے علاوہ اپنی زندگی کے وہ سنسنی خیز واقعات سناتا رہا جن کی بنا پر اس کی مقبولِ عام تصویر لوگوں کے ذہن میں ترتیب پا رہی تھی اس ملاقات سے مجھے یہ پتہ چلا کہ کرشن ادیب کو ہزاروں نئے اور پرانے اشعار زبانی یاد ہیں اور بہت سے مشہور و معروف شعرا کو ذاتی طور پر ٹھیک اسی طرح جانتا ہے جس طرح لوگ اپنے ریس کے گھوڑوں کو جانتے ہیں۔ پھر اس کے بعد تیسری ملاقات دہلی میں ہنس راج رہبر کے مکان پر ہوئی اور اس ملاقات کے بعد ہماری مسلسل ملاقاتوں کا آغاز ہوا۔

کرشن ادیب جسمانی طور پر کمزور ہونے کے باوجود اُن مردوں کی صف میں آتا ہے جن کی کشش عورتیں فطری طور پر محسوس کرتی ہیں۔ اس کا قد لمبا ہے، جسم دبلا پتلا، بال گھنے، ملائم اور خوبصورت ہیں۔ پیشانی سے وہ خوش بختی کا ثبوت دیتا ہے (ویسے عملی زندگی میں اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا) آنکھوں میں عجیب و غریب قسم کا اضطراب ملے گا بےبسی، امید، بےچینی، افسردگی، یاس، آتشِ نفس۔ خدا جانے کتنے متضاد عناصر کا امتزاج ہے۔ میں نے ان میں مسرت دیکھی ہے۔ شرارت دیکھی ہے اور وہ وسعت و ہمہ گیری دیکھی ہے جو صرف نیلے آسمان یا کھلے میدانوں اور پہاڑیوں میں ہوتی ہے۔ چہرے پر گوشت کی کمی ہے لیکن اس میں منفرد قسم کی کشش ہے جو پہلی ہی نظر میں دیکھنے والے کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے۔ ہونٹ قدرے موٹے ہیں لیکن ان کی ساخت سے جذبے کی شدت کا احساس ہوتا ہے۔ یہ ہونٹ ایک ایسے شخص کے ہونٹ ہیں جو جسمانی اعتبار سے بھرپور محبت کے قابل ہے لیکن بے قاعدہ و بے ترتیب زندگی اور بیماریوں کی وجہ سے کمزور ہو چکا ہے۔ باقی جسم عام آدمی کا جسم ہے۔ بالوں سے ڈھکا ہوا، جانور کا جسم، شکاری کا جسم۔ ہاتھ بڑے خوبصورت ہیں لیکن یہ ہاتھ خالص فنکار کے ہاتھ نہیں۔ ان میں لچک اور نرمی کے ساتھ ساتھ سختی اور کھردرا پن بھی ہے۔ اس کی لمبی انگلیاں تو با کرٹنے، دوسروں کے مکانوں کے تالے کھولنے اور تصویروں میں رنگ بھرنے کے علاوہ رقص کی مدراؤں کے دائرے بھی بنا سکتی ہیں!

کرشن ادیب کا اندازِ گفتگو اس کی صد رنگ شخصیت کا سب سے دلچسپ پہلو ہے۔ وہ فنِ گفتگو کا ماہر، گفتار کا غازی اور باتوں کا سوداگر ہے۔ اس کی زبان سے الفاظ پہاڑی ندی کی موجوں کی طرح بہتے ہیں۔ اس کا انگریزی مطالعہ اگرچہ بہت محدود ہے لیکن بڑا وقت پڑنے پر وہ اس محدود علم سے بھی بڑے بڑے معرکے مار سکتا ہے۔ کیٹس اور شیلی اس کے محبوب شعرا ہیں (جن کو اس نے قطعاً نہیں پڑھا) ایذرا پاؤنڈ، ٹی ایس ایلیٹ سے بڑی عقیدت رکھتا ہے (اگرچہ ان کی شاعری اس کے فہم سے ماورا ہے۔ اُردو اس کی رگ و پے میں سرایت کر چکی ہے۔ پنجابی زبان کا استعمال وہ لطیفے اور "بولیاں" سنانے کے لئے کرتا ہے۔ ہندی نظمیں اس نے لڑکیوں کو متاثر کرنے کے لئے یاد کر رکھی ہیں۔ دوستوں کی محفل میں موڈ آنے پر گھنٹوں بول سکتا ہے۔ اُن کو گدگدا سکتا ہے، جھنجھوڑ سکتا ہے اور ان کو اشتعال دلا سکتا ہے۔ اُن کو ایسی ان کہی تفصیلات سے آگاہ کر سکتا ہے۔ جو صرف زندگی کے وسیع تجربے سے حاصل ہوتی ہیں۔ وہ اُس کی باتیں سنتے ہیں ہنستے ہیں، قہقہے لگاتے ہیں۔ داد دیتے ہیں اور جانے سے پہلے بخوشی کئی بار نقد معاوضہ ادا کر کے جاتے ہیں۔ کرشن ادیب اُن کی کمزوریوں

سے واقف ہے۔ وہ مسکراتا ہے اور محفل میں آنے والے نئے دوستوں کے ساتھ کسی تازہ مہم پر روانہ ہو جاتا ہے:

لباس کے بارے میں اس کی بے پروائی ضرب المثل بن چکی ہے۔ اُس کے لباس کا بے ترتیب ہونا ضروری ہے۔ اس کے کپڑے "پریس" نام کی ایجاد سے قطعی طور پر واقف نہیں۔ ان کا دو چار جگہوں سے جدا ہونا ضروری ہے۔ رنگوں کے بارے میں اس نے زیادہ غور نہیں کیا۔ کیونکہ پتلون کلکتہ سے آئی ہے۔ قمیص بمبئی کی پیداوار ہے اور کوٹ دہلی سے دریافت کیا گیا ہے۔ جرابیں پھٹی ہوئی ہیں اور بوٹ پالش سے نا آشنا ہیں۔ اس کے دن کے کپڑوں اور رات کے کپڑوں میں کوئی فرق نہیں۔ انہیں کپڑوں میں وہ سڑکیں ناپتا ہے۔ کافی ہاؤس میں لطافت، ظرافت اور کثافت کے دریا بہاتا ہے اور رات ہونے پر انہیں کپڑوں میں سو جاتا ہے۔ نہانے کی ضرورت محسوس ہو تو یار لوگوں کے گھروں کے غسل خانے استعمال کرتا ہے۔ گرمی، آندھی، طوفان، سخت سردی، بھوک پیاس، کوئی چیز اس کے نحیف و نزار جسم پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ صبح کا سورج نمودار ہوتا ہے اور وہ مسکراتا ہوا اس کے استقبال کے لئے شاہراہوں پر آجاتا ہے۔ پھر کسی ہوٹل کے کونے میں بیٹھ کر یار لوگوں کو "ٹکٹ" لگا کر اپنی تازہ غزل سناتا ہے اور اسی ہوٹل میں بیٹھ کر نہایت پُرتکلف لنچ کھا کر ٹکٹ سے اکٹھی کی ہوئی رقم بطور بل اور بیرے کی ٹپ ادا کرتا ہے۔

بنیادی طور پر کرشن ادیب کا کردار ایک جنگلی جانور کا کردار ہے۔ اس جنگلی جانور کا کردار، جو تہذیب کی نزاکتوں سے واقف ہونے کے باوجود شکار کی بُو سونگھتا پھر رہا ہے۔ دائمی مسرت سے اُسے وحشت ہوتی ہے۔ وہ لمحہ مسرت کو شدید سے شدید تر کرنا چاہتا ہے وہ موسموں کے سب راز جانتا ہے۔ تغیرات کی نبض پہچانتا ہے۔ سب زبانوں، سب بولیوں کا مطلب سمجھتا ہے۔ اس کو آج اور صرف آج سے دلچسپی ہے۔ وہ گھر یا گھونسلا بنا کر رہنے کے فن سے واقف نہیں ہے۔ صرف پرواز کرنا جانتا ہے۔ سفر کی لذت کا شیدائی ہے۔ وقت اور فاصلوں کی حدود سے باہر، معاش کی فکر سے آزاد، صحراؤں، بیابانوں، آسمانوں کی وسعتوں کو اپنی گرفت میں لینا چاہتا ہے شہر، قصبے، مکان، گلیاں، بازار، کوچے — سبھی اس کی لپیٹ میں آتے ہیں لیکن اُس کے پَر نہیں کاٹ سکتے۔ اس کے قدموں میں زنجیر نہیں پہنا سکتے۔ وہ آزاد ہے ازل سے ابد تک۔ وہ ایک ایسا مسافر ہے جو صدیوں سے منزل کی تلاش میں محوِ سفر ہے۔ وہ ایک آوارہ خواب ہے جو برسوں ذہن کے گرد منڈلاتا رہتا ہے۔ سماجی حدبندیوں اور قوانین کو پھلانگتا نیلی دھند کی طرح افق کو چُھوتا نظر آتا ہے۔ یہ کرشن ادیب ہے۔ اس سے مل کر آپ اپنی شخصیت کے اس ٹکڑے سے ملتے ہیں جو آپ سے گردشِ روزگار میں کہیں بچھڑ چکا ہے۔

نظم و ضبط کا دشمن ہوتے ہوئے بھی وہ زندگی کی نفاستوں کا شیدائی ہے۔ اچھے کھانے اس کی کمزوری ہیں۔ چائے وہ خاص اہتمام اور سلیقے کے ساتھ پیتا ہے۔ چائے دانی کا خوبصورت ہونا ضروری ہے۔ پیالیوں کو دیکھ کر چینی تصویروں کی یاد آنی چاہیئے۔ چائے ٹھیک اسی طرح سے پیالیوں میں گرے جس طرح اے حمید کی کہانیوں میں گرتی ہے۔ گفتگو کا لطف اٹھانے کے لئے باذوق دوستوں کا چائے کی میز پر ہونا ضروری ہے اور اگر ممکن ہو تو میزبان کی بیوی بھی وہاں موجود ہو۔ اس ماحول میں کرشن ادیب لہلہا اٹھتا ہے، مسکراتا ہے، ہنستا ہے اور اشعار کی پھلجھڑیاں چھوڑتا ہے۔ محفل کو گدگداتا ہے اور چائے کا بھرپور لطف اٹھاتا ہے!

کرشن ادیب پیدائشی عاشق ہے۔ گلیوں، بازاروں، سڑکوں، شراب خانوں، ریستورانوں کا موسموں کے حُسن کا اور سب سے زیادہ عورت کا! اس میں CASANOVA بننے کے سبھی خصائل موجود ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک عجیب و غریب قسم کی ملائمیت ہے جو جسم کی وساطت سے روح میں اُتر جاتی ہے۔ لیکن جسم کو کریدنے سے گریز کرتی ہے۔ میں نے اسے لڑکیوں اور عورتوں پر عقاب کی طرح جھپٹتے نہیں

دیکھا۔ اُن کی ذات میں اپنی پُوری شخصیت کو تحلیل کرتے دیکھا ہے۔ اس کی زندگی کے بہترین سال اسی غم کی آبیاری کرنے میں گزرے ہیں جو اس کو اُن لڑکیوں سے ملا ہے ——————— جو اس کے ساتھ محبت کرنے کے بعد اپنے جمال کی دھندوں میں معدوم ہو گئیں۔ کرشن ادیب کے عشق میں خلیل جبران کے عشق کا سا تقدس ہے۔ وہ معدوم محبوب کا نام لے کر بیدار ہوتا ہے۔ رات کو سونے سے پہلے محبوب کو یاد کرتا ہے۔ دن بھر اپنی منتشر شخصیت کے گوشے دکھاتا ہے تاکہ لوگ اس کے جنگلی کردار کے ہر گوشے کو دیکھ سکیں۔ میں نے اُسے ہزل گوئی کرتے سُنا ہے، غلیظ ترین لطیفے اور ان سے لطف اندوز ہوتے دیکھا ہے لیکن خلیل جبران کو ذلیل کرتے نہیں دیکھا، غم کا تمسخر اڑاتے نہیں دیکھا۔ اس کا راستہ وہی ہے جو صبا کا ہوتا ہے۔ جو چاندنی کا ہوتا ہے جو ستاروں کا ہوتا ہے۔ اور جو نیلے آسمان کا ہوتا ہے۔

لیکن کرشن ادیب بنیادی طور پر اُن عاشقوں میں سے نہیں جو شادی کو عشق کی معراج سمجھتے ہیں۔ اس کا جنگلی کردار اس کے سماجی کردار سے زیادہ اہم ہے۔ وہ محبوبہ کو بیوی بنا کر اپنی نظروں سے گرانا نہیں چاہتا، ذمہ داری سے وہ بھاگتا ہے۔ اُسے ڈر لگتا ہے کہ اب اسے اپنے جنگلی کردار کی قربانی دینا پڑے گی۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ کرشن ادیب کو باقاعدہ ملازمت اختیار کرنا پڑے گی۔ کپڑے، لتے، آٹا، دال کی فکر کرنا پڑے گی اور جب بچے ہو جائیں گے تو اُن کی تعلیم کا بندوبست کرنا پڑے گا اور یہ عظیم کارنامہ ایسا ہے جو کرشن ادیب کی فطرت کے خلاف ہے، اس کی قوت اس کی حدود سے باہر ہے۔ لیکن کرشن ادیب کی زندگی کا تضاد اسی کارنامے سے ابھرتا ہے۔ اسی کارنامے سے پتہ چلتا ہے کہ کس طرح جنگلی جانور موسموں کے تغیرات کا مقابلہ کرنے کے لئے اپنے جسم کی ساخت بدل لیتا ہے۔ سرد ملکوں میں اس کے جسم پر بال اُگ آتے ہیں۔ کھردری زمین پر اس کے پاؤں کی کھال سخت ہو جاتی ہے اور اونچے پیڑ دیکھ کر اس کے اندر لپکنے کی قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ کرشن ادیب کے اندر چھپا ہوا جنگلی جانور وقت آنے پر محبوبہ کو بیوی بنا لیتا ہے۔ تین بچوں کا باپ بن جاتا ہے اور ایگریکلچرل یونیورسٹی میں بہ حیثیت فوٹوگرافر ملازمت اختیار کر لیتا ہے۔ لیکن اپنے جنگلی کردار پر حرف نہیں آنے دیتا۔ دن بھر گھریلو ذمہ داریاں پوری کرنے کے لئے ملازمت کے فرائض ادا کرتا ہے لیکن شام ہوتے ہی وہ گھر سے نکل جاتا ہے۔ یار لوگوں کی محفلیں اس کا انتظار کرتی ہیں۔ اُس کے دوستوں، مداحوں کی فہرست آج بھی لمبی ہے۔ شہر بھر کے شاعر، مصور، گلوکار اس کے چاہنے والوں میں سے ہیں (کرشن ادیب کو یہ بھی فخر محسوس ہوتا ہے کہ اس کی غزلیں جگجیت سنگھ اور محمد رفیع جیسے گلوکار گاتے ہیں)، وہ جہاں جاتا ہے لوگ اس کی پذیرائی کرتے ہیں۔ کرشن ادیب ان کے ساتھ بیٹھا شراب پیتا ہے۔ سگریٹ پھونکتا ہے۔ سنجیدہ غیر سنجیدہ موضوعات پر اپنے مخصوص لہجے میں باتیں کرتا ہے اور خود فراموشی کے لمحوں میں بیتے دنوں کی یادوں کو تازہ کرتا ہے جب وہ مملکتِ بیکاری کا بادشاہ تھا۔

میں سوچتا ہوں کیا کرشن ادیب اب بھی شراب کے نشے میں سرسوں کے تیل کو شراب سمجھ کر پی سکتا ہے؟ کیا اب بھی وہ کھلونے بیچنے والے کی دکان سے گیند چوری کر کے اپنے میزبان دوست کی بچی کو پیش کر سکتا ہے! — یہ سوال بڑے اہم ہیں کیونکہ میں نے اُسے یہ سب کام کرتے اور ان کے علاوہ بہت سے عجیب و غریب کام بڑی آسانی اور خوش اسلوبی سے سرانجام دیتے — اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔

میں خود ہی اس سوال کا جواب دینا چاہتا ہوں۔ کرشن ادیب میں زندگی کی لگن اس قدر شدید ہے کہ وہ گھر سے باہر نکل کر گلیوں، بازاروں، سڑکوں کو اپنے استقبال کے لئے مجبور کر دیتا ہے۔ وہ دو بار تپدق کا شکار ہو چکا ہے۔ ایک بار نروس بریک ڈاؤن ہو چکا ہے اور ابھی گزشتہ دنوں وہ ہسپتال میں کشمکشِ مرگ و حیات میں مبتلا آکسیجن کے رحم و کرم پر رہا ہے۔ یہ معجزہ ہے کہ وہ آج بھی زندہ ہے۔ منوں تمباکو پی چکا اور کھا چکا ہے۔ ٹنوں شراب اُس کے جسم کی وادی سے چُپ چاپ بہہ گئی ہے، وہ لوگوں کا ہزاروں روپیہ جائز مال کی طرح ہضم کر چکا ہے

درجنوں لڑکیوں سے بھرپور عشق کر چکا ہے۔ بڑے بڑے فلم اسٹاروں، فن کاروں، شاعروں کا ہم نوالہ و ہم پیالہ رہ چکا ہے اور مارکوپولو کی طرح ہندوستان کے شہروں، قصبوں، جنگلوں اور ویرانوں کی سیاحت کر چکا ہے۔ وہ ایک ایسا شادی شدہ برہمچاری ہے جو سرسوں کا تیل تو کیا زہر بھی پی سکتا ہے۔ تاروں، زنجیروں اور لوہے کی دیواروں کو اپنی شعلہ بار آنکھوں سے پگھلا سکتا ہے۔ وقت آنے پر کھلونے بیچنے والے کی ساری دوکان لوٹ سکتا ہے اور کھلونے دنیا بھر کے بچوں میں تقسیم کر سکتا ہے!

لیکن خوش قسمتی سے کرشن ادیب کے ازلی و ابدی جنگلی کردار نے اپنا محبوب مشغلہ تلاش کر لیا ہے۔ یہ سچ ہے کہ یہ تلاش بڑی کٹھن تھی اس تلاش میں اسے اپنی صحت، اپنے سکون کی قربانی دینی پڑی لیکن جو کچھ اس نے حاصل کیا ہے وہ دیرپا ہے، خوبصورت ہے اور اپنے اندر وسیع امکانات لئے ہوئے ہے۔

میں اس کی نظمیں پڑھتا ہوں
غالباً آپ بھی پڑھتے ہوں گے
لیکن یہ ایک الگ داستان ہے!

ڈاکٹر داؤد رہبر

اُستاد فیاض علی خاں مرحُوم

(امریکہ کے سفر کے دوران بوسٹن یونیورسٹی میں ڈاکٹر داؤد رہبر سے خاصی صحبتیں رہیں۔ داؤد رہبر بوسٹن یونیورسٹی میں مذہبیات کے پروفیسر ہیں۔ اُن کے والد ڈاکٹر محمد اقبال پنجاب یونیورسٹی میں فارسی کے پروفیسر تھے۔ ان کے تایا پروفیسر خادم محی الدین ریاضی کے پروفیسر تھے، ان کو موسیقی سے بے حد لگاؤ تھا۔ ممتاز ایئر ضیا محی الدین، پروفیسر خادم محی الدین کے صاحبزادے ہیں اور داؤد رہبر کے تایا زاد بھائی ہوتے ہیں۔ داؤد رہبر کو موسیقی سے صرف لگاؤ ہی نہیں بلکہ کلاسیکل راگداری میں دسترس حاصل ہے۔ انہوں نے بہت راگ سنائے اور دورانِ ملاقات جناب محمد ایوب اولیا مقیم لندن کا مکتوب بھی دکھایا جس میں وہ لکھتے ہیں: "ضیا محی الدین سے معلوم ہوا کہ گائیکوں میں سے استاد فیاض علی خاں مرحوم آپ کو بہت زیادہ پسند تھے۔ ہم رہے پنجابی۔ ہمارے تو پٹیالہ کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے یا پھر کرانہ اور اس کی ترقی یافتہ صورت اندور۔ میں آپ کا بے حد ممنون ہوں گا اگر آپ اپنی مصروفیت میں سے کچھ وقت نکال کر ہمیں استاد فیاض علی خاں مرحوم کی خوبیوں سے مطلع کریں اور بتائیں کہ وہ آپ کو اس قدر کیوں پسند تھے۔"

ڈاکٹر داؤد رہبر نے محمد ایوب اولیا کے خط کا جواب لکھا۔ اُسے پڑھنے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ یہ ایک ایسا مکتوب ہے جو موسیقی کے شائقین کے لئے محفوظ رکھنا ضروری ہے۔ لہٰذا قارئین کو اس کے مطالعہ میں شریک کرتا ہوں۔ (آغا بابر)

بوسٹن میسے چوسٹس، (امریکہ)
۵ جون ۱۹۷۹ء

مکرمنا اولیا صاحب،

تسلیمات، زندگی کے جھمیلوں کے درمیان ایسے دن بھی آتے ہیں کہ اپنی خوش بختی پر ناز ہوتا ہے، چند بار ایسا ہوا کہ کسی اہلِ ہنر کی دوستی اپنے آپ ہماری جھولی میں آن گری، آپ نے خدا جانے کہاں سے خاکسار کا ذکر سُن پایا۔ یقیناً یہ ہمارے دلِ گرم کی شرارت ہے، ورنہ کوئی ایسا کمال ہم نے نہیں دکھایا جس کے باعث لوگ ادھر توجہ فرمائیں۔

آپ نے پوچھا کہ خاص استاد فیاض علی خان مرحوم کا تُو کیوں قائل ہوا۔ اس کا سادہ جواب تو یہ ہے کہ یہ مزاج کی بات ہے، آفتابِ موسیقی کا گانا اسے پسند آئے گا جو شکستہ ناپسند کرتا ہے، خاں صاحب مرحوم کی گائیکی فاتحانہ گائیکی ہے، یوں تو آگرہ گھرانہ پہلے ہی

فتحندی کا گھرانہ تھا لیکن استاد مرحوم نے اسے ایسی فتح کا آئینہ کر دیا جس میں کمند اور کمین گاہ اور کمینگی کا کوئی کام نہیں، بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ یہ فتح تلوار کی فتح بھی نہیں، یہ قوتِ کردار کی فتح ہے۔

استاد فیاض علی خان کا گانا سُننے سے حوصلہ بڑھتا ہے، آپ فرمائیں گے کہ پٹیالے کے تان کپتان بھی نڈر لوگ ہیں اور جرات کا پیغام دیتے ہیں۔ اس سے مجھے انکار نہیں، لیکن استاد فیاض خان صاحب کے گانے میں فتح پوری سیکری کی درباداری کے آداب ہیں اور پٹیالے والوں کے ہاں عام بول چال کی بے تکلفی ہے، پٹیالے والے ہنس بول کر گاتے ہیں۔ بیچ میں لطیفہ بھی کہہ جاتے ہیں اور ایک بے ضرر گالی بھی سُروں کے روپ میں جڑ دیتے ہیں۔ آگرے والے راگ راگنی کو شاندار کر کے پیش کرتے ہیں، سجاوٹ میں شکوہِ سلطانی ہے، دیہاتی چودھراہٹ نہیں، آگرہ گھرانے کی گائکی "باادب ہشیار" گائکی ہے۔

آگرہ گھرانے کے گائک آج سے سو سال پہلے کیسے گاتے تھے۔ اس کا ہم کو اندازہ کیونکر ہو، یونس حسین خان یہاں تشریف لائے تھے، انہوں نے یہ "راز" افشا کیا کہ استاد فیاض خان کا گانا ان کی اپنی اختراع نہیں تھا، بقول یونس حسین خان "استاد فیاض علی خاں مرحوم نے گانے کا انداز اپنے ایک معاصر بزرگ استاد عبداللہ خاں سے اڑایا"۔ اس کی تصدیق کی کوشش بیکار ہے، ممکن ہے اس میں کچھ صداقت ہو، کتنے فی صد؟ اس سے ہم کو بحث نہیں، البتہ یہ ہم کو معلوم ہے کہ آگرہ اکبر کا دارالسلطنت تھا، وہاں نوبت اور شہنائی کی گونج تھی، یہ گونج آگرہ گھرانے کی گائکی میں صاف سنائی دیتی ہے۔ میں نے استاد امراؤ بندو خان صاحب سے یہ بات سنی کہ استاد فیاض خان مرحوم بسم اللہ خاں کی شہنائی کو بہت مانتے تھے۔ غور سے سُنیئے تو کلاسیکی شہنائی اور آگرہ کی گائکی میں خاصی مشابہت ہے، تار سپتک کے کام میں یہ مشابہت اور بھی واضح ہوتی ہے۔ شہنائی ترک اور ایرانی موسیقاروں کا ساز ہے۔ اس لئے شہنائی میں قوالوں کی بے نیازی جھلکتی ہے اور قوالی قلندرانہ گانا ہے آگرہ گھرانے میں بھی قلندری استغنا کا دبدبہ ہے۔ آگرہ والوں کے حلقے سے باہر قلندری اور قوالی کا خاص اثر شہسوان والوں کے ہاں بھی ہے نا، اور اس لحاظ سے سب سے خالص اسلامی رنگ کی راگداری میں نے اپنی زندگی میں نثار حسین خاں صاحب کے ہاں پائی۔ رامپور کے پٹھانوں کا بانکا پن اور اضطراب، نثار حسین خان صاحب کے اسلوب میں سب سے زیادہ ملتا ہے۔ خاں صاحب گوڑ سارنگ اور بندرابنی سارنگ سے اپنے مزاج کو سب سے زیادہ ہم آہنگ پاتے ہیں، یہ دونوں مدبرِ روش کی راگنیاں ہیں۔

آگرہ گھرانے کے خواص پہلے دیکھنے چاہئیں، اس کے بغیر استاد فیاض خان صاحب کی برگزیدگی کی بات نہیں ہو سکتی۔ آگرہ گھرانہ چونکہ بر ملا اسلوب کا پرستار ہے اس لئے اس کے عناصر پہچاننے چاہئیں:

پہلی بات: آلاپ کاری، آگرہ والوں سے باہر یہ کام صرف ڈاگر خاندان میں ہوتا ہے دھرپدیوں کا یہ مسلمان خاندان دراصل بینکاروں کا خاندان ہے۔ بینکاری ان کی اصل میراث تھی، چنانچہ ان کے آلاپ میں بینکاری کی گونج ہے ڈاگر بانی آلاپ میں بینکاری کا انیونی اثر ہے، لمبی لمبی سست سُست مینڈیں اٹھائی جاتی ہیں، ان کے گلے کے آلاپ میں اور ان کی دھرپد میں نون غنہ بھی بہت ہے جو سرتی بین کے نون غنہ کا اثر ہے۔ اس گھرانے کی سپھرتی تان (جس کو وہ لوگ بدتلفظی سے اسفرتی تان کہتے ہیں) میں ایسی نون غنہ بہت ہے جس سے وہ تان آلاپ میں ایک ہلکہ خیز چیز بن کر دوڑتی ہے۔

آگرہ گھرانے کے آلاپ میں ڈاگر بانی آلاپ کی احتیاطیں، آہستگی، ٹھہراؤ اور تاملات نہیں ہیں، آگرے کا آلاپ لشکر کی طرح کوچ کرتا ہے۔ نون غنہ آگرہ گھرانے میں بھی ہے، ناک اس گھرانے میں بہت کارآمد آلہ ہے، تاہم اس گھرانے میں ناک کے استعمال کے باوجود افیمی کیفیت نہیں بلکہ گرجنے اور نعرہ لگانے کا عمل ہے۔ یہ گرج ڈرانے کے لئے نہیں بلکہ حوصلہ دلانے کے لئے ہے۔ بغیر نون غنہ کے نعرے کیسے لگے؟ لیکن یہ انفی

زن غنّہ نہیں، جنگل کے شیر کا زن غنّہ ہے۔

بجائے لگی لپٹی رکھنے کے سیدھی بات کہنے کا جو مستقل رجحان آگرہ گھرانے میں ہے اس کی نشاندہی اور چیزیں بھی کرتی ہیں۔ ڈاگر بانی آلاپ میں ایک وردمنٹ سا قائم کیا جاتا ہے، آگرہ آلاپ میں سا کی سادھی نہیں لگائی جاتی، تاکہ ہمسایہ سُروں سے کام لے کر بات چیت کی جاتی ہے۔ یہ بھی اسلام مظہر ہے، گفتگو اسلامی تہذیب کا خاص فن ہے۔ ہندو پہلے ذاتِ بے صفات کی نشاندہی جاتا ہے، خود طنبورہ بن جاتا ہے اور اس شانتی کے چشمے سے راگنی کی گنگا نکالتا ہے۔ خان صاحبان خلوت کی شانتی سے گانا شروع نہیں کرتے، ابتدا ہی سلام اور مزاج پرسی سے کرتے ہیں۔

آگرہ والے دھرپد بھی گاتے ہیں اور خیال بھی، اور ان کے خیال پر دھرپد کا اثر مستقل ہے۔ اس گھرانے کی دھرپد بھی نقارہ مزاج دھرپد ہے، ڈاگر بانی اور ہندوانہ دھرپد سنیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مہادیو شیوجی ناچ رہے ہیں ہر چند دھرپد ہر رنگ میں زور آوری کا مظاہرہ ہے لیکن شیوجی کی زور آوری کا رنگ اور ہے اور سلطانی منادی کا رنگ اور۔ شیوجی طاقت کی شان نٹ راج بن کر دکھاتے ہیں ــــــــــ ــــــــــ ڈاگر بانی دھرپد گویا ہاتھیوں کی فوج ہے جو جھوم جھوم کر چلتی ہے، آگرے کی دھرپد گھوڑوں کی ٹاپ ہے اور نقارے کی چوٹ ہے، اور واقعہ تو یہ ہے کہ آگرے والے دھار کی چُست دھرپد پسند کرتے ہیں، چوتالے اور سول فاختہ کی جھومتی جھامتی دھرپد شاذ ہی گاتے ہیں۔

آپ کے خوشگوار سوال کے جواب میں طوالت سے کام لوں تو آپ کو بے لطف کروں گا، صرف استاد فیاض خان مرحوم کی خیال گائیکی کی دو ایک باتوں کے ذکر میں ایسا لطف ہے کہ ان کو حذف کرنا بدمذاقی ہوگی۔

اولین یہ کہ بنی بنائی بندشوں میں مرحوم آگرہ گھرانے کی خاص چیزیں گاتے تھے۔ اتاپ شتاپ دوسرے گھرانوں سے اُدھار لے کر نہیں گاتے تھے۔ ان کو اپنے دبستان کے اسلوب کے تقاضوں کی پختہ ترین حس نصیب تھی، جس بندش میں ذرا بھی پھوہڑ، رکیک یا مبتذل کوئی بات دیکھتے فوراً اس سے منہ موڑ لیتے، بھاری بھرکم بندشیں انتخاب فرماتے، تین تال میں نویں ماترے سے شروع ہونے والی معمولی بندشیں ان کو کم ہی پسند ہیں پہلے، تیسرے، چھٹے، ساتویں اور تیرھویں ماتروں سے شروع ہونے والی بندشیں پسند کرتے تھے۔ انوکھے اور اچانک پن والے سم کی بندشیں خود بناتے تھے۔ اس میں ان کو خاص سہولت یہ تھی کہ راجستھانی جو ان کی مادری زبان تھی۔ چیزیں بنانے کے لئے یہ برج بھاشا سے بھی بڑھ کر مناسب ہے۔ اس معاملے میں پنجاب کے بڑے بڑے موجدانِ بندش ان کے مقابلے پر نہیں آ سکتے۔ پنجابی بولنے والوں کو بھاشا کے الفاظ پر وہ قدرت نہیں ہو سکتی۔

دھرپد سے پوری واقفیت رکھنے کے باعث استاد مرحوم بندشیں تیار کرتے ہوئے ماترے کے تنوع کے تجربات سے اپنی خلوت کو انجمن کرتے تھے۔ اس معاملے میں ان کی جدت کا نشانہ اکثر ایسا ٹھیک بیٹھتا تھا کہ سننے والوں کے سر ہل کر رہ جائیں۔ الفاظ کی نشست میں یہ التزام خاص رکھتے کہ حروفِ علت کی آوازوں (آ۔ اے۔ ای۔ او۔ اُو) کا تغیر قدم قدم پر قائم رہے اور یک آہنگی کی بے رنگی اور بھونڈے پن سے واسطہ نہ پڑے۔ ان کی تان میں بجائے پھرتی کے بھاری بھرکم پن اور سجاوٹ کا رکھ رکھاؤ تھا۔ استاد فیاض خان کا کمال اس میں نہ تھا کہ دیکھو ہم سرکس کے کردار ہیں، تم کو ہیں طرح کی قلابازیاں دکھائیں گے۔ وہ راگنی کے امکانات میں سے اپنے وجدان اور سوجھ بوجھ سے کچھ رُوپ انتخاب کر کے ان کو اس طرح ترتیب دیتے تھے کہ زیور تیار ہو جاتے ــــــــــ

ــــــــــ راگ راگنی کو کھنگال ڈالنا یا اس کے سروں کو گیند کی طرح اچھالنا یا اس کو چھاج میں ڈال کر چھٹک لگائی نہیں۔ جلیبی تری ہیں تھوڑی سی خاصیاں سجا کر پیش کرنا سلیقہ ہے اور مہمان کے آگے جلیبیوں کا ڈھیر لگا دینا دوسری بات ہے۔ استاد مرحوم کی گھرانہ داری کے رازکو

سمجھے ہوئے تھے، وہ تو رسے میں ہینگ نہیں ملاتے تھے۔ ان کو استاد غلام علی خان کی تہائیوں اور برق رفتار تانوں پر کبھی رشک نہ آتا تھا یہی باتیں ان کے بعد ختم ہوگئیں۔ مرحوم کے شاگرد استاد شرافت حسین خاں کو ندتی ہوئی تانیں مارنے لگے ہیں۔ میں نے ان سے اکتانے کی درباری، جرت ترکمان، سنی، بلمپت کی درباری کبھی نہیں گاتے تھے۔ اس کی بجائے درباری کا آلاپ ہی فرماتے تھے، میں نے بارہ سال انکا گانا ریڈیو پر سیر ہوکر سنا، بلمپت میں صرف میاں کی ملہار (کریم نام تیرو) اور بہاگ (کون ڈھنگ تورا) ان کو پسند تھے، ان کو بھی ذرا تیز قدم بلمپت میں گاتے تھے، اور تین چار منٹ میں اس کو نپٹا کر تین تال کی درت کی طرف لپک جاتے۔

وہ انترے کے لئے کسی کو ترساتے نہیں تھے، ٹیپ کے سا کی جانب جلدی اور سیدھے یوں بڑھتے تھے کہ صاف گوئی کی فضا پیدا ہوتی تھی پورا مدعا جلدی سامنے آجاتا تھا۔ طوالت اور لٹکائے رکھنا ان کی نظر میں ہرگز کمال نہ تھا، گھرانہ داری اس بات کا نام ہے کہ بڑھت پہلی جھلکی سے اپنا رشتہ قائم رکھے اور فضا میں ہم آہنگی رہے۔ ادائے راگ میں ہر دوسرا جملہ پہلے جملے سے متسلسل ہو۔ گانا گفتگو ہے۔ کبھی مدلل گفتار اور کبھی حکایت کی رفتار، بات سے بات نکلنی چاہیئے، اسی مزے کے لئے میں خاں صاحب مرحوم کے گانے کا شیدائی ہوں۔

مرحوم امیر خان صاحب کی گائیکی در اصل بلمپت کی گائیکی ہے۔ وہ اپنی متانت کو بالآخر درت کی تان بازی سے بگاڑ دیتے ہیں ——— ——— امیر خاں صاحب کی بلمپت کی گائیکی دلّی کے شرفا کی نستعلیق گفتگو کی عکاس ہے۔ اس کو افراتفری والی تلا بازیوں سے کیا تعلق! برعکس اس کے استاد عبد الوحید خاں مرحوم اس گر کو خوب سمجھتے تھے کہ صوفیانہ متانت کیا چیز ہے، صرف آستائی گاتے تھے (بعض ستم ظریف کہتے تھے ہیں کہ اس بہانے انترے پر پردہ رکھتے تھے۔)

استاد فیاض خان اور استاد نثار حسین خان ہی وہ بزرگ ہیں جن کی گھرانہ داری گائیکی میں خالص ہے۔

خیال گائیکی کی بہت سی بندشیں رادھا کے گیت ہیں۔ اس اعتبار سے بھی استاد فیاض خاں مرحوم کے گانے پر نظر ڈالی جائے (بلکہ کان لگائے جائیں) استاد مرحوم نے ہندو بھگتی رس اور اسلامی عاشقانہ سرمستی کے عناصر کو بعض چیزوں میں نہایت کامیابی سے یکجان کیا ہے۔

پاٹ دار آواز اور دلِ دردمندانہ ایک ہی ذات میں اس طرح جمع ہونا ہر روز نہیں ہوتا۔ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہم نے ایسے عالی ظرف اور حوصلہ مند عاشقِ حسنِ حقیقی کا گانا برسوں سُنا!

آپ کے ستار بجانے کے امیر خسرو ہیں۔ سبحان اللہ ان سے جو مصافحہ کرے اپنے ہاتھوں کے بوسے لیا کرے۔ میری غزلوں میں ایک جگہ ان کا ذکر مبارک ہے ؎

مستانہ جھالا تیز تاروں کی ہواری کا سنگی کیا انگلیاں ہیں اللہ رکھے چشم بد دور روی شنکر

ایک تصویر ملفوف ہے، اپنی تین کتابیں، ایک پارسل بنا کر بھیج رہا ہوں۔

اپنی دعاؤں میں ہم کو بھی یاد رکھیئے

خاکسار

داؤد رہبر

ساقی فاروقی: زمیں تیری مٹی کا جادو کہاں ہے

گوپی چند نارنگ

ساقی فاروقی اُردو شاعری کی نہایت زندہ اور توانا آواز کا نام ہے۔ ان کا سوچنے اور بیان کرنے کا انداز اتنا اچھوتا اور نرالا ہے کہ اسے کوئی نام دینا آسان نہیں۔ ساقی فاروقی اس عہد کے ان بیدار ذہن شاعروں میں ہیں جن کے تخلیقی ارتقا کا افق ہنوز روشن ہے اور جنہوں نے کسی مقام کو منزل نہیں بنایا۔ ان کا پہلا مجموعہ پیاس کا صحرا ۱۹۵۵ء سے ۱۹۶۶ء تک کے کلام پر مشتمل ہے، جب منظرِ عام پر آیا تو ساقی لندن جا چکے تھے۔ وہ برسوں سے لندن میں ہیں۔ زبان و ادب کے سوتوں سے کٹ کر شعر گوئی آسان نہیں لیکن ساقی کے دوسرے مجموعے "رادار" سے جو دس گیارہ برسوں کی طویل مدت کے بعد شائع ہوا ہے معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ عمر کے ساتھ ساتھ بغاوت کی لَے کچھ کمزور پڑ گئی ہے، لیکن تخلیق کی آگ روشن ہے اور آگہی کا نشہ کچھ بڑھ گیا ہے۔ نیز تفکر میں کچھ اور گہرائی اظہار میں رس اور سوچ میں بالیدگی پیدا ہو گئی ہے۔

زندگی اور اس کے گھنے پن سے ساقی کا رشتہ ہمیشہ مضبوط تھا۔ نئی شاعری سیکڑوں رنگوں کے پھول کھلنے کی فضا سے عبارت ہے اور چونکہ ہر رنگ میں انفرادی اظہار کی بہار کا اثبات لازم ہے، اس لئے اس دور میں اندازِ فکر، لہجے، طرزِ بیان اور اسالیب کے اتنے منطقے اور اتنی جہتیں ہیں کہ ایک رنگ دوسرے کو کاٹتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ تاہم اس جلوۂ صد رنگ میں دھنک کی سی کیفیت ہے، اور رنگوں کا اختلاف و امتزاج حسن کاری کا لازمہ بن کر سامنے آتا ہے۔ ساقی کی شاعری کے بارے میں پہلی بات یہ ہے کہ یہ اپنے میں مگن نہیں یعنی یہ اس طرح انکشافِ ذات کی شاعری نہیں جس طرح اس عہد کی زیادہ تر شاعری ہے۔ چنانچہ یہ براہِ راست مابعد الطبیعاتی مسائل سے آنکھیں نہیں ملاتی اور تجریدی فضاؤں میں پرواز نہیں کرتی بلکہ طبیعات سے چپک کر چلتی ہے، یعنی زمین اور اس سے لگا ہوا جو کچھ ہے، جن وانس، پیڑ، پودے، گھاس کے میدان، سبزہ، نباتات، چرند پرند، مینڈک، سور، خرگوش وغیرہ کائنات کی نظر آنے والی ملموس چیزوں سے اس کا گہرا تعلق ہے۔ ان چیزوں کو دل کی دھڑکنوں میں سمو کر اور ان سے گفتگو کر کے ساقی خوشی محسوس کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے ان کی شاعری زندگی کی شیئیت، بھرے پُرے پن اور بوقلمونی اور ان خارجی عوامل کے ذریعے سے داخلی مسائل تک پہنچنے کی شاعری ہے۔ چنانچہ کہا جاسکتا ہے کہ اس شاعری کی نوعیت نہ ذاتی ہے نہ مابعد الطبیعاتی بلکہ اس کا آہنگ کائناتی ہے۔

اس بات کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ یہ شاعری اس معنی میں ابلاغ پسند ہے کہ علامت و استعارہ یا تمثیل و کنایہ ابلاغ کی نفی نہیں بلکہ شعری تجربے کی نوعیت کے اعتبار سے حسنِ اظہار کے مختلف وسائل و پیرائے ہیں، اور ابلاغ کے حسن میں اضافے اور ابہام کی تہ داری کے ضامن ہیں۔ ساقی کا رُخ چونکہ کائنات کی طرف ہے، اس لئے وہ کم کلامی یا خود کلامی کے شاعر نہیں، وہ ہم کلامی کے شاعر ہیں۔ انہوں نے اپنی نظم [illegible] میں اس بات پر فخر کیا ہے کہ شاعری کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کی آواز دلوں میں اتر سکتی ہے۔ اس نظم کو ساقی کی شاعری کا مزاج نامہ سمجھنا چاہیئے۔

یہ احساس کہ اک ذی روح
مری آواز کے شعلے سے جل سکتا ہے
خاموشی کے ریشم سے کٹ سکتا ہے
اتنا جاں پرور ہے کہ آنکھیں
بند ہوئی جاتی ہیں خوشی سے
بھیگی جاتی ہیں

تاہم اس آواز کو جو چیز مہمیز کرتی ہے، وہ تباہی اور موت کا خوف ہے۔ یہ کسی منفی احساس کا اشاریہ نہیں بلکہ اس المیے کو سمجھنے کی کوشش ہے کہ موجودہ دور میں انسان کا شعور بگٹٹ کس منزل کی طرف رواں ہے۔ راشد نے ایک جگہ اس بات پر افسوس کیا ہے کہ غم والم کا روائتی تصور اُردو شاعری کی جان کا روگ ہے۔ پیاس کا صحرا میں غم والم کی رومانی پرچھائیاں کچھ تو نرگسیت کی وجہ سے اور کچھ سن بلوغ کے جذبات کے تحت ملتی ہیں، لیکن رادار تک پہنچتے پہنچتے ان کی نوعیت بدل گئی ہے۔ مثلاً پہلی کوشش تو یہی ملتی ہے کہ اگر ممکن ہو تو کسی طرح درد کی فصیل توڑ دی جائے۔

جسم کے چاروں طرف
درد کی تاریک فصیل
ذات کے حبس میں کمہلا گئی آواز مری
غم کی یلغار سے دل بند ہوا

قلب پیوندیِ اربابِ الم تو ہوگی
شہر میں کوئی دھڑکتا ہوا دل ــــ
دل کی کوئی تازہ قلم تو ہوگی (محاصرہ)

ورنہ بالعموم اس کیفیت نے اس افسردگی کو راہ دی ہے جو تخلیقی عمل کا کام کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ کہیں یہ بے زاری و "بے لطفی" کا پتہ دیتی ہے اور کہیں گاڑھے کسیلے "دھوئیں" کی شکل میں اُبھرتی ہے اور کہیں زبان پر "کسیلا" ذائقہ چھوڑ جاتی ہے۔
مقدرِ انسانی کے استفہامیے کا یہ کسیلا پن جگہ جگہ حواس کو ڈستا ہوا نظر آتا ہے۔

دلوں کے جزیروں میں
اشکوں کے نیلم چھپے ہیں
رگوں میں کوئی رودِ غم بہہ رہا ہے،

ہمیں موت کی تیز خوشبو نے پاگل کیا ہے
امیدوں کی سُرخ آبدوزوں میں بیٹھے
تباہی کے کالے سمندر میں بہتے چلے جا رہے ہیں
کراں تا کراں ایک گاڑھا کسیلا دھواں ہے
زمیں تیری مٹی کا جادو کہاں ہے،

(موت کی خوشبو)

موت کی تیز خوشبو سے بچنے کے لئے ساقی فاروقی شہرِ آئندہ کے دروازے پر بار بار دستک دیتے ہیں۔ سنتری پتھر کی مورت بنا کر کھڑا ہے، ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ کائنات کے مہیب بکنگھم پیلس کے سامنے ایک زبوں حال زائر کی حقیقت بھی کیا، اور زائر بھی ایسا جس نے باطنی اقدار کے سارے اسم بھلا دیئے ہوں، اور اپنے آپ ہی طمانیت کے دروازے خود پر بند کر دیئے ہوں۔

ایک پاگل کی صورت کھڑا ہوں مگر
سنتری مسکراتا نہیں
اس کی بے رحم آنکھوں میں
چیتے کی عیّار ــــ
ــــ بیمار نظروں کی ٹھنڈی چمک
پاس ورڈ
(اسمِ اعظم ہی)
یاد آتا نہیں
(شہرِ آئندہ کے دروازے پر)

ایسی حالت میں 'زمیں تیری مٹی کا جادو کہاں ہے' کی معنویت واضح ہو جاتی ہے۔ آج کا انسان اسمِ اعظم بھول چکا ہے۔ شہرِ آئندہ کی خواب گاہوں میں جھانکنے کی گنجائش نہیں۔ آسمانوں میں پرواز کا مزہ جاتا رہا۔ ایسے میں مٹی کا بلاوا شدید سے شدید تر ہو جاتا ہے۔ ساقی فاروقی کے کائناتی آہنگ کا بنیادی رمز یہی ہے کہ وہ بار بار مٹی اور اس کے مظاہر کی طرف کھچتے ہیں، مٹی کے جادو کی جہتوں میں سفر کرتے ہیں اور مٹی کے مظاہر کی کشش اور برتاؤ کے اسرار کی دریافت میں گُم نظر آتے ہیں۔ مٹی کے بلاوے کی پہلی بنیادی مہک بدن کی ہے۔ بدن سے وابستگی کا ثبوت پیاس کا صحرا میں بھی ملتا ہے اور رادار میں بھی۔ شروع کی نظموں اور غزلوں میں دشت، صحرا، ریت، پیاس اور کالی گھٹا کے جو پیکر بار بار ابھرتے ہیں، وہ استفہامیہ کی فضا میں بدن کی تشنگی، طلب اور تڑپ کو ظاہر کرتے ہیں / ریت کی صورت جان پیاسی تھی، آنکھ ہماری نم نہ ہوئی / لہولہان، خون میں لت پت، خون پاشی، بدن کی آگ، شعلہ، زخموں کے سرخ گلاب، داغوں کے بدر منیر وغیرہ الفاظ ــــ جو ساقی کے یہاں بار بار چمکتے ہیں۔ بدن سے وابستگی کے لبادے ہیں۔ بدن سے وابستگی سے مراد جسد کے آسیب سے بھاگ کر جنس میں پناہ لینا نہیں۔ جنس زندگی یا لذت اندوزی تو بہرحال نا آسودگی کو راہ دیتی ہے اور پھر زمانے

کی بے رحمی کی طرف دھکیل دیتی ہے۔ اس کے برعکس ساقی کے یہاں بدن سے وابستگی سے جسم کی وہ لطافت اور حساسیت مراد ہے جو زندگی کو رس اور حبس دیتی ہے۔ ساقی کے یہاں بدن ہر طرح کے نفسی مراتع سے ہٹ کر ایک لمس زار اور رنگ زار کے طور پر ملتا ہے یعنی انسانی حسن حسی اور جسمانی معنی میں بھی اور اس کائناتی معنی میں بھی جو اس کارزارِ حیات میں انسان کا بوجھ ہلکا کرتا ہے اور اس کے پورے وجود کو سرشار کر دیتا ہے۔

پاؤں میں سونے کے گھنگرو باندھ کر
ناچتی ہے رات کی نیلم پری
جل کے آخر بجھ گئی پت جھڑ کی آگ
تو گلابی کونپلوں میں چھپ گئی
میرے سینے میں کھلے نکہت کے پھول
روح کی اور جسم کی دیوار سے
اب بہت آگے نکل آئی ہے رات
ہم نہ جانے کون سے موسم میں ہیں (وصال)

یہ چھوٹی سی لیکن نہایت موثر نظم جو باصرہ اور لامسہ کے بخشے ہوئے زندہ پیکروں سے تھرتھرا رہی ہے، پہلے مجموعے سے لی گئی ہے اور بلاشبہ ساقی کی بہترین نظموں میں سے ایک ہے۔ پہلے دور کی اس نوع کی نظموں میں سُرخ گلاب اور بدر منیر، پری خانہ اور تتلی اور دوسرے دور سے امانت، نامحرم، سی سک، باکرہ، داشتہ، بانجھ اور مسسز ماریا تریزا خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ یہ بات لائقِ غور ہے کہ بدن کے جاگتے احساس اور محبت کا جو دائرہ پہلے دور میں تتلی سے شروع ہوتا ہے، دوسرے دور میں وہ امانت میں مکمل ہوتا ہے۔ تتلی معصوم محبت کی نظم ہے، نہایت پیاری اور ہلکی پھلکی۔

وہ پاگل تھی
پاگل پن میں
اس کے پر کانٹوں سے الجھ کر ٹوٹ گئے
اب پیلے زخمی پروں پر
اک پیلے پتے کے نیچے
بیٹھی ہے اور سوچتی ہے
سوچتی ہے اور روتی ہے

یہ تو مری محبت ہے
یہ تو مری محبت ہے

پیاس کا صحرا کی یہ معصوم تتلی راداری میں امانت ہی ملتی ہے، لیکن شاعر انسانی رشتوں کو اب کہیں زیادہ بے رحمی سے دیکھ سکتا ہے۔ امانت محبت کی معصومیت کی نہیں درندگی کی تصویر ہے جو ہر انسان میں پنہاں ہے۔ یہ نظم جنس کا دوسرا رخ پیش کرتی ہے۔ یعنی مرد کی اشتہا، بے رحمی اور بہیمانہ خود غرضی کا،

اک قصبے کے
اک اسکول میں
اک لڑکے نے تتلی ہوئی اک تتلی پکڑی تھی
اور رہائی کی کوشش میں
اس تتلی کے پروں کا اودا نیلا رنگ
فضا میں بکھر گیا تھا

اس لڑکے نے
میز کے اوپر پیپرویٹ کے نیچے رکھ کر
اس کے پَر ماچس سے جلائے
اور اس کا دھڑ
پنسل کاٹنے والے چاقو سے
دو حصّوں میں بانٹ دیا تھا

وہ لڑکا تو چلا گیا
پر تیس برس سے
اس کا گندا چاقو میرے پاس ہے
اور چاقو پر
اس مٹیالے پیلے خون کے دھبّے سے اُلجھن ہے
اور زباں پر ایک کسیلا پن ہے
اتنی تھکن ہے
نیند سے پاگل ہوں

مرد کی بہیمیت اور درندگی سے متعلق یہ ایک نہایت پُرتاثیر نظم ہے، اور اس کے تمثیلی پیرائے نے اس کو بے پناہ بنا دیا ہے۔ بات یہاں بھی تتلی ہی کی ہے، لیکن اصل چیز وہ عمل ہے جس کے باعث تتلی کو میز کے اوپر پیپرویٹ کے نیچے رکھ کر اس کے پَر ماچس سے جلائے گئے لیکن

بنیادی شخصیت تتلی کی نہیں، اس گندے چاقو کی ہے جس سے تتلی کا دھڑ دو حصوں میں بانٹ دیا گیا اور جس پر مٹیالے پیلے خون کا دھبہ ابھی تک ہے۔ یہ گندا چاقو مرد کی سرشت ہے، مرد کے خمیر میں مضمر ایذا موقع ملنے پر تتلی کے دھڑ کو دو حصوں میں بانٹ دیتی ہے۔ ساقی کی امیجری میں رنگوں کی خاص اہمیت ہے۔ رہائی کی کوشش میں تتلی کے پروں کا اودا نیلا رنگ فضا میں بکھر جاتا ہے۔ اس میں مرکزی تاثر اودے نیلے رنگ کا ہے جس سے ایک نسائی کیفیت نظروں میں سما جاتی ہے۔ اس طرح مٹیالا پیلا خون کا دھبہ مرد کی بہیمانہ شخصیت کی موثر پہچان ہے۔ نظم تتلی میں زخمی تتلی کے ایک پیلے پتے کے نیچے بیٹھنے کا ذکر ہے۔ یہاں پیلے پتے تتلی کی دل شکستگی کا پیکر ہیں۔

ساقی کے یہاں زبان کا تخلیقی استعمال ایک نئے درجۂ حرارت پر ملتا ہے۔ نئے لفظ یا نئی ترکیبیں تو سامنے کی بات ہے۔ اصل چیز زبان کی صرفی و نحوی توسیعات، نئے تلازمے اور انسلاکات، لفظیات کا نیا مزاج یا نظام اور نئے اسلوبیاتی پیرائے و معنیاتی جہات ہیں جو ساقی کی پوری شاعری میں بکھرے ہوئے ہیں (اس مضمون میں ان امور کی طرف ممکنہ حد تک اشارے کئے جائیں گے، لیکن شاید ہر جگہ یہ ممکن نہ ہو۔ ان مقامات پر ایسے لفظوں یا کلموں کے نیچے خط کھینچ دیا گیا ہے۔ ساقی کے شعری مزاج اور اسلوبیاتی نظام کو سمجھنے کے لئے ان پر نظر رکھنے سے مدد ملے گی)

اب مٹی کے بلاوے کا ایک اور رُخ دیکھئے۔ خواہش صرف گندا چاقو ہی نہیں، کثافت کا ایک پہلو لطافت کی طرف بھی کھلتا ہے، اور اس گناہ کا ایک رخ تقدس آشنا بھی ہو سکتا ہے۔ سسٹر ماریا تریزا اس لحاظ سے دلچسپ نظم ہے کہ اس میں جنسی خواہش کو بالیدہ اور ارتفاع آشنا احساس کے ساتھ پیش کیا ہے۔ نظم کے پہلے حصے میں / جسم کی ایذا دہی میں / روح کی خود لذتی میں / کیا ملے گا / اور اس کے فوراً بعد سبز گدلے سوگ ساگر میں / نئی لہریں بناتے / اور پانی کاٹنے کی / جو مذمت کی گئی ہے وہ جنس کے عینیت پسند نقطۂ نظر کی نفی کرتی ہے، اور اس نظم کو جدید بناتی ہے۔

یاد و بستر میں
تنا کے پرانے آئینے کے سامنے

جسم کی ایذا رسی میں
روح کی خود لذتی میں
کیا ملے گا؟
درد جیلی فش کی صورت
نارسی کے بادباں کھولے ہوئے

سبز گدلے سوگ ساگر میں
نئی لہریں بناتے
اور پانی کاٹنے میں
کیا ملے گا؟

بات صرف جنسی جذبے کے تقدس کی نہیں بلکہ ہزاروں لاکھوں برسوں کے اس احساس کی ہے جو تخلیق کا رمز ہے اور جس کا سلسلہ فرو ازل کے دھندلکے سے مل جاتا ہے۔ جنسی جذبے کی تقدیس و تطہیر متصوفانہ موضوع ہے اور عہد وسطیٰ کی شاعری کی خصوصیت خاصہ ہے

لیکن جو چیز زیرِ نظر نظم کو متصوفانہ ہونے سے بچالیتی ہے وہ جنسی جذبے کا ترفع نہیں بلکہ فرد کا یہ وجودی احساس کہ وہ خود تخلیق کے با اختیار لمحوں کا لا منتہی سلسلہ ہے، اس وجہ سے وہ خود روحِ قدس یا نورِ ازل ہے اور چونکہ وجود کا امین ہے اور تخلیق کار بھی، اس لئے وہ خدا ہے چنانچہ راز بستہ چھاتیوں کے چاندی کٹوروں سے چھلکنے کی خواہش صدیوں کو آواز دیتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

اپنی تنہائی میں اک دن میری تنہائی ملا دو

میں ہی روحِ قدس ہوں

نورِ ازل ہوں

دیر سے تم میں چھپا ہوں

جن دھنک لمحوں کو اپنے دھیان میں

زنجیر کر کے مطمئن ہو

میں انہی کا سلسلہ ہوں

اور تمہاری راز بستہ چھاتیوں —

— چاندی کٹوروں سے چھلکنا چاہتا ہوں

ادھر ساقی فاروقی نے جو طویل نثری نظمیں لکھی ہیں، ان میں شیر امداد علی کا میڈک اپنی معنوی تہہ داری اور امیجری کے اعتبار سے انوکھا تجربہ ہے۔ شیر امداد علی — مینڈک کا نام ہے۔ نظم کا مرکزی خیال غالباً یہ ہے کہ غصب انسان کی فطرت ہے، علم ہو یا کوئی اور چیز جس کو ایک بار ہم حاصل کر لیں، اپنا لیں یا اپنی شخصیت کا جزو بنا لیں، اس سے دوسروں کو محروم رکھنا چاہتے ہیں لیکن اس نظم کی ایک اور معنوی جہت بھی ہے اس کی ساری امیجری تالاب اور پانی کی ہے۔ پانی کا بلاوا مٹی کے بلاوے سے الگ نہیں۔ ساقی کے یہاں پانی کا بلاوا جنسی خواہش کے استعارے کے طور پر کئی جگہ ابھرتا ہے۔ اس نظم میں / مٹیالے تالاب میں / اس ادھ کھلے کنول پر / وہ بہار تھی / جو دیکھنے والی آنکھوں میں دھنک کھلاتی ہے / ادھ کھلے کنول اور آنکھوں میں دھنک کھلنا دونوں جنس کی کشش کے استعارے ہیں۔ اس کے فوراً بعد / پھر پانی کا بلاوا اتنا تھا / اس ساحرانہ کشش سے ہار کر / اپنا تہمد اتار کر / وہ مردہ پانی میں کود پڑے / یہاں پانی کا بلاوا، ساحرانہ کشش، تہمد اتارنا اور مردہ پانی میں بے اختیار کود پڑنا غور طلب ہے۔ معاملہ یہیں پر ختم نہیں ہو جاتا۔ اس کے بعد شیر امداد علی کے جل کنبھی سے الجھنے اور گل گھتنوں سے شارک مچھلیوں کے شور سے ڈر کے ہر طرف بھاگنے کا معنی خیز ذکر ہے،

جل کنبھی سے الجھے

تو ہفتے عشرے کے حمل کے مانند

نرم اور خام سروں والے

گل گھتنے

(صداکار مینڈکوں کے
دُمدار بچّے)
شارک لہروں کے شور
سے ڈر کے
فر فر ہر طرف بھاگ کھڑے ہوئے
اور شیر امداد علی گلے گلے پانی میں تھے
اور کنول دور تھا ـــــ

پانی، تالاب، کنول، دھنک، ساحرانہ کشش، ہتھ، جل کنجی، جل اور گل گھٹنوں کی تمثیلی فضا میں میرے لئے اس نظم کو ایک زمینی جنسی نظم کے طور پر پڑھنا اظہاری اعتبار سے زیادہ بامعنی ہے۔ اس کے بعد دُمدار آب خوار کا جو ذکر ہے، اس/عبارے کی سرعت سے/جس میں ہوا بھری ہو/ اور ہاتھ سے چھوٹ جائے/ بھی جنسی عمل کی تمثیل ہے۔ موسم بدلتے ہیں، یگ بیتتے ہیں، انسان خواہ شہر بدلے یا ملک، خواہش اس کے خمیر میں ہے، اور/ لہو میں وہی صدا ہلکورے لیتی ہے/ باہر آنے دو/ اس زندان سے باہر نکلنے دو/ اور

شیر امداد علی
پانی کی امانت
غضب سے
اپنے گھر میں زنجیر ہوئے بیٹھے ہیں
باہر پانی کھڑا ہے،

غرض یہ خواہش صرف انسان کے وجود اور سائیکی میں ہے بلکہ اس سے باہر بھی دائرہ در دائرہ گھیرا ڈالے رہتی ہے۔ نظم کی آخری سطروں میں/پ/کا تواتر بھی اسے پانی کے بلاوے کی معدنیاتی مرکزیت سے منسلک کر دیتا ہے۔

اور پانی میں پیپل کے پتّوں کی طرح
سانولے
خشگیں آنکھوں والے
پیلے پیلے مینڈک اپنا گھیرا ڈالے
پڑے ہوئے ہیں

اس نظم کی دوسری معنیاتی جہات بھی ہو سکتی ہیں۔ اس سے باآسانی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہاں جنس اور بدن کی کیفیات دوسری زمینی کیفیات کے ساتھ کس طرح گھل مل کر وارد ہوتی ہیں۔ معنوی گٹھاؤ کی یہ پیچیدہ کیفیت ساقی کی پوری شاعری میں جاری وساری ہے۔ ساقی اگر صرف مٹی کے بلاوے کے شاعر ہوتے تو بھی ان کی JENUINENESS میں کلام نہیں تھا۔ لیکن مٹی کا بلاوا ان کی شعری جمالیات و معنیات

کی صرف ایک جہت ہے۔ دوسری جہت زندگی کے وہ سینکڑوں ہزاروں رُوپ اور اَن گنت مسائل و مطالبات ہیں جنہیں ساقی کا ذہن زمینی تقاضوں کے ساتھ ساتھ بُنتا ہوا چلا جاتا ہے۔

ساقی کی پیدائش گورکھپور میں ہوئی اور ان کا لڑکپن وہیں گزرا۔ پانی، بارش، تالاب، کنول، جل کنجیاں، سانپ، چھپکلیاں، مینڈک، گل گھنے، چتنار پیڑ، جنگلوں کی شبیہیں یوں تو برِ صغیر میں کہیں بھی ہو سکتی ہیں لیکن پورب کی مٹی اور وہاں کے مناظر سے بھی ان کا کچھ تعلق ہو سکتا ہے اور غالباً یہ وہاں کی فضاؤں کی یاد دلاتے ہیں۔ پیرا۔ ایسے پیکر ساقی کے زمینی گھنے پن سے رابطے میں معنویت پیدا کرتے ہیں۔ ساقی خارج سے داخل کی طرف سفر کرتے ہیں وہاں ان کی خارج کی آنکھ پوری طرح کھلی رہتی ہے۔ لگتا ہے ساقی زمینی گھنے پن کو نہیں دیکھتے (زمینی گھنا پن ان کو دیکھتا ہے اور ان کے پورے وجود میں سرایت کر جاتا ہے) اور یہی زمینی گھنا پن ان کے یہاں عجیب و غریب کائناتی رنگا رنگی اور تنوع پیدا کرتا ہے۔ ساقی کے کائناتی آہنگ کی مزید تفصیل میں جانے سے پہلے پیاس کا صحرا کی دو خاص نظموں کا ذکر ضروری ہے، یعنی منتقم اور مُردہ خانہ۔ منتقم مشینی عہد پر موثر طنز ہے۔ یہ مغرب کے کیسینو کا نقشہ پیش کرتی ہے جو پوری دنیا کی مثال ہے۔ انسان اس جوا گھر میں رفتہ رفتہ مشین سے اپنا سب کچھ ہارتا جا رہا ہے، اور اگر کبھی جیتنے کے واہمے میں مبتلا ہو بھی جائے تو مشین بھی علی الاعلان کہتی ہے۔

میں چلا تو اس سہاگن نے پکارا ڈارلنگ
ایک دن کی جیت کیا اور ہار کیا
جیتنے پر مان کیا اور مان پر اصرار کیا
میں ابھی ہاری نہیں، ہاری نہیں
اس صدی کا آدمی میری گرفتاری میں ہے

مُردہ خانہ ساقی کی شاہکار معرّا نظم ہے۔ یہ اس عہد کی آسیب زدگی کا اشاریہ ہے۔ اس میں ساری امیجری مُردہ خانہ کی ہے، انتہائی ہیبت ناک اور روح فرسا، چاروں طرف لاشوں کے انبار رکھے ہیں۔ یکلخت ہوا کا ایک یخ بستہ جھونکا آتا ہے، دروازے سر پٹکنے لگتے ہیں، اور بلب کے ٹوٹنے اور اندھیرے کے بڑھنے سے سارا منظر نہایت ڈراؤنا اور بھیانک ہو جاتا ہے۔

وہ ہونٹ نیم تراشیدہ، دانت نکلے ہوئے
وہ نصف دھڑ چلے آتے ہیں رقص کرتے ہوئے
وہ جسم سہمے ہوئے بند مرتبانوں میں۔
جو بات کی تو انہیں تیز و ترش زہر ملا
جو چپ ہوئے تو انہیں سولیوں پہ ٹانگ دیا

ان میں سے کئی لاشیں آزادیِ اظہار کی موت رسیدہ ہیں۔ آخری دو مصرعوں سے مُردہ خانہ کی تمثیلی نوعیت واضح ہو جاتی ہے۔ یہ اس جیتی جاگتی دنیا کا منظر نامہ ہے جس میں جرأتِ اظہار سب سے بڑا جرم ہے اور جس کی سزا میں زہر سے سولیوں تک کی داستانیں ارتقائے انسانی کی روداد کا حصہ بن چکی ہیں۔

چھپی ہیں سیکڑوں بدروحیں ان فضاؤں میں
وہ گھورتی ہوئی آنکھیں کہیں خلاؤں میں

زمیں کے مالکِ دیرینہ کی تلاش میں ہیں
جراحتوں کے نشاں ہر خمیدہ لاش میں ہیں
اور اک صدا سی آتی ہے ہر جراحت سے

یہ سارے زخم مقدر ہوئے ہیں موت کے بعد
سکونِ لفظ و بیان و سکوتِ صوت کے بعد

نظم زمین کے مالکِ دیرینہ کے الفاظ کی دہائی دیتی ہے جہاں ہر زندگی زخم خوردہ ہے، جہاں انسان بار بار مرتا ہے، اور جہاں موت کے بعد بھی جراحتوں کا سلسلہ جاری رہتا ہے / یہ سارے زخم مقدر ہوئے ہیں موت کے بعد / سکونِ لفظ و بیان و سکوتِ صوت کے بعد / کے مصرعے اس بند کو معنیاتی طور پر پچھلے بند کی ارتقائی صورت کے طور پر پیش کرتے ہیں، اور مرکزی خیال نکھر کر سامنے آجاتا ہے۔ الفاظ کے دروبست اور تراکیب سازی میں راشد کا اثر نمایاں طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ مردہ خانہ اگرچہ معرا نظم ہے لیکن بندوں میں قوافی کے التزام کے باعث ایک منفرد ہئیتی نظام کی حامل ہے۔ نظم میں کل چار بند ہیں۔ پہلا بند پانچ مصرعوں اور باقی تینوں بند ایک ایک شعر اور پانچ پانچ مصرعوں پر مشتمل ہیں۔ پانچ مصرعوں کے تمام بندوں میں یہ التزام ہے کہ شروع کے دو دو اور آخری دو دو مصرعے ہم قافیہ ہیں اور بیچ کا مصرعہ تینوں بندوں میں بے قافیہ ہے اس سے نظم میں ایک ہئیتی وحدت اور داخلی ارتباط پیدا ہو گیا ہے۔ آخری بند اس فضا پر ختم ہو جاتا ہے۔

بڑی بساند ہے ٹھٹھری ہوئی ہواؤں میں
میں گھر گیا ہوں لہو چاٹتی بلاؤں میں

ایسے میں ایک بریدہ زبان لڑکھڑاتی ہوئی ڈراؤنی آواز میں سرگوشی کرتی ہے۔

تم اپنی لاش لئے بھاگ جاؤ جلدی سے
نہ سن سکو گے کہ ہیں موت کے فسانے بہت
متاعِ جسم سلامت کہ مُردہ خانے بہت

اس نظم میں بیک وقت احتجاج کی گونج ہے۔ انسان کے تئیں انسان کے ظلم و ستم کے خلاف احتجاج کی، کیونکہ کائنات میں جبر و استبداد کا سلسلہ عہدِ عتیق سے جاری ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ اس میں ہمارے عہد کی آسیب زدہ، خوف و دہشت کی کیفیت بھی ہے جہاں ہر لمحہ لہو چاٹتی بلاؤں میں گھرا ہوا ہے۔ ہر انسان اپنی لاش لئے پھر رہا ہے، اور موت کے فسانے ہر طرف ہیں۔ تاہم نظم میں تنبیہہ کا تمہ زندگی کا اشاریہ بھی ہے، اس لئے کہ مردہ خانہ کی ٹھٹھری ہوئی ہواؤں سے متاعِ جسم بچا کے لے جانا جہاں تک ممکن ہو سکے ضروری ہے۔

ایسی نظموں کا ذائقہ بدنی نظموں سے مختلف ہے۔ ان میں زندگی کی ترقیوں اور لعنتوں اور جبر و آزادی کے مسائل کو من حیث پیش کیا گیا ہے اور ان نظموں کے ساتھ ساتھ ہم موضوعات کی اور ان کو انوکھے طور پہ برتنے کی ایک نئی دنیا میں داخل ہو جاتے ہیں۔ ساقی کی شاعری

موضوعات کی رنگارنگی سے لبریز ہے۔ اس میں انسان کی دنائیت و خباثت اور نفسی طوفان اور جھٹکوں سے لے کر لطیف ترین کیفیتوں تک کی ترجمانی ملتی ہے۔ مثال کے طور پر بازگرہ میں جہاں مرد کے احساس فتح مندی کی بیمار بنیادوں سے پردہ ہٹایا گیا ہے، وہاں صبح کا شور اس لحاظ سے نہایت فرحت بخش ہے کہ اس میں صبح کی کیفیت کو اچھوتے پیکروں کی مدد سے اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ حواس میں صحت و مسرت کی گھنٹیاں بج اٹھتی ہیں

سفاک الارم کلاک
کی خواب دوز آواز
اوس کی صورت پتی پتی
نیند کے پھول پر گر رہی تھی —
سونے والے نے
آہستہ آہستہ
اپنی پلکوں کے چمپئی پردے سرکائے
اور سورج مکھی کی طرح
اس جگ مگ دریچے کی طرف نگاہ پھیری
جس پر دھوپ کے ڈرتے ہوئے سفید پر
تیز ہوا میں پھڑ پھڑا رہے تھے،

اس چھوٹی سی نظم میں ایک روزمرہ کی کیفیت کو بیان کیا گیا ہے۔ الارم سے نیند کا کھلنا اور دریچے پر دھوپ کا چمکنا معمولی سی بات ہے لیکن ایک معمولی بات کو شاعر UNIQUE طور پر محسوس کرتا ہے جس طرح ہر آواز سو فی صد دہرائی نہیں جا سکتی یعنی UNIQUE ہوتی ہے، اسی طرح ہر تجربہ بھی UNIQUE ہوتا ہے۔ اچھی شاعری کی ایک پہچان یہ ہے کہ وہ زندگی کی UNIQUENESS کو گرفت میں لینے پر قادر ہوتی ہے اور اسے موثر بیان کی شکل دے کر لازوال کر دیتی ہے۔ الارم کی آواز کو خواب دوز کہنا اور اس کا نیند کے پھول پر اوس کی صورت پتی پتی گرنا منفرد اظہار ہے۔ اسی طرح سونے والے کا اپنی پلکوں کے چمپئی پردوں کو سرکانا اور دریچے پر دھوپ کے ڈرتے ہوئے سفید پروں کا ہوا میں پھڑپھڑانا ایک ساتھ ہی کیفیت کو نظم کا دریچہ دے دیتا ہے

شاعر کے سوچنے اور محسوس کرنے کا عمل اگر UNIQUE ہوگا تو اس کا اثر لامحالہ اظہار کی UNIQUENESS پر پڑے گا۔ ساقی کی لفظیات اس کی پیکر تراشی، اس کا پیرایۂ بیان اور اسلوب و اظہار تازہ اور انوکھا اسی لئے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا سوچنے اور محسوس کرنے کا انداز عام ڈگر سے ہٹا ہوا ہے۔ ایک اور نظم بام کے پیڑ سے گفتگو کے چند مصرعے دیکھئے۔ نظم کی انوکھی کیفیت تو نام ہی سے ظاہر ہے، مرکزی تحرک بے چہرہ انسان کی لاحاصلی اور بے کیفی اور فطرت کے رشتے کی بازیافت ہے۔

مجھے سبز حیرت سے کیوں دیکھتے ہو
ذرا اپنے پنکھے ہلا دو
مجھے اپنے دامن کی ٹھنڈی ہوا دو
بہت تھک گیا ہوں

یہ بات اگر یوں کہی جاتی کہ مجھے حیرت سے کیوں دیکھتے ہو تو ایک عام سی بات تھی۔ صرف ایک لفظ یعنی سبز کے اضافے نے / مجھے سبز حیرت سے کیوں دیکھتے ہو / اسے شاعری کی سطح عطا کردی۔ شاعری میں عام زبان استعمال ہوتی ہے، لیکن اس کا استعمال عام نہیں ہوتا۔ ان دونوں باتوں میں فرق ہے۔ شاعری اپنی غذا عام بول چال کی زبان سے نہ لے تو اس کا حشر وہ ہوتا ہے جو شاہ نصیر یا ناسخ کی شاعری کا ہوا۔ یعنی زبان صناعی اور بازی گری کا شکار ہو کر نرکس ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس عام زبان شاعری میں آکر ایک ایسے درجۂ حرارت پر پہنچ جاتی ہے، جہاں وہ دہکنے لگتی ہے اور اس سے نئی نئی معنیاتی شعاعیں پھوٹ نکلتی ہیں۔ ساقی کے یہاں زبان کی تخلیقیت کا یہ میلان جیسا کہ پہلے بھی اشارہ کیا گیا ہے، عام ہے۔ اس کی مثالیں قدم قدم پر ملتی ہیں۔ چند مثالیں بغیر کسی خاص کوشش کے ادھر ادھر سے پیش کی جاتی ہیں۔ ان میں خط کشیدہ حصے لفظوں کے تخلیقی استعمال، پیکریت، استعارہ سازی اور طرفگیٔ بیان کے لئے غور طلب ہیں۔

جو سہاگن بیل برسوں جان رس پیتی رہی
وہ بدن کے موسموں کی آگ سے کمہلا گئی
(پیراسائٹ)

بیوگی کی چھینٹ چادر پر اپنے صبر سے کر استری
استری کر کے فراموشی کی الماری میں پھینک
..... یہ بدن شاداب ہے بیکار واویلا نہ کر
(داشتہ)

یہ فنا کے گرم بوسوں کے نشان
جل گیا مٹی کا رس
رائگاں سب رائگاں
(دوسرا)

روشنی روتا ہوا بلب ابھی زندہ ہے....
رات کے زینۂ پیچاں سے اترنے لگی تنہائی مری
(محاصرہ)

نیند میں بسا ہوا / اس کا لیٹی بدن
بے تہی کے وار سے / میں بے ایمان تھا
(نامحرم)

جیتا جیتا لہو
ٹیلیویژن کی شریانوں سے پھوٹ پھوٹ کر
بہہ نکلا ہے
(ایک کتا نظم)

بدن میں رات پھیلتی جاتی ہے (خالی بورے میں زخمی بلا)

میں اپنے درد کی ننگی دھوپ سے
گھنی تتلی مانگ کر ہار گیا
مجھے خوابوں کی بیساکھی دو (بیساکھی)

خبروں کی خوں پاشی نے
ایک لمبا سا اپریل اگا دیا تھا (اچنبھا)

وفا
یاد کی شاخ مرجاں سے
لپٹی ہوئی ہے (موت کی خوشبو)

ساقی کی طرفگی بیان کا ایک خاص امتیازی نشان باصرہ کا شدید طور سے بروئے کار آنا ہے۔ وہ باصرہ سے کچھ ایسے انوکھے طریقے سے کام لیتے ہیں کہ احساس و طرفگی اور لطف و انبساط بالکل انجانی اور نئی سطحیں سامنے آجاتی ہیں۔ ان کے پیکروں اور اظہاری سانچوں میں رنگوں کی خاص اہمیت ہے۔ ساقی کے یہاں ہر رنگ، بعض معنیاتی جہتوں کو لے کر آتا ہے۔ مثال کے طور پر اوپر کے اقتباسات میں بدن کے موسموں کی آگ، بیوگی کی چھپئی چادر، رات کا زینۂ پیچاں، بے تہی کے وار سے لہولہان، جیتا جیتا لہو، ٹیلیفون کی شریانوں سے پھوٹ پھوٹ کر بہنا بدن میں رات کا پھیلنا، درد کی ننگی دھوپ، گھنی تتلی، خبروں کی خوں پاشی، یاد کی شاخ مرجاں وغیرہ میں متعدد الوکھی حسی اور معنیاتی کیفیتیں رنگوں کے استعمال سے پیدا ہوئی ہیں۔ ساقی کے یہاں رنگوں کو چھو کر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ان کی اپنی جسمانیت اور شخصیت ہے۔ اپنی زبان اور اپنا روزمرہ ہے۔ نیز دکھ درد، خوشی اور استعجاب، بے بسی و پژمردگی اور کئی دوسری جانی انجانی کیفیات کے کئی پہلو ایسے ہیں، جنھیں ساقی صرف رنگوں کی زبان میں بیان کرتے ہیں اور کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ اس میں ایک مکانی بُعد پیدا ہو جاتا ہے۔ نتیجتاً یہ رنگ فضا میں گھل مل کر جھلملاتے رہتے ہیں اور احساس کے خلیوں کی گہرائیوں میں جذب ہو جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر ان اظہاریوں پر نظر ڈالیے:

شبہوں کا گھنا جنگل، مٹیالے پیلے خون کا دھبہ، اودا نیلا رنگ،
کاسنی روشنی، درد کی تاریک فصیل، پیلے پیلے مینڈک، مٹیالا تالاب،
بھوری جھاڑیاں، پیلی گھاس، گلابی کونپلیں، سبز پتیاں،
سرخ آب دوزیں، تباہی کا کالا سمندر، پلکوں کے چھپئی پردے،
رات کی نیلم پری کا سونے کے گھنگھرو باندھ کر ناچنا،

پت جھڑ کی آگ کا بجھ جانا، آواز کا اوس کی صورت پتی پتی نیند کے پھول پر گرنا،
دھوپ کے ٹوٹے ہوئے سفید پروں کا پھڑ پھڑانا، سبز حیرت سے دیکھنا،
سانس لیتے گھاس کے میدانوں میں سبز مٹی سے شعاعیں اُگنا،
اَدھ کھلے کنول کا دیکھنے والوں کی آنکھوں میں دھنک کھلانا،
سبز گدلے سوگ ساگر میں لہریں بنانا اور پانی کاٹنا، چاندی کٹوروں سے چھلکنا،
تبلی کی سنہری پتیوں کا گرنا، کیا یہ ایسے اظہاریئے نہیں ہیں جن کی رنگ آشنائی ذہن پر ـــ ایک خاص اثر چھوڑ جاتی ہے یہ صرف باصرہ کی بیداری کا عکس نہیں، بلکہ پورے احساس و وجود کا باصرہ میں کھنچ آنا ہے۔ اس سے اظہار و بیان میں جو رنگ سامانی پیدا ہوتی ہے، وہ ساقی کے شعری مزاج کے لئے کلیدی حوالے کا حکم رکھتی ہے۔

اس وضاحت کے بعد اب ان خاص نظموں کو لیا جاسکتا ہے جو ساقی کے شعری سفر میں ایک واضح ارتقا کا پتہ دیتی ہیں۔ یہ تمام نظمیں پچھلے چار پانچ برسوں میں کہی گئی ہیں۔ ساقی ایک طویل مدت کے بعد ۱۹۷۵ء میں آئے تھے۔ ہندوستان پاکستان، اس زمانے میں وہ شیر امداد علی کا مینڈک لکھ چکے تھے جسے مختلف الخیال لوگوں نے پسند کیا، سفر سے بھی ترغیب ذہنی ملی ہوگی۔ چنانچہ ان چھ برسوں میں انھوں نے کئی خاص نظمیں لکھی ہیں۔ ایک کتا نظم، ایک سور سے، مسٹر ماریا تریزا، خرگوش کی سرگذشت، مجھے جزیرہ ملے، شمالی یورپ میں زخمی بلا، اور شاہ صاحب اینڈ سنز۔ ایک کتا نظم میں بے حس لوگوں کی بُردباری اور رحمانیت پر طنز کیا ہے۔ مجھے جزیرہ ملے ماہ زدگی کی تمثیلی داستان ہے جو ساحلوں کے بوسے یعنی خواہشوں کی تکمیل کے لئے ہوا کے چلنے کی منتظر ہے۔ بیساکھی کا بنیادی جذبہ قیدِ خوف سے رہائی پانے کی تمنا ہے جو خوابوں کی بیساکھی چاہتا ہے۔ یہ سب مختصر نظمیں ہیں۔ ان کے مقابلے میں شیر امداد علی کا مینڈک، ایک سور سے، مسٹر ماریا تریزا، خرگوش کی سرگذشت اور شاہ صاحب اینڈ سنز نسبتاً طویل نظمیں ہیں اور تاثیر کے اعتبار سے زیادہ بھرپور ہیں۔ ان میں سے شیر امداد علی کا مینڈک اور مسٹر ماریا تریزا کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ البتہ باقی تین پر ذیل میں نظر ڈالی جائے گی؛

ایک سور سے اس لحاظ سے عجیب و غریب نظم ہے کہ اس کے عنوان سے ہی ایک تحیر زا کیفیت سامنے آتی ہے اور تنفر کا جذبہ بھی پیدا ہوتا ہے۔ غالباً اسی بنا پر بعض حضرات نے اس کی اشاعت کو مناسب نہیں سمجھا، حالانکہ یہ نظم سیدھی سادی PREJUDICE AND COMMUNICATION یعنی تعصب اور تکلم پر ہے۔ سور کا استعارہ غالباً اس لئے کہ ایک تو اس سے شدید نفرت کا اظہار ہوتا ہے اور دوسرے سور تکلم کی نفی بھی ہے یعنی یہ گرد و پیش سے بے نیاز زمین سے تھوتھنی چپکائے چلتا رہتا ہے

وہ طلسمی دوپہر تھی
سانس لیتے گھاس کے میدان میں
سبز مٹی سے شعاعیں اُگ رہی تھیں
اور تم کرنوں میں
اپنے تھوتھنے گاڑے ہوئے
دندناتے پھر رہے تھے

ساقی کی اس خصوصیت کی طرف پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے کہ وہ اسطور میں توسیع کے عمل سے پیکر خلق کرتے ہیں۔ دوپہر کے ساتھ طلسمی کے اضافے سے تمثیلی کیفیت پیدا ہو گئی۔ گھاس کا میدان عام زبان ہے/ سانس لیتے گھاس کے میدان میں رکھنے سے گھاس کا میدان زندہ ہو کر سامنے آ گیا۔ اس کے بعد گھاس کی رعایت سے مٹی نہیں بلکہ/ سبز مٹی سے شعاعیں اُگ رہی تھیں/ رکھنے سے دوپہر، گھاس کے میدان اور دھوپ کے لئے تازہ کار پیکر تراشنے کا عمل پورا ہو گیا۔ یہ مصرعے نظم کے آخر میں بھی دہرائے گئے ہیں، اگرچہ ان کا کچھ نہ کچھ ربط مسرت اور بہجت کی اس فضا سے بھی ہے جو نظم کے خاتمے پر سامنے آتی ہے۔ اس کے بعد کسی کے کرتوں میں ستو بھتے گاڑے ہوئے دندناتے پھرنے کی تصویر ہے۔ گویا کوئی بے نیازانہ اپنے جبلی تقاضے پورے کرنے میں مصروف ہے۔ دوسرے بند میں متکلم کا ذکر ہے جو "سُور" کی کھال کے جوتے پہنے (جو شدید نفرت کے اظہار کی ایک شکل ہے) کینے اور برتری کا شکار اکیلا بیٹھا کراہ رہا ہے یہ کسی طرح تکلم کا آغاز کرنا چاہتا ہے۔ تیسرے بند میں تکلم کے آغاز سے تعصب کے مارے ہوئے شخص کے اندر تتلیاں سی اُڑنے لگتی ہیں اور نظم کے آخری حصے میں اس ایسی مسرت اور نئی لذت کا ذکر ہے جو تعصب کے ٹوٹنے اور تکلم کے قائم ہونے یعنی دلوں کے رشتے جڑنے سے منظر پر چھا گئی ہے۔ تعصب اُنا یا برتری کی زمین سے پیدا ہوتا ہے۔ اس کا تضاد نظم میں بے نیازی اور معصومیت سے ہے۔ چنانچہ تکلم کے رابطے سے زندہ رہی ہو اٹھتا ہے جو اس سے پہلے اپنی انا کے ہاتھوں مرا جا رہا تھا۔ اس فتح مندی اور دوستی کے احساس سے اب دوپہر، طلسمی دوپہر لگتی ہے اور گھاس کا میدان سانس لیتا نظر آتا ہے اور دھوپ کے سونے سے شعاعیں اگنے کے باعث سارا منظر گویا حسن، شادمانی اور بہجت سے سرشار نظر آتا ہے۔

وہ جو نفرت کی کائی
دل کی تہ میں گرد گئی تھی
ٹوٹتی جاتی تھی
میرے اندر کی کلیں کھلنے لگی تھیں
میں پگھلتا جا رہا تھا

وہ ہماری دوستی
وہ ہماری فتح مندی کا جنم دن تھا
وہ طلسمی دوپہر
..... سانس لیتے گھاس کے میدان میں
سبز مٹی سے شعاعیں اُگ رہی تھیں

دوسری نظم خرگوش کی سرگذشت کے دو حصے ہیں۔ رقص اور موت۔ رقص میں بھوری جھاڑیاں اور پیلی گھاس کے جنگل کا گودام کھلا ہے۔ اس میں فطرت کی آزادی کی ایسی فضا ہے جہاں پوری کائنات سامنے پھیلی ہوئی ہے۔ اس نظم کا بنیادی خیال وہاں کھلتا ہے جہاں خرگوش سے اپنے بلے کل نتھنوں میں/ اس خوشبو کا چھلا ڈال کے رقص کرو/ کے بعد کہا جاتا ہے۔

ہر خطرے کو چکمہ دو
چورچٹانوں کے پیچھے
سو دروازے ہیں
کیسر پھولوں کے بستر ہیں
دھوم مچانے کو سارا میدان پڑا ہے

کیسر پھولوں سے پہلے سرخ کونپلوں، سبز پتیوں، سانپ چھتریوں اور پیلی گھاس اور بھوری جھاڑیوں کا ذکر آچکا ہے جس سے نظم کے کائناتی آہنگ کی تصدیق ہوتی ہے۔ پہلا حصّہ گویا دعوت ہے۔ کائنات سے جی بھر کے لطف اندوز ہونے کی اور لطف و مسرت کی خاطر خطرے مول لینے کی۔ دوسرے حصّے کا عنوان ہے موت، جس میں بیاباں کے اندھیرے میں رقص کرنے والا خرگوش خون میں لت پت پڑا ہے۔ ساقی یہاں انسانی فطرت کے ایک راز کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں کہ تجسس میں ایسی کشش ہے کہ انسان جان پر بھی کھیل جاتا ہے۔ انسانی ارتقا کی ساری کہانی ان دیکھی دنیاؤں کو اسیر کرنے کی کوشش سے عبارت ہے۔

نامعلوم کو تسخیر کرنے کی تمنا کس لئے ہے
اس پرانی آرزومندی میں کیا ہے
اس خیابان کے عقب میں
وہ جو پُراسرار دنیا میں بسی ہیں
وہ ہمیں کیوں کھینچتی ہیں؟

نامعلوم کو تسخیر کرنے کی تمنا میں انسان کو کبھی کبھی اپنی جان سے بھی ہاتھ دھونے پڑتے ہیں، لیکن وہ باز نہیں آتا اور وہ اس کی کشش سے برابر کھنچتا ہے۔ اس کے لئے وہ آرام و آسائش کو بھی تج دیتا ہے —— اور طرح طرح کے خطرات کو بھی مول لیتا ہے۔ اہم یہ نہیں کہ جنگل میں کیا نہیں تھا جہاں اس کی حکمرانی تھی بلکہ خواب کی دیواروں کے اس پار کیا ہے۔ یہ وہ آرزومندی ہے جو انسان کو ہمیشہ پُراسرار دنیاؤں کی کھوج میں سرگرم رکھتی ہے۔

تیسری اہم نظم شاہ صاحب اینڈ سنز ہے۔ اس کا مرکزی کردار شاہ صاحب ہیں جن کی آنکھوں کی روشنی عمر کے ساتھ ساتھ جاتی رہتی ہے۔

شاہ صاحب خوش نظر تھے
خوش ادا تھے
اور روزی کے اندھیرے راستوں پر
صبر کی ٹوٹی ہوئی چپل پہن کر
اِک لگن، ایک طنطنے کے ساتھ سرگرم سفر تھے
اور جینے کے مرض میں مبتلا تھے
جو غذائیں دسترس میں تھیں

عجیب بے نور تھیں
ان میں نوکاری نہ تھی
وہ جو موتی کی سی آب آنکھوں میں تھی
جاتی رہی

صرف دشمن روشنی کا انتظار
زندگانی غزوۂ خندق ہوئی
اس قدر دیکھا کہ نابینا ہوئے

صبر کی ٹوٹی ہوئی چپل سے غلط فہمی نہیں ہوئی چاہیے کیوں کہ کامیاب کاروباری ذہنیت کا تقاضا یہی ہے کہ ظاہر اور باطن میں امتیاز رہے۔ یاد رہنا چاہیئے کہ صبر کی ٹوٹی ہوئی چپل کے باوجود شاہ صاحب روزی کے اندھیرے راستوں پہ اک ٹک اک طنطنے کے ساتھ سرگرم سفر تھے اور اس سے بھی اہم یہ ہے کہ شاہ صاحب / جینے کے مرض میں مبتلا تھے / جینے کا مرض ہی تو اصل مرض ہے کیوں کہ جیسے جیسے جینے کی ہوس بڑھتی ہے، ریاکاری اور خود غرضی بڑھتی ہے اور طمع کی دنیا میں انسان اندھا ہونے لگتا ہے۔ بات شاہ صاحب کے خوش نظر خوش ادا ہونے سے شروع ہوئی تھی۔ یہ ضروری بھی ہے کیونکہ نظم کا سفر اندھے پن یا ذاتیت کی تاریکی کی طرف ہے۔ یہاں اس بات کی طرف بھی اشارہ ضروری ہے کہ ساقی جہاں ضروری ہوتا ہے صوتی مناسبتوں اور آہنگ کے زیر و بم سے کام لینا جانتے ہیں۔ اس ایک بند میں بھی کئی مقامات ایسے ہیں / شاہ صاحب خوش نظر تھے / خوش ادا تھے / میں صفیری آواز / ش / کے بار بار آنے سے صوتی حسن کاری کا تاثر پیدا ہوا ہے۔ اک ٹک اور طنطنہ تو صوتی جھنکار کے الفاظ ہیں ہی، لیکن / صبر / ساتھ / سرگرم / سفر / میں / س / کی کارفرمائی صاف ظاہر ہے۔ اسی طرح / مرض / مبتلا / میں / م / اور بے نور / نوکاری میں / ن / اور / آب / آنکھوں / میں / آ / اور ایسی دوسری مناسبتوں سے پوری نظم خوش آہنگی اور حسن کاری سے مملو ہے۔

دوسرے بند میں نظم اپنے عروج کی طرف آتی ہے۔ اس میں استعاراتی طور پر بتدریج اندھے ہونے کی المناک کیفیت ہے۔ جو خارجی اور داخلی دونوں سطحوں پر ملتی ہے۔ تیسرے بند میں نابینا ہونے کے عمل کا اتنا ہی شدید تشکیلی ردِ عمل ہے۔

..... اور جیب رازق نگاہوں میں
سیاہی کی سلائی پھر گئی
چنار آنکھوں سے
تجلی کی سنہری پتیاں گرنے لگیں
تو صاحب اور بے سایہ ہوئے
ان کی اندھی منتقم آنکھوں میں دنیا
ایک تاتی کی طرح سے جم گئی

جیسے مرتے سانپ کی آنکھوں میں
پلتے اجنبی دشمن کا عکس

یہاں سے نظم کا موڑ شروع ہوتا ہے۔ جب شاہ صاحب نابینا ہوگئے تو ان کا وجود انتقام کی آگ میں جلنے لگا۔ دنیا اب ان کے لئے قاتل تھی۔ جینے کے مرض میں مبتلا ہونے سے دنیا سے جو گہری ہم آہنگی اور جو گہرا رشتہ تھا، وہ ٹوٹنے لگا۔ چاروں طرف بکھری ہوئی چیزوں سے، انسانوں سے، عزیزوں سے ہمدمی کا سلسلہ اب گویا ختم ہوگیا۔

جگمگاتی بے قرار آنکھیں
کسی سہمے ہوئے گھونگھے کے ہاتھوں کی طرح
دیکھتی تھیں سونگھتی تھیں لمس کرتی تھیں
وہی جاتی رہیں تو زندگی سے رابطہ جاتا رہا
ہمدمی کا سلسلہ جاتا رہا
وہ جو اک گہرا تعلق
اک امر سمبندھ سا
چاروں طرف بکھری ہوئی چیزوں سے تھا
ہنستے ہوئے روتے ہوئے لوگوں سے تھا
اس طرح ٹوٹا کہ جیسے
شیر کی اک جست سے
زیبرے کی ریڑھ کی ہڈی چٹخ جاتی ہے

ساقی نے نظم میں مرکزی خیال کو اندھے پن کی استعاراتی اور تمثیلی کیفیات اور شدید المیہ احساس کے ذریعے درجہ بدرجہ بیان کیا ہے اور رفتہ رفتہ بڑھایا اور پھیلایا ہے۔ نظم کی پُرتاثیری میں اس کی پیکری فضا اور اظہاری حسن کاری کے علاوہ بندوں کے آخر کی ڈرامائیت کا بھی ہاتھ ہے۔ اس بند کے آخر میں بھی دنیا سے تعلق کے ٹوٹنے کو ایک انتہائی متحرک پیکر کے ذریعے بیان کیا ہے۔ شیر کی جست اندھے پن کی یلغار ہے اور زیبرے کی ریڑھ کی ہڈی کے چٹخنے سے مراد ماضی اور کائنات اور کائنات کی اشیا اور انسانوں سے ربط کا یکلخت ٹوٹنا ہے۔ اب سماج سے بے تعلقی مکمل ہے۔ وہی شخص جو ایک ٹھاٹ اور طنطنے کے ساتھ سماج میں رواں دواں تھا اور جو اس کی ہر نعمت سے بہرہ اندوز تھا اگرچہ زندہ اب بھی ہے لیکن صرف ایک چیز نہ رہنے سے سماج نے اس طرح اس کو اپنے اندر سے نکال کر پھینک دیا ہے جیسے موج سیپی کو ساحل پر اچھال کر سمندر سے الگ کر دیتی ہے۔ اُسی سماج نے جس کا ایک لازمی جزو شاہ صاحب تھے، اندھا ہونے کے بعد شاہ صاحب کو کلیتہً مسترد کر دیا۔ گویا انسان جب تک بعض شرائط کو پورا کرتا ہے یا ان اوصاف سے متصف رہتا ہے جن سے سماج میں اس کی پہچان ہے، سماج اس کو قبول کرتا ہے لیکن اگر ان صفات میں کچھ کمی آجائے تو سماج کو اسے مدفضول سمجھ کر الگ کر دینے میں ذرا دیر نہیں لگتی۔ بات یہیں پر ختم نہیں ہوتی، کیونکہ اصل المیہ سماج کا نہیں انسان کا ہے۔ سماج سے مسترد ہو جانے

کے بعد انسان اپنی رہی سہی شخصیت اور انسانی اقدار سے بھی رفتہ رفتہ محروم ہونے لگتا ہے، اور بالآخر چاہتا ہے کہ دوسرے بھی اس کی طرح سماج کے حصہ دار نہ رہیں، اور ہر شے سے محروم ہو جائیں۔ نظم یوں اختتام پذیر ہوتی ہے،

ایک دن آنکھوں میں صحرا جل اٹھا
وہ خیال آیا کہ چہرہ جل اٹھا
اپنے بیٹوں کو کلیجے سے لگایا
جی بھرا تھا ابر کی مانند روئے
رو چکے تو ایک مہلک آتشیں تیزاب کے
شعلۂ سفاک سے
ان کی فاقہ سنج آنکھوں کو جلایا
اور سجدے میں گرے

اندھے پن کی کیفیت پوری نظم کا مرکزی استعارہ ہے۔ بیٹوں کو اندھا کر دینے کا عمل انسان کی اس خواہش کا غماز ہے کہ اگر وہ خود معذور ہے تو دوسروں کو بھی معذور دیکھنا چاہتا ہے، یا اگر وہ خود سماج یا زندگی سے کٹ گیا ہے تو دوسروں کو بھی اس سے الگ کر دینا چاہتا ہے اس کے لئے انسان مہلک سے مہلک حربوں کو استعمال کر سکتا ہے اور خون کا رشتہ بھی مانع نہیں آتا۔ یہ نظم چونکہ تمثیلی ہے اس میں معنیاتی جہتوں کے جواز کا امکان بھی ہے مثلاً طمع دنیا کے الم ناک مدارج اور عبرت ناک انجام وغیرہ۔ اس سے اگرچہ نظم کی نوعیت اخلاقی ہو جاتی ہے لیکن اہمیت نوعیت کی نہیں بلکہ موضوع کے برتاؤ کی ہے جو ہر لحاظ سے نیا ہے۔ ایک اور معنوی امکان تغیر پذیر صنعتی معاشرے میں انسان کا اپنی شخصیت سے محروم ہونا، بے چہرہ ہونا، بے روح ہونا ہو سکتا ہے اور اس کے منطقی نتائج کی نشاندہی بھی نظم کے ذریعے ممکن ہے۔ ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ نظم بیٹوں یا نوجوانوں پر ختم ہوتی ہے، جس کی مایوس کن تعبیر سامنے کی بات ہے۔ لیکن جب سماج کی صنعتی ہلاکت خیزی کا سارا ارتقا ہی انسان کی سالمیت کی مخالفت میں ہے تو کیا ہم کسی بشارت یا حل کی توقع کرنے میں حق بجانب ہوں گے۔ ساقی ان معاملوں میں غالباً چپ خفت کے ہم نوا ہیں کہ فن کار کا کام سوال اٹھانا یا مسائل کو اس طرح پیش کر دینا ہے کہ دوسرے ان سے صرفِ نظر نہ کر سکیں۔ نظم بہر حال نہایت پُر تاثیر بھر پور اور معنیاتی طور پر اطمینان بخش اور مکمل ہے۔ نظم جو خوش نظری کے ذکر سے شروع ہوئی تھی، نظر کی محرومی اور نظر کی خیرات کے دلدوز منظر پر ختم ہوتی ہے۔ شروع کے مصرعوں میں /ش/ کی خوش آہنگی تھی، خاتمہ

"اے سخی شہرِ سخاوت میں گذر اوقات کر
اے نظر والے نظریات خیرات کر"

/ز/ کی گمبھیر آواز کی تکرار پر ہوتا ہے۔ دونوں آوازیں صفیری ہیں، لیکن پہلی غیر مسموع دوسری مسموع ہے۔ مسموع آوازیں گہرائی اور بھاری پن کا تاثر پیدا کرتی ہیں اور نظم کے المناک انجام سے ہم آہنگ ہیں۔

ان چند نظموں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ساقی اس وقت زندگی کو کس طرح دیکھ رہے ہیں اور ان کی شاعری کن منزلوں کا پتہ دے رہی ہے۔ شاہ صاحب اینڈ سنز، شیر امداد علی کا مینڈک، مسٹر ماریا تریزا، خرگوش کی سرگذشت اور ایک سور سے اگلی نظموں سے کہیں زیادہ بھر پور

اور مکمل نظمیں ہیں، تہ دار اور پُر تاثیر، جن میں خیال کا ارتقاء، نشوونما اور اتمام سب پر پوری توجہ کی گئی ہے۔ جس طرح مُردہ خانہ پہلے مجموعے کی نمائندہ ترین نظم ہے، اسی طرح یہ چند نظمیں بشمول امانت کے اس مجموعے کی بہترین نظمیں ہیں۔ ان میں ساقی کے شعری مزاج کا ایک رخ یا ایک پہلو نہیں بلکہ ان کی پوری شعری شخصیت سامنے آتی ہے۔

ساقی غزل پر اب اتنی توجہ نہیں کرتے جتنی وہ پہلے کرتے ہیں۔ ان کے پہلے مجموعے میں دوسرے مجموعے کی بہ نسبت تین گنا غزلیں ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ساقی کی بعض غزلیں اچھی ہیں اور چند اشعار کو تو قبولِ عام کے دربار سے خلعتِ فاخرہ بھی عطا ہو چکی ہے۔ اگرچہ ساقی کی غزل پر اس مضمون میں اتنی توجہ نہیں کی جا سکتی جتنی اس کا حق ہے، تاہم چونکہ افتادِ ذہنی اور مزاجِ شعری کے اعتبار سے ان کی غزل، نظم سے الگ نہیں چند منتخب اشعار یہاں درج کئے جاتے ہیں۔ ان میں بھی ساقی کی نئی لفظیات اور کائناتی آہنگ سے وابستہ پیکریت اور استعارہ سازی صاف دکھائی جا سکتی ہے۔ غزل میں استعمال ہونے والے ان کے تین چار خاص معنوی سٹ لوں ہیں۔

۱۔ صحرا، دشت، ریت، پیاس، غبار، مٹی، خاک، گھٹا، بادل، موسم

۲۔ لہو، خون، شعلہ، بدن کی آگ، دھنک، رنگ

۳۔ آواز، طوفان، خامشی، خواب، تنہائی

۴۔ مُردہ، موت، بین، نوحہ، پرچھائیں، سسکی، درد، آسیب، خوف، رات اداسی، گریہ۔

میں وہی دشت ہمیشہ کا ترسنے والا ۔۔۔ تو مگر کون سا بادل ہے برسنے والا

ریت کی صورت جاں پیاسی تھی آنکھ ہماری نم نہ ہوئی ۔۔۔ تیری درد گساری سے بھی روح کی الجھن کم نہ ہوئی

میری صحرا زاد محبت ابرِ سیہ کو ڈھونڈتی ہے ۔۔۔ ایک جنم کی پیاسی تھی اک بوند سے تازہ دم نہ ہوئی

میں پیاس کا صحرا ہوں ترسنے کے لئے ہوں ۔۔۔ تو کالی گھٹا ہے تو برس کیوں نہیں جاتی

اے صاحبانِ شہر اداسی اس قدر نہ ہو ۔۔۔ وہ دیکھنا غبار کوئی خوشی خبر نہ ہو

میں وہ مُردہ ہوں کہ آنکھیں مری زندوں جیسی ۔۔۔ بین کرتا ہوں کہ میں اپنا ہی ثانی نکلا

مستی تھی خا موج اٹھا لے گئی ہم کو ۔۔۔ گرداب میں ساحل کی بلا لے گئی ہم کو

مجھے خبر ہے کہ اک مشتِ خاک ہوں پھر بھی ۔۔۔ تو کیا سمجھ کے ہوا میں اڑا رہا ہے مجھے

شاخ سے ٹوٹ کے بے حرمت ہیں ویسے بھی بے حرمت تھے ۔۔۔ ہم گرتے پتوں پہ ملامت کب رسمِ موسم نہ ہوئی

خامشی چھیڑ رہی ہے کوئی نوحہ اپنا ۔۔۔ ٹوٹتا جاتا ہے آواز سے رشتہ اپنا

ان ہواؤں میں یہ سسکی کی صدا کیسی ہے ۔۔۔ بین کرتا ہے کوئی درد پرانا اپنا

یہ لوگ خواب میں بھی برہنہ نہیں ہوئے ۔۔۔ یہ بد نصیب تو کبھی تنہا نہیں ہوئے

تیرے بدن کی آگ سے آنکھوں میں ہے دھنک ۔۔۔ اپنے لہو سے رنگ یہ پیدا نہیں ہوئے

دامن میں آنسوؤں کا ذخیرہ نہ کر ابھی ۔۔۔ یہ صبر کا مقام ہے گریہ نہ کر ابھی

جس کی سخاوتوں کی زمانے میں دھوم ہے — وہ ہاتھ سو گیا ہے تقاضا نہ کر ابھی
نظریں جلا کے دیکھ مناظر کی آگ میں — اسرارِ کائنات سے پردہ نہ کر ابھی

ساقی کا تخلیقی سفر ان بیس بائیس برسوں میں دو واضح موڑوں سے گزرا ہے۔ نئی شاعری کی ہنگامہ خیزیوں کے زمانے میں ساقی کی آواز ایک ایسے شاعر کی آواز کے طور پر ابھری تھی جس نے معرا نظم کے نئے امکانات کی خبر دی تھی۔ پیاس کا صحرا میں زیادہ تعداد معرا نظموں ہی کی ہے۔ یہ معرا نظمیں اکثر و بیشتر مختصر ہیں۔ اس دور میں شاید ہی کسی دوسرے شاعر نے اتنی بڑی تعداد میں معرا نظمیں کہی ہوں۔ ساقی کی اس زمانے کی کامیاب ترین نظمیں معرا ہی ہیں جو ۱۹۵۵ء سے ۱۹۶۶ء کے درمیان کہی گئیں۔ اس کے بعد ۱۹۶۶ء سے ۱۹۷۵ء تک کا زمانہ ٹھہراؤ کا زمانہ ہے۔ اس میں ساقی زیادہ تر آزاد نظمیں کہتے رہے، لیکن ان میں وہ تخلیقی ارتعاش یا پھٹ پڑنے یا برسنے کی کیفیت نہیں جو معرا نظموں میں ہے۔ ساقی کی باغی طبیعت جو ہمیشہ نئی راہوں اور نئی وادیوں کی تلاش میں رہی، اسے پھر ایک موقع ۷۵۔۱۹۷۴ء کے لگ بھگ ملا۔ اس زمانے میں کچھ انگریزی شاعری کے اثر سے، کچھ طبیعت کے تقاضے سے اور کچھ اس لئے کہ اردو میں نثری نظم کی بحث فروغ ہو چکی تھی، ساقی کی باغی طبیعت نے نثری نظم میں کشش محسوس کی، اور اسے برتنا شروع کیا اور جلد اس میں بھی اپنی انفرادیت کے لئے گنجائش پیدا کرلی۔ اُردو میں نثری نظمیں کہی جا رہی تھیں، لیکن زیادہ تر مختصر اور تاثراتی نظمیں تھیں۔ ساقی نے طویل نثری نظمیں لکھیں، اور یہ اس پایۂ تکمیل کی ہیں کہ ان کا شمار اس دور کی بہترین نثری نظموں میں ہو سکتا ہے۔

ساقی کے ذہن میں اب بھی کہیں نہ کہیں آسیب کا کوئی سایہ لرزاں ہے لیکن غالباً اس کی نوعیت نجی نہیں۔ یہ مشینی دور کی سفاکی اور ایٹمی دہشت کی دین بھی ہو سکتا ہے۔ جس میں انسانیت کا مستقبل وقت کا سب سے بڑا سوالیہ نشان بن گیا ہے۔ چنانچہ ساقی خوف، اندیشے یا درد و الم سے مقابلے کے لئے زمین یا وجود کی طبعی جڑوں کی طرف بار بار لوٹتے ہیں۔ ان کی شدید ترین خواہش جیسا کہ کہا گیا ہے مٹی کا بلاوا ہے جو دو خاص طرح سے اظہار کی راہیں ڈھونڈتا ہے۔ زمینی رشتوں کا سب سے بنیادی اظہار بدن سے وابستگی ہے۔ چنانچہ ساقی کے یہاں بدن کا رنگ نار لامسہ، شامہ اور باصرہ کی نئی آگاہیوں کے ساتھ سامنے آتا ہے اور ان کی کئی نظموں میں بدن کی نعمتوں اور لطافتوں کے خزینے زندگی کی فعال اور توانا علامت کے طور پر کھلے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مٹی کے بلاوے کا دوسرا رخ کائناتی ہے، یعنی چاروں طرف بکھری ہوئی اشیاء، اجسام اور اشکال سے گہرے رابطے اور واسطے کا، علائق اور علائم کے یہ دائرے جیسا کہ بتایا گیا ہے گھاس کے میدانوں، بھوری جھاڑیوں، گلابی کونپلوں، سانپ چھتریوں، کیسر کیاریوں، جل کنبھیوں، پیپل کے پتوں، سنہری پتوں، اوس کی بوندوں، ادھ کھلے کنولوں، سہاگن بیلوں، گھنے جنگلوں اور آنکھوں میں دھنک کھلانے والی بہاروں سے لے کر پیلے پیلے مینڈکوں، زخمی بطوں، دم سادھے کتوں، چیتے کی عیار آنکھوں، دندناتے سوروں اور خون میں لت پت خرگوشوں اور ان سے بھی آگے بڑھ کر دوسرے جانداروں یعنی شیر امداد علی، جان محمد خان، ماریا تریزا اور شاہ صاحب انسان کے بیٹوں تک پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ رابطے ذات اور ہیچ کے مسائل سے ہٹ کر بڑھتے اور پھیلتے ہیں۔ نتیجتاً ان سے زمین، زندگی اور ذات کے جن خارجی و داخلی مسائل کا شور و شر پیدا ہوتا ہے، وہ ساقی کے کائناتی آہنگ کی تشکیل کرتا ہے۔ بدن کی لطافتوں کی نمو کاری اور زمینی مظاہر و کوائف کے رابطوں کا کائناتی آہنگ، یہ دونوں ساقی کی شاعری کے ایسے امتیازات ہیں جن کے باعث ان کا قد متعدد دوسرے ہم عصروں سے نکلتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ جہاں تک عصر کے اثرات کا تعلق ہے، شاعر کی پہلی بغاوت اپنے قریبی ماضی سے ہوتی ہے۔ اس عہد میں نظم میں تین آوازیں خاص رہی ہیں، میراجی، راشد اور فیض۔ فیض کے اثرات کا زمانہ آٹھ دس برسوں سے زیادہ نہیں رہا۔ ساقی کی شاعری تاریخی اعتبار سے بعد کی چیز ہے۔ جدید شاعروں پر سب سے واضح اثر میراجی کا رہا ہے۔ ساقی کے معرا سانچوں سے دلچسپی میراجی کی یاد دلاتی ہے، نیز برن کا سایہ جیسی نظموں میں میراجی کے لہجے کی گونج سنی جا سکتی ہے۔ لیکن ساقی کی آگ، ان کی توانائی اور ان کا جوشِ نمو انہیں بالکل دوسری راہوں کی طرف

لے گیا۔ ساقی خودکلامی اور سرگوشیوں کے شاعر ہو ہی نہیں سکتے۔ وہ ذات سے باہر رابطوں اور تعلقات کے شاعر ہیں جس نے انہیں خودکلامی کے بجائے ہم کلامی کی راہ پر ڈال دیا۔ راشد کی اہمیت کا اعتراف تو جدید شاعری کے غلغلے کے ساتھ ہی شروع ہو گیا تھا، لیکن راشد کی بازیافت کہیں ۱۹۶۵ء کے بعد شروع ہوئی۔ پیکر تراشی، غیر رسمیت اور حسن کاری کے اعتبار سے ساقی راشد کے قبیلے کے شاعر ہیں لیکن راشد کی لفظیات اور موضوعات سے انہوں نے عمداً گریز کیا، اور اپنی پہچان اپنی افتادِ طبع کے بل بوتے پر کرائی۔ اگرچہ بغاوت کا جذبہ اور رسمیات سے انحراف کی لے مشترک ہے، لیکن ساقی کے یہاں رابطے و ابلاغ کی خواہش دوسرا رنگ پیدا کرتی ہے۔ ساقی کا لہجہ، ان کی لفظیات، ان کے علائم و پیکر اور ان کا نظامِ فکر ان کا اپنا ہے۔ ساقی کی توانائی، تازگی، تہ داری، خوش سلیقگی، حسن کاری، بدنی کیفیت اور کاشتی آہنگ انہیں اپنے عہد کے تصادم اور اثرات کے باوصف ایک منفرد شاعر کا درجہ عطا کرتے ہیں۔ وہ وطن سے ہزاروں میل دور ہیں، ان کا تخلیقی سفر جاری ہے۔ ان کے شعری امتیازات کے پیشِ نظر یہ خواہش ناگزیر سی ہے کہ خدا ان کے سینے کی آگ روشن رکھے اور وہ اسی طرح نظم کے نئے امکانات کی خبر دیتے رہیں۔

ڈاکٹر انور سدید

حلقہ اربابِ ذوق کی تنقید

حلقہ اربابِ ذوق کے تخلیقی عمل میں اخفا، ابہام اور بُعد کو اہمیت حاصل ہوئی تاہم تنقید میں حلقہ اربابِ ذوق نے یکسر مختلف رویہ قبول کیا اور ابہام کے برعکس فن پارے کے بے رحم تجزیے کا رجحان پیدا کیا۔ حلقہ اربابِ ذوق کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس نے فن پارے کے حسن و قبح کے فیصلے کو محض ذاتی تاثر کی میزان پر نہیں تولا بلکہ فیصلے کے لئے جواز مہیا کرنا بھی ضروری قرار دیا۔ اہم بات یہ ہے کہ جب حلقے کی تاسیس عمل میں آئی تو ترقی پسند تحریک نے مقصدیت اور افادیت کو اتنی اہمیت دے دی تھی کہ فن پارے کی تنقید میں سب سے پہلے یہی معیار آزمایا جاتا یوں تنقید کے فنی اور جمالیاتی زاویوں سے یا تو اغماض برتا جاتا یا انہیں بالکل نظر انداز کر دیا جاتا۔ حلقے نے فن پارے کی داخلی قدروں کو اجاگر کرنے کی سعی کی تھی۔ چنانچہ تنقید فن میں بھی یہی زاویہ حلقہ اربابِ ذوق کا امتیازی نشان بن گیا اور اس دور میں جب "ادب برائے زندگی" کا نعرہ بلند ہوا تو حلقے نے "ادب برائے ادب" کے نظریے کو پروان چڑھانے کی کوشش کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حلقے کی تنقید میں فن کا جمالیاتی پہلو زیادہ نمایاں ہوا اور تخلیقات سے ان زاویوں کو تلاش کرنے کی کوشش کی گئی جن سے عالمگیر انسانیت سے ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوتا تھا اور روح اہتزاز اور بالیدگی کی کیفیت محسوس کرتی تھی۔

حلقہ اربابِ ذوق کی تنقیدی جہت کو متعین کرنے کا فریضہ میراجی نے سرانجام دیا۔ میراجی نے تنقید کی کوئی باضابطہ کتاب نہیں لکھی تاہم ان کے نظریات عملی تنقید کے ان مضامین میں موجود ہیں جو "مشرق و مغرب کے نغمے" کے نام سے ان کی وفات کے بعد شائع ہوئے۔ میراجی کا اساسی نظریہ یہ ہے کہ "شعر و ادب زندگی کے ترجمان ہیں"[1] تاہم وہ زندگی کو جامد یا یک رُخا تصور نہیں کرتے اور ادب کو زندگی کا غلام قرار نہیں دیتے بلکہ انہوں نے ادب کے تغیر کو زندگی کے تغیر کے مماثل قرار دیا اور نئے زمانے کی برتری کو علم اور شعور کی نئی آگہی کا نتیجہ شمار کیا اور ادب کی تخلیق و ترویج میں ان عوامل کی اہمیت کو تسلیم کیا۔ میراجی کا یہ نظریہ بھی اہم ہے کہ "داخلی اور خارجی فنی اُصولوں سے قطع نظر ادب ہر مصنف کی اپنی شخصیت کا آئینہ ہوتا ہے"[2] چنانچہ انہوں نے بیٹے کو باپ کا عکس قرار دیا اور بیٹے کے کردار سے باپ کے کردار کی خصوصیات تلاش کرنا ممکن تصور کیا۔ اہم بات یہ ہے کہ وہ مصنف کو اپنے عصر کے حالات سے علیحدہ نہیں کرتے تاہم انہوں نے تخیّل کی اہمیت کو واضح کیا اور لکھا کہ "انسانی زندگی تخیل کے ماتحت ارتقائی منازل طے کرتی ہے"۔ اس تخیّل کا اوّلین نقش دیومالا کی صورت میں ظاہر ہوا لیکن زمانے کے تغیر کے

---

[1] میراجی۔ مشرق و مغرب کے نغمے۔ ص ۱۶۴

[2] ایضاً۔ ص ۱۶۷

ساتھ انسان دیومالا کے بندھن سے آزاد ہوگیا اور اس کی جگہ مادیت نے لے لی۔ میراجی نے اپنے تنقیدی نظریات کا اطلاق قدیم شعراء پر کیا انہوں نے چنڈی داس کی شاعری سے ایسے تصورات تلاش کیے جن میں نطشے کے مافوق البشر کے عناصر موجود تھے۔ بودلیر کی جذباتی نفس پرستی سے اس کے احساسِ حسن کی اور وہٹمن کی جمہوریت پسندی سے اس کے جنسی رجحانات کی نشان دہی کی۔ اُردو تنقید میں میراجی کی انفرادیت یہ ہے کہ انہوں نے نہ صرف نظریہ سازی کی بلکہ اس کے عملی اطلاق سے شعراء کو تخلیقات کے حوالے سے جانچنے کا شعور پیدا کیا۔ میراجی کی کتاب "اس نظم میں" جدید شاعری کی تفہیم کا بنیادی صحیفہ شمار ہوتی ہے اور اس کے تجزیاتی عمل سے حلقہ اربابِ ذوق کی تنقیدی جہت متعین ہوتی ہے۔

حلقہ اربابِ ذوق میں فکر کے جو دھارے بیک وقت جمع ہوگئے تھے ان میں سے مغربی فکر کا زاویہ میراجی نے اور مشرقی فکر کا زاویہ مولانا صلاح الدین احمد نے مہیا کیا۔ مولانا صلاح الدین احمد کی تنقید کے سب انداز مشرقی تھے چنانچہ انہوں نے لفظ اور خیال کے حسن کو فوقیت دی۔ اہم بات یہ ہے کہ روایت کی پیروی کے باوجود انہوں نے ادب کے صحت مند نئے دھارے کو قبول کیا اور جدیدیت کے مخصوص رجحانات کو تحریک میں تبدیل کرنے کی کوشش کی۔ مولانا صلاح الدین احمد کی تنقید میں تحسین کا عنصر زیادہ ہے اور وہ ادب کے آبگینوں کو توڑنے کے بجائے انہیں جوڑنے کی سعی کرتے ہیں اور اسے وضعدار تنقید کہنا زیادہ مناسب ہے۔

حلقہ اربابِ ذوق کی تنقید میں قطعیت کا زاویہ ڈاکٹر وحید قریشی نے پیدا کیا۔ ان کی اساسی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے ادبی تنقید کی اخلاقیات مرتب کی اور صداقتِ اظہار اور استخراجِ مطالب میں اس ضابطہ پر سختی سے عمل کیا۔ ڈاکٹر وحید قریشی فن کو معاشرتی اور تاریخی ماحول سے علیحدہ نہیں کرتے اور تخلیق کو کسی ایک زاویے یا معیار سے پرکھنے کے بجائے اُسے مختلف پیمانوں سے جانچتے ہیں اور اس کے معائب و محاسن کو کسی مصلحت اندیشی کے بغیر پیش کر دیتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ ڈاکٹر وحید قریشی تنقید کو ایک ادبی عمل تصور کرتے ہیں[1] چنانچہ وہ جہاں محاسن کا تذکرہ کرتے ہیں وہاں معائب کا ذکر کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ انہوں نے ادب کو پرستار کی حیثیت سے کم اور نقاد کی حیثیت سے زیادہ دیکھا ہے۔ حلقہ اربابِ ذوق میں ڈاکٹر وحید قریشی کی تنقید آزادیٔ فکر، آزادیٔ اظہار اور جرأت و بےباکی کی ایک نہایت مضبوط آواز ہے۔

ریاض احمد کی انفرادیت اس بات میں ہے کہ انہوں نے ادبی تنقید کو سائنسی عمل بنا دیا چنانچہ انہوں نے متخیلہ، ہیئت، اسلوب، جمال اور ذوقِ جمال جیسے مسائل کو عالمانہ انداز میں سلجھانے کی کوشش کی اور ترقی پسند نقطۂ نظر کو ہدف بنائے بغیر حلقے کے نقطۂ نظر کو مثبت انداز میں ابھارا۔ نفسیات ریاض احمد کی تنقید کی امتیازی جہت ہے۔ انہوں نے بیشتر مباحث کو نفسیاتی اصطلاحات سے اور ان کی صداقت کو شاعری کے داخلی تجزیے سے ثابت کرنے کی سعی کی۔ ریاض احمد نے زندگی کو ادب کا موضوع قرار دیا ہے[2] اور وہ ادب کے وسیلے سے حسن، خیر اور صداقت کی قدروں کو اُجاگر کرنے کے آرزو مند ہیں اور ادب میں حقیقت کے متعلق پہلو کو اُجاگر کرنے کے بجائے اس کے جمالیاتی تاثر کو جذباتی اسلوب میں پیش کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ ریاض احمد جدید اُردو تنقید میں توازن اور استدلال کی مثال ہے چنانچہ ان کے بیشتر تجزیے خالصتاً علمی نوعیت کے ہیں اور ان کے ہاں جانبداری کا شائبہ تک نہیں۔

ص۱ ڈاکٹر وحید قریشی۔ مطالعۂ حالی ص ۲۱ ص۲ ریاض احمد۔ تنقیدی مسائل ص ۱

محمد حسن عسکری کی تنقید میں سوچ کی گمبھیرتا، مطالعے کی وسعت اور نتائج کی ہمہ گیریت سب سے پہلے متاثر کرتی ہے۔ عسکری نے ادب میں اپنی غیر جانبداری کا اعلان کبھی نہیں کیا چنانچہ انہوں نے "فن برائے فن" کی برملا حمایت اور ترقی پسند تنقید اور ادب کی کھلی مخالفت کی۔ عسکری نے یہ باور کرایا کہ فن حقیقت کو ہی پیش کرتا ہے بلکہ آزادانہ عمل سے حقیقت کو تلاش بھی کرتا ہے اور یہ عمل اگر مقبول تصورات یا اداروں کی معاونت سے سرانجام پائے تو حقیقت نہ صرف مسخ ہو جاتی ہے بلکہ انصاف کا مطلب بھی مبہم ہو جاتا ہے[1] چنانچہ محمد حسن عسکری نے حقیقت کی تلاش کو ایک انفرادی عمل قرار دیا اور فنکار کو پوری انسانیت کا نمائندہ قرار دیتے ہوئے لکھا کہ "فنکار محض ایک آدمی نہیں ہوتا، فنکار تو براہِ راست زندگی کا آلۂ کار ہوتا ہے"۔ ادب کی یہ انفرادیت حلقے کے اساسی نظریات کے عین مطابق ہے اور عسکری نے اس انفرادیت کی مثالیں آسکر وائلڈ، اور بودلیر کی شخصیتوں سے فراہم کیں تو صاف معلوم ہونے لگا کہ میراجی اور عسکری کے نظریاتِ تنقید و ادب ایک ہی سرچشمے سے پھوٹے ہیں۔ محمد حسن عسکری اُردو تنقید کی فعال اور مؤثر آواز ہے انہوں نے نظریاتی مباحث کو جذباتی شیفتگی سے اُبھارا اور بین السطور صدہا سوال پیدا کیے چنانچہ آزادی کے فوراً بعد اُردو ادب میں جو بحث بھی چلی وہ عسکری کے کسی مضمون سے ہی چلی[2] ان بحثوں سے حلقے کی تحریک کو بالواسطہ طور پر تقویت ملی اور ڈاکٹر جمیل جالبی، سلیم احمد، ممتاز شیریں، انتظار حسین اور سجاد باقر رضوی کی صورت میں تنقید کا ایک نیا دبستان وجود میں آگیا چنانچہ یہ کہنا درست ہے کہ میراجی کے بعد حلقے میں فکر کی نئی رَو محمد حسن عسکری نے داخل کی۔

اب تک جن ناقدین کا تذکرہ ہوا ہے، ان کی مجموعی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے اپنے عہد کے ادب کو دروں بینی کی طرف مائل کیا اور ادبا کے تخلیقی فن پر براہِ راست اثر ڈالا چنانچہ اس دور میں جو نقاد اُبھرے ان کے خیالات پر حلقے کے اثرات کی گہری چھاپ موجود تھی۔ ان میں سے مختار صدیقی کی اہمیت یہ ہے کہ انہوں نے ادب کے سماجی اداروں (مثلاً مشاعرے) کا تجزیہ عالمانہ انداز میں کیا۔ سید عابد علی عابد نے جدید ادب کو ضابطے کی قدیم آنکھ سے دیکھا اور اس کے فنی محاسن اُجاگر کر دیے۔ آفتاب احمد خان نے ادب کی صحت مند اقدار کا تعین کیا اور غالب کی شاعری سے اس کے داخلی رجحانات دریافت کئے۔ ڈاکٹر داؤد رہبر نے اصنافِ ادب میں سے شاعری اور تنقید کے خصوصی رویوں کی نشان دہی کی۔ الطاف گوہر اور اعجاز حسین بٹالوی نے اپنے عہد میں پروان چڑھنے والے ادبی رجحانات کا تجزیہ کیا اور معنی اور ہیئت کی انفرادی حدود تلاش کرنے کی سعی کی۔ حزب اللہ اور وجیہہ الدین احمد نے تخلیقات کا نفسیاتی تجزیہ کیا اور ان محرکات تک رسائی حاصل کی جو تخلیقات کے باطن میں پرورش پاتے ہیں۔ قیوم نظر نے اُردو ڈرامے پر تحقیقی و تحلیلی مضامین لکھے اور نظمِ جدید کے تجزیوں سے اس کی تفہیم میں آسانی پیدا کی۔ سید امجد الطاف نے انشاء اللہ خان انشاء کے فن کا تجزیاتی مطالعہ کیا اور اس کے کئی نئے گوشے اُجاگر کر دیے۔ ناقدین کا متذکرہ بالا گروہ بیشتر ایسے تعلیم یافتہ ادبا پر مشتمل تھا جنہوں نے انگریزی علوم میں سندِ افتخار حاصل کی اور اس مطالعے کی اساس پر اُردو ادب کو جدیدیت کی رَو قبول کرنے پر مائل کیا۔ تاہم دکھ کی بات یہ ہے کہ ان ادبا میں سے بیشتر کا تنقیدی اثاثہ بکھرا ہوا ہے[3] اس لیے ادب پر ان مضامین کے مستقل اثرات کا اندازہ لگانا

صد۱ محمد حسن عسکری۔ انسان اور آدمی۔ ص ۸۸   صد۲ مظفر علی سید۔ بہترین مقالات ۱۹۶۳ء، ص ۷۷   صد۳ سید عابد علی عابد کا شمار مستثنیات میں کیا جا سکتا ہے کہ ان کی متعدد تنقیدی کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور ادب پر ان کے اثرات سے انکار ممکن نہیں۔

مشکل ہے۔ یہ ناقدین اُردو تنقید کے اُفق پر شہابِ ثاقب کی طرح نمودار ہوئے اور پھر بہت جلد معروفیتوں کی کہکشاں میں گم ہو گئے تاہم حلقے نے چند ایسے ناقدین کو بھی روشناس کرایا جنہوں نے مستقبل کی تنقید پر دائمی اثرات مرتب کئے اور ایک الگ تنقیدی نقطۂ نظر بھی پیدا کیا۔ ان میں ڈاکٹر وزیر آغا کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا نے ادبی موضوعات پر جزوی نظر بھی ڈالی ہے اور انہیں ایک وسیع تناظر میں رکھ کر ایک بڑے "کل" کے ساتھ وابستہ بھی کیا ہے۔ مؤخر الذکر رجحان کے تحت ان کی کتاب "اُردو شاعری کا مزاج" لکھی گئی اور اس میں اُردو شاعری کی تین اصناف یعنی غزل، نظم اور گیت کا مزاج دریافت کیا گیا اور اوّل الذکر کے تحت وہ بیسیوں مضامین لکھے گئے جو "تنقید اور احتساب" "نئے مقالات"، "نظم جدید کی کروٹیں" اور "تنقید اور مجلسی تنقید" وغیرہ کتابوں میں شامل ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے تخلیقی عمل کا فلسفہ مرتب کرنے کی سعی بھی کی ہے اور زندگی کے دائرے سے "جست" کی اہمیت دریافت کر کے تخلیق کی جہت بھی متعین کی۔ نظریاتی اعتبار سے ڈاکٹر وزیر آغا ادب کو انسانی تہذیب و ثقافت کا مظہر قرار دیتے ہیں اور ارضی اور روحانی زندگی میں حدِ فاصل پیدا کئے بغیر ان دونوں کے فنی انضمام کو زندگی اور ادب کے ارتقا کا وسیلہ قرار دیتے ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے تنقید میں جدید علوم سے کما حقہٗ فائدہ اٹھایا ہے اور وسیع مطالعے کی اساس پر نئے نظریات پیش کئے ہیں چنانچہ ڈاکٹر وزیر آغا کے ارضی ثقافتی نظریۂ ادب سے ایک نئی ادبی تحریک پیدا ہو گئی جس نے نہ صرف جدیدیت کے نقوش اُجاگر کئے بلکہ نئی معنویت کو بھی فروغ دیا۔

جیلانی کامران نے مسلمانوں کی تہذیب کو تنقید کے نئے پس منظر کے طور پر خوبی سے استعمال کیا اور کشف۔ الہام۔ رویا اور خواب کی علامتوں سے ظاہر اور باطن کے کیمیائی رشتوں کا اثبات کیا۔ انہوں نے معنی کی تلاش میں علامتی مناظر اور روحانی اقدار کو اہمیت دی اور قدیم داستانوں، رزم ناموں، سہ حرفیوں اور تلمیحات وغیرہ میں سے نئے معنی تلاش کئے۔ سجاد باقر رضوی نے تنقیدی فکر کی رو ہند اسلامی تہذیب میں تلاش کی اور ادب کی تعبیر میں ان عناصر کو اہمیت دی جن سے نیا قومی طرزِ احساس مرتب ہوتا ہے۔ سجاد باقر رضوی کے نظریے کے مطابق فن تنقیدِ حیات اور زندگی تنقیدِ فن ہے اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں[۱]۔ تاہم وہ فن کو ذریعہ سمجھنے کے بجائے اسے مقصود بالذات قرار دیتے ہیں اور استعارے کو گرد و پیش کا عکس تصور کرنے کے باوصف اس کی تشکیل میں روحانی اور تہذیبی اثرات سے انکار نہیں کرتے۔ سجاد باقر رضوی کی تنقید میں اظہار کی قطعیت تو ملتی ہے تاہم انہوں نے کوئی مبسوط تنقیدی نظریہ پیش نہیں کیا ——————————

—————— اُردو تنقید میں تہذیبی رویے کی ایک اور اہم مثال انتظار حسین ہے۔ ان کے ہاں نظریاتی شدت اور لہجے کی کاٹ دونوں موجود ہیں۔ تاہم وہ بالعموم ردِ عمل کی تنقید لکھتے ہیں اس لئے ان کا ذاتی نقطۂ نظر کچھ زیادہ اُبھر نہیں سکا۔ شیخ محمد ملک اور منیر احمد شیخ کے ہاں بھی ہند اسلامی تہذیب کی برتری کا زاویہ نمایاں ہے لیکن اوّل الذکر کے اسلوب کی جراحت اور مؤخر الذکر کی افسانہ آرائی نے ان کے نظریات و اظہار کی ثقاہت پر منفی اثر ڈالا ہے اور اس جذباتی کاوش میں زیادہ تر حقائق کے آبگینے شکستہ ہوئے لیکن نئی تعمیر کی صورت پیدا نہیں ہوئی۔

---

[۱] سجاد باقر رضوی: تہذیب و تخلیق۔ ص ۶۵

حلقہ اربابِ ذوق کی تنقید میں شدید ردِ عمل کی مثال مظفر علی سید کی صورت میں نمایاں ہوئی۔ مظفر علی سید کی تنقید محبت اور نفرت کی متضاد نہایتوں پر سفر کرتی ہے۔ ان کا مطالعہ، مشاہدہ اور حافظہ اور ان سب پر مبنی ان کا جراتِ مندانہ تجزیہ ادب کی اس اخلاقیات کا تابع ہے جس کی اولیں ترویج ڈاکٹر وحید قریشی نے کی ہے۔ تاہم ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جہاں کہیں موضوع کا انتخاب مظفر علی سید کے اپنے ذہنی عمل کا نتیجہ ہے وہاں انہوں نے فن پارے پر خاصی ہمدردانہ نظر ڈالی ہے لیکن جب انہوں نے ردِ عمل کا اظہار کیا ہے تو اِن کے ادبی تعصبات پینترے بدل بدل کر وار کرتے ہیں چنانچہ مظفر علی سید نے حلقہ اربابِ ذوق کے دفاع کا فریضہ سرانجام دیا اور اپنے دو ٹوک کٹیلے لہجے سے اہلِ ادب کو اپنی جانب متوجہ کر لیا۔ یہ عمل چونکہ منفی تھا اور اس سے کوئی مثبت نتیجہ برآمد نہ ہو سکا اس لئے مظفر علی سید بہت جلد تھک کر ادب کے میدان سے روپوش ہو گئے۔

حلقہ اربابِ ذوق کی تنقید کا ایک اہم زاویہ "مجلسی تنقید" ہے جسے حلقے کی ہفتہ وار مجالس کی بدولت فروغ حاصل ہوا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس قسم کی تنقید میں ناقد کے سامنے حوالے کی کتب موجود نہیں ہوتیں اور وہ زیادہ تر قوتِ حافظہ کے بل بوتے پر ہی تنقید کو آگے بڑھاتا ہے تاہم یہ ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ تنقید خواہ مجلسی ہو یا غیر مجلسی اس کا مقصد فن پارے کے حسن و قبح کا جائزہ اور اس کی جمالیاتی قدر و قیمت کا تعین ہی ہوتا ہے[۱] اس قسم کی تنقید انبوہ کے اثرات اور فنکار کی شخصیت کے تاثر سے بھی آزاد نہیں ہوتی۔ چنانچہ اضطراری لہجے کی افزائش اور دلیل پر جذبات کے غلبے سے انکار بھی ممکن نہیں۔ حلقے کی مجلسی تنقید میں یہ سب معائب نظر آتے ہیں چنانچہ اکثر اوقات "طرفدارانِ غالب" نے سخن فہمی کے بجائے حیلہ جوئی کا شعار اختیار کیا جس سے فکری تلاطم کم اور جذباتی انتشار زیادہ پیدا ہوا۔ تاہم اس عیب کے باوصف حلقہ اربابِ ذوق کی مجلسی تنقید ادبا کے ذہنی کیتھارسس کا عمدہ وسیلہ ثابت ہوئی اور اس سے نہ صرف نئے ادبا کو اعتماد و اظہار عطا کیا بلکہ انہیں ادب تخلیق کرنے اور اپنے نقطۂ نظر کو جراتِ مندانہ انداز میں پیش کرنے کی تحریک بھی دی۔ حلقے کی اس عطا سے انکار ممکن نہیں کہ اس نے جہاں میراجی، حسن عسکری، ریاض احمد اور وزیر آغا جیسے ناقدین پیدا کئے وہاں شاد امرتسری، عزیز الحق، عارف امان، سعادت سعید، آزاد کوثری، زاہد فارانی، خالد احمد، سراج منیر اور یوسف کامران جیسے مجلسی نقادوں کو بھی روشناس کرایا جو ہر نئے مسئلے پر خیالات کی ترتیب، فوری رائے کے اظہار اور زبانی تنقید میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔

حلقہ اربابِ ذوق کی تنقید مجموعی طور پر تین ادوار میں تقسیم کی جا سکتی ہے۔ دورِ اوّل میں حلقے نے تاثراتی تنقید کو فروغ دیا اور فن پارے کے حسن و قبح کے لئے وجدان کو ہی منصف قرار دیا۔ حلقے کی تنقید کا دوسرا دور میراجی کی شمولیت کے بعد شروع ہوا۔ اس دور میں میراجی نے تنقید میں جمالیاتی زاویہ پیدا کیا اور ادب اور زندگی کے رشتے کا اثبات کرنے کی کوشش کی۔ حلقے کی تنقید کا تیسرا دور میراجی کی وفات کے بعد شروع ہوا۔ اس دور میں لکھنے والوں کی ایک نسل پرانی ہو چکی تھی اور حلقے میں حسن عسکری، ریاض احمد، وزیر آغا، انتظار حسین اور ناصر کاظمی نے تنقید میں ایک نیا تہذیبی رجحان پیدا کیا چنانچہ نہ صرف علامتوں اور استعاروں کے نئے معنی دریافت کئے گئے بلکہ ماضی کے قدیم ادب کی تعبیرِ نو کا فریضہ بھی سرانجام دیا گیا۔ اس دور میں حلقے نے برہم نوجوانوں کی ایک ایسی جماعت

---

[۱] وزیر آغا۔ تنقید اور مجلسی تنقید ص ۲۱۳

بھی پیدا کی جو ہیئت ترکیبی کو تبدیل کرنے اور دو حقیقتوں کے درمیان استعارے کا وسیلہ توڑنے کے درپے تھی چنانچہ حلقے سے ایک منفی تحریک "نئی لسانی تشکیلات" کے نام سے ابھری اور اس نے کچھ عرصے تک تنقید میں خاصی گرد اڑائی۔ حلقہ چونکہ صحت مند خیال افروزی کا قائل تھا اس لئے اس تحریک کے خلاف ردِ عمل بھی حلقے کے اندرونی دائرے سے ہوا چنانچہ یہ منفی تحریک بہت جلد موت کے گھاٹ اتر گئی۔

حلقہ اربابِ ذوق کی تقسیم کے بعد حلقے کی تنقید بھی دو الگ الگ دبستانوں میں بٹ گئی۔ ادبی حلقہ تنقید کے جمالیاتی زاویوں کو اُجاگر کرتا اور ادب کی تفہیم کے لئے تجزیہ کو لازمی عمل قرار دیتا۔ دوسرا حلقہ چونکہ ترقی پسندی کی طرف مائل تھا اس لئے یہ زیادہ تر مارکسی اندازِ عمل کو تنقید میں آزمانے کی سعی کرتا چنانچہ اس حلقے پر نظریاتی تعصب، زہرناکی اور شدت غالب آگئی۔ اس بحث سے یہ نتیجہ اخذ کرنا درست ہے کہ حلقہ اربابِ ذوق نے تنقید کے صحت مند انداز کو اُبھارنے میں قابلِ قدر خدمات سرانجام دی ہیں اور اُردو ادب کے ارتقا کی رفتار کو تیز تر کرنے میں اس کی خدمات کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں۔

(زیر ترتیب کتاب "حلقہ اربابِ ذوق۔ تحریک اور ادب" کا ایک باب)

اقبال اور امام ربّانیؒ

پروفیسر ملک حسن اختر

ابوالبرکات امام ربانی[1] شیخ احمد مجدد الف ثانی ہندوستان کے بزرگانِ دین اور مفکرینِ اسلام میں بلند مقام رکھتے ہیں۔ آپ نے اکبر اور جہانگیر کے زمانے میں تجدیدِ دین کا فریضہ سرانجام دیا اور ان جلیل القدر بادشاہوں کے رعب و جلال کی کوئی پرواہ نہ کی اسی وجہ سے آپ کو مجدد کا لقب دیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ ہر صدی میں ایک مجدد آتا ہے جو دین کی روشنی پھیلاتا ہے اور اسے آلودگیوں سے پاک کرتا ہے مگر ایک مجدد ہزار سال کے بعد آتا ہے اس کا مرتبہ صدی والے مجدد سے بلند ہوتا ہے۔ آپ کو مجدد الف ثانی اس لیے کہا جاتا ہے کہ آپ ہجری سن کے دوسرے ہزار کے مجدد تھے۔ حضرت مجددؒ نے خود فرمایا ہے کہ

"جاننا چاہیے کہ ہر سو سال کے بعد ایک مجدد گزرا ہے لیکن سو سال کا مجدد اور ہے اور ہزار سال کا مجدد اور ہے جس قدر سو اور ہزار کے درمیان فرق ہے اسی قدر بلکہ اس سے زیادہ دونوں مجددوں کے درمیان فرق ہے۔ اور مجدد وہ ہوتا ہے کہ جو فیض اس مدت میں امتوں کو پہنچتا ہے اس کے ذریعہ پہنچتا ہے خواہ اس وقت کے اقطاب اوتاد اور خواہ ابدال ہوں۔"[2] ص

اور وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ اس الف کے مجدد ہیں۔

"ان علوم و معارف کا صاحب اس الف کا مجدد ہے چنانچہ اس کے ان علوم و معارف میں خوذات و صفات اور افعال و احوال و مواجید اور تجلیات و ظہورات منطق میں نظر و غور کے علوم اور اولیاء کے معارف سے وراء الوراء ہیں ....."[3] ص

---

[1] آپ ۱۴ شوال ۹۷۱ھ / ۱۵۶۴ء میں سرہند شریف میں پیدا ہوئے۔ سرہند کسی زمانہ میں جنگل تھا اور اس میں شیر رہتے تھے۔ اسی مناسبت سے شہر کا نام سرہند رکھا گیا۔ فیروز شاہ تغلق نے اس شہر کی بنیاد اسی لئے رکھی تھی کہ انہیں کسی بزرگ نے بتایا تھا کہ رسول اکرمؐ کی ہجرت کے ہزار سال بعد یہاں ایک مجدد پیدا ہوگا۔ آپ سترہ برس کی عمر میں علوم متداولہ کی تکمیل کے بعد آگرہ تشریف لے گئے۔ خلافت حضرت شاہ کیتھلی قادری سے حاصل کی۔ والد کی وفات کے بعد دہلی تشریف لائے اور حضرت باقی باللہ (جو سلسلہ قادریہ کے ہندوستان میں بانی ہیں) کے مرید ہوئے۔ حضرت باقی باللہ فرماتے ہیں کہ شیخ احمد ایک آفتاب ہیں کہ ہم جیسے ہزاروں ستارے اس کی روشنی میں گم ہیں۔ حضرت مجدد الف ثانی ۲۸ صفر ۱۰۳۴ھ / ۱۶۲۴ء کو تریسٹھ برس کی عمر میں فوت ہوئے آپ کا مزار سرہند میں ہے۔ آپ کے ماننے والے اس وقت بھی ہندوستان، افغانستان، روس اور پاکستان میں موجود ہیں۔ آپ سے ایک نیا سلسلہ شروع ہوا جسے مجددیہ کہا جاتا ہے۔

[2] مکتوبات ربانی دفتر دوم ترجمہ حافظ عبدالکریم ناشر اللہ والے کی قومی دکان لاہور ۱۹۵۷ء ص ۲۱

[3] ایضاً ۱۹۵۷ء ص ۲۱

علامہ اقبال حضرت مجدد الف ثانی کے بڑے معتقد تھے۔ آپ نے حضرت کے مزار کی سرہند میں زیارت کی۔ اس کے متعلق سیّد نذیر نیازی کو لکھتے ہیں۔

"سرہند خوب جگہ ہے۔ مزار نے میرے دل پر بڑا اثر کیا ہے۔ بڑی پاکیزہ جگہ ہے۔ پانی اس کا سرد اور شیریں ہے۔"[1]

حضرت مجدد الف ثانی نے جب تبلیغ دین کا کام شروع کیا تو اکبر کے دینِ الٰہی کا غلغلہ تھا۔ آپ نے دینِ اکبر کے خلاف پرچار شروع کیا۔ جب جہانگیر بادشاہ بنا تو اس نے آپ کو اپنے دربار میں بلایا۔ آپ نے دربار کے قواعد کے مطابق تعظیمی سجدہ نہ کیا جس کی وجہ سے جہانگیر بڑا فروختہ ہوگیا اور آپ کو باغی قرار دے کر گوالیار کے قلعہ میں قید کر دیا۔ حضرت امام ربانی کو قید کرنے سے پیشتر جہانگیر نے امرائے دربار میں سے خانِ خاناں کو دکن، سیّد صدرِ جہاں کو مشرقی ممالک، خان جہان لودھی کو مالوہ اور مہابت خاں کو کابل کی صوبہ داری پر تعینات کر دیا کیونکہ یہ امراء حضرت مجدد کی بیعت میں آچکے تھے۔ جب ان امراء کو حضرت کے قید ہونے کی خبر ملی تو انہوں نے بغاوت کر دی۔ جہانگیر مہابت خان کی بغاوت کو کچلنے کے لئے روانہ ہوا مگر مہابت خاں نے جہانگیر، آصف خاں اور بعد میں نور جہاں کو بھی قیدی بنا لیا۔ اس پر حضرت امامِ ربانی نے امراء کو لکھا۔

"مجھے سلطنت کی ہوس نہیں اور میں تمہارے فتنہ و فساد کو پسند نہیں کرتا۔ میں نے قید و بند کی تکلیف اٹھائی تو وہ اور کام کے لئے ہے جب وہ کام پورا ہو جائے گا میں خود بخود تمہاری کوشش کے بغیر ہی قید سے رہا ہو جاؤں گا۔ یہ فساد میرے کام کے لئے رکاوٹ ہے۔ بہتر ہے کہ تم بغاوت سے باز آجاؤ اور فوراً اپنے بادشاہ کی اطاعت قبول کرو۔ میں انشاء اللہ جلد ہی قید سے آزاد ہو جاؤں گا۔"[2]

چنانچہ مہابت خاں نے یہ خط ملنے پر بادشاہ کو رہا کر دیا اور آدابِ شاہی بجا لایا۔ اس کے بعد جہانگیر آپ کا معتقد ہو گیا۔ بعد میں شاہجہان نے بھی آپ کی بیعت کر لی۔ علامہ اقبال کو امام ربانی کی یہ جرأت اور دلیری بہت پسند آئی اور انہوں نے اپنی نظم "پنجاب کے پیرزادوں سے"، (بالِ جبریل) میں انہیں یوں خراجِ عقیدت پیش کیا۔

حاضر ہوا میں شیخِ مجدد کی لحد پر	وہ خاک کہ ہے زیرِ فلک مطلعِ انوار
اس خاک کے ذرّوں سے ہیں شرمندہ ستارے	اس خاک میں پوشیدہ ہے وہ صاحبِ اسرار
گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے!	جس کے نفسِ گرم سے ہے گرمیٔ احرار
وہ ہند میں سرمایۂ ملّت کا نگہباں	اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار
کی عرض یہ میں نے کہ عطا فقر ہو مجھ کو	آنکھیں ہیں مری بینا و لیکن نہیں بیدار
آئی یہ صدا سلسلۂ فقر ہوا بند	ہیں اہلِ نظر کشورِ پنجاب سے بیزار
عارف کا ٹھکانہ نہیں وہ خطہ کہ جس میں	پیدا کلۂ فقر سے ہو طرۂ دستار

---

[1] مکتوباتِ اقبال مرتبہ سیّد نذیر نیازی ص ۱۶۲

[2] انوار اصفیا شائع کردہ شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور ۱۹۶۷ء ص ۴۶۵

باقی کلاہِ فقر سے تھا ولولۂ حق
طرّوں نے چڑھایا ہے نشۂ خدمتِ سرکار

علامہ اقبال نے اس نظم میں حضرتِ مجدّد کی مثال سے پنجاب کے پیرزادوں کو بیدار کرنے کی کوشش کی ہے اور انہیں حضرت کی طرح بادشاہوں کے سامنے نہ جھکنے کی تلقین کی ہے۔ وہ حضرت مجدّد سے خودی کی حفاظت کا سبق حاصل کرتے ہیں۔

علامہ اقبال نے ابنِ عربی کے فلسفۂ وحدت الوجود کی مخالفت کی تھی اور ان کی مخالفت کی بنیاد یہ تھی کہ یہ فلسفہ مسلمانوں میں بے عملی کو جنم دیتا ہے اور ایک بار انہوں نے فصوص الحکم کو الحاد و زندقہ سے بھرپور کہہ دیا تھا۔ حضرت مجدد الف ثانی بھی ابنِ عربی کے فلسفۂ وحدت الوجود کو دینی تعلیمات کے خلاف تصور کرتے ہیں۔ علامہ اقبال کے زمانے کے سیاسی اور سماجی حالات اس بات کے متقاضی تھے کہ وہ عمل اور جدوجہد کی تلقین کریں۔ انہوں نے وجودی فلسفے کو اس کے خلاف سمجھا تو اس کی مخالفت پہ کمربستہ ہو گئے۔ اگرچہ بعد میں وہ خود بھی اس نظریہ کے حامی بن گئے تھے کیونکہ اس نظریہ کو رَد کرنا آسان نہیں ہے اور اس سے فرار صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب اس کے متبادل دوسری دلیلیں اور دوسرا نظریہ پیش کر دیا جائے۔ حضرت مجدد الف ثانی کے زمانے میں وجودی فلسفہ کے پیروکار زیادہ مستعدی سے اس کے صرف ملحدانہ پہلو کو ابھار رہے تھے۔ اکبر نے دینِ الٰہی کا تصور پیش کیا تھا اور وہ اپنے دربار میں آنے والوں سے سجدہ کرواتا تھا۔ وجودی فلسفہ کے تحت یہ نظریہ اس طرح جائز قرار پا سکتا تھا کہ جب ہر چیز میں خدا ہے تو پھر یہ سجدہ غیر خدا کے سامنے نہ ہوا۔ ظاہر ہے کہ یہ وحدت الوجود کی بڑی سطحی تعبیر ہے مگر پھر بھی اکبر کو اس سے تقویت ملتی تھی چنانچہ حضرت مجدد کو ایسے پیچیدہ اور مشکل حالات سے دوچار ہونا پڑا چنانچہ وہ خود اپنے ایک خط میں توحیدِ وجودی کے پیروکاروں کی اس روش کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

"...... ان دقیق علوم کی تحریر کا باعث اور سبب یہ ہے کہ اس وقت کے بہت سے لوگ بعض تقلیداً، بعض علم کے باعث اور بعض علم اور قدرے ذوق کی بنا پر اور بعض الحاد اور زندقہ کے باعث اس توحیدِ وجودی کے دامن سے چمٹے ہوئے ہیں اور سب کو حق کی طرف سے بلکہ حق جانتے ہیں اور اپنی گردنوں کو تکلیفِ شرعی کی رسی سے اس بہانے کے ساتھ باہر نکال رہے ہیں اور احکام شرعیہ میں سستیوں کے مرتکب ہو رہے ہیں اور اس حالت پہ خوش وقت اور مسرور ہیں اور شرعی احکام کی بجا آوری کا اگر اعتراف بھی کرتے ہیں تو اسے طفیلی جانتے ہیں اور مقصودِ اصلی شریعت کے علاوہ کسی اور کو خیال کرتے ہیں۔" ص۱

مجدد صاحب کو ان لوگوں کی یہ بے راہروی اچھی نہیں لگی اور انہوں نے اس کا ذمہ دار ابنِ عربی کے نظریے وحدت الوجود کو قرار دیا لہٰذا وہ اس نظریہ کے منکر ہو گئے اور انہوں نے اپنا ایک نیا نظریہ وحدت الشہود کے نام سے پیش کیا۔ علامہ اقبال کو حضرت مجدد کا یہ انداز پسند آیا کہ انہوں نے مدتوں پرانے نظریہ کا تجزیہ بڑی بے باکی اور جرأت سے کیا۔ وہ اپنے خطبات میں رقم طراز ہیں:۔

"اس لحاظ سے دیکھیے تو نفسیاتِ حاضرہ نے مذہبی زندگی کا گویا قشر تک بھی نہیں چھوا۔ وہ اس تنوع اور گونا گونی سے بالکل بے خبر ہے جو مذہبی واردات اور مشاہدات میں پائی جاتی ہے لیکن جس کا تھوڑا بہت اندازہ شاید آپ سترہویں صدی کے ایک بہت بڑے مرشدِ کامل احمد سرہندی کی ایک عبارت سے کر سکیں گے۔ انہوں نے اپنے زمانے کے تصوف کا تجزیہ جس

ص۱ مکتوباتِ امام ربانی دفترِ اول حصہ دوم طبع اول ۱۹۷۱ء ترجمہ مولانا محمد سعید احمد ص ۱۶۹

بے باکی اور تنقید و تحقیق سے کیا اس سے سلوک و عرفان کا ایک نیا طریق وضع ہوا۔ ان سے پہلے جتنے بھی سلسلہ ہائے تصوف رائج ہوئے وہ یا تو وسطِ ایشیا یا سرزمینِ عرب سے آئے تھے مگر یہ صرف انہیں کا طریق ہے جس نے ہندوستان کے حدود سے نکل کر باہر کا رخ کیا اور جواب بھی پنجاب، افغانستان اور ایشیائی روس میں ایک بہت بڑی قوت ہے۔" ح۱

علامہ اقبال اور حضرت مجدد دونوں شروع میں ابن عربی کے معتقدین میں سے تھے اور دونوں کے والدین کو نظریۂ وحدت الوجود سے شغف تھا لہٰذا فصوص کی تعلیمات دونوں گھرانوں میں عام تھیں۔ حضرت مجدد الف ثانی خود اس کا اعتراف کرتے ہیں۔

"کم عمری کے زمانہ میں فقیر کا اعتقاد بھی توحیدِ وجودی کے مشرب جیسا تھا۔ فقیر کے والد صاحب قدس سرہٗ بھی بظاہر اسی مشرب پر تھے.... اسی طریقۂ عالیہ میں محنت کرنے کے بعد تھوڑی مدت کے بعد ہی توحیدِ وجودی منکشف ہوگئی اور اس کشف میں غلو پیدا ہوگیا۔ اس مقام کے علوم و معارف کثرت سے ظاہر فرمائے گئے اور اس مرتبے کی باریکیوں میں کوئی کم ہی باریکی ہوگی جو منکشف نہ کی گئی ہو..... شیخ محی الدین ابن عربی کے معارف کے دقائق پورے طور پر ظاہر کئے گئے اور تجلی ذاتی جسے صاحبِ فصوص نے بیان فرمایا ہے نہایت عروج اسی کو قرار دیا ہے اور اس تجلی کی شان میں فرماتے ہیں، اور اس کے بعد صرف عدم محض ہے، مجھے اس ذاتی تجلی سے بھی مشرف فرمایا اور ذاتی تجلی کے علوم و معارف جنہیں شیخ نے خاتم ولایت کے ساتھ مخصوص کیا ہے وہ تفصیل سے معلوم ہوئے..... یہ حال مدت تک رہا اور مہینوں سے سالوں تک پہنچ گیا، اچانک حضرت حق سبحانہٗ کی عنایت بے نہایت غیب کی کھڑکی سے ظہورِ میدان میں آئی اور بے چون و بے چگون کی روپوشی کے پردہ کو اٹھا دیا۔ علوم جو اتحاد اور وحدت الوجود کی خبر دیتے تھے، زائل ہونا شروع ہوگئے اور احاطہ اور ذاتِ حق کا قلبِ مومن میں سما جانا اور قرب و معیتِ ذاتی یہ سب کچھ جو اس مقام میں منکشف ہوئے تھے، پوشیدہ ہوگئے اور پورے یقین کے ساتھ معلوم ہوگیا کہ صانع عالم جل شانہ سے عالم کے ساتھ ان مذکورہ نسبتوں میں سے کوئی نسبت بھی ثابت نہیں" ح۲

مگر یہ بات حضرت مجدد الف ثانی کے لئے وجۂ اضطراب تھی کہ وہ ایک ایسا قدیم مسلک چھوڑ رہے ہیں جس پر بڑی بڑی بزرگ ہستیاں عامل رہی ہیں۔ ح۳

چنانچہ انہوں نے اس وجودی مسلک کو بھی بالکل غلط نہیں قرار دیا اور اسے صرف ایک منزل سمجھا اور یہ کہا کہ وحدت الوجود کی انتہا سُکر پر ہوتی ہے جبکہ وحدت الشہود میں صحو پر اور صحو سُکر سے بہتر ہے کیونکہ وہ شریعت کی طرف لوٹ آتا ہے۔ اسی لیے انہوں نے ابن عربی کے برخلاف نبوت کو ولایت پر ترجیح دی کیونکہ نبی صاحبِ شریعت ہوتا ہے اور ولی شریعت سے محروم ہوتا ہے۔ یہ دونوں حالتیں انہوں نے کشف سے ہی معلوم کیں اگرچہ ان کے نزدیک کشف ہمیشہ سچائی کا حامل نہیں ہوتا اور بقول اقبال غلط آہنگ بھی سرزد ہونے لگتا ہے۔ اس کے بھی ان کے نزدیک درجے ہیں اور ایک درجہ دوسرے سے برتر ہو سکتا ہے چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ "اس فقیر نے وحدت الوجود کو قبول کیا تھا تو وہ بھی

ح۱. تشکیل جدید الہیاتِ اسلامیہ ترجمہ نذیر نیازی ناشر بزم اقبال لاہور ۱۹۵۲ء ص ۲۹۸

ح۲. مکتوبات امام ربانی حصہ اول مرتبہ ... محمد سعید ناشر مدینہ پبلشنگ کمپنی کراچی ص ۱۱۰-۱۱۱

ح۳. ایضاً ص ۱۱۱

کشف کی بنا پر تھا تقلید کی بنا پر نہیں تھا۔ اب اگر اس کا انکار کر رہا ہوں تو وہ بھی الہام کے باعث اور الہام انکار کی گنجائش نہیں رکھتا اگرچہ دوسرے کے لیے حجت بھی نہیں ہے۔[۱] اس طرح انہوں نے ابنِ عربی کے کشف سے انکار نہیں کیا ہے مگر کشف کے ماننے کو ضروری قرار نہیں دیا۔ ابنِ عربی نے فصوص الحکم کے متعلق کہا تھا کہ یہ کتاب انہیں رسولِ اکرمؐ نے دی تھی کچھ ایسی ہی بات مجدد صاحب نے بھی اپنے ایک رسالے کے متعلق لکھی ہے:۔

"وہ رسالہ بعض دوستوں کی فرمائش پر میسر آیا ہے۔ ان دوستوں نے فرمائش کی تھی کہ فیض نصائح لکھو جو اس طریقہ میں نفع مند ثابت ہوں اور ان کے مطابق زندگی بسر کی جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ رسالۂ ہذا بے نظیر اور کثیر البرکات ہے۔ رسالہ ہٰذا کی تحریر کے بعد یوں معلوم ہوا کہ حضرت رسالت خاتمیت علیہ الصلوٰۃ والسلام اُمت کے مشائخ کی جماعت کثیرہ کے ساتھ تشریف فرما ہیں اور یہ رسالہ دست مبارک میں پکڑا ہوا ہے اور کمال کرم و مہربانی سے اسے بوسہ دے رہے ہیں اور مشائخ کو دکھا رہے ہیں کہ اس طرح کے عقائد رکھنے چاہیئں"۔[۲]

ابتدائی زمانے میں مجدد صاحب کا بھی ابنِ عربی کی طرح یہی خیال تھا کہ انسان اپنے آپ کو تلاش کرے تو خدا کو پا لیتا ہے اور خدا کو پائے تو اپنے آپ کو ہی پاتا ہے۔

"غرض یہ ہے کہ مدتِ دراز تک وہ مطلوبِ حقیقی کو تلاش کرتا رہا مگر اس کے باوجود اس نے اپنے آپ کو ہی پایا۔ اس کے بعد اسکا کام اس مقام کو پہنچا کہ اگر اس نے اپنی تلاش کی تو پھر بھی بجائے اپنے مطلوبِ حقیقی کو ہی پایا۔ اب اس کو گم کر چکا ہے اور اپنے آپ ہی کو پاتا ہے"۔[۳]

اور علامہ اقبال کے ان اشعار سے اس بات کی تائید ہوتی ہے۔

کجا جوئی چرا در پیچ و تابی   کہ او پیداست تو زیرِ نقابی
تلاشِ او کنی جز خود نیابی   تلاشِ خود کنی جز او نیابی

لیکن انہوں نے بعد میں یہ نظریہ بدل دیا جبکہ علامہ اقبال آخر تک اس نظریہ پر قائم رہے۔

جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ حضرت مجدد صاحب ابنِ عربی کے مسلک کو ناقص قرار دیتے ہیں مگر اسے کلی طور پر رد نہیں کرتے بلکہ بعض صوفیا کے اقوال کی تشریح اس طرح کرتے ہیں کہ وہ ان کے مسلک کے مطابق ہو جائیں یا پھر انہیں حالتِ سُکر کی پیداوار قرار دیتے ہیں اور سُکر کی پیروی کو وہ ضروری نہیں سمجھتے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"پس بعض مشائخ کے اقوال جو بظاہر شریعتِ حقہ کے مخالف معلوم ہوتے ہیں اور بعض لوگ انہیں توحیدِ وجودی پر محمول کرتے ہیں جیسے ابنِ منصور الحلاج کا قول انا الحق اور ابو یزید بسطامی کا سبحانی کہنا اور اسی طرح کے اور اقوال۔ اولیٰ اور انسب

۱۔ مکتوباتِ امام ربانی دفترِ اول حصہ اول ترجمہ مولوی محمد سعید احمد ص ۱۱۴

۲۔ ایضاً ص ۷۶

۳۔ مکتوباتِ امام ربانی دفترِ اول حصہ اول ترجمہ مولانا محمد سعید ناشر مدینہ پبلشنگ کمپنی بندر روڈ کراچی طبع اول ۱۹۷۰ء ص ۴۲، (مکتوبات نمبر ۱۵)

یہ ہے کہ انہیں توحیدِ شہودی پر محمول کیا جائے اور عقل و شرع کے ساتھ مخالفت کو دور کیا جائے چونکہ غلبۂ حال میں ماسوائے حق سبحانہ کے ہر شے ان کی نظر سے پوشیدہ تھی تو ایسے الفاظ ان سے صادر ہو گئے اور انہوں نے حق سبحانہ کے سوا کسی شے کو ثابت اور موجود نہ مانا۔ انا الحق کا معنی ہے "حق ہے میں نہیں ہوں" جبکہ وہ اپنے آپ میں بھی نہیں دیکھتے تو اپنے آپ کو ثابت نہیں کرتے۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ یہ بزرگ اپنے آپ کو دیکھتا ہے اور خود آپ کو حق کہتا ہے۔ یہ مفہوم صریح کفر ہے" ص۱

یہاں امام ربانیؒ نے انا الحق کا مفہوم سُکر کے لحاظ سے کیا ہے یعنی سُکر کی حالت میں منصور کو اپنی ذات کا احساس نہ ہوا اور اسے ہر طرف خدا ہی کا جلوہ نظر آیا حالانکہ اس کی اپنی ذات موجود تھی مگر علامہ اقبال نے اس کی تشریح صحو کے لحاظ سے کی ہے اور اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ منصور کہہ رہا تھا کہ میرا وجود حق ہے یعنی یہ ایک حقیقت ہے اور اسے فنا نہیں کیا جا سکتا۔ وہ اپنے ایک خطبہ میں رقم طراز ہیں:

"عالمِ اسلام نے جب بھی آنحضرت صلعم کے اس ارشاد کے مطابق کہ انسان اپنے اندر اخلاقِ الٰہیہ پیدا کرے۔ مذہبی مشاہدات اور واردات کی طرف قدم بڑھایا ہے تو جیسا کہ مطالعے سے پتہ چلتا ہے اس تقرب و اتصال کی ترجمانی کچھ اسی قسم کے اقوال میں ہوئی مثلاً انا الحق یا انا الامر میں ہوں قرآنِ ناطق (علیؓ) ما اعظم شانی (بایزیدؒ)[۲] لہٰذا اسلامی تصوف کے اعلیٰ مراتب میں اتحاد و تقرب سے یہ مقصود نہیں تھا کہ متناہی خودی لامتناہی خودی میں جذب ہو کر اپنی ہستی فنا کر دے بلکہ یہ کہ لامتناہی متناہی کے آغوشِ محبت میں آ جاتی ہے۔ مولانا روم نے کیا خوب کہا ہے۔

علمِ حق در علمِ صوفی گم شود
ایں سخن کے باورِ مردم شود" ص۳

یہ جو علامہ اقبال نے کہا ہے کہ لامتناہی خودی متناہی کے آغوشِ محبت میں آ جاتی ہے تو اس سے ابنِ عربی تو اتفاق کر سکتے ہیں مگر مجدد صاحب کو اتفاق نہیں ہو سکتا کیونکہ مجدد صاحب کا عقیدہ ہے کہ خدا کی ذات بے مثال ہے اور انسان کے اندر وہ سما نہیں سکتی اور نہ انسان اس کی صفات کو حاصل کر سکتا ہے۔ انسان جب انتہائی کمال حاصل کر لیتا ہے تو اس وقت بھی وہ بقول حضرت مجدد الف ثانیؒ "بندہ اس مقام پر پہنچ کر اپنے مولیٰ سے ساتھ کچھ مناسبت نہیں پاتا۔ سوائے اس کے کہ وہ اپنے آپ کو اس کا محتاج پاتا ہے اور واجب تعالیٰ تقدس کی جانب سے ذات اور صفت کے لحاظ سے مکمل استغنا ہوتا ہے۔ یہ بات بھی نہیں ہوتی کہ اپنی ذات کی اس سبحانہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ اور اپنی صفات کی اس ذات عز سلطانہ کی صفات کے ساتھ، اپنے افعال کی اس حق سبحانہ کے افعال کے ساتھ کسی وجہ کی مناسبت محسوس کرتا ہے"۔ ص۴

مگر علامہ اقبال یہ کہتے ہیں کہ جب انسان ترقی کے انتہائی مراحل طے کر لیتا ہے تو وہ اپنے اندر خدا کی صفات پیدا کر لیتا ہے۔ وہ کہتے ہیں

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں کار کشا کار ساز

ص۱ مکتوباتِ امام ربانی دفتر اوّل حصہ دوم ترجمہ مولانا محمد سعید احمد ص ۱۲۷
ص۲ پورا قول ہے سبحانی ما اعظم شانی
ص۳ تشکیل جدید الٰہیاتِ اسلامیہ ترجمہ نذیر نیازی ص ۱۲۶
ص۴ مکتوباتِ امام ربانی دفتر اوّل حصہ اوّل ترجمہ مولانا سعید احمد ص ۱۰۸

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

البتہ مقامِ بندگی کے حصول میں علامہ اور مجدد صاحب کے نظریات میں اتفاق ہے اور دونوں بندہ ہونے کو بڑی اہمیت دیتے ہیں مجدد صاحب فرماتے ہیں۔

" پیدائشِ انسانی سے مقصود وظائفِ بندگی کا ادا کرنا ہے اور اگر ابتدا اور درمیانِ راہ میں عشق و محبت عطا کر دیا گیا ہے تو اس کا مقصود یہ ہے کہ بندہ جناب قدس جل سلطانہ کے ماسوا سے ہر طرح کا تعلق قطع کر لے۔ عشق و محبت بھی مقاصد سے نہیں ہیں بلکہ عبدیت کے مقام کے حصول کے لئے ہیں۔ انسان خدا تعالیٰ کا بندہ کہلانے کا اس وقت مستحق ہوتا ہے جب غرض کی بندگی و گرفتاری سے پوری طرح نجات پا جائے اور عشق و محبت کی حیثیت قطعِ تعلقاتِ ماسوا سے زیادہ نہیں لہٰذا مراتبِ ولایت کی انتہا مقامِ عبدیت ہے۔ ولایت کے درجات میں مقامِ عبدیت سے اوپر کوئی مقام نہیں۔" ص۱

علامہ اقبال نے بھی عشق و محبت کو انسان کی خودی کے بلند کرنے کا سبب قرار دیا ہے یعنی عشق و محبت مقامِ عبودیت پر پہنچانے کا ایک وسیلہ ہے کیونکہ مقامِ عبدیت بہت بلند مقام ہے اور بقول اقبال :-

مقامِ بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی

رسولِ اکرمؐ بھی حضرت مجدد کے الفاظ میں انسان تھے مگر وہ انسانیت کے بلند مقام پر فائز تھے کیونکہ انہوں نے مقامِ عبودیت کو پا لیا تھا۔ بقول مجدد صاحب "محمد صلی اللہ علیہ علیہ وسلم بندے ہیں اور محدود و متناہی ہیں اور اللہ تعالیٰ تقدس غیر محدود و غیر متناہی ہے"۔ ص۲

رسولِ اکرمؐ عام انسانوں کی طرح نہ تھے۔ انہوں نے عبدیت کا مقام حاصل کر لیا تھا بلکہ اس سے بھی آگے وہ نبوت کی روشنی سے منور تھے۔ علامہ اقبال نے حلاج کی زبان سے عبد اور عبدہٗ کی تشریح یوں کی ہے۔

پیشِ او گیتی جبیں فرسودہ است   خویش را خود عبدہٗ فرمودہ است
عبدہٗ از فہمِ تو بالاتر است   زانکہ او ہم آدم و ہم جوہر است
جوہرِ او نے عرب نے عجم است   آدم است و ہم ز آدم اقدم است
عبدہٗ صورت گرِ تقدیر ھا   اندرو ویرانہ ہا تعمید ھا
عبدہٗ ہم جانفزا ہم جانستاں   عبدہٗ ہم شیشہ ہم سنگِ گراں
عبد دیگر عبدہٗ چیزے دگر   ما سراپا انتظار او منتظر
عبدہٗ دہر است و دہر از عبدہٗ ست   ما ہمہ رنگیم او بے رنگ و بوست
عبدہٗ با ابتدا بے انتہا ست   عبدہٗ را صبح و شام ما کجاست

ص۱ مکتوباتِ امام ربانی دفتر اول حصہ اول ترجمہ مولانا محمد سعید احمد ص ۱۰۷-۸
ص۲ مکتوباتِ امام ربانی دفتر اول حصہ دوم ترجمہ مولانا محمد سعید احمد ص ۲۶۸

کس ز سرِ عبدہٗ آگاہ نیست — عبدہٗ جز سِرّ الا اللہ نیست
لا الٰہ تیغ و دمِ او عبدہٗ — فاش تر خواہی بگو ہو عبدہٗ
عبدہٗ چند و چگونِ کائنات — عبدہٗ رازِ درونِ کائنات

ان اشعار میں عبد سے عام انسان اور عبدہٗ سے رسولِ اکرمؐ کی ذات مراد ہے۔ یہاں بھی علامہ مجدّد صاحب کی نسبت ابنِ عربی کی طرف جھک گئے ہیں بہرحال آئیے اب دیکھیں کہ حضرت مجدد الف ثانی اور ابنِ عربی کے نظریات میں کیا فرق ہے کیونکہ جب تک وحدت الشہود اور وحدت الوجود کی اصطلاحوں کا مطلب واضح نہ ہو بات سمجھ میں نہ آئے گی۔ حضرت مجدد الف ثانی نے ایک خط میں توحیدِ وجودی اور توحیدِ شہودی کا فرق اس طرح بیان کیا ہے:

"وہ توحید جو اس بلند گروہِ صوفیا کو راہِ سلوک دفتر میں میسر آتی ہے وہ دو قسم کی ہے۔ توحیدِ وجودی اور توحیدِ شہودی۔ توحیدِ شہودی ایک ذات کو دیکھنا ہے یعنی سالک کا مشہود صرف ایک ہی ذات ہو اور توحیدِ وجودی ایک ذات کو موجود جاننا ہے اور اس کے غیر کو معدوم خیال کرنا اور معدوم خیال کرنے کے باوجود کائنات کے آئینوں اور مظاہر کو ایک جاننا۔ پس توحیدِ وجودی علم الیقین کے قبیل سے ہے اور توحیدِ شہودی عین الیقین کی قسم سے ہے۔" ص۱

انہوں نے توحیدِ وجودی اور توحیدِ شہودی کو ایک مثال سے واضح کیا ہے وہ کہتے ہیں:

"مثلاً ایک شخص کو وجودِ آفتاب کا یقین ہو، اس یقین کا غلبہ اس کو مستلزم نہیں کہ ستاروں کو اس وقت منتفی اور معدوم جانے لیکن جب آفتاب کو دیکھا تو ستاروں کو نہیں دیکھے گا اور اس کے مشاہدہ میں صرف ایک آفتاب ہی ہو گا لیکن اس وقت کہ ستاروں کو نہیں دیکھ رہا یہ ضرور جانتا ہے کہ ستارے معدوم نہیں ہیں بلکہ یہ جانتا ہے کہ موجود تو ہیں مگر پوشیدہ ہیں اور نورِ آفتاب کے پرتو کے آگے مغلوب ہیں۔ یہ شخص اس جماعت کے ساتھ جو اس وقت کے ستاروں کے وجود کی نفی کر رہی ہے، مقامِ انکار میں ہے اور جانتا ہے کہ ستاروں کے وجود کی نفی کرنا ایک غیر واقعی بات ہے تو توحیدِ وجودی جو ایک ذاتِ تعالیٰ و تقدس کے ماسوا کی نفی پر مبنی ہے عقل و شرع کے خلاف ہے بخلاف توحیدِ شہودی کے ایک ذات دیکھنے میں کچھ مخالفت نہیں۔ مثال کے طور پر طلوعِ آفتاب کے وقت ستاروں کی نفی کرنا اور معدوم جاننا خلافِ واقعہ ہے لیکن ستاروں کو اس وقت نہ دیکھنے میں کچھ مخالفت نہیں بلکہ ستاروں کو نہ دیکھنا نورِ آفتاب کے غلبہ کے واسطہ سے دیکھنے والے کے ضعفِ بصارت کی بنا پر ہے۔ اگر دیکھنے والے کی آنکھ اسی آفتاب کے نور سے سرگیں ہو جائے اور اپنے اندر قوت اور استعداد پیدا کرے تو عین اسی وقت ستاروں کو بھی آفتاب سے جدا دیکھے گی اور یہ یقین حق الیقین کے مرتبہ پر ہے۔" ص۲

علامہ اقبال حضرت مجدد الف ثانی کے اس نظریہ سے اتفاق کرتے ہیں کہ انسان کی آخری منزل یہ ہے کہ وہ آفتاب کے سامنے اپنے وجود کو قائم رکھ سکے اور اپنے اندر آفتاب کے نور کو اس طرح پیدا کرے کہ ستاروں کا وجود اسے نظر آنے لگے۔ علامہ بھی چاہتے ہیں کہ انسان اپنے آپ

ص۱ مکتوباتِ امامِ ربانی دفترِ اوّل حصہ دوم ترجمہ مولانا محمد سعید احمد ص ۱۲۶
ص۲ مکتوباتِ امامِ ربانی دفترِ اوّل حصہ دوم ترجمہ مولانا محمد سعید احمد ص ۱۲۷

کو ختم نہ کر دے اور نہ کسی ذات میں خواہ وہ کتنی ہی برتر کیوں نہ ہو اپنے آپ کو ضم کرے جیسا کہ بعض صوفیا نے کہا ہے کہ انسان قطرہ ہے اور وہ سمندر یعنی خدا میں مل کر سمندر بن جاتا ہے مگر وہ اپنی ہستی کو فنا کر دیتا ہے اور یہ بات علامہ اقبال کو پسند نہیں ہے۔ وہ اپنے چھٹے خطبے "کیا مذہب کا امکان ہے" میں مجدد صاحب کی تعریف اسی لئے کرتے ہیں کہ انہوں نے انا الحق کی بجائے انا الموجود کہا تھا۔ انہوں نے جاوید نامہ میں بھی ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا ہے:

پیشِ این نور ار بمانی استوار — حی و قائم چون خدا خود را شمار
بر مقامِ خود رسیدن زندگی ست — ذات را بے پردہ دیدن زندگی ست
مردِ مومن در نسازد با صفات — مصطفیٰؐ راضی نشد الاّ صفات
چیست معراج آرزوئے شاہدے — امتحانے روبروئے شاہدے
در حضورش کس نماند استوار — ور بماند ہست او کامل عیار
ذرہ از کف مدہ تابے کہ ہست — پختہ گیر اندر گرہ تابے کہ ہست
تابِ خود را بر فزودن خوشتر است — پیشِ خورشید آزمودن خوشتر است
پیکرِ فرسودہ را دیگر تراش — امتحانِ خویش کن موجود باش
این چنین موجود محمود است و بس — ورنہ نارِ زندگی دود است و بس

ان اشعار میں علامہ اقبال نے رسولِ اکرمؐ کے واقعۂ معراج کی طرف اشارہ کیا ہے کہ جس طرح وہ اللہ کے سامنے اپنے وجود کو برقرار رکھ سکے ایسے ہی ہمیں بھی رکھنا چاہیے۔ انہوں نے بھی حضرت مجددؒ کی طرح سورج کی مثال دی ہے کہ سورج کے سامنے اپنے وجود کو برقرار رکھنا ہی زندگی ہے۔ اگر اس امتحان میں کامیاب ہو گئے تو انسانِ کامل کے مرتبہ پر فائز ہو گئے۔ دراصل علامہ اقبال تخلیقِ کائنات کے سلسلے میں ابن عربی سے متفق ہیں تو انسان کی ترقی کے مراحل کے سلسلے میں مجدد صاحب کا ساتھ دیتے ہیں۔ وہ حضرتِ مجددؒ کے اس لئے بھی قائل ہیں کہ وہ چیزوں کو معروضی نظر سے دیکھتے ہیں اور صوفیانہ تجربوں کو بھی پرکھنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ وہ ان کی اس صفت کو سراہتے ہوئے رقم طراز ہیں

"کچھ ایسے ہی تزکیکا، جیسا کہ اس جلیل القدر صوفی کے ارشادات سے، جن کو ہم نے ابھی پیش کیا تھا، ظاہر ہوتا ہے۔ وہ شخص بھی آرزومند ہے جس کو نفسیاتِ مذہبی سے عملی دلچسپی ہے۔ اس کی حسِ معروضیت ایسی ہی تیز ہے جیسی سائنسدان کی اپنے حلقہ معروضیت میں۔ وہ بھی ایک مشاہدے کے بعد دوسرے مشاہدے میں قدم رکھتا ہے، اس کی حیثیت بھی تماشائی کی نہیں بلکہ ایک ناقد اور مبصر کی ہے۔ وہ بھی اپنے دائرۂ تحقیق کے پیشِ نظر جن طریقوں سے کام لیتا ہے ان کے اصول و قواعد کے مطابق محسوسات و مدرکات کی چھان بین کرتا اور ہر ایسے عنصر کو خواہ وہ عضویاتی ہو یا نفسیاتی مگر جس کی نوعیت داخلی ہے ان کے مشمول سے خارج کر دیتا ہے کیونکہ اس کی آرزو بھی یہی ہے کہ اس حقیقت تک پہنچے جس کی حیثیت فی الواقع معروضی ہے۔ یوں بالآخر وہ اپنا گزر جس تجربے اور واردات سے کرتا ہے اس سے زندگی کا ایک نیا عمل شروع ہوتا ہے، اصلی، اساسی و ابداعی..... یہاں کوئی خطرہ ہے تو یہ کہ اس آخری تجربے سے پہلے سالکِ راہ کو جو مشاہدات ہوتے ہیں، ان سے لطف اندوزی یا انہماک و استغراق میں وہ کہیں اپنی تلاش اور جستجو کا عمل ترک نہ کر دے۔ مشرقی تصوف کی تاریخ سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ

خطرو بے بنیاد نہیں چنانچہ ہم نے جس ہندی بزرگ کے ارشادات کا حوالہ دیا ہے۔ ان کی تحریکِ اصلاح میں بھی یہی نکتہ مضمر تھا اور اس کے وجوہ بھی ظاہر ہیں۔ خودی کا نصب العین یہ نہیں کہ کچھ دیکھے بلکہ یہ کہ کچھ بن جائے۔ یہ درحقیقت کچھ بن سکنے ہی کی کوشش ہے جس سے بالآخر اسے موقعہ ملتا ہے کہ اپنی معروضیت کا زیادہ گہرا ادراک پیدا کرتے ہوئے عمیق اور مستحکم بنا پر انا الموجود کہہ سکے یعنی اپنے وجود کی کنہ اور اساس کو پا لے۔"[۱]

حضرت مجدد نے اپنے مذکورہ بیان میں توحیدِ وجودی کو سُکر قرار دیا ہے جبکہ توحیدِ شہودی کو صحو کہا ہے۔ دراصل ابنِ عربی نے جس مقام کو مقامِ ولایت کہا ہے اس کو مجدد صاحب صرف ایک منزل قرار دیتے ہیں۔ ابنِ عربی کے نزدیک ولایت نبوت سے افضل ہے کیونکہ ولایت کا رُخ خدا تعالیٰ کی طرف ہے اور نبوت کا مخلوق کی طرف۔ وہ نبی کو بھی سب سے اعلیٰ اس لئے سمجھتے ہیں کہ وہ ولایت میں اعلیٰ ترین مقام رکھتا ہے مگر حضرت مجدد الف ثانی نبوت کو ولایت سے اعلیٰ قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک ولایت سُکر ہے اور نبوت صحو ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"اور بعض نے اس جملے کی یوں توجیہہ کی ہے کہ نبی کی ولایت اس کی نبوت سے افضل ہے لیکن اس فقیر کے نزدیک اس طرح کی باتیں دور از کار ہیں کیونکہ نبوت میں رُخ صرف مخلوق کی طرف نہیں بلکہ مخلوق کی طرف توجہ کے باوجود حق تعالیٰ کی طرف توجہ موجود رہتی ہے۔ نبی کا باطن خدا تعالیٰ کے ساتھ ہوتا ہے اور ظاہر مخلوق کے ساتھ اور جس کی کل توجہ مخلوق کی طرف ہی ہو اور خالق سے بالکل غیر متعلق ہو ایسا شخص بدقسمت ہوتا ہے۔ انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات تمام موجودات سے افضل ہیں لہٰذا بہترین دولت و نعمت بھی انہی کا حصہ ہے۔ ولایت نبوت کا جُز ہے اور نبوت کُل ہے لہٰذا نبوت ہی افضل ہے خواہ نبی کی ولایت ہو یا ولی کی ولایت تو ثابت ہوا کہ صحو سُکر سے افضل ہے کیونکہ سُکر صحو میں مندرج ہے جس طرح نبوت ولایت میں مندرج ہے۔ وہ صحو یا ہوش جو عوام الناس کو حاصل ہے وہ خارج از بحث ہے اس صحو پر سُکر کو ترجیح دینا بے معنی امر ہے لیکن وہ صحو جو سُکر کو متضمن ہے البتہ سُکر سے افضل ہے۔

علوم شرعیہ کا مصدر و منبع مرتبۂ نبوت ہے جو سراسر صحو ہے اور علوم شرعیہ کے مخالف جو کچھ ہے سُکر سے ہے۔ صاحبِ سُکر معذور ہوتا ہے۔ تقلید کے لائق صحو کے علوم ہیں۔ سُکر کے علوم تقلید کے لائق نہیں ہیں۔"[۲]

یہاں مجدد صاحب کا خیال درست ہے کہ نبی ولی سے افضل ہے خود ابنِ عربی بھی یہ بات مانتے ہیں کہ "خاتم الاولیاء بھی حکم میں ان اُمور کے تابع ہیں جو تشریع کا خاتم رُسل لایا ہے"[۳]۔ چنانچہ اگر ولی نبی کے احکام کا پابند ہے تو یقیناً نبی ولی سے افضل ہے مگر مجدد صاحب کے بیان سے کئی اُلجھنیں بھی پیدا ہوتی ہیں انہوں نے توحیدِ وجودی کو صرف ایک منزل قرار دیا ہے اور کہا کہ سُکر کی حالت میں صوفی کو سوائے خدا کے کچھ نظر نہیں آتا۔ مگر بات صرف کشف اور منازلِ سلوک کی ہی نہیں ہے بلکہ توحیدِ وجودی کی بنیاد ابنِ عربی کے منطقی اور فلسفیانہ افکار ہیں۔ ابنِ عربی نے وحدت الوجود کو ثابت کرنے کے لئے کائنات کی تخلیق پر غور کیا تھا اور ان کے پیشِ نظر یہ سوال تھا کہ یہ کائنات، انسان اور خدا کیا ہیں اور ان کا آپس میں کیا تعلق ہے؟

---

[۱] تشکیل جدید الٰہیاتِ اسلامیہ ترجمہ سید نذیر نیازی ص ۲۰۶ - ۲۰۵

[۲] مکتوباتِ امام ربانی دفتر اوّل حصہ دوم ترجمہ مولانا محمد سعید احمد ص ۲۶۹ - ۲۶۸

[۳] فصوص الحکم ترجمہ حافظ محمد برکت اللہ ناشر اقبال پبلشرز کراچی ص ۱۸۱ - ۱۸۰

ان سوالات کا جواب تلاش کرتے ہوئے وہ توحیدِ وجودی تک پہنچے تھے۔ جب امام صاحب نے توحیدِ شہودی کا فلسفہ پیش کیا تو وہ بھی صرف اس حد تک جا سکتا تھا کہ توحیدِ وجودی میں غیرِ خدا معدوم ہے مگر توحیدِ شہودی میں سالک خدا کے ساتھ غیرِ خدا کو بھی موجود مانتا ہے۔ لا محالہ انہیں بھی کائنات، انسان اور خدا کے تعلق کو زیرِ بحث لانا پڑا۔

ابنِ عربی نے کہا تھا کہ یہ کائنات خدا کی ذات کا مظہر ہے یا یہ اس کا ظل ہے اور اس میں خدا کی ذات کی نشانیاں ہیں۔ اشیاء اس کے مختلف اسماء و صفات کی مظہر ہیں چنانچہ ان کے خیال میں "وہ اشیاء کا عین ہے اور محدود ہے اگرچہ اس کے حدود مختلف ہوں چنانچہ وہ ہر محدود کی حد سے محدود ہے اور جب کسی چیز کی حد ہوتی ہے تو وہ حق تعالیٰ ہی کی حد ہوتی ہے اور وہی مخلوقاتِ زمانی میں ساری ہے اگر یہ امر نہ ہوتا تو کسی موجود کا وجود صحیح نہ ہوتا اور وہی موجود ہے اور وہ ہر شے پر بذاتہٖ محافظ ہے اور اس کو شے کی محافظت تھکاتی نہیں ہے پس اس کو کل اشیاء کی حفاظت کرنی عین اپنی صورت کی حفاظت ہے اور وہ اس سے پاک ہے اور بلند تر ہے کہ کوئی اس کی صورت کا غیر ہو اور سوا اس کے دوسری صورت صحیح نہیں ہے پس شاہد سے شاہد وہی ہے اور مشہود سے مشہود وہی ہے اور تمام عالم اس کی صورت ہے اور حق تعالیٰ تمام عالم کی روح ہے اور وہی عالم کا مدبر ہے اور عالم ہی انسانِ کبیر ہے جس کا حق تعالیٰ روح ہے" [۱]

دراصل ابنِ عربی کا خیال یہ ہے کہ تمام چیزوں سے خدا ہی کی ذات قدیم ہے اور کوئی چیز بھی اس سے قدیم نہیں ہے اور جب کچھ نہ تھا تو وہی تھا اور اسی سے یہ سارا عالم وجود میں آیا ہے۔ مجدد صاحب بھی اللہ کے قدیم ہونے کے قائل ہیں چنانچہ فرماتے ہیں۔

"حق تعالیٰ کے سوا کسی کے لئے قدم نہیں یعنی ہمیشگی نہیں اور نہ ہی اس کے سوا کوئی چیز قدیم ہو سکتی ہے۔" [۲]

مگر مجدد صاحب یہ کہتے ہیں کہ وہ اشیاء کا عین نہیں ہے بلکہ اس کی ہر صفت کا ایک عدم ہے یا نقیض ہے مثلاً علم کا عدم علم کا نہ ہونا یا جہالت ہے اور خیر کا عدم شر ہے اللہ نے جب کائنات کو پیدا کیا تو عدم کے ساتھ اپنی صفات کے ظل کو ملا دیا اور یوں کائنات وجود میں آگئی یعنی خیر سے شر کو اور علم سے جہالت کو ملا دیا لہٰذا تمام برائیاں عدم سے تعلق رکھتی ہیں اور تمام خیر خدا سے۔ "جس طرح وجود ہر خیر و کمال کا مبداء اور ہر حسن و جمال کا منشاء ہے اسی طرح عدم جو اس کے مقابل ہے بے شک ہر شر و نقص کا مبداء، ہر قبیح و وبال کا منشا ہوگا۔ اگر وبال ہے وہ بھی اس سے پیدا ہے اور اگر گمراہی ہے وہ بھی اس سے ظاہر ہے..... ابلیس لعین جو ہر فساد و گمراہی کا مبداء ہے عدم سے بھی زیادہ شریر ہے اور وہ بدبخت ان ہنروں سے بھی جو عدم میں پائے جاتے ہیں بے نصیب ہے۔" [۳]

اس پر ایک بڑا اعتراض یہ وارد ہوتا ہے کہ عدم بھی اللہ کی طرح قدیم ہو جاتا ہے اگر اللہ خیر ہے تو ابلیس تمام تر شر ہے اور یہ شر خیر کے مقابلے میں موجود ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بات درست معلوم نہیں ہوتی۔ غالباً اس اعتراض کو رفع کرنے کے لئے انہوں نے کہا کہ عدم اللہ کی ذات کے مقابل نہیں ہے بلکہ اس کی صفات کا عدم ہے۔ وہ تحریر فرماتے ہیں:

"جاننا چاہیے کہ عالم سب کا سب حق تعالیٰ کے اسماء و صفات کا مظہر ہے اگر ممکن میں حیات ہے تو اسی واجب تعالیٰ کی حیات کا آئینہ ہے اور اگر علم ہے تو اسی کے علم کا آئینہ ہے اور اگر قدرت ہے تو اسی کی قدرت کا آئینہ ہے علیٰ ہذا القیاس لیکن اس کی ذات

---

[۱] فصوص الحکم ترجمہ حافظ محمد برکت اللہ ص ۲۵۸
[۲] مکتوباتِ امام ربانی دفتر سوم ترجمہ قاضی عالم الدین ص ۳۴
[۳] مکتوباتِ امام ربانی دفتر دوم از قاضی عالم الدین ص ۲۹۵-۹۶

کا عالم میں نہ کوئی آئینہ ہے نہ کوئی مظہر"[۱]

یہاں تک تو بات درست تھی مگر مجدد صاحب نے اللہ کی صفات کو بھی قدیم قرار دیا ہے اس طرح بات پھر اُلجھ گئی ہے کیونکہ یہ مان لیں تو پھر خدا کی طرح شر بھی قدیم قرار پائے گا۔ وہ اس اعتراض کو دُور کرنے کے لئے لکھتے ہیں۔

"علوم کی نقیض وہ وجود نہیں جو عین واجب تعالیٰ ہے یا حق تعالیٰ کی صفاتِ ذاتیہ میں سے اخص ہے بلکہ عدم کی نقیض اس وجود کے ظلال میں سے ایک ظل اور اس کے عکسوں میں سے ایک عکس ہے۔ غرض وہ وجود جس کے مقابلہ میں عدم ہے وہ دائرۂ امکان میں سے ہے اور عدم (جو اس کی نقیض ہے) کے رفع کرنے کی احتیاج رکھتا ہے۔ حق تعالیٰ کی صفات اگرچہ دائرۂ امکان سے خارج ہیں لیکن چونکہ حق تعالیٰ کی ذات کے ساتھ احتیاج رکھتی ہیں اور ہر ایک کے مقابل میں اعدام ثابت ہیں اس لئے امکان کی آمیزش سے خالی نہیں اور حق تعالیٰ کی ذات کی احتیاج ہمیشہ ان کے دامن گیر ہیں اگرچہ قدیم ہیں حق تعالیٰ کی ذات سے جدا نہیں ہیں لیکن نفسِ احتیاج امکان کی دلیل ہے اور غیر کی طرف احتیاج ہے تو کامل ناقص ہے۔"[۲]

یہ بیان خاصا اُلجھا ہوا ہے اور مسئلہ کو صاف نہیں کرتا کیونکہ اس میں "احتیاج" کے لفظ سے انسانِ کبیر اور خدا میں فرق پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے جیسا کہ ابنِ عربی نے بھی کیا تھا۔ یہاں خدا کے ظل کو عدم سے ملایا گیا ہے اور اس کے ذاتی وجود کو پاک رکھا گیا ہے۔ ابنِ عربی بھی وجوبِ ذاتی تک کسی کی رسائی کو نہیں مانتے اور اس کائنات کو ظلال ہی کی آمیزش قرار دیتے ہیں لیکن چونکہ یہ صفاتِ الٰہی کے ظلال ہیں اس لئے قدیم ہیں اور ہمیشہ رہیں گے لیکن مجدد صاحب ایک اور مقام پہ اپنے اور ابنِ عربی کے فلسفہ کے فرق کو بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"پس محی الدین کے نزدیک ممکنات کے حقائق وہ اسماء و صفات ہیں جو مرتبہ علم میں ایک دوسرے سے متمیز ہیں اور فقیر کے نزدیک ممکنات کے حقائق وہ عدمات ہیں جو اسماء و صفات کی نقیض ہیں مع اسماء و صفات کے عکسوں کے جو خانۂ علم میں ان عدمات میں ظاہر ہوئی ہیں اور ایک دوسرے سے باہم مل گئی ہیں۔ قادرِ مطلق جلّ شانہٗ نے جب چاہا کہ ان ماہیات ممتزجہ میں سے کسی ماہیت کو وجودِ ظلی کے ساتھ جو حضرت وجود کا پرتو ہے متصف کر کے موجود خارجی بنائے تو اس ماہیت ممتزجہ پہ حضرتِ وجود کا پرتو ڈال کر اس کو آثارِ خارجیہ کا مبدا بنایا۔ پس ممکن کا وجود علم و خارج میں اس کی باقی صفات کی طرح حضرتِ وجود اور اس کے کمالات کا تابع پرتو ہے مثلاً ممکن کا علم واجب الوجود کے علم کا پرتو اور ظل ہے جو اپنے مقابل میں منعکس ہوا ہے اور ممکن کی قدرت بھی ایک ظل ہے جو عجز میں اس کے مقابل ہے منعکس ہوتی ہے۔۔۔۔۔ لیکن فقیر کے نزدیک شے کا ظل شے کے عین نہیں ہے بلکہ اس کا شبح اور مثال ہے اور ایک کا دوسرے پر حمل کرنا ممتنع اور محال ہے پس فقیر کے نزدیک ممکن واجب کا عین نہ ہوگا اور ممکن کا واجب پر حمل کرنا ثابت نہیں ہوگا کیونکہ ممکن کی حقیقت عدم ہے اور وہ عکس جو اسماء و صفات سے اس عدم میں منعکس ہوا ہے وہ ان اسماء و صفات کا شبح اور مثال ہے نہ کہ ان کا عین۔ پس ہمہ اوست کہنا درست نہ ہوگا بلکہ ہمہ از اوست کہنا درست ہوگا۔۔۔۔۔ پس شیخ محی الدین کے نزدیک عالم سب کا سب اسماء و صفات سے مراد ہے جنہوں نے خانۂ علم میں تمیز پیدا کر کے ظاہر وجود کے آئینہ میں نمود

---

[۱] مکتوباتِ امامِ ربانی دفترِ دوم از قاضی عالم الدین ص ۳۴۱

[۲] مکتوباتِ امامِ ربانی دفترِ سوم ترجمہ قاضی عالم الدین ص ۵۲۔۱۵۱۔ ناشر اللہ والے کی قومی دکان لاہور

> نمائش حاصل کی ہے اور فقیر کے نزدیک عالم ان عدمات سے مراد ہے جن میں حق تعالیٰ کے اسماء و صفات خانۂ علم میں منعکس ہوئی ہیں اور وہ عدمات بمعہ ان عکسوں کے حق تعالیٰ کے ایجاد سے وجودِ ظلی کے ساتھ خارج میں موجود ہوئی ہیں پس عالم میں خُبثِ ذاتی اور شرارتِ جبلی ظاہر اور پیدا ہے اور سب خیر و کمال حق تعالیٰ کی طرف راجع ہے"۔ صدا

مجدد صاحب نے یہاں ہمہ اوست کے مقابلہ میں ہمہ از اوست کی ترکیب استعمال کر کے یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ اشیاء اللہ سے الگ وجود رکھتی ہیں اور وہ اس کی مخلوق ہیں مگر پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ عدم تو پہلے سے موجود ہے وہ کیسے مخلوق ہو گا چنانچہ علامہ اقبال یہاں ابن عربی کے زیادہ قریب ہیں کیونکہ وہ خدا کو لامتناہی خودی اور انسان کو متناہی خودی قرار دیتے ہیں۔ وہ خدا کو قرآن اور انسان کو سیپارہ سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مادہ ادنیٰ خودیوں کی ایک بستی ہے صدا انہوں نے مسلم لیگ کے خطبہ صدارت ۱۹۳۰ء میں فرمایا۔

> "مذہبِ اسلام کی رو سے خدا اور کائنات، کلیسا اور ریاست اور روح اور مادہ ایک ہی کل کے مختلف جز ہیں"۔ صد۳

مجدد صاحب اس دنیا کو وہم قرار دیتے ہیں جبکہ علامہ اقبال اسے حقیقت سمجھتے ہیں۔ مجدد صاحب کے خطوط سے جو اقتباس اوپر نقل ہوا ہے وہاں بھی عکس اور ظل کے الفاظ اس طرف اشارا کرتے ہیں مگر مندرجہ ذیل اقتباس میں وہ دنیا کو واضح طور پہ وہم قرار دے کر اس سے چھٹکارا پانے کی بات کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم موت کے بعد وہم کی دنیا سے نجات حاصل کر لیتے ہیں۔

> "پس معلوم ہوا کہ ولائت ظلی میں موت کے بعد جبکہ وہم معدوم ہو جاتے ہیں، وہم سے خلاصی حاصل ہو جاتی ہے لیکن ولائت اصل میں جو ولائت کبریٰ ہے اسی جہان میں وہم و خیال کی قید سے آزادی حاصل ہو جاتی ہے اور وہم کے باوجود وہم کی قید سے آزاد ہو جاتے ہیں۔ پہلے گروہ کو جو کچھ آخرت میں جا کر حاصل ہو گا۔ دوسرے گروہ کو اسی جگہ میسر ہوتا ہے۔ ولائتِ ظلی میں حصول مطلب اس جہان میں وہم و خیال کا بنایا ہوا اور ولائتِ اصلی میں مطلوب وہم کی تراش خراش سے منزہ اور مُبرا ہوتا ہے۔ شاید حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ وہم و خیال سے تنگ آکر موت کی آرزو کرتے ہیں تاکہ وہم و خیال سے خالی اپنے مطلوب کو پائیں"۔ صد۴

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ عالم وہم و خیال ہے تو پھر انسان بھی وہم و خیال ہے اور ایک وہم دوسرے وہم سے اس دنیا میں کیسے چھٹکارا پا سکتا ہے نیز مرنے کے بعد وہم و خیال سے نجات کیونکر ممکن ہے کیونکہ انسان خود وہم و خیال ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ مرنے کے بعد شر یا عدم ختم ہو جاتا ہے اور صرف ظلالِ الٰہی رہ جاتے ہیں تو پھر سزا اور جزا کا معاملہ کیا ہے اور مرنے کے بعد انسان واصلِ بحق سمجھا جائے تو پھر سزا اور جزا کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ حضرت مجدد صاحب اس اعتراض سے بچنے کے لئے فرماتے ہیں۔

> "انسان میں دو چیزیں ایسی ہیں جو عرش میں نہیں ہیں اور نہ ہی عالم کبیر کو ان کا کچھ حصہ ملا ہے۔ انسان میں ایک جز ارضی ہے جو عرش میں نہیں ہے اور دوسری ہیئتِ وحدانی ہے جو عالمِ کبیر میں نہیں اور وہ شعور جو ہیئتِ وحدانی سے تعلق رکھتا ہے نورٌ علیٰ نور

صدا مکتوبات امام ربانی مجدد الف ثانی دفتر دوم ترجمہ مولوی قاضی عالم الدین ناشر اللہ والے کی قومی دکان لاہور شعبان ۱۲۷۶ھ

صد۲ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ ترجمہ نذیر نیازی ص ۱۷۰

صد۳ بحوالہ نقدِ اقبال از میکش اکبر آبادی ناشر آئینۂ ادب لاہور ۱۹۷۰ء ص ۲۷

صد۴ مکتوباتِ امام ربانی دفتر دوم ترجمہ قاضی عالم الدین ص ۱۵

ہے جو عالمِ اصغر کے ساتھ مخصوص ہے۔ پس انسان ایک اعجوبہ ہے جس نے خلافت کی لیاقت پیدا کر لی ہے۔"[1]

چنانچہ معلوم ہوا کہ کائنات کی دیگر اشیاء انسان کی نسبت کسی اور طرح بنائی گئی ہیں وہ ظل کی پیداوار ہیں جبکہ انسان ظل نہیں بلکہ نور کی پیداوار ہے اسی لیے انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ انسان کے قلب کی "تجلی میں ظلیت کی آمیزش نہیں ہے"[2] مگر علامہ اقبال اس صورتِ حال کو قبول نہیں کرتے کیونکہ ان کے خیال میں انسان اور کائنات کی تخلیق ایک ہی چیز سے ہوتی ہے اور وہ خودی ہے اگرچہ انسان کی خودی کائنات کی خودی سے اعلیٰ درجہ کی ہے۔ علامہ کا ایک بیان ہم پہلے نقل کر چکے ہیں۔ اب یہاں ساقی نامہ سے زندگی کے متعلق اشعار کو درج کرتے ہیں جس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ہر چیز کی اصل ایک ہی ہے۔

دمادم رواں ہے یمِ زندگی — ہر اک شے سے پیدا رمِ زندگی
اسی سے ہے ہوتی بدن کی نمود — کہ شعلے میں پوشیدہ ہے موجِ دود
گراں گرچہ ہے صحبتِ آب و گل — خوش آئی اسے محنتِ آب و گل
یہ ثابت بھی ہے اور سیار بھی — عناصر کے پھندوں سے بیزار بھی
یہ وحدت ہے کثرت میں ہر دم اسیر — مگر ہر کہیں بے چگوں بے نظیر
یہ عالم یہ بت خانۂ شش جہات — اسی نے تراشا ہے یہ سومنات
پسند اس کو تکرار کی خو نہیں — کہ تو میں نہیں اور میں تو نہیں
من و تو سے ہے انجمن آفریں — مگر عینِ محفل میں خلوت نشیں
چمک اسکی بجلی میں تارے میں ہے — یہ چاندی میں سونے میں پارے میں ہے
اسی کے بیاباں اسی کے ببول — اس کے ہیں کانٹے اسی کے ہیں پھول
کہیں اس کی طاقت سے کہسار چور — کہیں اس کے پھندے میں جبریل و حور
کہیں جرّہ شاہینِ سیماب رنگ — لہو سے چکوروں کے آلودہ چنگ
کبوتر کہیں آشیانے سے دور — پھڑکتا ہوا جال میں ناصبور
فریبِ نظر ہے سکون و ثبات — تڑپتا ہے ہر ذرۂ کائنات
ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود ! — کہ ہر لحظہ ہے تازہ شانِ وجود
سفر زندگی کے لیے برگ و ساز — سفر ہے حقیقت حضر ہے مجاز

حضرت مجدد دنیا کو وہم اور شر کی پیداوار سمجھتے ہیں چنانچہ وہ اسے زہرِ قاتل اور بے کار سامان کہتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں :۔

"دنیا بظاہر شیریں اور صورت میں تر و تازہ دکھائی دیتی ہے لیکن حقیقت میں زہرِ قاتل اور بے کار سامان ہے اور اس میں

---

[1] مکتوباتِ امامِ ربانی دفتر دوم ترجمہ قاضی عالم الدین ص ۲۹

[2] ایضاً ص ۲۸

گرفتاری بے فائدہ بات ہے۔ دنیا کی نظر میں مقبول درحقیقت خوار ہے اور اس پر فریفتہ ہونے والا دیوانہ ہے۔ یہ سونا چڑھائی ہوئی نجاست کی طرح اور شکر ملے ہوئے زہر کی مانند ہے۔"[1]

مگر علامہ اقبال حضرت مجدد کے اس خیال سے متفق نہیں ہیں۔ ان کے نزدیک دنیا نہ تو وہم ہے اور نہ زہر قاتل اور بے کار سامان ہے۔ وہ اسے کارآمد چیز سمجھ کر اپنے قابو میں کرنا چاہتے ہیں چنانچہ اس کی تسخیر کا مشورہ دیتے ہیں۔ مجدد صاحب جسم کو دنیا کا حصہ سمجھتے ہیں اور اسے زہر قاتل قرار دیتے ہیں وہ لکھتے ہیں:

"دنیا کی لذت اور الم دو طرح کا ہے، روحانی اور جسمانی۔ ہر وہ چیز جس میں جسم کے لئے لذت ہے روح کے لئے اس میں تکلیف ہے جس سے بدن کو تکلیف پہنچے، روح کو اس سے لذت حاصل ہوتی ہے۔ روح اور جسم ایک دوسرے کی نقیض ہیں اور اس جہان میں روح جسم کے مقام میں نزول کر چکا ہے اور جسم و جسمانیات میں گرفتار ہو چکا ہے۔ جسم کے حکم میں ہو چکا ہے اور جسم کو تکلیف پہنچنے سے اس کو بھی تکلیف پہنچتی ہے۔"[2]

اور شاید اسی لئے مجدد صاحب نے جسم سے نجات حاصل کرنے کی بات کی تھی مگر علامہ اقبال جسم اور دنیا دونوں کو شر نہیں سمجھتے اور کہتے ہیں کہ بدن روح کے اعمال کا حاصل جمع ہے[3] لہٰذا وہ بدن کو فتح کر لینے کا مشورہ دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک بدن کا تعلق روح سے وہی ہے جو راکھ کا کوئلے سے ہے۔ وہ کوئلے ہی سے پیدا ہوتی ہے چنانچہ وہ جسم کو نظرانداز نہیں کرتے بلکہ اس کو قابو میں کر کے اس سے کام لینا چاہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگرچہ انہوں نے ان تمام گروہوں کی مذمت کی ہے جو برائی کی طرف لے جاتے ہیں مگر کہیں بھی دنیا کو شر کا مجموعہ نہیں قرار دیا اور نہ اس سے کنارہ کش ہونے کی تلقین کی ہے۔ دراصل مجدد صاحب کے زمانے میں ایک اسلامی حکومت موجود تھی لہٰذا مجدد صاحب کا کام صرف یہ تھا کہ وہ مسلمانوں کو دنیاوی لذتوں سے محفوظ رکھیں کہ کہیں وہ ان میں کھو کر کمزور نہ ہو جائیں۔ علامہ اقبال کے زمانے میں حکومت مسلمانوں سے چھن چکی تھی لہٰذا وہ بھی دنیا کی برائیوں سے مسلمانوں کو بچانا چاہتے تھے مگر دنیا کے کاموں میں ان کو الجھانا بھی چاہتے تھے یہی وجہ ہے کہ انہوں نے عمل اور حرکت پر بڑا زور دیا ہے تاکہ غیر ملکی طاقت کے پنجوں سے نجات حاصل کی جا سکے۔ اس طرح کے عمل کی مجدد صاحب کے زمانہ میں ضرورت نہ تھی چنانچہ جب چند امرا نے بغاوت کی تو انہوں نے انہیں ایسا کرنے سے منع کر دیا۔

چونکہ مجدد صاحب جسم اور روح کی دوئی کے قائل ہیں اس لئے وہ جسم کو تکلیف پہنچانے کے حق میں ہیں۔ ان کے خیال میں جو چیز روح کے لئے بہتر ہے وہ جسم کے لئے نقصان دہ ہے چنانچہ وہ جسم کو مصائب میں گرفتار کر کے روح کی جلا کا سامان مہیا کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

"مصائب میں اگرچہ بڑی تکلیف و ایذا برداشت کرنی پڑتی ہے لیکن ان میں بڑی کرامت اور مہربانی کی امید ہے۔ اس جہان کا بہتر اسباب حزن و اندوہ ہے اور اس دسترخوان کی خوشگوار نعمت الم اور مصیبت ہے۔ ان شکر پاروں پر دوائے تلخ کا رقیق غلاف چڑھا ہوا ہے۔"[4]

---

[1] مکتوبات امام ربانی دفتر اول حصہ دوم ترجمہ مولانا محمد سعید احمد ص ۱۸۴

[2] ایضاً ص ۲۰۸

[3] تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ ص ۱۵۹

[4] مکتوبات امام ربانی دفتر دوم ترجمہ قاضی عالم الدین ص ۷۵

علامہ اقبال بھی درد و الم کو پسند کرتے ہیں اور اسے ایک عظیم نعمت قرار دیتے ہیں مگر وہ درد و الم تک مختلف راستے سے پہنچے ہیں۔ ان کے نزدیک انسان مصائب جھیل کر اپنی خودی کو پہچان سکتا ہے اور تسخیرِ کائنات کا جو کام اس نے اپنے ذمہ لیا ہے اس کی راہ میں مقاماتِ آہ و فغاں آتے ہی رہیں گے۔ ؎

اگر کھو گیا اک نشیمن تو کیا غم — مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں

یاد رہے یہ اس غزل کا شعر ہے جس کا مطلع ہے۔ ؎

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں — ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

انہوں نے اپنی نظم فلسفۂ غم میں بھی اسی حقیقت سے پردہ اٹھایا ہے۔ غم سازِ زندگی کو چھیڑتا اور خواب سے بیدار کرتا ہے لہٰذا غم کتابِ زندگی کا لازمی حصہ ہے اور اس کے بغیر زندگی نامکمل ہے مگر غم و اندوہ کو اس لئے برداشت نہیں کرنا چاہیے کہ ہم اپنے جسم کو تکلیف پہنچا کر خوش ہوں کہ یہ شرف کی علامت ہے بلکہ ہمیں اپنے مقاصد کے حصول کے لئے دُکھ اور درد کو برداشت کرنا چاہیے۔

حضرت مجدد صاحب چونکہ زندگی میں درد و الم کی اہمیت پر زور دیتے ہیں اس لئے وہ عشق کے معاملے میں بھی وصال کی بجائے فراق کو پسند کرتے ہیں

”عشق میں صرف محبوب کا درد ہوتا ہے اور وصل کچھ ملحوظ نہیں ہوتا بلکہ وصل کو نہیں چاہتے اور محبوب کے اتصال سے بھاگتے ہیں یہ عشق کے دیوانہ پن کی باتیں ہیں بلکہ عشق کے ہنر و فن ہیں“ [1]

حضرت مجدد نے عشق میں وصال کو پسند نہیں کیا اور اس معاملے میں علامہ اقبال بھی ان کے ہم نوا ہیں اور وہ زندگی کی تڑپ کو فراق کا ہی مرہونِ منت سمجھتے ہیں۔ وصال چونکہ حرکت کو ختم کر دیتا ہے اور جستجو اور تلاش ختم ہو جاتی ہے اس لئے علامہ اقبال اس کی مخالفت کرتے ہیں؛

عالمِ سوز و ساز میں وصل سے بڑھ کے ہے فراق
وصل میں مرگِ آرزو ہجر میں لذتِ طلب
گرمیٔ آرزو فراق! شورشِ ہائے و ہو فراق
موج کی جستجو فراق! قطرہ کی آبرو فراق

مگر غالب نے نہایت عجیب طریقے سے وصال کی حمایت کی ہے اور موج کی جستجو کو فراق کا نہیں بلکہ وصال کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ ان کا یہ شعر اس سلسلے میں بڑی دلچسپی اور اہمیت رکھتا ہے۔

گر ترے دل میں ہو خیال، وصل میں شوق کا زوال
موجِ محیطِ آب میں مارے ہے دست و پا کہ یوں

غالباً علامہ کی نگاہ سے یہ شعر نہیں گزرا تھا ورنہ وہ موج کی جستجو کو فراق نہ کہتے۔ بہرحال علامہ کو مجدد صاحب کا نظریۂ فراق پسند ہے۔ وہ اپنے ایک خط میں اس کا ذکر بھی کرتے ہیں؛

”حضرت امام ربانی (مجدد الف ثانیؒ) نے ایک جگہ بحث کی ہے کہ گسستن اچھا ہے یا پیوستن۔ میرے نزدیک گسستن عینِ اسلام

---

[1] مکتوباتِ امام ربانی دفتر سوم ترجمہ قاضی عالم الدین ناشر اللہ والے کی قومی دکان لاہور اگست ۱۹۵۶ء ص ۲۱۲

ہے اور یہ پرستی رہبانیت یا ایرانی تصوف ہے اور اسی کے خلاف میں صدائے احتجاج بلند کرتا ہوں۔ گزشتہ علمائے اسلام نے بھی ایسا ہی کیا ہے اور اس بات کی تاریخی شہادت موجود ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ جب آپ نے مجھے سرالوصال کا خطاب دیا تھا تو میں نے آپ کو لکھا تھا کہ مجھے سرالفراق کہا جائے اس وقت میرے ذہن میں یہی امتیاز تھا جو مجدد الف ثانی نے کہا ہے"۔[2]

اگرچہ علامہ اقبال نے یہاں مجدد صاحب سے اتفاق کیا ہے اور انہوں نے آپ کا نام ہر جگہ ادب اور احترام سے لیا ہے مگر بعض مقامات پر انہوں نے مجدد صاحب کے نظریات سے اختلاف بھی کیا ہے اور ابن عربی کی طرف جھک گئے ہیں اگرچہ انہوں نے اس کا ذکر نہیں کیا مگر ایسا ہوا ضرور ہے اور ان کی تحریریں اس کی شاہد ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ابن عربی کا نظریہ بڑی ٹھوس منطق اور فلسفیانہ دلیلوں پہ استوار ہوا ہے اور اگرچہ اس سے بعض مقامات پر اختلاف تو کیا جا سکتا ہے مگر اسے کلی طور پہ رد کرنا ممکن نہیں ہے

ابن عربی کے نظریہ میں اتنی قوت تھی کہ مجدد صاحب کا نظریہ اس کی جگہ نہ لے سکا اور ان سے بار بار وضاحتیں طلب کی جاتی رہیں حتّٰی کہ خود مجدد صاحب بھی غور و فکر کے بعد اس کی منطقی قوت کو ماننے لگے اور محی الدین ابن عربی کی بزرگی کے قائل ہو گئے۔

"مانا کہ یہ مسئلہ توحید متقدمین صوفیہ میں صاف اور واضح نہیں ہوا تھا...... جب شیخ محی الدین ابن عربی قدس سرہٗ تک یہ نوبت پہنچی اس نے کمالِ معرفت سے اس مسئلہ دقیقہ کو مشرح کیا اور بابوں اور فصلوں میں تقسیم کر کے صرف و نحو کی طرح جمع کیا۔ باوجود اس امر کے پھر بھی اس طائفہ میں سے بعض نے اس کی مراد کو نہ سمجھ کر اس کو خطا کی طرف منسوب کیا اور اس پر طعن و ملامت کی، اس مسئلہ کی اکثر تحقیقات میں شیخ حق پر ہے اس کے طعنہ لگانے والے دور از صواب ہیں۔ شیخ کی بزرگی اور اس کے علم کی زیادت اس مسئلہ کی تحقیق سے معلوم کرنی چاہیے اور اس کی رد و طعن نہ کرنی چاہیے اس مسئلہ پر جوں جوں غور و بحث کی جاتی ہے متاخرین کے مختلف فکروں کے ملنے سے واضح اور صاف ہوتا جاتا ہے اور حلول و اتحاد کے شبہ سے دور تر ہوتا جاتا ہے"۔[3]

انہیں وحدت الوجود پہ یہ اعتراض تھا کہ اس سے بعض لوگ اشیاء میں خدا کے حلول کو ثابت کرتے ہیں، اب انہوں نے وحدت الوجود کو اس اعتراض سے مبّرا پایا اور اب وحدت الوجود کی تشریح اس طرح کی کہ ان کے اپنے نظریہ سے مطابقت پیدا ہو جائے۔

"جاننا چاہیئے کہ سابقہ تحقیق سے واضح ہوا کہ صوفیا جو کلام ہمہ اوست کے قائل ہیں، عالم کو حق تعالیٰ کے ساتھ متحد نہیں جانتے اور حلول و سریان ثابت نہیں کرتے بلکہ ظہور و ظلیت کے اعتبار سے حمل کرتے ہیں نہ وجود و تحقیق کے اعتبار سے۔ اگرچہ ان کی ظاہر عبارت سے اتحادِ وجودی کا وہم گزرتا ہے لیکن ہرگز ہرگز ان کی یہ مراد نہیں کیونکہ یہ کفر و الحاد ہے جب ایک دوسرے پر حمل کرنا باعتبار ظہور کے ہے نہ باعتبار وجود کے تو پھر ہمہ اوست کے معنی ہمہ از اوست ہیں کیونکہ شے کا ظل اسی شے سے پیدا ہوتا ہے اگرچہ غلبہ حال میں ہمہ اوست کہتے ہیں لیکن در حقیقت اس عبارت سے ان کی مراد ہمہ از اوست ہے"۔[4]

---

[1] یہ خط خواجہ حسن نظامی کے نام ہے۔

[2] خطوطِ اقبال مرتبہ رفیع الدین ہاشمی ص ۱۱۶

[3] مکتوباتِ امام ربّانی دفتر سوم ۲۲۱ ۔ ۲۲۰ ترجمہ از قاضی عالم الدین

[4] مکتوباتِ امام ربّانی ترجمہ از قاضی عالم الدین دفتر سوم ص ۲۲۴

حضرت مجدد کے لئے دقت یہ تھی کہ ان کے والد، اُستاد اور دوسرے بزرگ وجودی مسلک تھے اور اکثر صوفیا رعظام کے اقوال وجودی تھے۔ چنانچہ انہوں نے وحدت الوجود اور وحدت الشہود میں اشتراک کے پہلو تلاش کرلئے اور دونوں کو حق سمجھنے لگے۔

"پس صوفیہ جو وحدتِ وجود کے قائل ہیں حق پر ہیں اور علمار جو کثرتِ وجود کا حکم کرتے ہیں حق پر ہیں۔ صوفیا کے احوال کے مناسب وحدت ہے اور علما کے حال کے مناسب کثرت ہے کیونکہ شرائع کی بنا کثرت پر ہے اور احکام کا جدا جدا ہونا کثرت پر موقوف ہے۔ انبیار علیہم الصلوٰۃ والسلام کی دعوت اور آخرت کا ثواب کثرت پر موقوف ہے"۔ صا

علامہ اقبال بھی اس معاملے میں حضرت مجدد الف ثانی کے ہمنوا ہیں کہ علمار انبیار کے وارث ہیں اور وہ شریعت کے کاموں کے محافظ ہیں۔ وہ صوفیار کے ہاتھ میں طاقت کے ہونے کو پسند نہیں کرتے۔ وہ ایک خط میں لکھتے ہیں

"پنجاب میں علمار کا پیدا ہونا بند ہوگیا ہے اور اگر اللہ تعالیٰ نے کوئی خاص مدد نہ کی تو آئندہ بیس سال نہایت خطرناک نظر آتے ہیں۔ صوفیار کی دکانیں ہیں مگر وہاں سیرتِ اسلامی کی متاع نہیں بکتی۔ کئی صدیوں سے علمار اور صوفیار میں طاقت کے لئے جنگ رہی جس میں آخر کار صوفیا غالب آئے یہاں تک کہ اب برائے نام جو علمار باقی ہیں وہ بھی جب تک کسی نہ کسی خانوادے میں بیعت نہ لیتے ہوں ہر دلعزیز نہیں ہو سکتے۔ یہ روش گویا علمار کی طرف سے اپنی شکست کا اعتراف ہے۔ مجدد الف ثانی، عالمگیر اور مولانا اسماعیل شہید نے اسلامی سیرت کے احیار کی کوشش کی مگر صوفیار کی کثرت اور صدیوں کی جمع شدہ قوت نے اس گروہِ احرار کو کامیاب نہ ہونے دیا۔ اب اسلامی جماعت کا محض خدا پر بھروسہ ہے میں بھلا کیا کر سکتا ہوں"۔ صا۲

علامہ اقبال اور حضرت مجدد الف ثانی دونوں علمار کو اس لئے پسند کرتے ہیں کہ وہ شریعت کو بڑی اہمیت دیتے ہیں اور بعض صوفیار چونکہ شریعت کی پابندی نہیں کرتے اس لئے ان کے نزدیک ان کی پیروی جائز نہیں۔ ان پر اس وقت سُکر کی حالت طاری ہوتی ہے چنانچہ مجدد صاحب طریقت کو شریعت کا خادم کہتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"شریعت کے تین جزو ہیں۔ علم، عمل، اخلاص۔ جب یہ تینوں جزو نہ پائے جائیں شریعت متحقق نہیں ہوپاتی اور جب شریعت متحقق ہوگئی تو حق سبحانہٗ کی رضا تمام دنیوی و اخروی سعادتوں سے فائق و اعلیٰ ہے۔۔۔۔ اس لئے شریعت تمام دنیوی اور اخروی سعادتوں کی ضامن و کفیل ہے اور کوئی ایسا مقصود و مطلوب نہیں جو شریعت سے الگ ہو اور انسان کو اس کی محتاجی ہو۔ طریقت و حقیقت جس کے ساتھ صوفیار کرام ممتاز ہیں دونوں شریعت کی خادم ہیں ان دونوں سے شریعت کے تیسرے جُز یعنی اخلاص کی تکمیل ہوتی ہے لہٰذا دونوں سے مقصود شریعت کی تکمیل ہے نہ کوئی اور امر جو شریعت کے علاوہ ہو"۔ صا۳

علامہ اقبال اور ابنِ عربی دونوں ہی شریعت کی پابندی کو ضروری خیال کرتے ہیں اور یوں ہم دیکھتے ہیں کہ تینوں مفکر مقاصد میں یکسانیت رکھتے ہیں مگر طریقۂ کار میں کہیں کہیں اختلاف پایا جاتا ہے۔

صا مکتوباتِ امامِ ربانی ترجمہ از قاضی عالم الدین دفتر دوم ص ۱۲۱

صا۲ اقبال نامہ حصہ دوم ص ۴۹ - ۴۸

صا۳ مکتوباتِ امامِ ربانی دفتر اول حصہ اول ترجمہ مولانا سعید احمد ص ۱۲۶

انیسؔ کے مرثیے، نظریۂ رس کی روشنی میں

ڈاکٹر عنوان چشتی

ایک زمانے تک ہمارے نقادوں نے اُردو شعر و ادب کو عربی و فارسی اصول نقد کی روشنی میں پرکھا۔ ایک ایسا وقت بھی آیا جب ہماری نگاہیں مغرب کے تنقیدی معیاروں پر مرکوز ہو گئیں اور ہم نے تاثراتی، جمالیاتی، نفسیاتی، سماجی اور لسانیاتی تنقید وغیرہ کے اصولوں سے مدد لے کر اپنے ادب کا جائزہ لیا لیکن اُردو میں سنسکرت شعری جمالیات کے اصولوں سے جس طرح بے اعتنائی برتی گئی ہے اس پر حیرت ہوتی ہے۔ "نظریۂ رس" سنسکرت شعری جمالیات کا بہت مقبول اور اہم نظریہ ہے۔ اُردو میں سید احتشام حسین اور ڈاکٹر مسیح الزماں نے اس کی اہمیت کا اعتراف کیا ہے اور میراجی نیز پنڈت حبیب الرحمٰن نے اس سلسلے میں تھوڑا بہت کام بھی کیا ہے۔ رس میں انسانی جذبات کی نہ صرف فلسفیانہ اساس فراہم کی گئی ہے، بلکہ رس میں "جذباتی قدر" کو بنیادی اہمیت بھی دی گئی ہے۔ شاعری بھی انسانی افکار و جذبات کا پُرآہنگ لسانی اظہار ہے۔ اس لئے شاعری کی تحسین اور تنقید میں نظریۂ رس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ انسان کے پاس اس کا سب سے مقدس، خالص اور ذاتی سرمایہ اس کے شخصی تجربات، افکار اور جذبات ہیں، شاعری بالخصوص مرثیے میں انسانی جذبات اور جذباتی ردِ عمل کی خاص اہمیت ہے۔ اگرچہ مرثیے کی بنیاد "رثائیت" پر ہے جس میں جذبۂ غم کو کلیدی حیثیت حاصل ہے لیکن دوسرے احساسات اور جذبات بھی اپنی ارفع اور بالیدہ صورت میں ملتے ہیں۔ مرثیے میں انسانی جذبات اور ان کے مختلف رنگوں کی جو تصویریں ملتی ہیں وہ آپ اپنا جواب ہیں۔ چونکہ "نظریۂ رس" کی بنیاد بھی انسانی جذبات اور ان کے فلسفیانہ نظام پر ہے، اس لئے نظریۂ رس کی روشنی میں انیس کے مرثیوں کا مطالعہ ممکن ہے، اور سود مند بھی۔ ذیل میں نظریہ رس، کا مختصر سا خاکہ پیش کیا جاتا ہے تاکہ اس کی روشنی میں انیس کے مرثیوں پر گفتگو ہو سکے۔

بھرت منی نے ناٹیہ شاستر میں "رس" کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

"تتر د بھاؤ، انو بھاؤ، دیبے بھی چاری سینو گادرس نشپتہ"

یعنی واسنا روپی استھائی بھاؤ، جب وبھاؤ، انوبھاؤ اور سنچاری بھاؤ سے مل کر اپنے نقطۂ عروج کو پہنچتا ہے اور آتما کے ترفع کی وجہ سے، اس میں مخصوص قسم کی جمالیاتی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے تو وہ کیفیت "رس" کہلاتی ہے۔ اس تعریف سے یہ بات واضح ہے کہ "رس کی کیفیت ذہنی یا روحانی کیفیت ہے جو انسان کے ذہنی و جذباتی عمل اور ردِ عمل کے ایک خاص نقطۂ کمال پر پیدا ہوتی ہے۔ آچاریہ وشوناتھ نے استھائی جذبے کے رس تک پہنچنے کے عمل کو دودھ سے دہی بننے کا عمل قرار دیا ہے۔ گلاب رائے نے "آسواد جینہ آنند" کو "رس" کا نام دیا ہے۔

"نظریۂ رس" میں "بھاؤ" "انو بھاؤ" اور "وبھاؤ" کی تثلیث کو سمجھنا ضروری ہے۔ سنسکرت شعریات میں بھاؤ یعنی بنیادی جذبہ کے دو مفہوم ہیں۔ ایک وسیع اور دوسرا محدود۔ بھاؤ کے وسیع مفہوم میں استھائی اور سنچاری دونوں قسم کے بھاؤ شامل ہیں۔ اس کا دائرہ مستقل اور عارضی ہر قسم کے جذبات اور فکر و احساس کی ہر جہت پر محیط ہے۔ اس میں انسان کے موڈ کی ساری تبدیلیاں، جذباتی اور حسّی سارے تغیرات شامل ہیں۔ سنسکرت کے بعض نقادوں نے "بھاؤ" میں "انو بھاؤ" اور اس کی تمام ذیلی قسموں کو بھی شامل کر لیا ہے۔ محدود مفہوم میں "رس" کی نامکمل حالت کو بھاؤ کہتے ہیں۔ "استھائی بھاؤ" انسان کی شخصیت کے نہاں خانوں میں ہر وقت محوِ خواب رہتے ہیں جو ہمارے داخلی اور حسّی وجود کی تشکیل کرتے ہیں۔ سنچاری بھاؤ کو اعتباری، ذیلی یا ضمنی احساسات قرار دیا جا سکتا ہے۔ جن کی تعداد ۳۳ ہے۔ "نظریۂ رس" میں ان کا کوئی اپنا خود مکتفی یا آزاد وجود نہیں۔ ان کا انحصار بنیادی جذبے یعنی "استھائی بھاؤ" پر ہے۔ سنچاری بھاؤ، استھائی بھاؤ کے خاکے میں رنگ آمیزی کرتے ہیں۔ استعارے کی زبان میں استھائی بھاؤ کو سمندر اور سنچاری بھاؤوں کو بلبلے اور لہریں قرار دیا جا سکتا ہے۔ "دش روپک" کے مصنف نے استھائی بھاؤ کی بنیادی، بیکراں اور ناقابلِ تغیر حقیقت کو "رس کا مُول" یعنی رس کی قدر کہا ہے۔ "ساہتیہ درپن" کے مصنف نے بھی استھائی بھاؤ کو رس کی جڑ قرار دیا ہے۔ یعنی استھائی بھاؤ اور رس لازم و ملزوم ہیں۔ ایک کا تصور دوسرے کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

وشوناتھ نے "ساہتیہ درپن" میں لکھا ہے کہ جو محرکات "استھائی بھاؤ" یعنی بنیادی جذبے کو جگاتے ہیں اور جب وہ شاعری یا ڈرامے میں بیان ہوتے ہیں تو "وبھاؤ" کہلاتے ہیں۔ وبھاؤ کی دو قسمیں ہیں۔ ایک "آلمبن" اور دوسری "اُدّیپن"۔ انسان کے جذبات براہِ راست جس چیز سے متعلق ہوتے ہیں، اس کو "آلمبن" کہتے ہیں اور جذبات جس کے دل میں پیدا ہوتے ہیں اس کو "آشرے" کہا جاتا ہے۔ "آلمبن" کو محرک اور "آشرے" کو متاثر کہہ سکتے ہیں۔ آلمبن یعنی محرک پر جذبات کا اور جذبات پر شاعری کا انحصار ہے۔ صحیح "آلمبن" سے ہی شاعری میں تازگی اور توانائی پیدا ہوتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ فن سے اکثر محرکاتی عناصر مفقود ہو جاتے ہیں اور ان کی جگہ "اوراکی عناصر" لے لیتے ہیں لیکن اس سے موضوعِ شعر یا بنیادی محرک کی اہمیت کم نہیں ہوتی بلکہ وہی فن کی خشتِ اوّل کی حیثیت رکھتا ہے۔

"آلمبن" کے ساتھ "اُدّیپن" کی خاص اہمیت ہے یہ بھاؤ کی دوسری قسم کی وہ تمام اشیاء اور احوال و جذبات کو بیدار کرنے ان کو باقی رکھنے یا مشتعل کرنے میں مدد دیں انہیں "ادّیپن" کہا جاتا ہے۔ اُدّیپن میں ثانوی محرکات اور پس منظر وغیرہ آتے ہیں۔ اُدّیپن کی بھی دو قسمیں کی گئی ہیں ایک وہ جو آلمبن کے حرکات و سکنات سے متعلق ہے اور جس کو "چیتن" کہا گیا ہے، اور دوسری وہ جس میں خارجی پس منظر، منظر نگاری اور دوسرے ثانوی اسباب و محرکات شامل ہیں، جس کو "اچیتن" کہا گیا ہے۔

نظریۂ رس کا تیسرا اہم عنصر "انو بھاؤ" ہے۔ "انو" کے معنی بعد کے ہیں۔ "انو بھاؤ" یعنی بھاؤ کے بعد آنے والے۔ انو بھاؤ میں وہ خارجی تغیرات اور اظہارات شامل ہیں جن سے بھاؤوں کی شناخت ہوتی ہے۔ انو بھاؤ خارجی اور مادی و عملی دنیا میں حرکات و سکنات کی صورت میں نمودار ہوتے ہیں۔ "نظریۂ رس" میں "آلمبن" یعنی موضوعِ شاعری یا بنیادی محرک "آشرے" کو متاثر کرتا ہے۔ آشرے کے وہ تاثرات جو بھاؤوں کے درشن سے پیدا ہوتے ہیں، آشرے کی حرکات و سکنات میں ڈھل کر انو بھاؤ کہلاتے ہیں۔ نفسیات کی اصطلاح میں جذبات کے خارجی اظہار کو "انو بھاؤ" کہا جا سکتا ہے۔ گلاب رائے کے خیال میں "آلمبن" اور اُدّیپن سے آشرے کے من میں جو بھاؤ پیدا ہوتے ہیں، اور اس کی حرکات و سکنات میں ظاہر ہوتے ہیں، وہی "انو بھاؤ" ہیں۔ "ساتوک بھاؤ" اگرچہ "انو بھاؤ" سے مختلف ہیں مگر انہیں بھی "انو بھاؤوں" میں شامل کیا جاتا ہے۔ "نظریۂ رس" کی ان مبادیات کے بعد انیس کے مرثیوں پر غور کرنا سود مند ہوگا۔

"نظریۂ رس" میں رسوں اور استھائی بھاوؤں کی تعداد برابر ہے یعنی ہر ایک رس کا ایک استھائی بھاؤ ہوتا ہے۔ شرنگار رس کا استھائی بھاؤ "رتی" یا جذبۂ عشق، ہاسیہ کا ہاسیہ یا مزاح، کرن کا شوک یا جذبۂ غم، رودر کا کرودھ یا غصہ، ویر کا اتساہ یا جوش، بھیانک کا بھے یا خوف، وی بھتس کا "جگپسا" یا نفرت، ادبھت کا وسمئے یا حیرت اور شانت کا استھائی بھاؤ سکون ہے۔ انیس کے مرثیوں میں کسی نہ کسی حد تک یہ تمام رس موجود ہیں لیکن چونکہ مرثیے کی بنیاد رثائیت پر ہے، اس لئے مرثیے میں "کرن رس" کی فراوانی ہے اور "کرن رس" کے استھائی بھاؤ شوک یا جذبۂ غم کی کارفرمائی ہے۔ استھائی بھاؤ کے ذیلی یا اعتباری احساسات یعنی سنچاری بھاؤ بھی اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔ اس سے قبل کہ انیس کے مرثیوں میں "کرن رس" کی تلاش کی جائے، یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کے ارتقائی مراحل کی نشاندہی بھی کر دی جائے۔

"استھائی بھاؤ" کے رس تک پہنچنے میں "وبھاؤ" کی منزل آتی ہے جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے، وبھاؤ میں "آلمبن" اور "ادیپن" شامل ہیں۔ چونکہ انیس کے لئے تمام واقعاتِ کربلا مرثیے کے موضوعات ہیں اور یہی محرک بھی ہیں۔ اس لئے وسیع مفہوم میں ان واقعات کی جزئیات اور افراد سبھی آلمبن ہیں۔ انیس نے آلمبن کو کن انداز میں پیش کیا ہے ملاحظہ کیجئے۔

(الف) شہدائے کربلا کی مجموعی صورت و سیرت کی مصوری

رُخ ہے کسی کا جوشِ شجاعت سے لالہ رنگ　　کوئی سنوارتا ہے بدن پر سلاحِ جنگ
جھک جھک کے چست کرتا ہے کوئی فرس کا تنگ　　چلّے سے جوڑتا ہے کوئی فاقہ کش خدنگ
بھالا سنبھالتا ہے کوئی جھوم جھوم کے
تکتا ہے کوئی تیغ کو تیغے کو چوم کے

(ب) شہدائے کربلا کے صبر و تحمل، بردباری اور ذہانت و علمیت کی عکاسی۔

سوکھے لبوں پہ حمدِ الٰہی رُخوں پہ نور　　خوف و ہراس و رنج و کدورت دلوں سے دور
فیاض و حق شناس و اولوالعزم و ذی شعور　　خوش فکر و بذلہ سنج و ہنر پرور و غیور
کانوں کو حسنِ صوت سے حظ بر ملا ملے
باتوں میں وہ نمک کہ زباں کو مزا ملے

(ج) شہدائے کربلا کے حسن و جمال اور وجاہت کی جمالیاتی نقش گری

وہ برگِ گل سے لب، وہ دہن اک کلی سے تنگ　　وہ بھینی بھینی بو کسی غنچے میں، وہ نہ رنگ
لعل و گہر ہیں، ان لب و دنداں کے آگے تنگ　　اک منہ پہ قطرۂ نیساں ہے اور وہ سنگ
تشبیہ بھی جواں سے دی، نا امید ہیں
اس غم سے موتیوں کے کلیجے میں چھید ہیں

انیس ایک بالغ فن کار تھے انہوں نے اگرچہ شعوری طور پر "نظریۂ رس" کے مطابق اپنے مرثیے نہیں لکھے لیکن ان کے مرثیوں میں "نظریۂ رس" کے تمام عناصر موجود ہیں یا یوں کہہ لیجئے ان کے مرثیے نظریۂ رس پر پورے اترتے ہیں۔ انیس اس رمز سے آگاہ تھے کہ واقعاتِ کربلا اور ان کے تاثر کو گہرا اور پائیدار کرنے کے لئے ایک خاص نوعیت کے پس منظر کی ضرورت ہے۔ نظریۂ رس کی اصطلاح میں اس کو "ادیپن"

یعنی جذبے کو بیدار اور مشتعل کرنے والے ثانوی اسباب و محرکات کہا جا سکتا ہے۔ انیس کے منظر ناموں نے اسی پس منظر کا کام دیا ہے۔ دوپہر کا منظر ملاحظہ کیجیے۔

وہ لُو، وہ آفتاب کی حدت وہ تاب و تب کالا تھا رنگ دھوپ سے دن کا مثالِ شب
خود نہرِ علقمہ کے بھی سوکھے ہوئے تھے لب خیمے جو تھے حبابوں کے تپتے تھے سب کے سب
اُڑتی تھی خاک، خشک تھا چشمہ حیات کا
کھولا ہوا تھا دھوپ سے پانی فرات کا

گرداب پر تھا شعلۂ جوّالا کا گماں انگارے تھے حباب تو پانی شرر فشاں
منہ سے نکل پڑی تھی ہر اک موج کی زباں تہ پر تھے سب نہنگ مگر تھی لبوں پہ جاں
پانی تھا آگ گرمیٔ روزِ حساب تھی
ماہی جو سیخِ موج پہ آئی کباب تھی

ان بندوں میں محض گرمی کے احساس کا تاثر ہی کارفرما نہیں ہے بلکہ دلکش پیکریت بھی ملتی ہے۔ گرداب کو شعلۂ جوّالا قرار دینا مچھلیوں کا سیخِ موج تک آتے ہی کباب ہو جانا، موجوں کی زبان کا منہ سے نکل پڑنا، نہنگوں کے لبوں پر جان ہونا، حباب کو انگارا اور پانی کو شرر فشاں کہنا محض یونہی نہیں بلکہ اس میں شاعر کے وجدان اور اس کی روح کی بیقراری اور تشنہ لبی کا شدید احساس کارفرما ہے۔ انیس کے منظر نامے محض جامد تصویریں نہیں، ان میں وہ تحرک ہے جو جذبات کی زیریں لہروں سے ابھرتا ہے۔ انیس محض منظر کے مجموعی تاثر کے اظہار پر ہی اکتفا نہیں کرتے، بلکہ منظر کی جزئیات بھی پیش کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنے منظر ناموں کی تشکیل میں اظہار کے جن وسیلوں کا سہارا لیا ہے وہ قاری کے احساسات کو متاثر کرتے ہیں۔ پھر بھی ان کے مرثیوں میں ایسے بصری پیکروں کی بہتات ہے جن میں رنگین اور متحرک پیکریت کی خوبیاں موجود ہیں۔ صبح کا منظر نامہ ملاحظہ کیجیے۔

وہ صبح اور وہ چھاؤں ستاروں کی اور وہ نور دیکھے تو غش کرے ارنی گوئے اوجِ طور
پیدا گلوں سے قدرتِ اللہ کا ظہور وہ جا بجا درختوں پہ تسبیح خوانِ طیور
گلشن خجل تھے وادیٔ مینو اساس سے
جنگل تھا سب بسا ہوا، پھولوں کی باس سے

وہ دشت وہ نسیم کے جھونکے وہ سبزہ زار پھولوں پہ جا بجا وہ گہر ہائے آبدار
اٹھنا وہ جھوم جھوم کے شاخوں کا بار بار بالائے نخل ایک جو بلبل، تو گل ہزار
خواہاں تھے نخلِ گلشنِ زہرا جو آب کے
شبنم نے بھر دیئے تھے کٹورے گلاب کے

میدانِ کربلا میں یہ صبحِ عاشورہ کا منظر نامہ ہے یہاں فطرت محض ایک ورقِ سادہ نہیں بلکہ مقدس اور بصیرت افروز ہے۔ ایک تو صبح کا وقت فرحت بخش ہوتا ہی ہے دوسرے یہ وہ صبح ہے، جس دن امام حسینؑ ایک عظیم مقصد کے لئے جان کی بازی لگانے والے

ہیں۔ اس لئے انیس نے صبح کے منظر نامے کی تشکیل میں لسانی پیکروں سے روحانی اسرار و رموز کا کام لیا ہے اور ایک ایسی ذہنی فضا کی تشکیل کی ہے، جس میں تقدیس اخلاقی ارتفاع اور بصیرت کا سامان ہے۔ اس منظر نامے کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس کے استعاروں تشبیہوں اور پیکروں میں تنزیہی رجحان ہے۔ پھر بھی اصل خیال کا نقش قائم رہتا ہے۔ ———————

——————— اس منظر نامے کی یہی تنہا خصوصیت اس کو دوسرے شعرا کی منظر نگاری سے الگ کرتی ہے۔ انیس کی منظر نگاری مقصود بالذات نہیں۔ وہ مرثیے کے مجلسی اور شعری پہلو کی پابندی کرنے کے بعد ہی "رثائیت" کے لئے ایک ایسا منظر فراہم کرتے ہیں جس سے اصل تصویر اور زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے۔ چنانچہ "اُدبین" کے نقطۂ نظر سے بھی انیس کے مرثیے میں ایسے منظر نامے "استحائی بعاد" کر ایک خاص سطح اور استحکام عطا کرتے ہیں۔

انیس کے مرثیوں کا موضوع کربلا اور واقعاتِ کربلا ہیں جو انسانی تاریخ اور تہذیب کے بیحد دلدوز واقعات ہیں۔ میں یہاں کربلا کی تاریخ بیان کرنا نہیں چاہتا لیکن اتنی بات ضرور کہوں گا کہ کربلا کا میدان محض دو فریقوں کی جنگ کا میدان ہی نہیں تھا بلکہ دو آدرشوں اور دو نظام ہائے زندگی کی شدید آویزش کا میدان بھی تھا جس میں ایک طرف چند بے سروسامان افراد تھے اور دوسری طرف آلاتِ حرب و ضرب اور کثیر افواج حسینی قافلے کا ہر فرد اپنے اصول پر قائم۔ یعنی یزید کے ہاتھ پر بیعت نہ کرنے پر مصر اس لئے اپنے انجام سے باخبر۔ آخر ایک منزل ایسی آتی ہے جہاں بات چیت کے دروازے بند ہو جاتے ہیں اور حسینی قافلے کا ایک ایک فرد مقتل کی طرف جاتا ہے اور حق و صداقت کے نام پر اپنے سروں کے پھول چڑھاتا ہے۔ مستورات اور معصوم بچے اپنی آنکھوں سے قتل گاہ کا دردناک منظر دیکھتے ہیں۔ مختصراً یہ کہ تمام رفقا اور اعزہ کی شہادت کے بعد امام حسینؑ مقتل جانے کی تیاری کرتے ہیں، وہ حسینؑ جو مستورات، یتیموں اور بچوں کا آخری ملجا و ماویٰ ہیں۔ اس صورتِ حال میں مستورات پر کیا گزری ہوگی اس کا اندازہ مشکل نہیں بنیادی طور پر یہی جذبۂ غم مرثیے کا موضوع ہے۔ چونکہ مردوں کے مقابلہ میں عورتوں پر شدید جذباتی ردِ عمل ہوتا ہے اس لئے انیس کے مرثیوں میں زینبؑ "کرن رن" کی تصویر بن کر نمودار ہوتی ہیں۔ انیس نے زینبؑ کے کردار کے اخلاقی پہلو کو تو پیشِ نگاہ رکھا ہی ہے اس کو صحیح انسانی نفسیات کے مطابق بھی پیش کیا ہے ملاحظہ کیجئے :-

زینبؑ کا حالِ زار امام حسینؑ کو شہادت کے لئے رخصت کرتے ہوئے۔

بے خود ہے غم میں فورِ نظر کے وہ دلفگار ۔۔۔ سمجھی نہ کچھ کہ کون یہ روتا ہے زار زار
جب یہ سنا، کھڑا ہے محمدؐ کی یادگار ۔۔۔ ماتم کی صف پہ گر پڑی، اُٹھ کر وہ سوگوار
رو کر کہا نہ پاؤں نہ قابو میں ہاتھ ہیں
کیوں صاحبو! کہو علی اکبرؑ بھی ساتھ ہیں؟

پُرخوں جبین، پھٹے ہوئے کپڑے، بدن پہ خاک ۔۔۔ چادر سیاہ، ایک گریباں ہزار چاک
سر بھی جگر بھی، سینۂ پُرخوں بھی دردناک ۔۔۔ بیکس بہن کے حال پہ روئے امامؑ پاک
فرمایا آہ! کیا کہ سناں دل پہ کھائے ہیں
ہم ان کی لاش چھوڑ کے رخصت کو آئے ہیں

وہ کہتی تھی کہ جان نکل لے تو جائیے | خنجرِ اجل کا حلق پہ چل لے تو جائیے
مضطر ہے، دل بہن کا سنبھل لے تو جائیے | اچھا ذرا سکینہؑ بہل لے تو جائیے
بالوں پہ خاک اڑا لوں منہ اشکوں سے دھو تو لوں
ماں جائے بھائی میں تجھے جی بھر کے رو تو لوں

زینبؑ کا حالِ زار امام حسینؑ کی روانگی پر:

چلاتی تھی اسے میرا بھائی ہے کس طرف | ٹوٹی ہوئی علیؑ کی کمائی ہے کس طرف
دریا کدھر ہے خوں کا، ترائی ہے کس طرف | سونے کی جا حسینؑ نے پائی ہے کس طرف
رستہ دے اے زمیں کہ فلک کی ستائی ہوں
میں اپنے پیارے بھائی سے ملنے کو آئی ہوں
میں سیدہ ہوں، رحم میری بے کسی پہ کھاؤ | اے اہلِ قبر بنتِ نبیؐ کی مدد کو آؤ
دنیا میں تم خوشی رہو، عقبیٰ میں چین پاؤ | سید کدھر ہے خون میں غلطاں، مجھے بتاؤ
یاں لٹ گئے فلک سے نہ یہ دکھ ہم پہ ڈالے ہیں
اے بھائیو مدینے کے ہم رہنے والے ہیں

زینبؑ کا حالِ زار حسینؑ کی شہادت پر

ڈھانپ کر ہاتھوں سے منہ بنتِ علیؑ چلائی | ذبح ہوتے ہو مرے سامنے اے ہے بھائی
ضربِ اول تھی کہ تکبیر کی آواز آئی | گر پڑی خاک پہ غش کھا کے علیؑ کی جائی
آنکھ کھولی تھی کہ ہنگامۂ محشر دیکھا
سر اٹھایا تو سرِ شہ کو سناں پر دیکھا
رو کے چلائی کہ ہے ہے مرے مظلوم حسینؑ | فوجِ اعدا میں ترے قتل کی ہے دھوم حسینؑ
کچھ مجھے آنکھوں سے ہوتا نہیں معلوم حسینؑ | ہائے میں رہ گئی دیدار سے محروم حسینؑ
مُڑ کے دیکھو کہ مصیبت میں پڑی ہوں بھائی
ننگے سر نرغۂ اعدا میں کھڑی ہوں بھائی

ان تینوں ٹکڑوں میں کرن رس یعنی جذبۂ غم کے بہت سے سنچاری بھاؤ زینبؑ کے افکار و اعمال اور ان کے خارجی ظہور کی صورت میں نمودار ہیں۔ پہلے ٹکڑے میں فورِ تسلط کے غم میں بیخودی (اپس مار) ماتم کی صف پر گرنا اور ہاتھ پاؤں کا بے قابو ہونا (آویگ) بھائی کو دیکھ کر بہن کا بے قابو ہونا، بالوں میں خاک ڈالنا اور رونا (موہ اور آمرش) ہے دوسرے ٹکڑے میں بھائی کو آواز دے کر چلانا، شدتِ غم میں دوڑنا (انماد)، اپنی بے کسی پر رحم کی التجا کرنا اور اپنی حالتِ زار پر بین کرنا (ویریڑا)، اور (چپلتا) وغیرہ سنچاری بھاؤ ہیں۔ تیسرے بند میں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ کر رونا اور چلانا اور خاک پر گر جانا (ویریڑا، آویگ، موہ، آمرش وغیرہ ہیں) ان کے بارے میں

ننگے سر کھڑے ہونے کا احساس (ودریڑا اور اُن مار) ہے۔ انیس کے مرثیوں کے تجزیے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انیس نے استھائی جذبہ کے ذیلی احساسات (سنچاری بھاوؤں) کو بھی بڑی خوش اسلوبی سے ظاہر کیا ہے۔

ظلم کے اس سیاہ مرقع میں اگر سیدِ مظلوم امام حسینؑ کی تصویر بھی سجا لیجئے تو "کرن رس" اپنی معراج پر نظر آتا ہے۔ تمام رفقا کی شہادت کے بعد امام حسینؑ کی بے سروسامانی اور ان کی غم زدگی و بے چارگی کا عالم یہ ہے۔

(الف) وہ گھر کہ جس میں لاتے تھے جبریل، وحیِ رب — واں تیر، فوجِ ظلم سے آتے تھے بے غضب

ہنوز اشے سر کھڑے تھے شہنشاہِ تشنہ لب — تر تھا جواں پسر کے لہو سے لباس سب

لب پیاس سے کبود تھے، رخسار زرد تھے

مولا کی ایک جان تھی اور لاکھ درد تھے

(ب) میدانِ جنگ میں شہادت سے قبل امام حسینؑ کا عالم:

مانندِ آفتاب لرزتا تھا جسمِ پاک — جائیں کدھر، وہ فوج وہ صحرائے ہولناک

سر پر عمامہ پاؤں میں موزے ردا پہ خاک — لٹکے ہوئے تھے دونوں طرف پیرہن کے چاک

عابدؑ سا نورِ عین پڑا تھا بے ساتھ تھا

اک ہاتھ میں یتیم سکینہؑ کا ہاتھ تھا

پہلے بند میں ایک دلدوز منظر ہے، باری باری تمام رفقا شہید ہو چکے ہیں یہاں تک کہ آخر میں ایک عابد بیمار کے علاوہ کوئی مرد باقی نہیں۔ اعزہ و اقربا اور رفقا کی شہادت پر امام حسینؑ کے دل پر کیا گزری ہوگی اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ انیس نے "ہنوز اشے سر کھڑے تھے" کہہ کر جس بے چارگی کی طرف اشارہ کیا ہے وہ جواں پسر کے لہو سے لباس کے تر ہونے پر مکمل ہو رہی ہے۔ دوسرے بند میں خوف سے جسمِ پاک کا لرزنا، صحرائے ہولناک میں چاروں طرف سے فوج میں گھر جانا، غبار میں اٹے ہوئے اور پھٹے ہوئے کپڑوں کا لٹکنا، معصوم بچوں کا ہمراہ ہونا ایک ایسی تصویر پیش کرتا ہے جو مظلومیت اور بیچارگی کا سچا مرقع ہے۔ اس تصویر میں نہ صرف امام حسینؑ آشرے کی حیثیت سے نمایاں ہیں اور ان کی جسمانی حرکات اور تاثرات کا اظہار ہو رہا ہے، بلکہ "ساتوک بھاؤ" بھی نمایاں ہو رہے ہیں۔ جسم کا لرزنا (روما نچ) جائیں کدھر اور زردیٔ رخسار وغیرہ وحشت اور دہشت کا عالم (سے ور بھنگ) اور (دیپ تھوُ) کے ساتوک بھاؤں "کو نمایاں کرتے ہیں۔

"کرن رس" کی ابتدا اِشٹ (ﺍﺷﭧ) یا "شئے مقصود" کی تباہی سے ہوتی ہے۔ ایسی تباہی و بربادی جس میں خوشی، خوشحالی اور خوش آئند مستقبل کا امکان بھی نہ ہو۔ امام حسینؑ اور ان کے قافلے کے افراد کی شہادت ایک ایسا زیاں اور ایک ایسی بربادی ہے جس کی تلافی حشر تک ممکن نہیں ہے۔ اس زیاں سے زینبؑ اور قافلۂ حسینیؑ کے دوسرے افراد پر جو شدید غم انگیز ردِ عمل ہوا ہے اس سے "کرن رس" کی وہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جو قاری کو آتما اور پرماتما کے درمیان اس ذہنی کیفیت تک پہنچا دیتی ہے جو صرف محسوس کی جا سکتی ہے مگر بیان نہیں کی جا سکتی۔ انیس نے اپنے مرثیوں میں "رثائیت" اور جذبۂ غم کی نقش گری، اس کے ذیلی اور ضمنی احساسات نیز مختلف شیڈز کے ساتھ کی ہے جس کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ اگرچہ انیس نے اپنے مرثیے شعوری طور پر نظریۂ رس کے مطابق نہیں لکھے لیکن ان کے مرثیوں میں "کرن" موجود ہے اور اس کے اظہار میں انیس بڑی حد تک کامیاب ہیں۔

اکبر الہ آبادی — مثبت سوچ کا شاعر

محمد ایوب شاہد

اکبر الٰہ آبادی کا خیال آتے ہی ذہن میں ایک طنز یہ اور مزاحیہ شاعر کا خیال اُبھرنے لگتا ہے اور یہ خاکہ کچھ اتنے شوخ رنگوں سے عبارت ہے کہ اس کے پسِ پشت اکبر کی حقیقی شخصیت کو دیکھنا ذرا مشکل ہو جاتا ہے۔ بات یہ نہیں کہ اکبر کی مزاحیہ شخصیت محض بناوٹی ہے یا اس کا اکبر کی اصلی شخصیت سے کوئی رابطہ نہیں بلکہ اصل بات یہ ہے کہ اکبر نے اظہار کے لئے جس طریقے کو اختیار کیا وہ اُن کی حقیقی شخصیت کو ثانوی سطح پہ لے آیا اور یوں مزاحیہ شخصیت جو دراصل منفی بنیادوں پر قائم ہوتی ہے حاوی ہوتی چلی گئی۔ طنز و مزاح بنیادی طور پر منفی رویّہ ہے اور شخصیت کے منفی رُخ سے ہی جنم لیتا ہے۔ اکبر کے اس پہلو میں اتنی توانائی ہے کہ بالعموم قاری اسی رُخ سے لطف اندوز ہو کر رہ جاتا ہے اور اس مزاح کے پسِ پُشت جو زہرناکی ہے اس کو کم محسوس کرتا ہے۔ علاوہ ازیں اگر وہ مزاح کے عوامل کو گرفت میں لے ہی لے تو اکبر کے اس پہلو کو بہرحال کم ہی دیکھ سکتا ہے جس کا اظہار میں آپ کے سامنے کرنے والا ہوں اور وہ ہے اکبر کی مثبت شخصیت جس سے مثبت سوچ ایک مربوط نظامِ فکر کے سانچے میں ڈھل کر اُبھرتی ہے۔

۱۸۵۷ء کی تبدیلی کئی لحاظ سے اہمیت کی حامل ہے۔ مسلمان جو ایک عرصہ تک ہندوستان کی طویل و عریض سلطنت کے وارث تھے اس سے محروم ہو گئے۔ نو آمدہ حکمرانوں نے جنگِ آزادی میں قتل و غارت گری کی ساری ذمہ داری مسلمانوں پر ڈال کر انہیں طرح طرح کے مظالم کا نشانہ بنایا اور آہستہ آہستہ مسلمانوں کو تیسری پوزیشن پر پہنچا دیا گیا۔ انگریزوں کی عسکری فتح کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو شدید طور پر مفلوج کرنے والی چیز مغربی فکر اور اس کے تہذیبی مظاہر تھے۔ اس تہذیب و ثقافت میں ایک طرف تو ظاہری چمک دمک اور آن بان تھی اور دوسری طرح سائنسی ترقّی اور فوجی قوّت چونکہ اس کے پسِ پشت تھی اس لئے اچھے اچھوں کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ بہر حال مسلمان چونکہ ایک طویل عرصہ تک حکمران رہے تھے، اس لئے وہ مطابقت کا وہ رویّہ پیدا نہ کر سکے جو غلام قوم کی ترقّی کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ اس طرح مسلمانوں اور انگریزوں میں ایک بُعد پیدا ہوتا چلا گیا۔ یہ بُعد ایک فاتح کے خلاف شکست خوردہ قوم کا جذبۂ نفرت تھا جو دشمن کے لئے فطری طور پر موجود ہوتا ہے۔ اس کھچاؤ کا نقصان اس طرح سے ظاہر ہوا کہ مسلمان بدلتے حالات سے کٹ کر ایک نقطہ پر مرکوز ہو گئے اور یوں زمانی تسلسل میں جمود کا شکار ہو گئے جب کہ دوسری طرف ہندوؤں نے تبدیلی کو قبول کر کے ارتقائی رویّہ برقرار رکھا اور پھر جب ایک عرصہ بعد مسلمانوں نے دونوں طاقتوں کے مقابل اپنی حالت پر نظر کی تو وہ اجتماعی سطح پر احساسِ کمتری کا شکار ہو گئے۔ چنانچہ اس دور کی اکثر تحریریں اس اجتماعی احساسِ کمتری کو پیش کرتی دکھائی دیتی ہیں۔

اکبر کی شاعری کو بھی اگر آپ اس رُخ سے دیکھیں تو محسوس ہوگا کہ یہ بھی ایک ایسے ہی مجروح انسان کی پکار ہے جس کی شخصیت ہر

حیلے بہانے سے اپنے آپ کو برقرار رکھنے کی سعی کر رہی ہو۔ اکبر کے یہاں مغرب کی تہذیب اور اس کے دوسرے مظاہر کے بارے میں جو ایک تضحیک آمیز رویّہ ملتا ہے وہ اسی مجروح شخصیت کی آواز ہے لیکن اکبر صرف اسی سطح کے شاعر نہیں کہ انہوں نے مغربی اشیا و مظاہر کا مذاق اڑایا ہو اور بس بلکہ اکبر کی اصل دین تو وہ قومی شعور ہے جو ان کی شاعری میں اجتماعی زندگی قائم رکھنے کا وسیلہ ہے یوں اکبر ایک طرف تو منفی سطح پر بعض اشیاء کو رد کرتے ہیں اور مثبت سطح پر ایک متبادل نظام پیش کرتے ہیں۔ یہ متبادل نظام کیا ہے؟ آیئے اس پر کچھ گفتگو کریں۔

اکبر الٰہ آبادی کے متبادل نظام فکر میں سب سے بڑی چیز تصادم کی ایک کیفیت ہے۔ نزاع یا تصادم فی نفسہٖ کوئی اعلیٰ قدر نہیں لیکن کسی مخصوص صورت حال کے حوالے سے جب اس کی قدر و قیمت کا تعین کیا جائے تو اس کی الگ ایک معنویت بنتی ہے۔ اکبر نے جس دور میں تصادم کو ایک قدرِ اعلیٰ کے طور پر پیش نظر رکھا، اس دور میں یہ ایک ناگزیر ضرورت تھی۔ دراصل یہ وہ واحد حربہ تھا جس کے حوالے سے مسلمانوں کو جداگانہ تشخص پر قائم رکھا جا سکتا تھا۔ چنانچہ یہ بات تسلیم کی جاتی ہے کہ پاک و ہند کے مسلمانوں میں اپنی تہذیب کے بچے کھچے اثاثے بڑی حد تک اکبر کی اسی محاربہ پالیسی کی دین ہے۔ اکبر کے یہاں چونکہ یہ تصادم ایک فکری پس منظر رکھتا ہے اس لئے اس کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے اور یوں ایک پوری فکر کو قائم رکھنے کا وسیلہ قرار پاتا ہے۔

اکبر کے بارے میں خصوصیت سے جو بات قابلِ ذکر ہے وہ ان کا فکری پس منظر ہے۔ شاید اس بات میں کوئی کلام نہیں کہ وہ کوئی فکری سطح پر ایک ایسے تصورِ حیات و کائنات کے قائل تھے جس کی تشکیل تصوّف کے تحت ہوئی تھی۔ اُن کی شاعری کا بیشتر حصّہ اس بات کی تائید کرتا ہے اور عملی زندگی میں بھی وہ نظری یا عملی صوفی ہی تھے لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اکبر کے یہاں فکری سطح پر کائنات اور اس کے مظاہر کو ایک کُل سمجھنے کا رویہ نہیں ملتا بلکہ وہ فرق و امتیاز پر کثرت سے زور دیتے نظر آتے ہیں۔ علاوہ ازیں اکبر کے یہاں ہم آہنگی اور مطابقت کا وہ انداز بھی نہیں جو کائنات کے بارے میں سکونی تصورات رکھنے سے جنم لے سکتا ہے۔ اس کے برعکس ان کے یہاں حیات و کائنات کے بارے میں ایک حرکی تصور ملتا ہے۔ اکبر کی اس حرکیت کا پس منظر کیا ہے؟ کیا وحدت الوجود کے زیرِ اثر جہاں کائنات، وجود کا استعارہ بن جاتی ہے، ایسا تصور ممکن ہے؟

اس میں شک نہیں کہ اکبر کی شاعری میں ایسے مقامات بھی ہیں جہاں اس رجحان کا اظہار ملتا ہے جسے وحدت الوجود سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ لیکن اکبر کا مجموعی مزاج ان کے اس حصّہ کی تائید نہیں کرتا چنانچہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ حصّہ تصوّف برائے شعر گفتن خوب است کے تصور کی پیداوار ہے۔

جس کی روایتی اہمیت ہے یا یہ کہ وہ کائنات کو وجود واحد خیال کرنے کے برعکس اس کا مظہر خیال کرتے ہوں۔ دراصل اکبر کو وحدت الوجود فکر سے الگ کرنے والی چیز ان کا وہ اندازِ فکر ہے جو انہوں نے تصادم کی پالیسی کے تحت اپنایا اور مسلمانوں کے لئے ایک الگ تشخص کی ضرورت پر زور دیا۔ چنانچہ وہ تصادم اور تقسیم کے اس عمل کو قبول کرتے ہیں تو وہ ہم آہنگی اور مطابقت کو رد کرتے ہیں جس سے ان کی الگ شخصیت (ذاتی و اجتماعی) ختم ہو۔ انہوں نے اپنے ایک خط میں اس مسئلہ پر اظہارِ خیال کیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ حقیقت کا وجودی تصور نہیں رکھتے تھے۔ خواجہ حسن نظامی صاحب کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"حضرت اقبال نے میرے نزدیک تمہید میں احتیاط نہیں کی اور ایک بڑا مجموعہ دلوں کا مغموم و یاس ہوگا۔ لیکن اب سنبھل کر مسئلہ وحدت الوجود اور مسئلہ رہبانیت پر گفتگو کریں گے۔ میں آپ کو مناسب اور محفوظ جگہ پر نہ پاؤں گا اگر آپ قرآن مجید سے

مسئلہ وحدت الوجود کو ثابت کرنے پر قلم اٹھائیں گے۔ علمائے شریعت نے غالباً فرمادیا ہے کہ یہ مسئلہ جزو اسلام نہیں ہے اور میں تو کہتا ہوں کہ ہمہ اوست کہنے سے پہلے اُو کو ثابت کرو پھر ہست کی توضیح کرو۔ یعنی ہستی کیا ہے اور اُو کسے کہتے ہیں۔ ہمہ اوست تک پہنچنے ہی نہ پاؤگے کہ حواس رخصت ہو جائیں گے۔"

ویسے حقیقت یہ ہے کہ اکبر نے شاعری میں وجود و شہود کی ان بحثوں سے الگ ہو کر توحید کو اپنی شاعری کے جزو اعظم کے طور پر پیش کیا ہے۔ اکبر کے فکری نظام اور تصورِ حیات و کائنات میں حرکیت، مسلمانوں کے لئے الگ تشخص کی ضرورت اور اس کے لئے تصادم کی صورتِ حال سب کے سب ان کے اسی تصور سے پیدا ہوتے ہیں۔ اکبر کے سلسلہ میں توحید کی بات محض رسمی مذہبیت کی بات نہیں بلکہ وہ توحید کو ایک نفسانی اور عمرانی قوت کے طور پر محسوس کرتے ہیں۔ اکبر کے یہاں توحید کی نفسیاتی قوت تو یہ ہے کہ وہ فرد کی داخلی تنظیم میں ممد و معاون ہے اور دوسری طرف عمرانی قوت کے طور پر ایک ایسے نظام کی داعی ہے جس کے حوالے سے جداگانہ تشخص پیدا ہو سکتا ہے۔

اکبر نے اپنی شاعری میں توحید کا ذکر اتنی کثرت سے کیا ہے اور اس انداز سے کیا ہے کہ قاری سوچ میں پڑ جاتا ہے۔ پھر وہ ذاتِ احد کے اثبات پر جب دلائل دینے لگتے ہیں تو شکوک و شبہات کی وہ پرچھائیں نظر آنے لگتی ہیں جو اس دور کے ذہن پر پڑ گئی تھیں۔ میرے خیال میں اکبر کے عہد کا ایک المیہ یہ بھی تھا کہ وہ حقیقت کے جس تصور سے آشنا ہو رہا تھا اس کی بنیاد حواس اور مشاہدہ پر استوار تھی۔ سائنسی حقیقت پسندی نے حسی منہاج پر جس طرح اشیاء کو سمجھنے کی نیو ڈالی اور منطقی حوالوں سے اشیاء کی معنویت دریافت کرنے کی جو کوششیں شروع کی اس نے افراد کو مابعد الطبیعاتی سطح پر کمزور کر دیا تھا۔ چنانچہ اکبر کے عہد میں بڑے بڑے اکابر جن میں سر سید احمد خان ایسے بزرگ شامل ہیں مابعد الطبیعاتی مظاہر کے بارے میں شک کا شکار نظر آتے ہیں اور یہاں وہ معتزلی فکر کار فرما نظر آتا ہے جو عقل کو وحی پر ترجیح دیتا ہے، اس طرح اس عہد میں محسوس سے ماوریٰ سوچنے کی صلاحیت ختم ہوتی نظر آتی ہے اور حسی ادراک سے آگے اندھیرا ہی اندھیرا دکھائی دیتا ہے۔ چنانچہ توحید جو ظاہر ہے مادی علائق سے جُدا ایک مابعد الطبیعاتی حقیقت ہے، اس عہد کے ذہن میں کمزور پڑ رہی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اکبر نے اسی بے یقینی کیفیت کو محسوس کیا اور اس کو دُور کرنے کی کوشش کی۔ اکبر کو یقین تھا کہ یہی ایک ایسی کیفیت ہے جس کے ساتھ مسلمانوں کی ساری روحانی اور مادی توانائی وابستہ ہے اور ان کی کلیت کا واحد وسیلہ ہے چنانچہ انہوں نے بیک وقت دو چیزوں یعنی مادی فکر اور وجودی فکر کو رد کرکے توحیدی فکر کو پیش کیا اور اس طرح سے اسے ایک محرک قوت کے طور پر اذہان میں زندہ کرنے کی کوشش کی۔ اکبر کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے جس سے اس دور میں توحید کے بارے میں بے یقینی کا رویّہ واضح نظر آتا ہے۔

تمہاری بحثوں سے میرے شبہے خدا کی ہستی پہ کم نہ ہوتے   مگر یہ بات آگئی سمجھ میں خدا نہ ہوتا تو ہم نہ ہوتے

ہم نے یہ نکتہ سنا اک مردِ حق آگاہ سے   پھر گیا اس سے زمانہ جو پھرا اللہ سے

کعبے سے بُت نکال دیئے تھے رسولؐ نے   اللہ کو نکال رہے ہیں دلوں سے آپ

جو ذکر آتا ہے آخرت کا تو آپ ہوتے ہیں صاف منکر   خدا کی نسبت بھی دیکھتا ہوں یقین رخصت گمان باقی

رحم کر قوم کی حالت پہ تو اے ذکرِ خدا   بے ادب ہو گئی مجلس ترے اٹھ جانے سے

خدا ہی کی ہدایت کرتی ہے نورِ یقیں پیدا   دلیلوں کی رسائی تو فقط وہم و گماں تک ہے

خدا کہاں ہے جواب اس کا ہر مقام میں ہے ۔۔۔ نہ سمجھے کوئی تو کہہ دو کہ اپنے نام میں ہے

اکبر کے کلام میں ایسے بے شمار اشعار دراصل اس بات کا عندیہ ہیں کہ یہ دور مسلمانوں کی زندگی میں ایسی بے یقینی اور انتشار کا دور تھا جب وہ توحید کے اس مرکزی نظام سے کٹ رہے تھے جو ان کی کلیت کی اساس تھا۔ گویا اس سطح پر خارج کا بکھراؤ داخلی سطح پر پوری مذہبی اور تہذیبی تنظیم کی اس قدرِ اعلیٰ کی شکست و ریخت کے باعث تھا جس پر اس سارے نظامِ فکر کی بنیاد تھی. کسی بھی قوم کی زندگی میں وہ لمحات انتہائی سنگین نوعیت کے ہوتے ہیں جب وہ مرکز سے اُکھڑنے لگیں، اس عہد کی لامرکزیت توحید سے انقطاع کے باعث تھی اور اکبر نے اس مرض کی صحیح صحیح شناخت کر کے توحید کو ایک ایسی قدرِ اعلیٰ کے طور پر پیش کیا جس سے مسلمان ایک بار پھر قومی اور ملّی کلیت کو پا سکتے تھے۔ اکبر کا توحید کا تصور جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے محض چند رسمی عقائد تک محدود نہ تھا بلکہ انہوں نے اس قدر کی نفسیاتی، تہذیبی اور عمرانی قوت کا پورا پورا اندازہ لگایا تھا اور زندگی کو ایک کُل میں ڈھالنے کے لئے اس کی مرکزیت کے معنی و مفہوم سے آگاہ تھے۔ توحید یعنی اللہ کی وحدانیت کا تصور اگر ایک طرف فرد کو فرد کی خدائی کے چنگل سے نکالنے کا ضامن ہے تو دوسری طرف وہ جماعت کو بھی ایک الگ گروہ کی حیثیت سے ایک کُل بناتا ہے۔ پھر اس تصور کے ساتھ ایک پورا نظامِ حیات وابستہ ہے جو فرد اور اجتماع کے لئے راستے متعین کرتا ہے اور یوں ایک بالکل الگ اور منفرد انداز میں دونوں کو کائنات میں برقرار رکھتا ہے۔ توحید یعنی وحدت سے جو قوت و توانائی ابھرتی ہے۔ اس سے اکبر پوری طرح آگاہ تھے اور انہوں نے توحید پر جس قدر زور دیا ہے اس کا اصل مقصد یہی ہے کہ مسلمان توحید سے توانائی کا اکتساب کریں اور میدانِ عمل میں اس کا اظہار ایک زندہ قوم کی صورت میں ہو۔ چنانچہ ان کے یہاں توحید اور قوت لازم و ملزوم سے بن گئے ہیں اور اس کا فقدان کمزوری،

اللہ کی جانب متوجہ رہیں احباب ۔۔۔ صف ہوگی شکستہ جو کہیں رُخ نہ تھا ایک
یا رب رہے جمعیت مسلم یونہی قائم ۔۔۔ رُخ ایک، رسول ایک، کتاب ایک، خدا ایک
گردن خالق کے آگے جھکتی ہی نہیں ۔۔۔ اب ابتری سے یہ قوم رُکتی ہی نہیں
ہے عقیدوں کا اثر اخلاقِ انساں پر ضرور ۔۔۔ اس جگہ کیا چیز ہوگی وہ اگر جب دب گیا
خدا کی یاد ہے طاقت ہماری ۔۔۔ مصلّے ہے ہمارا تختِ شاہی

حکومت کی طلب کا بھی یہی مقصود ہے اصلی ۔۔۔ کہ روحانی طریقوں سے خلائق کو توسل ہو

اکبر کی حرکی اور گرم توحید کا اثر ان کی شاعری میں عملیت کی ترغیب و تلقین کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اکبر کے بارے میں یہ کہنا کہ انہوں نے صرف ماضی کے گیت گائے ہیں اور اپنے آپ کو ایک ایسی ذہنی فضا میں زندہ رکھا ہے جو خیالی عالم UTOPIA کے مماثل ہے درست نہیں ہوگا۔ اس میں شک نہیں کہ اکبر بدلتی ہوئی زندگی کے ساتھ اس طور نہیں بدلنا چاہتے جس طرح مثلاً مولانا حالی نے صدا لگائی ؂

چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی

لیکن اکبر کا اپنا ایک مزاج ہے اور یہ مزاج ان کے ایک نظام کی دین ہے چنانچہ انہوں نے اپنے اسی مزاج سے ماضی کے

اس حصے کو نصب العین سطح پر زندہ کیا جو حرکی اور تابناک ہے۔ ان کے یہاں ہمیں عملیت اور سعی و کوشش کی جو تعلیم نظر آتی ہے وہ اسی حوالے سے ہے وہ حال کی ضرورتوں کو بھرپور طریقے سے محسوس کرتے ہیں اور اس صورتِ حال میں مدرم سلطان بود کے رویے سے سخت نالاں ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ فرد یا قوم اسی وقت کسی مرض سے نجات حاصل کر سکتا ہے جب کہ اُسے اپنی بیماری کا احساس ہو۔ اکبر نے نہایت واشگاف الفاظ میں قوم کی اس بے عملی کو بے نقاب کر کے اس کے سامنے عمل کی راہ رکھی تاکہ وہ اپنے کھوئے ہوئے وقار کو حاصل کر سکے۔ اکبر کو اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ خالی خولی روحانی ترقی کسی کام کی نہیں۔ انہوں نے توحید کو جمعیت اور یک جہتی کا جو وسیلہ بنایا ہے اس میں بھی یہی نکتہ کارفرما ہے کہ وہ مسلمانوں کو وحدت کی قوت سے آشنا کرنا چاہتے ہیں کہ وحدت ہی سے قوت جنم لیتی ہے۔ چنانچہ اگر وہ روحانی ترقی پر زور دیتے ہیں تو ساتھ ساتھ وہ حیاتیاتی استحکام کے بھی داعی ہیں۔

چنانچہ ان کی عملیت قوت و توانائی ہے تاکہ مسلم معاشرہ اپنا کھویا ہوا مقام پا سکے۔

بلا طاقت یہ اخلاک انساں کی نہیں چلتی — وہاں تو ریل چلتی ہے یہاں روٹی نہیں چلتی
اے جدِ بزرگ کے نواسو پوتو — تزئین کرتہ کرو زمینیں جوتو
کیا رٹتے ہو اپنی ہسٹری کو ہر وقت — اللہ مدد کرے گا ویسے ہو تو
خدا حافظ مسلمانوں کا اکبر — مجھے تو ان کی خوشحالی سے ہے یاس
یہ عاشق شاہدِ مقصود کے ہیں — نہ جائیں گے ولیکن سعی کے پاس

اکبر کے نظامِ فکر میں اس عملیت و حرکیت کو جس سانچے کے حوالے سے متشکل کرنے کی کوشش کی گئی ہے وہ معاشی سانچہ ہے۔ اکبر کو اپنے عہد کے جن رجحانات سے شدید اختلاف تھا ان میں سے ایک گورنمنٹ کی ملازمت ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اکبر گورنمنٹ کے ملازم تھے لیکن تجربے سے وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ اس شکل کو اجتماعی سطح پر قبول کرنے کا مطلب قومی خودکشی کے مترادف ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اگر اس ذریعۂ معاش سے انحراف کیا جائے جو کہ اس وقت ایک بڑا ذریعہ تھا تو متبادل صورت کیا ہو۔ اس سوال کے جواب کے لئے اگر آپ اکبر کے کلام کا بغور مطالعہ کریں تو آپ کو اکبر کے یہاں اپنا متبادل لائحہ عمل نہایت وضاحت سے ملتا ہے۔ اکبر کو اس بات کا گہرا شعور تھا کہ معاشی سطح پر آزادی اور ترقی ہی ایک مکمل آزاد اور مختار معاشرے کو جنم دے سکتی ہے اور ظاہر ہے کہ کوئی قوم بھی اس وقت تک معاشی آزادی سے ہمکنار نہیں ہو سکتی جب تک وہ ملازمتوں پر انحصار کرے اور نہ ہی اس طرح کسی قسم کی معاشی خودکفالت ممکن ہے۔ خودکفالت کے بارے میں صرف اسی صورت میں سوچا جا سکتا ہے کہ افراد کا پیداواری وسائل پر کنٹرول ہو۔ اس میں بھی شک نہیں کہ عہدِ غلامی میں ملکی وسائل کو کسی بڑے پیمانے پر استعمال کرنے کی کوئی گنجائش نہ تھی لیکن دوسری طرف سرکاری ملازمتوں کے واسطے سے ہی معیشت میں کسی انقلاب کی توقع نہ تھی۔ یہ ملازمتیں چند سکوں کے عوض افراد کو اپنے گروہ کے مفادات سے الگ کر کے برطانوی بادشاہت کے لئے ان کی وفاداریاں اور صلاحیتیں خرید لیتی تھیں۔ یوں معاشی غلامی نے افراد سے سرے کی وہ آزادی بھی چھین لی جو قوم کے اپنے وجود کے لئے ضروری ہے جب کہ دوسری طرف اکبر کا اصل منشا ایک ایسے طرزِ احساس کو پیدا کرنا تھا جس کے باعث افراد قوم کی سطح پر اپنی کلیت سے ہمکنار ہو سکیں۔ چنانچہ اکبر نے اس اجتماعی طرزِ احساس کو پیدا کرنے کے لئے اپنا سارا زور اس بات پر صرف کیا کہ مسلمان انگریزوں کی ملازمتوں کو منفور بنانے کے بجائے کاروبار اور زرعی میدان میں اپنی توانائیاں صرف کریں۔

صنعت و حرفت برِ صغیر میں چاہے کتنے چھوٹے پیمانے پر کام کر رہی تھی بہرحال اس کا ایک مستقل کاروباری وجود تھا اور بے شمار افراد کی معاشی خود کفالت صنعتی زندگی سے وابستہ تھی۔ انگریز برِ صغیر میں خام مال کی تلاش میں آئے تھے اور دوسری طرف انہیں اپنی صنعتی پیداوار کے لئے منڈیوں کی ضرورت تھی۔ چنانچہ انہوں نے باقاعدہ پلاننگ کے تحت مقامی صنعتوں کو ختم کرنے کی کوشش کی اور اس سلسلہ میں انسانیت سوز مظالم تک ڈھائے گئے لیکن ظلم کی اس ساری صورت حال سے قطع نظر جس چیز نے مقامی صنعتی اور زندگی پر بھرپور وار کیا، وہ انگریزوں کے وہ تصورات تھے جو انہوں نے دستکار کے بارے میں پیدا کرنے کی کوشش کی۔ دستکار کے مرتبے اور مقام کو کم کرنے اور لوگوں کے دلوں میں ہاتھ سے کام کرنے والے کے لئے نفرت پیدا کرنے کے لئے انہوں نے مقامی معاشرے کو "کمین" کا تصور دیا جب کہ دوسری طرف جاگیرداروں کو جو صرف گھوڑے تیتر اور بٹیر لڑا کر اپنا وقت گزارتے تھے "خان" کے لقب سے نوازا گیا۔ اس طرح بے عملی کو ایسا سنہرا روپ دیا گیا کہ جس نے معاشرے کے ایک بڑے طبقے کو ناکارہ کر دیا۔ دوسری طرف دستکار کے مرتبے کو کمین کی اصطلاح سے کم کیا اور پہلے جو کام انگریز نے ظلم سے کیا تھا، اب آہستہ آہستہ لوگوں کی توجہ خود بخود کام سے ہٹنے لگی اور کام کو گھٹیا سمجھ کر نیچ طبقے کے لئے چھوڑ دیا گیا۔ انگریزوں نے یہ صورت حال اس لئے پیدا کر دی تھی کہ اس طرح نہ تو برِ صغیر معاشی طور پر خود کفیل ہو سکتا تھا اور دوسری طرف برطانیہ کی صنعت کو بھی دوام مل سکتا تھا کہ اُسے ایک بہت بڑی منڈی مہیا رہتی۔ اکبر انگریزوں کی اس تاجرانہ ذہنیت سے پوری طرح آگاہ تھے اور معاشی سطح پر انگریزوں نے جو لوٹ کھسوٹ مچا رکھی تھی، اس کو دیکھ کر اُن کے حساس دل و دماغ میں تڑپ پیدا ہو رہی تھی۔ انہوں نے انگریزوں کی اس ذہنیت کا اتنے بھرپور انداز میں تجزیہ کیا ہے اور اتنے سائنٹیفک انداز میں اصل عوامل اور محرکات پر انگلی رکھی ہے کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔

قطعات:۔

یہ بات غلط کہ ملکِ اسلام ہے ہند — یہ جھوٹ کہ ملکِ لچھمن و رام ہے ہند
ہم سب ہیں مطیع و خیر خواہِ انگلش — یورپ کے لئے بس ایک گودام ہے ہند

خواہش ہے اگر تجھے غنی بننے کی — دولت کی ہوس ہے اور غنی بننے کی
شخصی حالت کو چھوڑ کر اے ہندی — کوشش لازم ہے کمپنی بننے کی

اشعار:۔

علم یورپ کا ہوا میدان وسیع — رزق میں ہندی کے تنگی ہو گئی
بازارِ مغربی کی ہوا سے خدا بچائے — میں کیا مہاجنوں کا دوالا نکل گیا

مندرجہ بالا اشعار کو پڑھتے ہوئے شاید تھوڑی دیر کے لئے ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ اکبر ایک مزاحیہ شاعر ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ اشعار کسی بالغ نظر ماہر معاشیات کے تجزیے سے کم نہیں کہ انگریزوں نے جس طرح ہندوستان کو خام مال کے لئے "گودام" کے طور پر استعمال کیا اور اجتماعی سطح (کمپنی) پر لوٹ کھسوٹ کی اس کا اکبر نے نہایت ماہرانہ انداز میں تجزیہ کیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے ملکی قوتوں کو صنعت و حرفت اور زراعت کی اہمیت سے جس طرح اور جس شدت کے ساتھ آگاہ کیا اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ آزاد معیشت کے وہ کتنے قائل تھے

اور قومی عروج و ترقی کے لئے اس کو قدر ضروری خیال کرتے تھے جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں اکبر جس طرز احساس کو پیدا کرنا چاہتے تھے وہ گورنمنٹ کی ملازمت میں رہ کر نہ تھا اس کے لئے معاشی زندگی کی آزادی نہایت ضروری تھی۔ صنعت و حرفت اور زراعت کو معاشی نظام میں بنیادی مقام دلانے کے لئے اکبر نے جو محسوس کیا اس کا اظہار انہوں نے کثرت سے اپنی شاعری میں کیا ہے جس کی وسعت کا اندازہ ان کے کلیات پڑھ کر ہی لگایا جا سکتا ہے یہاں اختصار کی خاطر چند اشعار پیش کرتا ہوں۔

زوالِ قوم کی ابتدا وہی تھی کہ جب تجارت آپ نے کی ترک نوکری کر لی
کچھ پڑھ کے تو صنعت و زراعت کو دیکھ عزت کے لئے کافی ہے اے دل نیکی

(یعنی گورنمنٹ کی ملازمت اکبر کے نزدیک عزت کا نشان نہیں)

باقی ہیں قومیں تجارت سے عروج بس یہی ان کے لئے معراج ہے
ہے تجارت واقعی اک سلطنت زور یورپ کا اسی سے آج ہے
لفظ تاجر خود ہے اے اکبر ثبوت دیکھ لو تاجر کے سر پر تاج ہے
سعی بازو سے کرے جو کسبِ رزق بس وہی اللہ کا مہمان ہے
سہ کچھ صنعت و حرفت پہ بھی لازم ہے توجہ آخر یہ گورنمنٹ کی تنخواہ کہاں تک
نہ تجارت کا سلیقہ نہ عبادت سے لگاؤ یا گورنمنٹ کے دفتر میں ہیں یا قوم کے سر

اکبر کے نزدیک آزاد معیشت کا سوال تعلیم سے اس حوالے سے وابستہ ہے کہ اعلیٰ تعلیم کے بجائے وہ فنی تعلیم کی ضرورت پر زور دیتے ہیں بات کہی جاتی ہے کہ سرسید نے ایک موقعہ پر فنی تعلیم کی مخالفت کی تھی لیکن اس مخالفت سے قطع نظر ان کا مجموعی رجحان اعلیٰ تعلیم کی جانب ہی تھا یہ ہمارا قومی المیہ ہے کہ سرسید احمد خان ایسے مخلص اور پر خلوص شخص بھی بالکل غیر شعوری طور پر افراد کو انہیں سانچوں میں ڈھالتے رہے جن کی انگریز کو ضرورت تھی لارڈ میکالے کا یہی وہ نظام تعلیم تھا جس کے بارے میں وہ رقمطراز ہے۔ "ہمیں ایک ایسی جماعت بنانی چاہیئے جو ہم میں اور ہماری کروڑوں رعایا کے درمیان مترجم ہو اور یہ جماعت ایسی ہونی چاہیئے جو خون اور رنگت کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو مگر مذاق اور رائے اور اظہار و فہم کے اعتبار سے انگریز ہو۔"

چنانچہ جب ہم اکبر کا تعلیم کے بارے میں تنقیدی رویہ دیکھتے ہیں تو ان کی مخالفت محض مخالفت برائے مخالفت نہیں رہتی اور نہ ہی وہ اپنے آپ کو جزیرے میں رکھنے کے متمنی ہیں بلکہ وہ تو دراصل تعلیمی رویے کے اس بنیادی نقص کی نشاندہی کرتے ہیں جو فرد کو سطحیت کا شکار کر دیتا ہے۔ یوں اکبر کا تنقیدی رویہ نہ صرف یہ کہ تعمیری نوعیت کا ہے بلکہ اس کے پس پشت مسائل کو گہرے ادراک سے قبول کرنے اور ان کو صحیح صورت حال میں لانے کا جذبہ ہے۔ چنانچہ وہ بیک وقت مغرب اور مسلمانوں کی غلط روش دونوں کو ہدف ملامت بناتے ہیں۔ اکبر کی یہ تنقید رنگ لائی اور آزادیٔ رائے اور آزاد معیشت کے تعلق کو محسوس کر کے جامعہ ملیہ دہلی نے اپنا نصاب اور لائحہ عمل مرتب کیا۔ اکبر کس طرح تعلیم، معیشت اور ترقی کو لازم و ملزوم خیال کرتے تھے اور عام تعلیم کی سطحیت سے کس قدر آشنا تھے اس سے آگاہی کے لئے چند اشعار ملاحظہ فرمایئے۔

انجن آیا نکل گیا زن سے سن لیا نام آگ پانی کا

بات اتنی اور اس پہ یہ طُومار ــــ غل ہے یورپ کی جانفشانی کا
علم پورا ہمیں سکھائیں اگر ــــ تب کریں شکر مہربانی کا

؎ تکمیل ہیں ان علوم کے ہو مصروف ــــ نیچر کی طاقتوں کو جو کریں مکشوف

؎ عزم کر تقلیدِ مغرب کا ہنر کے زور سے ــــ لطف کیا لہرائیے موٹر پر زر کے زور سے
غیر ملکوں میں ہنر کو سیکھ تکلیفیں اٹھا ــــ روک سکتے ہیں وہ اگر اپنے اثر کے زور سے

؎ مغربی علم و ہنر تو خوب ہے اکبر مگر ــــ اپنی اس تعلیم پر ہم آفریں کیونکر کریں

؎ تعلیم اگر نہیں ہے زمانے کے حسبِ حال ــــ پھر کیا امیدِ دولت و آرام و احترام

اکبر کی اس ساری تنقید میں ہمیں ایک مثبت رویّے کا بھرپور احساس ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اکبر نے اپنے تھوڑے سے ابتدائی دَور کے علاوہ جس ذہنی سطح پر زندگی بسر کی اور جس فکری نظام کو انہوں نے تخلیقی سطح پر پیش کیا اس میں ذاتیات اور منفی رویّے کی گنجائش نہیں بلکہ ایک اجتماعی طرزِ احساس کی بھرپور جھلک ملتی ہے۔ یہ طرزِ احساس ایک طرف تو جزیرگی کے اُس رجحان کی نفی ہے جو ہماری تنقید اکبر کو رجعت پسند کے حوالے پیش کر کے ظاہر کرتی رہی ہے اور دوسری طرف ایک ایسے مفکّر کا طرزِ عمل ہے جو زندہ عناصر کو جذب کرنے کا خواہشمند ہے۔ اگر اکبر کے اس نظامِ فکر کو ذرا غور سے دیکھا جائے تو ہمیں بیک وقت ثبات و تغیر کا ایک ایسا فلسفہ نظر آتا ہے جو صورتِ حال کے مفکرانہ تجزیے کا نتیجہ ہے۔

اکبر کا عہد جس طرح تبدیلی و تغیر کو قبول کر کے اساسی تصورات سے بھی گریز پائی اختیار کر رہا تھا اکبر اس کے خلاف تھے۔ اکبر بھی یہ محسوس کرتے تھے کہ معاشرتی و سماجی ڈھانچے میں دراڑیں پڑ چکی ہیں اور ایک تبدیلی کی ضرورت ہی نہیں بلکہ وہ ناگزیر بھی ہے۔ لیکن وہ انقلاب کے کسی ایسے تصور کو قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ جو سرے سے اس ڈھانچے کی بنیادیں ہی بدل ڈالے۔ چنانچہ انہوں نے بھرپور انداز میں بنیادی اقدار میں ثبات اور وقتی مسائل میں تبدیلی کو اپنا اصول بنا کر پیش کیا۔ دوسرے لفظوں میں ہم انہیں ایک ایسا تجدیدی مفکر قرار دے سکتے ہیں جو بیک وقت دین اور زمانی شعور کو یکجا کرنا چاہتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ اکبر نے یہ تجدیدی کارنامہ کسی بڑی سطح پر انجام نہیں دیا لیکن وہ اس راستے کی نشاندہی کرتے ہیں، اس طرح سے اپنی اقدار اور روحِ عصر میں ایک توازن قائم کر رہے تھے ــــــ ــــــ

ــــ یہ توازن دوسری سطح پر مغرب اور مشرق کے درمیان بھی توازن ہے کہ وہ مشرقی اقدار کی بنیادیت کے ساتھ ساتھ مغربی ترقی کے عمدہ پہلوؤں کو قبول کرتے ہیں۔ اسی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر وزیر آغا صاحب اپنی کتاب "اردو ادب میں طنز و مزاح" میں رقمطراز ہیں۔

> "اکبر الٰہ آبادی کے عقائد اور مقاصد چاہے کچھ بھی کیوں نہ ہوں یہ ایک حقیقت ہے کہ ان کی طنز نے مغربی تقلید کی طوفانی رَو میں دھیما پن ضرور پیدا کیا اور یوں اپنے ملک کی ان ادبی، تمدنی اور مذہبی روایات کا تحفظ کیا جو بصورتِ دیگر فنا ہو جاتی۔ اس ضمن میں اکبر مرحوم کے کلام کا وہ حصّہ بھی قابلِ توجہ ہے جس میں انہوں نے مغرب کو نشانۂ طنز بنانے اور مشرق کو ایک مقامِ بلند پر دکھانے کے بجائے ان دونوں میں ایک توازن پیدا کرنے کا درس دیا ہے۔"

اس توازن کی ایک شکل تو وہی ہے جس میں اکبر نے مغربی دنیا کی سائنسی اور فنی ترقی کو قبول کر کے اس کی اہمیت کا احساس دلایا ہے اور دوسری طرف اپنی اقدار کی بنیادیت کا وہ شعور ہے جو انقلاب کے برعکس تغیر کو قبول کرتا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ کسی قوم

کی تعبیر اس صورت نہیں ہو سکتی کہ وہ اپنے ماضی سے بالکل کٹ کر ایک بالکل نئے تصورِ حیات و کائنات کے حوالے سے ابھرنے کی کوشش کرے بلکہ اس کی زندگی ماضی کے صالح اور زندہ عناصر اور زمانی شعور کے حوالے ہی سے قائم ہو سکتی ہے۔ اکبر کے یہاں ثبات اور تغیر کا یہی فلسفہ ہے جو انہیں ماضی اور حال دونوں سے منسلک رکھتا ہے۔

اک برگِ مضمحل نے یہ اسپیچ میں کہا — موسم کی کچھ خبر ہے اے ڈالیو تمہیں
اچھا جواب خشک یہ اک شاخ نے دیا — موسم سے باخبر ہوں تو کیا جڑ کو چھوڑ دیں
کارِ دنیا شوق سے کرتے رہو اے دوستو — لیکن اس کے ساتھ بگڑا کارِ دیں تو کچھ نہیں
میں نے مانا کہ بہت تیز ہیں یورپ کے کمیں — آپ شہتیر نہیں ہیں کہ چڑھے جاتے ہیں
کون کہتا ہے کہ تو علم نہ پڑھ عقل نہ سیکھ — کون کہتا ہے نہ کر حسرتِ لندن پیدا
بس یہ کہتا ہوں کہ قسمت کے معانی کو نہ بھول — راہِ قومی کا تو خود ہی نہ ہو رہزن پیدا

اکبر کا یہ بصیرت افروز رویّہ بلاشبہ حالات و واقعات کے گہرے تجزیے سے ابھرا ہے۔ اس پس منظر میں ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار صاحب کی یہ رائے بڑی وقیع معلوم ہوتی ہے کہ "سیاسی و سماجی مسائل کے بارے میں ان کا زاویۂ نظر بڑا حکیمانہ (سائنٹیفک) تھا۔ وہ مغرب کے مادی و علمی عروج اور مشرق کے ذہنی و روحانی زوال کو ایک حقیقت پسند مفکر کی نظر سے دیکھ کر اس کا تجزیہ کر رہے تھے۔"

قیّوم نظر

آج

اپنی محرومیوں کی صداؤں پہ لبّیک کہتے ہوئے
رنج سہتے ہوئے
بیتے برسوں کے دامن سے لپٹی ہوئی زندگی
تہ بہ تہ تیرگی کے نہاں خانۂ جبر سے
روشنی کو جھلکتے ہوئے دیکھتی زندگی
اک نئے عزم کی جانگسل لذّتوں،
بے اماں ولولوں کی سجل وسعتوں سے ہم آہنگ ہے

آج بیدادگر، چارہ گر کی
سلگتی زمیں سے دگر اک جہاں
اِک عقیدے کی بنیاد پر اِک جہاں
اِک وطن
چاند تارے کا مامن وطن
حق و عدل و مساوات کے گُل کھلاتا چمن
جس کی تعمیر کا مرحلہ خواب
تعبیر کے اوّلیں خوں چکاں مرحلوں سے گذرتا ہوا
سرحدوں کے تعین کی جنّت نشاں وادیوں میں اترتا ہوا
اِک حقیقت کی آغوش میں مسکرانے لگا ہے

آج مایوسیاں ہیں
نہ چہروں پہ ناکامیوں کی جمی گرد ہے
آج پیر و جواں
تابناک آرزوؤں کے مرکز پہ
جوشِ پذیرائی میں جمع ہیں
ہر بشر قوم ہے، قوم اک فرد ہے
آج مایوسیاں ہیں نہ چہروں پہ ناکامیوں کی جمی گرد ہے!

تخت سنگھ

تصویر کے دو رُخ

شفق زار کا گدگدا جھٹ پٹا تھا
تھی تحلیل قوسِ قزح سی دھوئیں میں
گداز اس قدر جھیل کا آئینہ تھا
گھرا اونچی، عریاں، کہن چوٹیوں میں
کٹورا سا تھا جو لبالب بھرا تھا
وہ جادو چلا شام کی ساحرہ کا
شفق کے تبسّم کا رنگ اُڑ چلا تھا
شفق زار کے اس بھرے جھٹ پٹے کو
اندھیرا غٹا غٹ پیئے جا رہا تھا
چٹانوں کی درزوں سے باریک پانی
پھسلتا ہوا لے زباں لگ رہا تھا
پلوں پر تھا طاری غشی کا وہ عالم
کہ سانس اونگھتی چپ کا بھی گھٹ رہا تھا
جو پیڑ ایڑیوں کو اٹھائے کھڑا تھا
طلوعِ مہِ نَو کی رہ دیکھتا تھا

ڈھندلکوں میں گم سُم کھڑی اونٹنی پر
کوئی شتر باں جانے کیا سوچتا تھا
معاً یاد آیا کہ کوہان ایسا
سرِ کوہ میرا ہی تو جھونپڑا تھا
پُر اسرار ماحول کا ذرہ ذرہ
کہ فقدانِ احساس میں مبتلا تھا
اپاہج سا، مختل سا، بے دست و پا تھا

اچانک کہیں سے گھٹا گھر کے آئی
گھٹا گھر کے آئی، ہوا ساتھ لائی
برسنے لگا مینہ، دُھواں دھار برسا
دھواں دھار برسا، لگاتار برسا
قیامت سی برپا تھی حدِ نظر تک
ہوا نے تھپیڑوں سے لہروں کو پیٹا
یہاں سے وہاں تک، اُدھر سے اِدھر تک
بلکتے ہوئے پانیوں کو گھسیٹا
تھے محوِ فغاں پیڑ، اُس کی بلا سے
حباب اُس نے ٹھکرا دیئے نوکِ پا سے

سیہ ابر کے اُونٹ نے بھوتنی سے
اُدھر بجلیوں کے شرارے نکالے
اِدھر قہقہے بادلوں کی گرج نے
مسلسل دھماکوں کے سانچے میں ڈھالے
اُدھر ٹخنوں تک گہرے سیلِ رواں میں
بہر گام پل پل بھنور پڑ رہے تھے
اِدھر جھونپڑی تک پہنچنے کو جم کر
مرے پاؤں طوفان سے لڑ رہے تھے

میں کُٹیا میں پہنچا، میں کچھ دیر ہانپا
ہوا کو سُنا، زورِ طوفاں کو بھانپا
ابھی جانے کیا ہو، یہ سوچا تو کانپا

میں جاگا تو دیکھا، سہانی سحر ہے
پہاڑی کا دامن ہے، ننھا سا گھر ہے
عناصر جو کل رات مجھ سے خفا تھے
غضبناک تھے، بے سبب سیخ پا تھے
مجھے دیکھ کر زیرِ لب ہنس رہے ہیں
فضا، پیڑ، سب راستے ہنس رہے ہیں

بلراج کومل

صبا کے ہاتھ پیلے ہو گئے

صبا کے ہاتھ پیلے ہو گئے
میں ساعت سرشار میں
لاکھوں دعائیں
خوبصورت آرزوئیں
پیش کرتا ہوں
صبا ممنون ہے
لیکن زباں سے
کچھ نہیں کہتی

صبا اب روز و شب
دیوار و درِ تن پر سجاتی ہے
اب آنچل چھت کا سر پر اوڑھتی ہے
لمس فرش مرمریں سے
پاؤں کی تزئین کرتی ہے

وہ کہساروں، شگفتہ وادیوں، جھرنوں
چمکتے، نیلگوں آکاش کے
نغمے نہیں گاتی
صبا اب لالہ و گل کی طرف شاید نہیں آتی
صبا شبنم ادا، تصویر پابستہ
درِ روزن میں آویزاں
حسیں، نازک بدن
روشن، منور ساحلوں پر اب نہیں بہتی
صبا لب کھولتی ہے، مسکراتی ہے
صبا سرگوشیوں میں
اب کسی سے کچھ نہیں کہتی !!

منیر نیازی

جگنو چمک رہا ہے

جگنو چمک رہا ہے
جگنو بھٹک رہا ہے
دامِ سیاہِ شب میں
املی کی ڈالیوں میں
خوابیدہ در کے باہر
مکڑی کی جالیوں میں
تنہا نگاہِ شب میں
مثلِ خیال روشن
خوابِ سیاہِ شب میں
جگنو چمک رہا ہے

بلراج کومل

صبا کے ہاتھ پیلے ہو گئے

صبا کے ہاتھ پیلے ہو گئے
میں ساعتِ سرشار میں
لاکھوں دعائیں
خوبصورت آرزوئیں
پیش کرتا ہوں
صبا ممنون ہے
لیکن زباں سے
کچھ نہیں کہتی

صبا اب روز و شب
دیوار و در تن پر سجاتی ہے
اب آنچل چھت کا سر پر اوڑھتی ہے
لمسِ فرشِ مرمریں سے
پاؤں کی تزئین کرتی ہے

وہ کہساروں، شگفتہ وادیوں، جھرنوں
چمکتے، نیلگوں آکاش کے
نغمے نہیں گاتی
صبا اب لالہ و گل کی طرف شاید نہیں آتی
صبا شبنم ادا، تصویر پا بستہ
در روزن میں آویزاں
حسیں، نازک بدن
روشن، منور ساحلوں پر اب نہیں بہتی
صبا لب کھولتی ہے، مسکراتی ہے
صبا سرگوشیوں میں
اب کسی سے کچھ نہیں کہتی!!

منیر نیازی

جگنو چمک رہا ہے

جگنو چمک رہا ہے
جگنو بھٹک رہا ہے
دامِ سیاہِ شب میں
املی کی ڈالیوں میں
خوابیدہ در کے باہر
لکڑی کی جالیوں میں
تنہا نگاہِ شب میں
مشعلِ خیال روشن
خوابِ سیاہِ شب میں
جگنو چمک رہا ہے

عبد العزیز خالد

حکایت و شکایت

دل عشقِ مجازی میں گرفتار ہے اب تک
للچاتے ہیں با وصفِ تبتّل اسے اب بھی
پیراہنِ شب جرت سے جن کی سُلگ اُٹھے
گو سمتِ خدا سیر بھی معمول ہے اس کا
ذکر اس متفنّن کا کروں کیا کہ اسے تو

تھا ساتھ سلیماں کے یہ، خاتونِ سبا نے
بغداد میں گھوما ہے بہت بھیس بدل کر

بیتا ہے اساطیر کا ہر واقعہ اس پر
اُڑ سچ کے نظارے سے نہ آپے میں رہے یہ
مچلا ہے بہت اس سے لپٹنے کو دمِ رقص
پہچان لے سنتے ہی صدائے قدم اس کی
ہے سیرنیٔ نقدِ مقاماتِ حریری
کم کم ہی اثر اس پہ ہو اوروں کی روش کا
جلوت سے زیادہ اسے مرغوب ہے خلوت
شوق اس کو نہیں طوفِ خراباتِ مغاں کا
ہر علم میں گو طاق سمجھتا ہے یہ خود کو
تمکین کا یہ رنگ یہ تلوین کا عالم
اوڑھی ہے تقشّف کی قبا بوالہوسی نے
قائل ہمہ از اوست کا اس کے لئے یکساں
اورنگ نشینوں کو کھٹکتی ہے نسب نے

زحمت کشِ بسیاریٔ خوبانِ سہی قد
بالائے بلند و لب و رخسارِ مورّد
کر دیتے ہوئے جسمِ جوان و متجرّد
بھرتا ہے مگر حسن کا دم بھی بہ شد و مد
بچپن میں لبھاتے رہے پُر عربدہ امرد
جب پنڈلیاں کھولیں سرِ صرحِ ممرّد
گو جعفر و منصور سے رہتی تھی رد و کد
چھوٹی نہ اچھوتی غم و لذّت کی کوئی مد
اُنمد ہی نظر آیا ہے دیکھا ہے اسے جد کد

رقّاصہ و طنّاز کا دامانِ ممدّد
وہ چشمۂ جُلجُل ہو کہ یا بُرقۂ شہمد
جاحظ ہے جلیس اس کا، ندیم اس کا مبرّد
اپنا ہی الاپے کوئی موسم ہو یہ دُھرپد
محتاجِ مرکّب نہیں یہ جوہرِ مفرد
پیتا ہے لبِ لعل کی صہبائے مصعّد
ہو ذہن نشیں اس کے نہ توحید کی ابجد
شب مومن و مرتاض، سحر ملحد و مرتد!
فاسق ہے سمجھتا ہے زمانہ اسے مُہتد
وہ دیر و کلیسا ہو کہ میخانہ و معبد
کس واسطے سرمستی و عریانیٔ سرمد؟

ہیں جتنے جہاندار حقیقت میں ہیں خرکار
ہوگا تہِ گردوں نہ کوئی ان کی طرح بد

شوریدہ سری ان کی نہیں عفو کے قابل
معبود کا جو عبد ہے وہ ان کا معبد

ابلیس سرشتانِ شبستانِ شہی نے
دام اپنے بچھائے ہیں بہر مکمن و مرصد

ظاہر مگر آزادیٔ اظہار سے خائف
ہیں ریت کا تودہ پہ لگیں صخرۂ جلمد

اغماض نظر کرکے مقاماتِ بشر سے
فطرت کے تقاضوں کو کریں قاطبۃً رد

کیا کو تُنک والوں کو خبر اصلِ زمیں کی
پستی کی اڑاتا ہے ہنسی بُرجِ مشید

مشکل سے ہو سرِ جنگِ جمل، قلب و شکم کی
ہیں دونوں ہی ثابت قدم و مقبل و معتد

میں خواب و حقیقت کے دورا ہے پہ کھڑا ہوں
ہے اور نہیں ہے ہوسِ گوہر و نُبتد

دونوں صفتیں مجھ میں ہیں موجود برابر
چاہے تو مُخَضرم کہو چاہو تو مُوَلَّد

آلودۂ عصیاں ہے مرے جسم کا رُواں رُواں
عاید نہ کہیں کردے کوئی اہلِ قضا حد!

حکمت ہے بلا شرکتِ غیرے مری تملیک
ملتی ہو جہاں سے بھی کروں اس کو درآمد

قدرت ہے مجھے جملہ اسالیبِ بیاں پر
آورد کو آتا ہے بہت تا ناجھے آمد،

الفاظ میں آباد طلسمات کی دُنیا
اندازِ سخن جامع و تہ دار و معقّد

منکر ہیں جو میرے میں اُلجھتا نہیں اُن سے
کام اہلِ کدورت کا ہے حقد و حسد و کد

صدیاں مرے دروازے پہ کیوں دیتی ہیں دستک
کیا مِل گئی ان کو خبرِ عمرِ مخلّد؟

اے مدّعیٔ فقر! تعلّی سے حذر کر
سرمایہ ہے کیا تیرا بجُز بُردِ مُجسّد؟

ہے اس قدر اپنی جو فتوحات پہ نازاں
اوروں کے کمالات سے واقف نہیں شاید

مشکل سے اُترتا ہے نشہ چڑھ کے خودی کا
اس راہ میں پھسلن ہے بہت، دیکھ کے دھر پد

چند صیادے کہیں تجھ کو نہ لشکارنے سے اپنے
کنگن کسی کامن، کسی مٹیار کا انگد،

حق مہر ہے بُدھ اس کا، جہیز اس کا ہے بن باس
بیٹی وہ جنک کی ہو کہ یا دُختِ دروپد

ہے بال سے باریک رہِ ترک و توکل
کر فرق کفِ دستِ جنالبتہ و ممتد!

دعویٰ تھا بہت مجھ کو خبر داریٔ دل کا
دیکھا جو سرِ محفلِ جاناں تو ندارد،

شیرازۂ افکارِ پریشاں ہے ابھی تک
کب دیکھیے دفتر ہو یہ مجموع و مجلّد!

ہے حرتی اللہ کی تلوار کا خالد
دکھلاتی ہے چم خم اسے کیا تیغ مہنّد!

غلام جیلانی اصغر

بچّوں کے درمیان

میں پھول، پتّوں سے، شاخساروں سے
رنگ و بُو سے گِھرا کھڑا ہوں!
تمام دن نرم رَو ہوائیں میرے اُدھڑتے بدن
کی شاخوں سے جھُولتی ہیں
سفید مرمر سی مسکراہٹ جو ماما سے ڈھلی ہُوئی ہے
کھُلے دریچوں سے آ کے
میرے گئے دنوں کو پکارتی ہے
جو بال گردِ سفر میں اَٹ کر اُلجھ گئے ہیں
کوئی ملائم سی پور انگلی کی،
ان کو دن بھر سنوارتی ہے
میں کتنے رنگوں کی تتلیوں میں گِھرا کھڑا ہوں!
کوئی پروں کا تمام سونا
میرے شکستہ، اُداس چہرے پہ مل گئی ہے
کوئی بس اِک چھین کو پاس آ کر
ہوا کی صورت نکل گئی ہے
میں اِن کے رنگوں کی ساری خوشبو سے اپنی چہرہ سنوار لوں گا
میں عمرِ رفتہ کی سلوٹوں کو بدن سے یکسر اتار دُوں گا

احمد ظفر

ہونے نہ ہونے کا عذاب

"تُو وہ نہیں ہے،
میں وہ نہیں ہوں؟
میں رات خوشبو سے کہہ رہا تھا
جو میرے بستر پہ میرے پہلو میں لیٹے لیٹے
کہانیاں سی سنا رہی تھی
میں اس کے چہرے کو اپنے ہاتھوں سے چھُو رہا تھا
وہ میرے ہونٹوں پہ ہونٹ رکھے یہ پوچھتی تھی
"..... تو کون ہیں ہم؟
جو آشنائی کے زرد صحرا میں اجنبی ہیں
ہماری آنکھوں میں زندگی کی مسافتیں ساعتوں میں
ڈھل کر
ہمیں جو آواز دے رہی ہیں
تو کون ہیں ہم؟
ہمارے ناموں سے کیوں پکارا گیا ہے ہم کو؟
یہ خوف کیا ہے، چراغ جس نے بجھا دیئے ہیں؟
ہوا کے جھونکے سے کیسی وحشت برس رہی ہے؟
بکھرتے جسموں کا وہم کیا ہے؟"

سوال کتنے تھے اس کے لب پر
شجر سے اُتری ہوئی حسینہ
جو میری نس نس میں جاگتی تھی
جواب دوں تو جواب کیسا؟
کہ میں تو خود لا کے بیکراں میں بھٹک رہا ہوں
ازل کا بے نام لفظ جس کو
ابد کی بے رحم خامشی نے نگل لیا ہے
میں اپنی پہچان کے حوالے سے بار ہا بے نشاں رہا ہوں

خیال کی وہ پری وہ خوشبو
ہوا کا نوحہ بنی ہوئی ہے
ہوا جو زینہ ہے آسماں کا
اُتر کے جس سے وہ میرے آنگن میں آگئی تھی
وہ چاند کے آئینے میں جُھک کر یہ کہہ رہی تھی
کہوں کہ میں ہوں
کہوں کہ وہ تھی"

جمیل یوسف

تمہارے لیے ایک نظم

تم ایک تتلی ہو، نرم و نازک، حسین و دلکش
خزاں زدہ باغ میں
درختوں کی ننگی شاخوں پہ
رس بھرے پھول دیکھنے کی طلب تمہاری نگاہ میں ہے،
ہوا کی ناؤ میں بیٹھ کر
جانے کون سے ساحلوں کی جانب رواں دواں ہو
تم اپنے سپنوں کو جانے کن خواب کے جزیروں میں دیکھ پاؤ
کسے خبر لوٹ سکے بھی آؤ؟
مگر تمہارے حسیں پروں کی گداز لرزش
فضا میں اک گیت لکھ رہی ہے
ہوا میں اک ساز چھیڑتی ہے
کرن کی صورت مری نظر میں سما گئی ہے

اس بازار میں

نازک نرم رسیلے منظر
جن کے ہونٹوں پر شبنم کے موتی چمک رہے ہیں
جن کے رخساروں پر کچّی اور کنواری روشنیاں ہیں
جن کی آنکھوں میں بچپن کی حیرت ہے
جن کا بدن انگڑائی جیسے قوسِ قزح کی
جیسے دو حیران کبوتر
جیسے دو لچکیلی شاخیں
ریت کے ریشم میں گم ہوتی
جیسے اک البیلا بوٹا —
جیسے جادو کی تحریریں
جیسے ہرنوں کی تصویریں
یہ تحریریں
یہ تصویریں
اس بازار میں
دیکھتے دیکھتے لٹ جاتی ہیں
نازک نرم رسیلے منظر
خاک میں جیسے رُل جاتے ہیں،

سہیل احمد

پرندوں کی بولی

در عشق سلیمانم، من ہمدم مرغانم (رومی)

بہت دن ہوئے
ایک تالاب کے پاس میں نے پرندوں کو دیکھا
فلک پر بھٹکتے ہوئے چند بادل تھے
اور صبح کی دھوپ میں ہلکی ہلکی سی ٹھنڈک
وہاں گہرے تالاب کے پاس اونچے درختوں کی اُس اوٹ میں
دھوپ کی ٹھنڈی ٹھنڈی سی کرنوں سے لپٹے ہوئے سبز پتّے
درختوں سے تالاب میں گر رہے تھے۔
وہیں میں نے دیکھا کہ دنیا کے سارے پرندے
نجانے کہاں سے، زمانوں کے پھیلے ہوئے فاصلوں سے
اُبھرتے ہیں، تالاب کے پاس آکر اترتے ہیں اور بولتے ہیں
وہیں میں نے اُن سب پرندوں کو اونچے درختوں پہ، نیلی فضاؤں میں، تالاب کے پانیوں پر کناروں پہ ہر سمت دیکھا
وہ اُڑتے ہوئے ہنس، گاتی ہوئی بلبلیں، مور، صدیوں کے قاصد کبوتر
اور ایسے پرندے بھی جو اپنے ناموں کو بس آپ ہی جانتے ہیں۔
وہ نادر صدائیں۔ کہ جیسے وہ صدیوں کے اسرار کو کھولتی ہوں
وہ چہکار۔ جیسے وہ اَن دیکھی دنیاؤں سے آ رہی ہو۔
پرندوں کی بولی کے اسرار کو سیکھتے دن کٹا، رات گزری۔
بہاریں خزائیں پلٹ کر کئی بار آئیں۔
بہت دن ہوئے میں نے جب اُن پرندوں کو دیکھا
اور اب اُن کی غیبی صداؤں کے اسرار کو چار سُو دیکھتا ہوں
مجھے علم ہے، ہر صدا دُور سے آنے والی صدا ہے
ہر اک شے میں کوئی اشارت نہاں ہے۔

رشید قیصرانی

کرنیں اور کرچیاں

چاندنی پر غزل کہنے والی سے میں نے کہا
"چاندنی تم بھی ہو"
اور — وہ ہنس پڑی
اُس کے ہونٹوں پہ بکھری ہوئی
نیم جاں زرد کرنوں کو میں نے چُنا
اور — میں رو پڑا

اُس نے مجھ سے کہا
"بول تیرے ہیں سب کانچ کی چوڑیاں
کانچ کی چوڑیاں کس کو پہناؤ گے؟"
اور — میں ہنس پڑا
کرچیاں میرے ہونٹوں سے جھڑنے لگیں
اور — وہ رو پڑی

زرد کرنوں میں جب کرچیاں میں پرونے لگا
وہ بھی رونے لگی، میں بھی رونے لگا

کشف

مجھے کہہ رہی تھی
"میں کچھ ان سُنے لفظ جب بھی سنوں گی
تو پھر عمر بھر اُن سے کھیلا کروں گی
میں ہنستی رہی ہوں، میں ہنستی رہوں گی"

مگر پھر ہوا یوں
کہ جب اس نے پلکوں کی چلمن اٹھائی
تو میں نے یہ دیکھا
کہ اس گہرے نیلے سمندر میں
کاغذ کی ناؤ پہ لفظوں کا لاشہ پڑا تھا
سمندر کی موجوں میں ماتم بپا تھا

ادیب سہیل

دو ہجرتوں کے بعد

جس تقریب میں جاتا ہوں میں
تم بھی وہاں ہوتی ہو اکثر
لدی پھندی اک پیڑ سی ہو تم

اب تو یہ باتیں بھی عبث ہیں
کیوں اک راہ پہ چلتے چلتے
بچھڑ گئے تھے
اب تو ان باتوں سے بھی ہم دو جُگ آگے نکل چکے ہیں
اب تو یہ سچائی ہے کہ گئے دنوں کی یاد گماں سی لگتی ہے

مجھ کو یہ سرمایہ بہت ہے
اک ہجرت نے دوری دی تھی
اک ہجرت نے پاس کیا ہے
تم نے بھی اس سنگم کو کیا اسی طرح محسوس کیا ہے؟

محمود علی محمود

روشنی

رات کے نو بجے سے
میں تری چارپائی کے نزدیک بیٹھا ہوا ہوں
آج چوکھٹ کے کنڈے میں لٹکی ہوئی لالٹین ایک مدقوق چہرہ بنی ہے
آج کیپسول، مشروب سب بے اثر، بے صدا ہیں
گیدڑوں کی صداؤں میں ڈر کلبلانے لگا ہے
ہوا تیز چلنے لگی ہے
درختوں سے ٹوٹے ہوئے زرد رُو برگ کمرے میں آسیب پالگ رہے ہیں
تجھے۔ بابا! کمبل اڑھا دوں؟
ترے ٹھنڈے پاؤں دبا دوں؟
آسماں پر سیاہی کا زہراب بہنے لگا ہے
گولیوں کی طرح بوندیں آنگن میں پڑتی ہیں
بوچھار— ہاں تیز بوچھار آئی ہے اور لالٹین ایک ساحق ملنگ کے انداز میں جھولتی ہے
گری، — وہ گری، روشنی! رو.... ش.... نی ---ای !!!

احسن زیدی

ایک خواہش

ہمارے مالک
زمین اور آسماں کے خالق،
ہمیں یہ توفیق دے کہ جب تک
زمین محور کے گرد گھومے
سلاسلِ کوہ کی جبینوں پہ جب تلک برف جگمگائے
سحاب کا سائبان
سورج کی آگ سے سبز کونپلوں کو پناہ بخشے
ہوائیں
نیلے، سنہرے، سُرخ اور سبز رنگوں کے
خوش گلو، بولتے پرندوں کے
قافلے اپنے ساتھ لائیں
زمین کے سینے میں جب تلک
دستِ آب زرخیزیاں بکھیرے
بطخیں یونہی نیل رنگ جھیلوں کے ساحلوں کو
سفید نقطوں کی دلکشی دیں
ہمارے مالک،
فلک کا جب تک چراغ روشن ہے
ہم کو توفیق دے کہ ہم
شاہِ انبیاءؐ پر
دُرود بھیجیں، سلام بھیجیں
جو فن کی دولت ہمیں میسر ہے
انؐ کے قدموں کی دھول پر سب نثار کردیں

زاہدہ نوید

نظم

خواہشیں،
دل کے نگر میں، گھومتی پھرتی ہیں یوں،
آسماں کی نیلگوں وسعت میں
جیسے،
فاختائیں مائلِ پرواز ہوں،
یا ستارے جھلملائیں، بادلوں کے درمیاں،
بادلوں میں، کوندتی پھرتی ہوں جیسے
بجلیاں
ایسے موسم میں یہ دلِ حبیب،
دسترس سے ماورا باتوں کی،
ضد کرنے لگے،
تو کیا کریں —

خادم رزمی

ہم سب لمحہ ہیں

باہر گھُپ اندھیرا آدھی رات
چاروں اور خموشی بکھری
اندر بند کواڑوں والے اس چھوٹے کمرے میں
جلتے لیمپ کی مدھم پیلی ضو
میں نے سوچا لمحہ کیا ہے ؟
سامنے جلتے لیمپ کی مدھم ضو سے پوچھا
لمحہ کیا ہے ؟
وہ کچھ اور چمک کر بولی
لمحہ ؟ ..... لمحہ میں ہوں
لمحہ تُو ہے
بند کواڑوں والے اس چھوٹے کمرے کے اندر
یہ مریل سی لَو لمحہ ہے
بند کواڑوں کی درزوں سے
باہر جاتی ضو کی تاریں بھی لمحہ ہیں
ان تاروں کے چاروں اور یہ گھُپ اندھیارا بھی لمحہ ہے
آدھی رات اور اس کی یہ سنسان خموشی بھی لمحہ ہے
بند کواڑوں سے باہر کا گھُپ اندھیارا
اندر کا یہ پیلا چانن
میں اور تُو
سب لمحہ ہیں،
ایک ہی لمحہ، ایک ہی پل !

ایوب خاور

ہمیں پھولوں کی خوشبو ہی بہت تھی

گھروں میں ایک گھر ایسا بھی تھا
جس میں
ہمیں تنہائی قطرہ قطرہ کرکے پی رہی تھی
اور ہم بھی
لالٹینوں کی طرح جلتی ہوئی سوچوں میں راتیں کاٹتے تھے
حبس اُگلتے۔ ہانپتے بام و در و دیوار جیسے دن اٹھاتے تھے
کبھی اچھے دنوں کے خواب
بن دستک دیئے دل میں در آتے تھے
تو اپنی رت جگی آنکھوں پر پلکیں اوڑھ لیتے تھے
ہوا کی آہٹیں سُن سُن کے ڈرتے تھے

گلی کے موڑ تک
سینوں کو بھاری کرنے والی بدبوؤں کا بوجھ
مٹی میں سلے چہرے
درختوں سے الگ ہو جانے والی چھال جیسی آرزوئیں
دوپہر کی دھوپ جیسی چُپ کی ٹکٹکی مار کر بیٹھی ہوئی آنکھیں
ماؤں جیسی کوئی ماں اور باپ جیسا کوئی باپ
یہی کچھ تھا
یہی کچھ تھا مگر دل میں امیدیں، حوصلے اور واہمے بھی تھے
تری شاموں سے اپنی صبحوں تک پھولوں کی خوشبو تھی
نہ جانے کس نے کس کو پہلے اپنے خواب کی تعبیر پایا تھا
ہمیں تو بس سبھی کچھ اپنا لگتا تھا

وہ تیری گفتگو کرتی ہوئی پلکیں
وہ تیرے ہاتھ کی پوروں میں اپنے نام کی لرزش
گلاب اور رات کی رانی کے گلدستے
سبھی کچھ اپنا لگتا ہے
اور ہم اس راہ پر چلتے،
کہانی لکھتے لکھتے پھر تری آنکھوں تک آ پہنچے
(اور اس سے پہلے اتنی اچھی آنکھیں کس نے دیکھی تھیں)

امیدوں، حوصلوں اور واہموں کے درمیاں،
آنکھوں کی دنیا تھی
اور اس دنیا میں بس تیری محبت کا زمانہ تھا
گذشتہ عمر کی گلیوں میں تنہا پھرنے والی مہرباں جاناں
زمانہ کب کسی کا ہو کے رہتا ہے
سبھی نے اپنی اپنی عمر کے قرضے چکاتے ہیں
زمانہ ایک بیلئے کی طرح چالاک ہے
ہونی کو انہونی میں انہونی کو ہونی میں کچھ ایسے ہی بدلتا ہے
کہ جس کے دکھ میں آنکھوں کے بھرے ساون پیالے ٹوٹ جاتے ہیں
ہوا سوچوں میں گرہیں ڈال دے تو روح کے اندر اترنے والے ساتھی چھوٹ جاتے ہیں
چٹخے آئینوں میں
ٹھنڈی راتوں جاگنے والی خموشی بولتی ہے
اور ایسے آئینوں میں ہم نے کتنی بار دیکھا
اور یہ سوچا ہے
گلی کے موڑ تک پہلے ہوئے کچے مکانوں سے
تری آنکھوں میں کاجل کی طرح سجنے کی منزل تک
ہیں اک واہمے جیسی حقیقت
اور کچھ پھولوں کی خوشبو ہی بہت تھی۔

نسیم احمد ناصر

بچھڑنے سے پہلے

نومبر کی پیلاہٹیں تو ہمیشہ دُکھوں سے عبارت رہی ہیں
درختوں کی شاخوں سے گرتے ہوئے زرد پتّے گواہ ہیں
— سُنو تو!!
اُداسی کا ملبوس پہنے، تشخص سے عاری یہ ہارے ہوئے لوگ سارے
اپنی بھاگتی ساعتوں کا کرشمہ ہیں — جن میں
ابھی چند لمحوں کی کچّی شناسائی کے بعد ہم بھی
صدا بن کے بہہ جائیں گے۔
مگر کون سُنتا ہے ان کو ٹریفک کے اس شور میں
آؤ — دُکھ کس لئے،
ہم بھی اپنی صداؤں کے زخمی لبوں پر کوئی خواب رنگین بُن کر
دُکھی رُت کی بھیگی فضا میں گلابوں کی مہکار بھر دیں
ذرا دیر ہنس لیں
اور اپنی وفاؤں کے اُجڑے مکانوں پہ ناآشنائی کی تختی لگانے سے پہلے
چلو — اجنبیت سے بھرپور ان دھوپ چھاؤں کے جھرمٹ سے نکلیں
خلوص و مروّت کے سچّے تعلق سے سرشار لمحوں کی شاداب چھاؤں میں بیٹھیں
اکیلے جو گزریں گی ان زرد شاموں کے نوحے
رفاقت کے سرسبز جذبوں کی اُجلی زمینوں پہ لکھ لیں
گئے گزرے لمحوں کی تلخی کے مدفون پیکر کو باتوں کے نشتر سے چھلنی کریں
اور آنکھوں کی تاریک قبروں میں دم توڑتے آنسوؤں کو

مرے دوست، پلکوں کی تپتی، دہکتی سلاخوں کے اندر پرولیں
اذیت کی بے نام کیفیتیں روح کی سرد گہرائیوں میں سمو لیں
گلے لگ کے جی بھر کے رولیں —
کہ جیون کے لمبے سفر میں
یہ آنسو امانت ہیں بے لوث رشتوں کی دشوار اور مشترک منزلوں کی
بچھڑنے سے پہلے ۔
چلو اپنی معصوم خوشیوں کے مُردہ بدن کو
کسی طور یادوں کی پرخواب گھاٹی میں محفوظ کر لیں
کہ لاشیں شہادت رہیں،
آنے والی رُتوں میں شگوفے کھلیں جب — !!
ہم اک دوسرے سے اچانک ملیں جب — !!

حسن عباس رضا

اپنی گلاب دھرتی کے نام ایک نظم

یہ ہم جانتے تھے
کہ صبحِ طرب
ظلمتوں کے سیہ روزنوں سے نکل کر
درو بام خواہش سے ہم رقص ہو گی
یہ ہم جانتے تھے

یہ منزل کی جانب
رواں غازیوں،
بے ردا بیٹیوں کے قدم جانتے تھے
یہ خونِ شہیداں میں ڈوبے ہوئے
خواہشِ جشنِ نو کے علم جانتے تھے
یہ ہم جانتے تھے کہ پل بھر کی اس بے ردائی سے آگے
شفق رنگ موسم
دریدہ بدن ڈھانپنے کے لئے ہیں

یہ میرے بزرگوں،
مرے شاعروں،
میرے دانشوروں کے قلم جانتے تھے
کہ الفاظ، بے چہرگی کے ہر اک سنگ کو
دستِ آذر کی صورت
تشخص کی اشکال میں ڈھال دیں گے
تشخص!

کہ جس کے لئے مدتوں کی رفاقت کو تج کر
گئی ساعتوں کی محبت کو تج کر
نئی راہِ ایقاں پہ
سینہ فگاروں نے
اِک جذبۂ نو سے پاؤں رکھے تھے
وہ راہِ تیقن!
جو منزل تھی
عمروں کی جہدِ مسلسل کا حاصل تھی
وہ منتظر تھی،
وہ منزل،
کہ جس کی زمیں کے ہر اک ذرۂ پاک کو ہم نے بوسے دیئے تھے
وہ منزل کہ جس نے
ہمیں مہرباں بازوؤں میں اماں دی
وہ منزل
خداوندِ اقدس کی لا منتہا نعمتوں میں سے ہم کو ملی ہے
وہ منزل ہماری مقدس زمیں تھی
وہ منزل ہماری مقدس زمیں ہے
یہ کامل یقیں ہے

ثمینہ راجہ

دِل دریا ——!

شب کا پاگل کر دینے والا سناٹا
پَر پھیلائے
ہولے ہولے اُمڈ آئے
پچھلے پہر کے کچھ لمحوں میں
اُس کی سانسیں
چہرے پہ محسوس کروں تو
دلکین یاد کا اک کانٹا بھی چُبھتا جائے،
اس کی قربت کے احساس میں
بھیگی بھیگی پلکیں
کھولوں
اس کی گہری سرشاری سے آنکھ
چُراؤں
یوں لگتا ہے
روم روم سے پھُوٹ پھوٹ کر بہتی راحت
جھُوٹی ہے
سینے کے اندر تو کوئی
دھیرے دھیرے روتا ہے

عباس رضوی

سحر آشوب

گرم گرم راتوں میں
صبح سے ذرا پہلے

میرے ساتھ بستر پر
گرد گرد چہروں کا اِک ہجوم ہوتا ہے
سرد سرد لمحوں کا لمس میری سانسوں میں
تیر تیر جاتا ہے

سرمئی دھندلکوں میں
ڈوبتے ابھرتے سُر
ہچکیاں سی لیتے ہیں
ٹوٹ ٹوٹ جاتے ہیں

ہاتھ ہاتھ میں ڈالے
دائروں میں چکراتے
زرد بے نشاں چہرے
جیسے خاک رُو پتے تند خو بگولوں میں
بے کسی سے رقصاں ہوں —

روشنی کی چاہت میں آنکھ کھولنے والے
آگہی سے ڈرتے ہیں،

(جاگ جانے والوں سے خواب روٹھ جاتے ہیں)

میں بھی خوف سے لرزاں
صبح سے گریزاں ہوں
روشنی سے ڈرتا ہوں
میں نے تیس برسوں میں بار بار دیکھا ہے
روشنی کے مقتل میں
خواب خواب آنکھوں کا درد سے پگھل جانا
سُرخ سُرخ پھولوں کا سرخوشی سے جل جانا

سیّد انس معین

زندہ لکیریں

میرے ہاتھوں نے کسی پیڑ پہ کچھ لکھا تھا
آج اس پیڑ کے پتّوں کی رگوں
اور مرے ہاتھوں کی
لکیروں میں کوئی فرق نہیں

خاموش سقراط

کسی کو کیا خبر ہے
کون افضل ہے
وہ لمحہ
جو صلیبِ وقت پر مصلوب ہو کر
زندگانی کی اذیت سے رہائی پا گیا ہے
یا —
وہ آنسو
جو میری آنکھ کے
زنداں میں صدیوں سے مقید ہے
مگر چُپ ہے،

فرحت نواز

المیہ

جن سپنوں کو
ان پلکوں سے چُن کر میں نے
آنکھوں کے ساگر میں چھپایا
ان سپنوں کا قطرہ قطرہ
درد کا دھارا بن کر شب کو
میری نیند بہالے جائے
اور سُلگتی آنکھوں سے میں
جب بھی اس کی جانب دیکھوں
سب جذبوں کو سوتا پاؤں ،

شاہین مفتی

اندھے تناظر کی ایک نظم

ہوا
سب اذیت سمیٹے
بڑی دیر سے
اپنے گھٹنوں میں سر دے کے
بیٹھی ہوئی ہے
زمیں پر ہوں لیکن
کوئی
میرے پیروں پہ ٹھنڈے عذابوں کی اندھی کہانی
رقم کر رہا ہے
ستارے
سرِ شام ہی بجھ گئے ہیں
نظر پر
فلک پر
کوئی رنگ کھلتا نہیں ہے
کہاں پر ملے ہو؟
جہاں
عکس و معکوس کی سب حدیں توڑ کر
میری آنکھیں فقط
دھند کا حاشیہ دیکھتی ہیں

ممتاز اطہر

سمندر ہاتھ اپنے پیٹ میں ڈالے

سمندر ہاتھ اپنے پیٹ میں ڈالے
کہ اس کو سیپیوں کی کوکھ سے بہتی سیاہی سے عقیدت ہے
ہماری کشتیوں کے بادباں، برگد کی بوڑھی داڑھیاں ٹھہرے
ہم اپنے جال اپنے گرد پھیلائیں،
تھکے بازو لفافوں میں لپیٹیں،
مگر ترسیل کے سارے وسیلے بھیگ جاتے ہیں
ہوا کی شوکتی لمبی زباں اشجار سے پتّے اتارے،
پرندے گھونسلوں میں اپنے بچّے چھوڑ کر، چیخوں کی
اندھی جھیل میں اُتریں
گزرتی ریل کی سیٹی پہ آنکھیں کھڑکیوں سے کود جاتی ہیں
مگر چہروں کی گاڑھی بھیڑ میں
صابن کے رنگیں بلبلے کب تک حفاظت کی پھسلتی انگلیاں تھامیں؟
اگر چولہوں پہ جلتی ہانڈیوں میں بھوک اُبلے
ہمکتی بھاپ سے نتھنوں میں کچا ماس جل جانے کی بُو اُترے
تو اپنی انگلیاں اپنے ہی دانتوں سے چبا لینا — !

ماہ طلعت

ماحصل

بے خودی کے سحر میں یا آگہی کے ناز میں
آرزو کا بیج میں نے بو دیا
اور پھر آنکھیں طوافِ آسماں کو اُٹھ گئیں
ہاں! وہاں لہرا رہے تھے
برف سے شفاف، آنچل سے مہین
بادلوں کے ریشمی سایوں کے جال
پر، — سحابِ جانفزا،
وہ جسے آنا تھا بھیگے ساحلوں کی اور سے
جس کے ہر قطرے میں لہریں لے رہی تھیں کھیتیاں
وہ نہ جانے کس طرف برسا گیا —؟
ڈرتے ڈرتے جاننا چاہا جو اپنے شوق کا احوال تو،
عُقدہ کھُلا —
اب یہاں جز خاک کچھ باقی نہیں
ہاں مگر وہ بے خودی کا سحر یا پھر آگہی کا ناز باقی ہے کہ جس نے،
اک تہی دامن کو بخشی بے نیازی ہائے شوق
ایک دل کو کر دیا بیگانۂ آہ و فغاں
ایک مُشتِ خاک کو وُسعت میں صحرا کر دیا —

شاہنواز زیدی

بہروپ

دھیمی آواز کے سُم
میرے وہم نے جب
اندھیرے کے سینے سے ٹکرا کے جاتے سُنے تب کہا
اپنی قسمت میں شاید رہائی کی کوئی بھی صورت نہیں ہے
دہائی تمنا ہر سے بلبلوں کی طرح ہونٹ پر پھوٹتی ہے
کہ پھر اس کو بجھتی ہنسی ایک ماتم زدہ دن کے چہرے پہ مَل دے
یہی دن ہمیشہ نئے روپ میں میری جاں کھینچتا ہے
میرا جسم ٹکڑے
میری روح غم کے تھپیڑوں سے چھلنی
میں زخمی ہوا کی طرح بے سہارا
ہمہ وقت تصویر کے دوسرے رُخ پہ میں اپنے کمرے میں بیٹھا
سیاسی سے کاغذ کی صورت بدلتا ہوں
میں کوئی قیدی نہیں
نہ میں ناکام غم نہ محبت کا گھائل نہ مردم گزیدہ
نہ خالق نہ مُنکر
میں یوں اپنے معمولی پن میں پڑا کڑھ رہا ہوں کہ مجبور ہوں
تم کو جھوٹے فسانوں سے دھوکے میں رکھوں
اسی روپ بہروپ میں چُھپ کے زندہ رہوں

یہ تمنا بھی بیکار
تم جانتے ہو۔

ژاں جوزف ۔ رابیری ویلو
ترجمہ:۔ اصغر ندیم سید

ایک نظم

کیسا چوہا ہے؟
جو دکھائی نہیں دیتا
رات کی دیواریں پھاند کے آتا ہے
اور چاند کے دودھیا کیک کو کترنے لگتا ہے
کل صبح
جب وہ چلا جائے گا
وہاں دانتوں کے خونی نشان ہوں گے
کل صبح
وہ جنہوں نے ساری رات شراب پی
اور جنہوں نے اپنے تاش کے پتّے کھوٹے کئے
چاند کو آنکھیں جھپک کے دیکھیں گے
ہکلاتے ہوئے کہیں گے
'یہ چوپنس کا سکہ کیسا ہے
جو سبز میز پر لڑکھڑا رہا ہے'
'اوہ'
اُن میں سے ایک گرہ لگائے گا
آسمان پر ہمارا دوست سب کچھ ہار گیا
اور خودکشی کر بیٹھا
اور سب ہی ہی ۔ ہو ہو ہا ہا کرنے لگیں گے
پھر ڈگمگائیں گے اور گر جائیں گے
اب چاند وہاں موجود نہیں ہوگا
چوہا اُسے اپنے بل میں گھسیٹ کر لے گیا ہوگا

دوی

منداکنی

جذبِ شفاف میں
تم نے آمیزشِ رنگِ تخیّل سے
نقشِ رعنا کی تخلیق کا خواب
دیکھا ہے گوشۂ خلوت میں
رسیا ہو تم حُسن کے
اس پری وش کے
شاید فروزاں ہے جو ریگ زارِ مسلسل کے اس پار
پھیلے افق پر کہیں

لاکھ اظہارِ الفت کرو، جامِ احساس چھلکاؤ
اس دشت میں روز و شب
ریگِ تشنہ
ہر اک شے کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے
گہری تہوں میں
جلا ڈالتی ہے
خرامِ شگفتہ جواں جسم کی ہر ادا سے منوّر
تمہارے تخیّل کا ہر معجزہ، حادثہ ہر حسیں عکس جب
جراتِ وصل کرتا ہے
منداکنی ۔ جو نئے روشن ۔ سے ملنے کی خواہش کا

جب بھی خطاکار ہوتا ہے
منداکنی، سہمی سمٹی سی
اپنے ہی خود دار آنچل میں لپٹی ہوئی
تشنگی، اپنے سینے کی گہرائیوں میں سمیٹے ہوئے
لوٹ جاتی ہے
اک بار پھر
بے زبان اور بے سُدھ، پریشان
پھیلے افق کی طرف

سعیٔ تخلیق کی
بے کراں دَرد کی یہ ریاضت
تمہارا مقدر، اسیرِ جمالِ فروزاں تمہارا مقدر
وصالِ تبسم سے محروم
بے سود یہ دشت پیمائی یہ کربِ زارِ جنوں
اس کی پہنائیوں میں مگر جانے کیوں
جاگزیں ہے تمہاری
درخشندہ، رعنا، نگارِ سکوں!!

(ہندی سے ترجمہ: بلراج کومل)

سجاد باقر رضوی

سلام

دِل کی راہوں میں نشانِ کربلا مل جائے گا
بس اسی رستے پہ آگے چل خدا مِل جائے گا

کیوں بھٹکتا ہے سرِ راہِ نشاطِ زندگی
درد کی وادی میں آ، درد آشنا مِل جائے گا

پتھروں کی زد میں بیٹھا آئینہ سازی نہ کر
کیا مِلا اب تک مِرے دل اور کیا مِل جائے گا

حق نما ہے مشعلِ خونِ حسینؑ ابنِ علیؑ
گھُپ اندھیروں سے نہ گھبرا راستہ مِل جائے گا

عابدِؑ بیمار کے نقشِ قدم آنکھوں میں رکھ
اُن کی زنجیروں سے تیرا سلسلہ مِل جائے گا

خواہشِ سیرابیٔ دِل نے دکھائے ہیں سراب
تشنگی کی راہ چل آبِ بقا مِل جائے گا

باقرؔ بے خانماں بن جا علیؑ کے در کی خاک
یوں مٹا تو رُتبۂ خاکِ شفا مِل جائے گا

شمس الرحمٰن فاروقی

رُباعیاں

پہنا کے مجھے تاجِ ہوائے صرصر
رکھا تھا آوارۂ وادیٔ شرر
پا سوختہ اب ساحلِ لاحاصل پر
میں خاک ہوں، مرا ثانی پیدا کر

دریا۔ دریا میں ناؤ کاغذ کا مکاں
گردن۔ گردن آب گھر میں طوفاں
کوئل۔ کوئل کی کوک پھولوں میں ہوا
آنکھیں۔ آنکھوں میں دردِ رفتہ لرزاں

تجھ سا نہیں دنیا میں کوئی تنہا آ
امڈا ہے چار سمت کا دریا آ
یہ تیرہ شبی گنجان اتنی کب تھی
مٹنے کو ہے تیری آواز پا آ

بارش کا جوش ہے اُڑا ہے سبزہ
ہے شورِ نمو گونج رہا ہے سبزہ
پتّی پتّی پہ لکھوں نامِ نامی
وہ آنکھ نہ تر کرے تو کیا ہے سبزہ

دیدار ہوس سے میں ہوں بےتاب کہ تُو
عالم ہے ترا عالمِ اسباب کہ تُو
ہر صفحۂ ناخواندہ کو بھرنے والے
دریائے فراقت شُدہ پایاب کہ تُو

سر میں ہے تپاں طاقت جلتی ہے ابھی
پیچیدہ دھواں میں شان اتنی ہے ابھی
رہ رہ کے یہ پوچھتی ہے ثابت قدمی
پسپا ہونے میں دیر کتنی ہے ابھی

دل شاد کروں خاک سے اُوپر اُٹھوں
ذرّہ ہوں مگر مہر کا ہم سر اُٹھوں
جب دیکھوں بےخوف بے منظر اُٹھوں
وہ وقت بھی ہوگا کہ میں مر کر اُٹھوں

حامد جیلانی

گیت

شام کے پنچھی گھر آئے
درشن پیا سے کجرائے
آج بھی نینا بھر آئے
شام کے پنچھی گھر آئے

آج بھی پربت پر سونا
پگھلے اور بہتا جائے
ڈھلتا دن کہتا جائے
لمحے کب مُڑ کر آئے
آج بھی نینا بھر آئے

اِک بانسوریا بجتی ہے
دریا پار مکانوں سے
آنچ آتی ہے تانوں سے
مانجھی پار اُتر آئے
آج بھی نینا بھر آئے

چاند آ پہنچا بستی پر
آنے والے تُو بھی آ
گھر سُونا ہے گھر کو آ
دیواروں سے ڈر آئے
آج بھی نینا بھر آئے
شام کے پنچھی گھر آئے
درشن پیا سے کجرائے
آج بھی نینا بھر آئے

احمد شریف

گیت

پل پل تیرے بل بل جاؤں
راہ میں تیری نین بچھاؤں

تجھ بن ناہیں چین اور راجا
من میں آجا درس دکھا جا
یاد میں تیری دیپ جلاؤں

پل پل تیرے بل بل جاؤں

رات نشیلی سر پر آئے
ناگن بن کے ڈستی جائے
اپنی بپتا کس کو سناؤں

پل پل تیرے بل بل جاؤں

پیار کی باتیں بھول نہ جانا
موری یاد میں ساتھ ہی لانا
دیکھ کے تجھ کو چین میں پاؤں

پل پل تیرے بل بل جاؤں

میرزا ادیب

ساتواں چراغ

گرمی ہو یا سردی۔ شمالی پہاڑوں کی بلندیوں سے سرد ہوائیں مسلسل نیچے اترتی رہتی تھیں۔ کبھی بڑی بوجھل ہوتیں اور کبھی نسبتاً ہلکی۔ یہ ہوائیں جب بھی اس بے آب و گیاہ علاقے میں سے گزرتی تھیں تو کہیں بھی ٹھہرنے کا نام نہیں لیتی تھیں کیوں کہ کوئی دیوار، درختوں کی کوئی قطار ان کے راستے میں حائل نہیں ہو سکتی تھی۔ برابر آگے بڑھتی چلی جاتیں اور گو بابا صاحب کے مقبرے تک پہنچتے پہنچتے ان کی رفتار کبھی کبھی مدھم پڑ جاتی تھی تاہم جس وقت بھی وہ اس مقبرے کی بوسیدہ دیواروں سے ٹکراتی تھیں تو دیکھنے والے کو فوراً یہ احساس ہوتا تھا کہ یہ دیواریں فی الفور زمین بوس ہو جائیں گی۔ مگر برسوں سے ہواؤں کا یہ عمل جاری تھا اور یہ کمزور دیواریں بدستور اپنی اپنی جگہ پہ کھڑی تھیں۔ یہ ضرور ہے کہ ان میں کہیں کہیں رخنے پڑ گئے تھے اور ہواؤں کے جھونکے ان درختوں میں سے گزر کر ٹوٹے پھوٹے مزار کو چھوتے ہوئے آگے نکل جاتے تھے۔

"یہ بابا صاحب کون تھے۔ ان کی یہ ابدی قیام گاہ کب تعمیر ہوئی تھی اور ان دیواروں نے کب سر اٹھایا تھا؟" ان باتوں کا کسی کو بھی علم نہیں تھا۔ بابا صاحب کے مقبرے سے ڈیڑھ میل دور جنوب کی جانب ایک چھوٹا سا گاؤں جی جی پور کے نام سے ضرور آباد تھا لیکن اس گاؤں کا بوڑھے سے بوڑھا آدمی بھی ان سوالوں کا جواب دینے سے قاصر تھا۔

اس گاؤں کو آباد ہوئے نصف صدی سے زیادہ مدت نہیں بیتی تھی۔ اس سے پہلے یہاں پانی ہی پانی تھا۔ پھر جب اس پانی کو مصرف میں لانے کے لئے ایک قریبی نہر میں منتقل کر دیا گیا تو دلدلی علاقہ سورج کی تمازت سے سوکھ کر اس قابل ہو گیا کہ یہاں لوگ کچے پکے مکان بنا سکیں اور ارد گرد دیہات میں رہنے والوں نے میلوں پھیلی ہوئی اس زمین کو دیکھا جہاں وہ آسانی سے مکانات تعمیر کر سکتے تھے۔ کھیت بنا کر فصلیں اگا سکتے تھے تو وہ ادھر آنے لگے اور چند ہی سال میں یہاں اچھی خاصی آبادی ہو گئی۔

اس گاؤں کا نام جی جی پور کیسے پڑا؟ اس سلسلے میں گاؤں کے پرانے لوگ بتاتے تھے کہ جب ان میں سے کسی نے سب سے پہلا مکان بنایا تو یہاں ایک جھونپڑی میں ایک بوڑھا شخص رہتا تھا جو بالعموم نیم عریاں نظر آتا تھا۔

اس شخص نے بتایا کہ وہ بابا صاحب کا مرید خاص تھا۔ چنانچہ وہ دن تو اپنی جھونپڑی ہی میں بسر کرتا تھا اور جیسے ہی شام کی تاریکی فضاؤں میں پھیلنے لگتی تھی۔ بابا صاحب کے مزار پر چلا جاتا تھا اور تمام رات وہیں گزار دیتا تھا۔

بابا صاحب کو ماننے والے لوگ مزار پر کچھ نہ کچھ نذر نیاز چڑھاتے رہتے تھے۔ یہ شخص اس میں سے تھوڑا سا حصہ وصول کر کے باقی زائرین ہی میں بانٹ دیتا تھا اور یوں اس کے لئے قوت لایموت کا سامان مہیا ہوتا رہتا تھا۔

گاؤں کا نام اس شخص کی نسبت سے مقرر ہوا تھا۔ اس نسبت سے نہیں کہ اس کا اپنا نام جی جی تھا۔ اس کا نام کسی کو بھی معلوم نہیں تھا، ورنہ

وہ کسی کو اپنے بارے میں معلومات بہم پہنچانے کا خواہش مند ہی تھا۔ اصل معاملہ یہ تھا کہ وہ ہر دوسرے فقرے پر 'جی جی' کہتا تھا۔ یوں کہنا چاہیے کہ 'جی جی' اس کا تکیہ کلام تھا۔ اس کے پاس عقیدت سے آنے والوں نے اُسے بار بار جی جی کہتے سنا تو اُس کا نام ہی جی جی میاں پڑنے لگا اور اس طرح یہ گاؤں 'جی جی پور' مشہور ہوگیا۔

گاؤں والے جی جی میاں کا بہت احترام کرتے تھے اور جو کچھ وہ کہتا تھا اُسے صحیح تسلیم کرلیتے تھے۔ اس جی جی میاں نے گاؤں کے خاص خاص لوگوں کو بتایا تھا کہ بابا صاحب بڑے اونچے درجے کے بزرگ تھے۔ مگر طبیعت کے لحاظ سے تھے جلالی۔ بڑی جلدی جلال میں آجاتے تھے اور بڑے سے بڑے آدمی کو بھی بلا تکلف جھڑک دیتے تھے۔

شاید انہی جی جی میاں نے بتایا تھا اگر بابا صاحب کے مزار پر ہر جمعرات کو مٹی کا ایک چراغ جلایا جائے تو ساتویں جمعرات کو جب آخری چراغ جلایا جلے گا تو چراغ جلانے والے کی دلی آرزو پوری ہو جائے گی۔

چراغ جلایا جاتا تھا مگر ابھی اسے مزار پر رکھا ہی نہیں جاتا تھا کہ شمالی پہاڑوں کی طرف سے آنے والی سرد ہوائیں اسے بجھا دیتی تھیں۔ گاؤں میں شاید ہی کوئی ایسا فرد ہوگا جسے اس کا علم نہیں تھا اور جس کے دل میں یہ یقین جاگزیں نہیں تھا کہ ساتویں جمعرات کو چراغ جلانے والے کی آرزو ضرور پوری ہو جاتی ہے۔ لیکن مشکل یہی تھی کہ اس آزمائش پر پورا اُترنا تقریب قریب ناممکن تھا۔ ہوتا یہ تھا کہ اوّل تو پہلی جمعرات ہی کو چراغ کی لو شمالی ہواؤں کے حملے سے سیاہ پوش ہو جاتی تھی اور اگر پہلے دو تین چراغ صحیح سلامت مزار تک پہنچ بھی جاتے تھے تو ان کے بعد جو چراغ جلایا جاتا تھا وہ ضرور بجھ جاتا تھا۔ عام یقین یہ تھا کہ اب تک جو کوئی بھی یکے بعد دیگرے سات چراغ جلانے میں کامیاب نہیں ہو سکا تو اس کی وجہ بابا صاحب کی جلالی طبیعت کی کارفرمائی ہے ورنہ شمالی پہاڑوں کی بلندیوں سے آنے والی سرد ہواؤں کا یہ کہاں حوصلہ کہ وہ عین اس لمحے دیوار کے روزنوں سے اندر آئیں جب مزار کے قریب چراغ جلایا جارہا ہو۔ یوں ساتواں چراغ جلانے کی کبھی نوبت ہی نہیں آئی تھی البتہ بعض لوگوں کی زبانی یہ بات سُنی جاتی تھی کہ کافی مدّت ہوئی ایک بار ایک دھوبن نے مزار پر ساتواں چراغ بھی جلا دیا تھا اور اس کی مراد بھی پوری ہوگئی تھی۔ اس کا بیٹا جو قتل کے مقدمے میں ماخوذ تھا پھانسی کی کوٹھڑی سے باہر نکل آیا تھا۔ اس حقیقت کی تصدیق اس وجہ سے نہیں ہو سکتی تھی کہ یہ ماں اور بیٹا۔ دونوں دنیا سے رخصت ہوگئے تھے۔

اگر کوئی شخص مقبرے کے اندر جانے کی بجائے اس کے اردگرد گھومتا تو اسے بے شمار ٹوٹے ہوئے مٹی کے چراغ نظر آجاتے۔ یہ وہ چراغ تھے جو مزار پر دو دو تین تین یا زیادہ سے زیادہ چار چار کی تعداد میں جلے تھے اور چونکہ یہ چراغ جلانے والے وہ شرط پوری نہیں کر سکے تھے یعنی سات جمعراتوں تک سات چراغ نہیں جلا سکے تھے۔ اس لئے ان کے چراغ مزار سے اٹھا کر باہر پھینک دیئے گئے تھے تاکہ نئے مرادیں مانگنے والوں کو بھی قسمت آزمائی کا موقع ملتا رہے۔

یہ چراغ باہر کون پھینک دیتا تھا۔ اس سوال کے مختلف جواب دیئے جاتے تھے۔ کچھ لوگ کہتے تھے کہ بابا صاحب کے واحد مرید جی جی میاں، جو ایک روز چُپ چاپ اپنی جھونپڑی چھوڑ کر اس طرح غائب ہوگیا تھا کہ پھر کبھی دکھائی نہیں دیا تھا۔ یہ اپنی جھونپڑی تو چھوڑ گیا تھا مگر اس نے اپنے پیر کا مقبرہ نہیں چھوڑا تھا۔ وہ آدھی رات کو باقاعدہ یہاں آتا ہے اور چراغ باہر پھینک دیتا ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ شمال سے آنے والی سرد ہوائیں ہی ان چراغوں کو دھکیلتی ہوئی دروازے سے باہر لے جاتی ہیں اور یہ چراغ اس عمل کے دوران ٹوٹ پھوٹ جاتے ہیں۔

جی جی گاؤں کا سب سے متمول آدمی ناصر خاں تھا جس کی زرعی اراضی بیس مربعوں پر مشتمل تھی اور جس کی حویلی کے دالان میں سو چارپائیاں باسانی بچھائی جاسکتی تھیں۔ ناصر خان ان آبادکاروں میں سے تھا جو سب سے پہلے یہاں آئے تھے۔ آدمی تجربہ کار اور معاملہ فہم تھا۔ اس نے حال کے آئینے میں مستقبل

واضح خدوخال دیکھ لیئے تھے اس لیئے وہ کشتیاں لے کر آیا تھا یعنی اس نے اپنی تھوڑی سی شہری جائداد فروخت کر دی تھی اور ہمیشہ کے لیئے اس اجاڑ مقام پر آ گیا تھا اس نے وقت سے فائدہ اٹھا کر زیادہ سے زیادہ اراضی پر اپنی ملکیت جما لی تھی۔ پیسہ پاس تھا۔ غریب لوگوں کو اپنا مزارع بنا لیا اور اس طرح اس کی دولت اور ذاتی وجاہت میں دن رات اضافہ ہونے لگا۔

گاؤں کے لوگوں کی تو بیشتر آبادی اس نتیجہ پر پہنچ چکی تھی کہ بابا صاحب کے مزار پر جا کر چراغ جلانے کی شرط پوری کرنا بہت مشکل ہے اس لیئے وہ لوگ ادھر کا رُخ ہی نہیں کرتے تھے۔ کبھی کبھی کسی کے دل میں بے اختیار خواہش پیدا ہو جاتی تھی تو وہ اپنے کٹھن سفر پر روانہ ہو جاتا تھا لیکن چوتھے پانچویں چراغ کے بجھ جانے پر اس کی اپنی طبیعت اس طرح بجھ جاتی تھی کہ وہ پھر زندگی بھر ایسا ارادہ نہیں کرتا تھا اور دوسروں کے لیئے درسِ عبرت بن کر رہ جاتا تھا۔ البتہ شہر سے کوئی نہ کوئی آتا رہتا تھا اور جو بھی آتا تھا وہ سیدھا ناصر خان کی حویلی کی طرف جاتا تھا اور ناصر خان اس وقت اس کے رہنے سہنے کا بندوبست اپنی حویلی میں کر دیتا تھا اور پہلے دن کے بعد اس سے یکسر بے نیاز ہو جاتا تھا کیونکہ اُسے معلوم تھا کہ یہ مہمان دو تین جمعراتیں ہی یہاں بسر کرے گا اور جاتے ہوئے ملے گا بھی نہیں۔

مہینے میں ایک دو قسمت آزما ضرور آ جاتے تھے۔ کوئی مرد تو شاذ ہی آتا تھا۔ عام طور پر عورتیں اور وہ بھی عمر رسیدہ۔ آتی رہتی تھیں مگر اس مرتبہ ایسا ہوا کہ تین مہینے گذر گئے اور ناصر خان کی حویلی کے بڑے پھاٹک پر کسی نے بھی دستک نہ دی۔ نہ جانے گاؤں والوں کو اس سے اپنی اجتماعی زندگی میں ایک خلا کیوں محسوس ہونے لگا تھا۔ چوپال میں جب بھی کچھ لوگ بیٹھتے تھے تو ہیر رانجھا یا زیتون نامہ سننے سے پہلے اس کمی کا تذکرہ ضرور کرتے تھے اور ناصر خان کے منشی منظور سے کو تو یقین ہو گیا تھا کہ اب یہاں کوئی نہیں آئے گا۔ چنانچہ اس نے حویلی کے چوکیدار سے کہہ دیا تھا۔

"چاچا رات کو آرام سے سو جایا کر۔ بابا صاحب کے مزار پر کوئی نہیں آئے گا۔"

اور چوکیدار چاچا میر وز نے یہ بات پلے باندھ لی تھی۔ وہ اس امر سے بے نیاز ہو گیا تھا کہ جمعرات کو کوئی شخص مٹی کا چراغ اور ماچس لے کر حویلی سے نکلا اور آدھی رات سے پہلے پہلے لوٹ آئے گا۔ وہ پھاٹک کے پہلو میں رکھے ہوئے بنچ کے اوپر بیٹھے بیٹھے اونگھنے لگتا تھا اور اونگھتے اونگھتے سو جاتا تھا۔

چوتھے مہینے کا پہلا ہفتہ شروع ہو گیا تھا۔ شام گہری ہوتی جا رہی تھی کہ جاگیردار ناصر خان اپنی سفید گھوڑی سے نیچے اترا اور مرزو کے حوالے کر کے پھاٹک کی طرف جا رہا تھا کہ ایک بڑھیا نے جس کا لباس میلا کچیلا تھا اور جس نے ہاتھ میں ایک تھیلا اٹھا رکھا تھا۔ پھاٹک کے پاس ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔

ناصر خان بارہا ایسے لوگوں سے پھاٹک کے سامنے مل چکا تھا اس لیئے یہ اندازہ لگانے میں اسے کوئی دقت نہ ہوئی کہ یہ عورت کس مقصد کے ساتھ آئی ہے اور اس سے کیا توقع رکھتی ہے۔

"ٹھیک ہے۔" ناصر خان نے رٹا رٹایا جملہ بڑھیا کی طرف پھینک دیا۔

ناصر خان جب یہ جملہ زبان سے نکالتا تھا تو اسے کچھ اور کہنے سننے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ چوکیدار مہمان کو ساتھ لے کر اسے حویلی کے ایک کمرے میں پہنچا دیتا تھا اور اس وقت اس کے قیام تک کھانے پینے کا بھی بندوبست کر دیتا تھا۔

ناصر خان پھاٹک کے اندر چلا گیا تھا۔ معمول کے مطابق بڑھیا کو چوکیدار کے ساتھ اس کے پیچھے پیچھے قدم اٹھانا چاہیئے تھا مگر وہ وہیں کھڑی رہی۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا تو اب کیوں ہو رہا تھا۔ ناصر خان چند قدم چل کر رُک گیا۔

"مرزو!" اس نے چوکیدار کو پکارا۔

چوکیدار نے بڑھیا کو چلنے کا اشارہ کیا اور وہ چلنے لگی۔

ناصر خان نے پھاٹک کے اوپر جلتے ہوئے سو پاور کے بلب کی روشنی میں بڑھیا کو دیکھا۔ اس چہرے میں اسے ایک عجیب کیفیت کا احساس ہوا۔ اسے

یاد آگیا کہ ایسی کیفیت اس نے اس دھوبن کے چہرے پر بھی دیکھی تھی جو مزار پر ساتواں چراغ جلا کر اپنی مراد پا چکی تھی۔

"تو کون ہے؟" جاگیردار کے لہجے میں کرختگی تھی۔

"میں - میں" بوڑھیا بس یہی لفظ کہہ سکی۔

وہ گھور گھور کر اسے دیکھ رہا تھا۔

"اماں! تو کرتی کیا ہے؟"

"پتر میں تو بس"

ناصر اس کے قریب آگیا۔

"تو بھی؟"

بوڑھیا اس کا مطلب نہ سمجھ سکی۔

"اماں تو بھی ساتواں چراغ جلائے گی؟"

بوڑھیا کا چہرہ جو پہلے تذبذب کا تاثر لئے ہوئے تھا اس پر ایک ایسا نور جھلملانے لگا جو طلوعِ آفتاب کے وقت مشرقی اُفق پر تھوڑی دیر کے لئے برقرار رہتا ہے اور پھر غائب ہو جاتا ہے۔

ناصر خاں چند لمحے وہاں ٹھہر کر چلا گیا۔

بوڑھیا کمرے میں داخل ہوئی تو اس کی نظر سب سے پہلے مٹی کے ان چند چراغوں پر پڑی جو ایک طرف ایک چھوٹی سی میز کے اوپر پڑے تھے چراغوں کے پاس کچھ روئی بھی نظر آ رہی تھی۔

میز کے علاوہ کمرے کے اندر ایک چارپائی تھی۔ ٹین کا ایک لوٹا، ایک دیگچی اور اس قسم کی گھریلو استعمال کی کچھ اور چیزیں بھی تھیں۔

چوکیدار بجلی کا بلب روشن کر کے کمرے سے باہر نکل گیا۔ بوڑھیا دروازے کے قریب رُک کر کمرے کا جائزہ لیتی رہی۔ اس کے دل میں ایک ہیجان سا برپا ہو گیا تھا۔ اس نے اپنا تھیلا میز کے اُوپر رکھ دیا اور اس کی انگلیاں انہی چراغوں کو چھُونے لگیں جن میں تیل کی ایک بوند بھی نہیں پڑی تھی۔ اسے یکا یک خیال آیا کہ جو بھی یہ چراغ لایا ہوگا وہ کتنی آس کے ساتھ آیا ہوگا اور پھر مایوس ہو کر چلا گیا ہوگا۔

اُسے اپنا خیال آگیا۔ وہ ایک ایسے کپڑے کی طرح تھی جس کو دھو کر پوری طرح اس کا پانی نہ نچوڑا گیا ہو اور اس حالت میں سبز گھاس پر بکھیر دیا گیا ہو۔ دھُوپ کی شدت کپڑے سے اس باقی پانی کو بھی چوس لے گی۔

اس کا سر گھومنے لگا اور وہ چارپائی پر گرنے ہی والی تھی کہ جاگیردار کے الفاظ اس کے کانوں میں گونجنے لگے: "وہاں تو بھی ساتواں چراغ جلائے گی" اور اس کے باطن میں پھر ایک اضطراب پیدا ہو گیا۔

جمعرات آنے میں دو دن باقی تھے۔ دوسرے دن صبح سویرے اس نے تھیلے میں سے ساری چیزیں میز پر انڈیل دیں۔ ان میں کڑوے تیل کی ایک بڑی بوتل تھی۔ دس بارہ مٹی کے چراغ اور روئی کا ایک بنڈل۔

جس وقت وہ تھوڑی روئی لے کر بتیاں بنا رہی تھی تو ایک دم اسے احساس ہوا کہ وہ کسی اجنبی جگہ پر نہیں، مرچی دروازے کے اندر اپنے چھوٹے سے جدی مکان میں ہے اور ہانڈی چولہے پر رکھ کر پرانے موڑھے پر بیٹھی دروازے کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہی ہے جہاں وہ چہرہ نظر نہیں آتا جو نو سال پہلے

غائب ہو گیا تھا۔

شوہر کی وفات کے بعد اس کا بیٹا چراغ دین ہی اس کا واحد سہارا تھا۔ بارہ سال تک وہ بڑا فرمانبردار بیٹا بنا رہا۔ ماں کو کبھی اس سے کسی قسم کی شکایت نہ ہوئی۔ محلے کے بیسیوں گھروں تک جانا، وہاں سے میلے کپڑے لانا۔ ہر ہفتے ان سب کپڑوں کی گٹھڑیاں بنا کر دریا پر لے جانا۔ دوسروں کے ساتھ مل کر انہیں دھونا اور پھیلی ہوئی ریت پر انہیں سکھانے کے لئے پھیلا دینا۔ شام کے بعد انہیں اپنے بیل پر لاد کر گھر لے آتا اور رات کو گیارہ بارہ بجے تک ان پر استری پھیر کر الگ الگ گاہکوں کے کپڑے تہ کر کے رکھ دینا اور دوسرے روز صبح سے لے کر تیسرے پہر تک گھر گھر کپڑے پہنچا کر اُجرت وصول کرتا۔ یہ سب کام وہ بڑی باقاعدگی کے ساتھ کرتا رہتا۔ ان سب کاموں میں اس کی ماں بھی برابر اس کی مدد کرتی رہتی تھی مگر وہ چاہتا نہیں تھا کہ ماں کی بوڑھی ہڈیوں کو تکلیف دے۔

تیرھواں سال شروع ہوا تو نہ جانے کس طرح سے اسے جوئے کی لت پڑ گئی۔ کئی دن اور کئی راتیں حوالات میں بھی گزار دیں۔ لیکن یہ لت دور نہ ہو سکی بلکہ بڑھتی چلی گئی۔ ایک رات وہ بڑی دیر سے گھر میں آیا۔ صبح اسے ایک ہمسائے نے بتایا کہ اسے گرفتار کرنے کے لئے پولیس آ رہی ہے۔ اس نے ابھی کلیجے کا ایک ہی لقمہ دہی میں لتھڑا کر حلق سے اتارا ہوگا کہ جلدی سے پاؤں میں جوتے ڈال کر سیڑھیوں سے اترنے لگا۔ ماں پیچھے آوازیں ہی دیتی رہ گئی۔

اس کے بعد اس کی ماں اس کی صورت نہ دیکھ سکی۔

اس کی زندگی کے سب سے خوشگوار اور مسرت بخش وہ لمحے ہوتے تھے جب وہ دروازے پر کھڑی ہو کر اپنے بیٹے کے بیل کی گھنٹیوں کی آواز سنا کرتی تھی۔ یہ بیل شام کے بعد واپس گلی میں داخل ہوتا تھا اور گلی میں داخل ہوتے ہی اس کی گھنٹیاں بجنے لگتی تھیں۔ گھنٹیوں کی آواز سن کر وہ تیزی سے دروازے پر آ کھڑی ہوتی تھی اور جب تک ایک ایک کر کے ساری گٹھڑیاں اندر رکھوا نہیں لیتی تھی اُسے چین نہیں پڑتا تھا۔

وہ سارے کام مزے لے لے کر کرتی تھی۔ استری میں سے بچی کھچی راکھ باہر نکالتی تھی۔ لمبے چوڑے تختے پر جس کے اوپر ایک ایک کپڑا بچھا کر استری کی جاتی تھی۔ اس کی چادر بدل دیتی تھی۔ کوئلوں کے ڈھیر پر ایک نظر ڈال کر یہ اندازہ کر لیتی تھی کہ ان سے کام چل سکتا ہے یا نہیں۔ نیم سوختہ کوئلے رکھ کر باقی راکھ باہر پھینک دیتی تھی۔

چراغ ابھی گھر سے دور ہی ہوتا تھا کہ وہ "صدقے جاواں۔ واری جاواں" کہہ کر اس سے جا کر لپٹ جاتی تھی۔

مگر پچھلے نو سال سے اس کے گھر میں اور اس کے دل میں تاریکیاں ہی تاریکیاں چھا چکی تھیں۔

اپنے بیٹے کو پانے کی خاطر اس نے کیا کچھ نہیں کیا تھا۔ سیانوں نے جو کچھ کہا تھا وہ کر چکی تھی۔ وہ تھک چکی تھی۔ بالکل مایوس ہو چکی تھی کہ اس نے بابا صاحب زار کی کرامت کا حال سنا اور وہ اسے آخری حربہ سمجھ کر جاگیردار کے یہاں آ گئی۔

اس کی آنکھیں دروازے پر جمی تھیں اور اس کی انگلیاں متواتر حرکت کر رہی تھیں۔ اس کے سامنے بتیوں کا ایک ڈھیر لگ گیا تھا۔

"اتنی ساری بتیاں۔ اچار ڈالنا ہے؟"

یہ الفاظ جاگیردار ناصر خاں نے کہے تھے جو شاید، جب سے حویلی بنی تھی تیسری مرتبہ اس کمرے میں داخل ہوا تھا۔

بڑھیا نے ایک نظر بتیوں پر ڈالی اور پھر اسے دیکھنے لگی جس کی مونچھوں کے بال جھک کر ٹھوڑی کو چھونے کی کوشش کر رہے تھے۔

"میں نے سنا ہے تمہارا بیٹا نو سال سے غائب ہے۔"

بڑھیا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

ناصر خاں چارپائی پر بیٹھ گیا۔

"تمہارا نام کیا ہے ؟" اس نے بڑھیا سے پوچھا۔

"فاطمہ!"

"فاطمہ" ناصر خان نے چند سیکنڈ بڑھیا کو گھور کر دیکھا اور پھر یوں سر ہلانے لگا جیسے اس کے دل میں کسی بات کی تصدیق ہو گئی ہے۔

"کوئی تکلیف؟"

بڑھیا نے نفی میں سر ہلا دیا

کمرے سے باہر ناصر خان کا منشی ہاتھ میں حساب کتاب کے لمبے لمبے رجسٹر لئے اپنے مالک کے فارغ ہونے کا انتظام کر رہا تھا۔ ناصر خان کی اس پر نظر پڑی تو دروازے کی طرف جانے لگا۔

جمعرات کی شام کو جھکڑ چلنا شروع ہو گیا تھا۔ بڑھیا نے چراغ میں بتی اور تیل ڈالا دوسرے ہاتھ میں ماچس پکڑی۔ بسم اللہ کہہ کر تنہا مزار کی طرف روانہ ہو گئی۔

کسان کھیتوں سے لوٹ رہے تھے اور ان کے بیلوں کی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ بڑھیا کے قدموں میں تیزی آ گئی۔ سنسان راستوں سے گزرتی ہوئی وہ مقبرے کے اندر داخل ہو گئی۔ اندر داخل ہوتے وقت بھی اس کے کانوں میں بیلوں کی گھنٹیوں کی آواز گونج رہی تھی اور وہ ان سرد شمالی ہواؤں سے بے نیاز تھی جن کے جھونکے مقبرے کی دیواروں سے ٹکرا کر مسلسل شور برپا کر رہے تھے۔

اس نے تیلی کو ماچس کے کنارے پر رگڑا۔ آہستہ سے اُسے بتی کی لو کی طرف بڑھایا۔ ایک ہلکی سی روشنی پھوٹ پڑی۔ جلتا ہوا چراغ اس نے مزار کے ایک طرف رکھ دیا۔ دُعا کے لئے ہاتھ اٹھائے اور انگلیوں سے رخساروں پر بہتے ہوئے آنسوؤں کو خشک کر کے جلتے ہوئے چراغ پر آخری نظر ڈال کر باہر نکل گئی۔

وہ قدم اٹھا رہی تھی مگر اُسے احساس نہیں تھا کہ وہ کہاں ہے۔ کہاں جا رہی ہے۔ یکایک حویلی کے چوکیدار نے کرخت لہجے میں پوچھا۔

"کیا ہوا مائی صاحب!"

بڑھیا نے اپنی شہادت کی انگلی اُوپر اٹھائی اور پھاٹک میں سے نکل گئی۔

کمرے میں جا کر اس نے ماچس میز کے اوپر رکھ دی۔ چارپائی پر جا بیٹھی۔ اس نے دیکھا کہ کمرے کے اندر آتے وقت اس نے دروازہ بند کر دیا تھا۔ بند دروازہ دیکھ کر اس کے ذہن میں نہ جانے کیا خیال آیا کہ اس وقت وہاں جا کر اس کے دونوں پٹ کھول دیئے اور ٹکٹکی باندھ کر اُدھر دیکھنے لگی۔

دوسری، تیسری اور پھر چوتھی جمعرات بھی گزر گئی اور بادِ شمال کے سرد جھونکے اس کے جلائے ہوئے چراغوں کی لوؤں کا کچھ نہیں بگاڑ سکے تھے۔

پانچویں جمعرات کو جب اس نے چراغ جلا کر مزار کے پہلو میں رکھا اور مدھم روشنی میں دُعا کے لئے ہاتھ پھیلائے تو اسے یکدم احساس ہوا کہ ایک سایہ اس کے قریب حرکت کر رہا ہے۔ اس احساس کے باوجود اس کے نم آلود ہونٹ لرزتے رہے۔

دونوں ہاتھ منہ پر پھیر کر وہ مڑی۔ اور اس نے دیکھا کہ ایک جلتا ہوا چراغ مزار کے دوسرے پہلو کی طرف جھکا جا رہا ہے اور دوسرے ہی لمحے میں آسے ایک دھندلا چہرہ دکھائی دینے لگا جس کے گرد دوپٹہ لپٹا ہوا تھا۔

دو تین لمحوں کے لئے دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ دونوں کے ہونٹ لرزتے رہے اور پھر دونوں کی نظریں جھک گئیں۔

ہوا تیز و تند تھی۔ اوپر کسی اڑتے ہوئے پرندے کی چیخ فضا میں تحلیل ہو گئی۔ وہ جب حویلی کے پھاٹک پر پہنچی تو اس مرتبہ چوکیدار مرزمنے کوئی سوال

نہ کیا۔ پھاٹک کا ایک پٹ کھول دیا۔

"یہ کون ہے؟" اس نے چارپائی پر لیٹ کر خود سے سوال کیا۔

"کوئی ہوگی — میری طرح — میری طرح دکھیاری۔"

چھٹی جمعرات کو وہ صاحب جی کے مزار کے پاس پہنچی تو اسے مزار کے پہلو میں ایک جلتا ہوا چراغ نظر آیا۔ اس چراغ کے ساتھ پانچ اور چراغ تھے جو بجھ چکے تھے مگر لگتا تھا اس چھٹے چراغ کی لو سے جو مدھم سی روشنی پھوٹ رہی ہے وہ ایک روشن لکیر کی طرح ان کے اُوپر پھیل گئی ہے۔

اس نے اپنا چراغ جلایا اور چراغوں کے پہلو میں رکھ دیا اور جب دونوں ہاتھ پھیلا کر سینکڑوں بار دہرائے ہوئے الفاظ اپنے ہونٹوں سے نکالنے لگی، تو اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی قطاریں نکلنے لگیں۔ اس نے دونوں ہاتھ نیچے کر کے اپنی جھولی کے کناروں کو پکڑ لیا اور آنسو ٹپ ٹپ اس کی جھولی میں گرنے لگے۔ اس نے آنسو بھری آنکھوں سے سامنے دیکھا۔ اس کا چراغ جل رہا تھا اور دوسری طرف دوسرا چراغ بھی جل رہا تھا۔ اس نے یکایک محسوس کیا کہ دونوں چراغوں کی لویں اس کے آنسوؤں میں سے گزرتی ہوئی آنکھوں کے اندر چلی جا رہی ہیں۔

وہ دیر تک جھولی پھیلائے کھڑی رہی۔

اس رات وہ بڑی دیر تک وہاں بیٹھی رہی اور جب آثارِ سحر نمودار ہونے لگے تو مقبرے سے باہر نکل آئی۔

باہر نکلتے وقت اس نے ایک لمحے کے لئے پلٹ کر دیکھا۔ ذرا فاصلے پر دونوں چراغ روشن تھے۔

اور وہ ساتویں جمعرات تھی۔

دُور عشا کی نماز کی اذان بلند ہوئی تو اس نے چراغ، بتی اور ماچس سنبھالی اور بسم اللہ کہہ کر چلنے لگی۔

اُوپر ستارے چمک رہے تھے اور ہوا خاصی تیز تھی۔ وہ خاموش، ویران راہ پر قدم اٹھائے مقبرے کی طرف جا رہی تھی۔

کسی قریبی علاقے میں شدید بارش ہوئی تھی جس کا پانی بہتا ہوا نشیبی حصوں میں آ کر جا بجا ٹھہر گیا تھا۔ کہیں کہیں یہ پانی زیادہ گہرا تھا اور اسے بڑی مشکل سے آگے بڑھنا پڑتا تھا۔

جب وہ مزار کے قریب کھڑی تھی تو اس کے دل میں ایک ہیجان برپا تھا۔ اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا اور سانس جیسے سینے میں رُک سا گیا تھا۔

اس نے ماچس کی تیلی جلائی۔ چراغ کی لَو کی طرف بڑھائی اور چراغ روشن ہو گیا۔

یہ چراغ آہستہ آہستہ مزار کی طرف بڑھنے لگا۔ اچانک اُسے احساس ہوا کہ اس کے پاس کوئی کھڑا ہے۔ ایک آہ اس کے کان تک جا پہنچی تھی۔

اس نے سامنے دیکھا۔ مزار سے کچھ اوپر ایک بجھا ہوا دیا۔ اور اس سے ذرا فاصلے پر ایک ایسا چہرہ جو اس طرح نظر آ رہا تھا جیسے اس پر سکتے کا عالم طاری ہو۔

ایک گرم گرم لہر اس کے سارے جسم میں سرایت کر گئی۔

اس کا ہاتھ مزار کی طرف حرکت کرنے کی بجائے اُوپر جانے لگا۔ دوسرے لمحے میں بجھا ہوا چراغ اس کے اپنے ہاتھ میں تھا اور اس کا جلتا ہوا چراغ اس مایوس عورت کے ہاتھ میں جو ایک کھنڈر کی دیوار کی طرح جھکی ہوئی تھی۔

تین چار لمحوں ہی میں یہ سب کچھ ہو گیا۔

بجھا ہوا چراغ لے کر وہ ایک سیکنڈ بھی وہاں نہ ٹھہری۔ مقبرے سے باہر آ گئی اور مشرق کی طرف چلنے لگی۔

ہوا کے تیز و تند تھپیڑے اس کے جسم سے ٹکرا رہے تھے۔ بار بار اس کے قدم لڑکھڑا جاتے تھے مگر وہ برابر چلی جا رہی تھی۔ آگے ہی آگے کسی منزل کا تصور

کئے بغیر جیسے دُور سے کسی نے اسے اشارہ کر دیا اور وہ کہیں بھی رُکنا نہ چاہتی ہو۔

پھر بارش ہونے لگی اور بارش کے بھاری بھاری قطرے چراغ کے کناروں پر اور چراغ کے اندر گرنے لگے۔ جب یہ قطرے چراغ کے کناروں سے لگتے تھے تو ٹن کی ہلکی سی آواز آنے لگتی تھی۔

اس کی آنکھوں کی پتلیاں پھیل گئیں۔ اس کے تھکے ہوئے ضعیف پاؤں میں ایک نامعلوم سی قوت آگئی۔

بارش کے قطرے گر رہے تھے۔ آواز بلند ہوتی جا رہی تھی۔ ٹن ٹن، ٹن ٹن، ٹن ٹن۔

وہ کہیں بھی نہ رُکی۔ تیز و تُند ہوائیں برابر چل رہی تھیں۔ بارش بڑھتی جا رہی تھی۔

پھر یوں ہوا کہ بارش ختم ہو گئی مگر ہواؤں کی تُندی و تیزی میں کوئی فرق نہ آیا۔

صبح ہو گئی تھی۔ کسان اپنے اپنے بیلوں کو لئے کھیتوں کی طرف جا رہے تھے۔

اچانک ان کے قدم رُک گئے۔ ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ انہوں نے دیکھا کہ ایک بڑھیا چلی جا رہی ہے اور طوفانی ہواؤں میں اس کے ہاتھ میں تھاما ہوا چراغ جل رہا ہے۔

بڑھیا کو خود بھی معلوم نہیں تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ اس کے اردگرد کیا ہو رہا ہے۔ اس نے چراغ کی طرف ایک لمحے کے لئے بھی نہیں دیکھا تھا وہ چلی جا رہی تھی اور اس کے دائیں بائیں اور پیچھے حیران و سراسیمہ لوگ قدم اٹھا رہے تھے۔

یہ ایک چھوٹا سا قصبہ ہے اور اس کے وسطی حصے میں ایک نوتعمیر شدہ مقبرے کی دیواریں کھڑی ہیں۔

قصبے کے لوگوں کا اعتقاد ہے کہ یہاں ایک بزرگ خاتون دفن ہے جس کا چراغ طوفانی ہواؤں میں بھی جلتا رہتا تھا۔ اس لئے اسے چراغ بی بی کہتے ہیں۔

ہر روز عقیدت مند یہاں آتے ہیں اور دعائیں مانگتے ہیں۔ خاص طور پر وہ لوگ جن کے بچے گم ہو گئے ہوں۔

مزار کے سرہانے ایک مٹی کا چراغ ساری رات جلتا رہتا ہے۔

غلام الثقلین نقوی

آنگن اور کھلیان

(دسواں باب)

کبھی کبھار، گندم، مکی، جوار یا باجرے کے کھیت میں کوئی اجنبی سا پودا بھی اگ آتا ہے،

اس کا وجود ان سے الگ تھلگ نظر آتا ہے۔ وہ کیوں اُگتا ہے؟ میں نہیں جانتا... پر مجھے اتنا پتہ ہے کہ میں تو اسی قسم کا ایک پودا تھا... اجنبی سا... الگ تھلگ.... اس پودے کا بیج بھی اسی کھیت کی مٹی میں چھپا تھا... یہیں پھوٹا... کونپل بنا اور پروان چڑھا پھر بھی وہ گندم، مکی، جوار یا باجرے کے عام پودوں سے الگ رہا۔ آخر کیوں؟

گاؤں میں میرے ہم عمر بہت سے لڑکے تھے۔ ان کے نام میں نہیں لکھوں گا۔ میں ان میں تھا اور ان سے نہیں تھا۔ اُن سے کبھی کبھار گاؤں کی کسی گلی میں، کنوئیں پر یا رستے میں ملاقات ہو جاتی، وہ مجھے دیکھ کر مسکراتے اور کہتے "ماہنے اردو حرف کیا پڑھ گئے ہو، کسی سے بات بھی نہیں کرتے!"

"نہیں... ایسی تو کوئی بات نہیں...." میں ایک ہی جواب دیتا۔

"شّی تو خیر بڑے چودھری کا بیٹا ہے، اس کے پاؤں زمین پر نہ بھی ٹکیں تو ٹھیک ہے لیکن تم تو...."

"میں تمہیں سے ہوں" میں ہنستا "تین کھیتوں کے مالک کسان کا بیٹا!"

کبھی کبھار ان میں سے کوئی لڑکا اپنی داستانِ عشق بھی سناتا۔

یہ داستان جو اکثر نگاہ اور زبان تک محدود ہوتی، کسی پگڈنڈی کے تیکھے موڑ یا کسی کھیت کی اوٹ میں ماہیے کے کسی بول کی گنگناہٹ میں جنم لیتی اور ایک دو ملاقاتوں کے بعد کہاروں کے کندھوں پر جھولتی ہوئی ڈولی کے پیچھے چلاتے ہلکوروں میں دم توڑ دیتی۔ ہیر نہ تو بابل کے حضور میں استغاثہ بلند کرتی، نہ قاضی سے سوال جواب ہوتے، نہ کوئی رانجھا ڈولی کا پیچھا کرتا، نہ کوئی منچلا مرزا اپنی صاحباں کو بکی پر بٹھا کر لے اڑتا۔ میرے چھوٹے سے گاؤں میں ہر مٹیار پر بڑا کڑا پہرہ تھا۔ ماں کا، باپ کا، بھائی کا، برادری میں ناک کٹ جانے کے ڈر کا۔ میرے گاؤں کی اکثر محبتیں دل اور ہونٹ سے آگے نہ بڑھتیں اور جب کوئی پیار اس حد کو پھلانگ جاتا اور بدن سے چھو کر بامراد ہو جاتا تو گاؤں میں زلزلہ آ جاتا۔ میرے ہم عمر ساتھیوں میں سے کسی نے اس حد کو نہ پھاندا تھا۔ پھر بھی گاؤں میں دو چار حادثے ہوئے تھے جن کی کڑوی یاد اب تک باقی تھی۔ ماسی ریشم کا خاوند ایک عورت کو لے کر بھاگا تو پھر اس نے گاؤں کا منہ نہ دیکھا۔

اور میں تو چھوئی موئی کا پودا تھا۔

کوئی لڑکا عشق کی بات مجھ سے کرتا تو میں اپنے آپ میں سمٹ جاتا اور مجھے غصہ آتا کہ وہ پیار جو میرے من میں ٹھنڈی ٹھنڈی چاندنی بن کر سمایا ہے، دوسروں کے ہونٹوں تک کیوں جا پہنچا۔ میں نے تو پیار کے اظہار کے لئے نہ ہیر رانجھا کا کوئی بیت گنگنایا تھا نہ

مرزا صاحباں کے کسی شعر کا سہارا لیا تھا۔ مجھے تو اس گھسے پٹے فقرے سے بھی نفرت تھی جو اکثر لڑکوں کی زبان پر تھا "سوہنیو! ہمیں بھی ایک نظر دیکھ لیجئے" یہ فقرہ میری جوانی کے زمانے میں بڑا مقبول تھا۔ اس سال گل بہار میں ایک شادی کے موقع پر جالندھر کے مہاجر نقلیئے آئے تھے۔ یہ رہس ڈالتے تھے۔ انہوں نے ہیر رانجھا، سوہنی مہینوال اور مرزا صاحباں کے کھیل کھیلے۔ میں بھی ہر رات دیکھنے کے لئے جایا کرتا تھا۔ ڈولے کا مسخرا آنکھ بھینچ کر یہ فقرہ کہتا تو ہم ہنستے ہنستے بے حال ہو جاتے پر رانجھے، مہینوال اور مرزے کی زبان پر یہ فقرہ نہیں آیا تھا وہ تو اکثر شعروں میں بات کرتے تھے۔ مشعلوں کی روشنی میں وہ رہس دھاریا کتنا سجیلا لگتا تھا۔ جس نے رانجھے، مہینوال اور مرزے کا روپ بھرا تھا۔ ہم لڑکوں نے چاہا تھا کہ ہمارے گاؤں میں بھی رہس پڑے اور رہس دھاریوں کے سردار نے وعدہ کیا تھا کہ وہ ہمیں "سوہنا زینی" کا نیا کھیل دکھائے گا لیکن چوہدری نے مخالفت کی تھی۔ اس نے کہا تھا "میں اپنے گاؤں میں پیار محبت کی لیلا نہیں رچانا چاہتا۔"

تب میں سوچ رہا تھا کہ پیار کے اظہار کے لئے وہ کون سا لفظ ہے جو برکھا کی پہلی بوند کی طرح میرے مَن میں ٹپک جائے گا اور میں بھی کسی سے اپنے دل کی بات کہہ سکوں گا۔ میں سوچتا "یہ لفظ نرالا اور انوکھا ہونا چاہیئے" پھر مجھے ماسی ریشم کی تنبیہہ یاد آتی جس نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا تھا اور سولھویں سال کی کچی جوانی کو یہ بھی ڈر تھا، کہیں سُلی کوئی گھسا پٹا شعر پڑھ کر شماں کے کان میں پیار کا جادو نہ پھونک دے اور میں چناب کے دوسرے کنارے پر کھڑا اس سنگیت کے ٹپکنے کا انتظار کرتا رہوں۔

ایک دن جب میں کنوئیں سے گاؤں کی طرف آ رہا تھا تو ڈھلتے ہوئے دن کی دھوپ میں سایوں کی خنکی گھل مل گئی تھی۔ یہ بھادوں کے مہینے کا ایک دن تھا۔ بھادوں کی کڑی دھوپ میں ہل چلانے والوں کے رنگ سنولا جاتے ہیں اور جگر میں گرمی بڑھ جاتی ہے۔ پر چھاؤں میں ٹھنڈک ہوتی ہے اور بھیگی ہوئی دھرتی سے جو بھاپ اٹھتی ہے، وہ بھی سایوں کی ٹھنڈک سے چھو کر ٹھنڈی ہو جاتی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے ہوا کے جھونکوں میں گرمی اور سردی ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر ناچ رہے ہوں۔ اس دن صبح سویرے گرجتی برستی بھاگتی دوڑتی کالی گھٹا ذری بھر کو آسمان پر چھائی تھی اور ایک سرلاتا ہوا تھا پھر پُورب سے ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا آیا تھا اور گھٹا پھٹ کر بکھر گئی تھی اور اب اُجلی سفید اون کے گالے گہرے نیلے آسمان پر تیر رہے تھے اور زمین پر دھوپ چھاؤں آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ پگڈنڈی کے دونوں طرف کماد کے اونچے اونچے کھیت تھے اور ہوا جوان پودوں کو گدگدا رہی تھی اور بڑی پُراسرار آوازیں اُن سے سرگوشیاں کر رہی تھی، دھیمی، میٹھی، زیر لب مسکراہٹ میں لپٹی۔ پگڈنڈی کے ایک موڑ پر زمین کا ایک خالی ٹکڑا تھا۔ یہ ایک مکون سی تھی جس کے تینوں سروں پر کماد کے کھیت تھے۔ یہ کھیت سبز گھاس سے ڈھکا ہوا تھا اور ابھی تک ہل کا پھالا یہاں نہیں لگا تھا۔ شماں کھیت کی ایک مینڈھ پر بیٹھی تھی۔ میں اُسے دیکھ کر حیران ہوا۔ اُس کے ہاتھ میں گوری کی رسی تھی۔ گوری کھیت میں چر رہی تھی۔ اب وہ پوری گائے بن چکی تھی۔ میں نے آج سے تین سال پہلے گوری کو جوانی کی جس منزل پر خیال ہی خیال میں دیکھا تھا، وہ منزل آ چکی تھی۔ گوری کے چکنے پنڈے پر آنکھ نہیں ٹھہرتی تھی میں ایک دو لمحوں کے لئے پگڈنڈی پر ٹھٹکا۔ تب میں سبز گھاس کو روندتا ہوا شماں کی طرف آہستہ آہستہ بڑھا اور شماں یوں بیٹھی رہی جیسے اس نے مجھے دیکھا ہی نہ ہو۔ گوری نے گھاس کا ایک تنکا منہ میں لے کر سر اٹھایا اور بھیگی بھیگی آنکھوں سے مجھے اس طرح دیکھا جیسے کہہ رہی ہو "بڑی دیر بعد ملے ہو اور وہ بھی زندگی کے کس موڑ پر!"

"گوری!" میں اپنی ہی دھیمی آواز کی اجنبیت پر حیران ہو گیا۔

شماں نے اُداس اُداس آنکھوں سے مجھے دیکھا تو میں نے پوچھا "تم گوری کو چرانے کے لئے گاؤں سے اتنی دُور کیوں نکل آئی شماں؟"

"تم کیوں پوچھتے ہو؟"

"یونہی!"

"ماسی جھنڈو کھیت کے اس پار گھاس کھود رہی ہے۔ اُس نے کہا تم اس کھیت میں گوری کو چراؤ۔"

"وہ سائے کی طرح تمہارے ساتھ کیوں لگی رہتی ہے شیماں؟"

"مجھے کیا پتہ؟"

"ابھی کل ہی کی بات ہے ہم ایک آنگن میں کھیلتے تھے شیماں!"

"اُن دنوں بابا زندہ تھا نا!"

"اس نے یہ تو نہیں کہا تھا، میرے مرنے کے بعد ماہنے سے دور ہٹ جانا!"

شیماں مسکرائی۔ زرد زرد، بجھی بجھی سی مسکراہٹ، جیسے راکھ میں کوئی چنگاری چمکی ہو۔ پھر چنگاری بجھ گئی۔ ایک آنسو اس پر گرا اور اس کے بجھنے کی آواز بھی آئی۔ ان آنسوؤں کی پھوار میرے دل پر پڑی تو مجھے ایک عجیب سی تازگی کا احساس ہوا۔ ایک بدلی نے زرد جھکتے ہوئے سورج کو ڈھانپ لیا تو ہرے بھرے کھیت پر گہرا سایہ چھا گیا۔

"شیماں تم رو رہی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں تو ... نہیں تو ... ماہنے!"

"شیماں! شلی تمہارے گھر آتا ہے؟"

"ہاں! آتا تو ہے۔"

"جھنڈو اُسے کچھ نہیں کہتی؟"

"نہیں تو۔"

"وہ تم سے باتیں کرتا ہے؟"

"کرتا ہے۔"

"تمہیں وہ اچھا لگتا ہے؟"

"ہاں! وہ مجھے اچھا لگتا ہے۔"

"اور میں؟"

"تم بھی اچھے لگتے ہو۔" اس نے مسکرا کر کہا "پر ماہنے! وہ مستری مجھے اچھا نہیں لگتا۔"

"مستری بھی تمہارے گھر آتا ہے؟"

"آتا ہے ... روز آتا ہے ماہنے۔ ماسی جھنڈو اُسے کچھ نہیں کہتی۔ وہ آنگن میں دھینے کے پاس بیٹھا رہتا ہے اور مجھے دیکھتا رہتا ہے۔ میں چلتی پھرتی ہوں تو اس کی نظریں میرا پیچھا کرتی رہتی ہیں پر ماہنے! مجھے اس سے ڈر نہیں لگتا۔"

"ڈر نہیں لگتا، اس سے؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"مجھے چوہدری سے کیوں ڈر لگتا ہے ماہنے؟" شیماں نے سہمی سہمی آواز میں مجھ سے پوچھا۔

"چوہدری سے ؟" میری آواز حیرت کے مارے چیخ اُٹھی تو شیماں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

"اونچا نہ بولو ماہنے۔ ماسی جنڈو سُن لے گی"

"شیماں! تمہیں چوہدری سے کیوں ڈر لگتا ہے۔ میں نے تو سنا ہے چوہدری نے اس سال تمہارے لئے دو من گندم دینے کو دی تھی' تمہیں یتیم اور بے آسرا سمجھ کر" میں نے سرگوشی میں کہا۔

"ہاں! ماہنے! ٹھیک ہے پھر بھی مجھے اس سے ڈر لگتا ہے۔ وہ کبھی کبھار ماسی جنڈو کے گھر آتا ہے۔ چُھپ چُھپا کر جیسے کوئی چور ہو اور مجھے یوں دیکھتا ہے جیسے ۔۔۔"

وہ رُک گئی تو میں نے پوچھا "جیسے کیا؟"

"مجھے نہیں پتہ وہ جنڈو سے ایک دو باتیں کرتا ہے اور کچھ کہے بغیر آنگن سے نکل جاتا ہے"

"شیماں! تمہاری بات میری سمجھ میں نہیں آرہی" میں نے گلے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"ماہنے! اب جاؤ۔ ماسی جنڈو اِدھر آنے ہی والی ہوگی"

میں نے شیماں کی بات فوراً مان لی اور پگڈنڈی کی طرف قدم بڑھا لیا۔ ابھی میں پگڈنڈی کے اگلے موڑ پر بھی نہیں پہنچا تھا کہ جنڈو سامنے آگئی۔ اس کے سر پر گھاس کا گٹھا تھا اور ہاتھ میں کھُرپا۔ اس نے مجھ سے پوچھا "ماہنے! کہیں شیماں کو دیکھا تُو نے؟"

"پچھلے کھیت میں وہ گوری کو چرا رہی ہے"

"شیماں! نی شیماں!"

"آئی ماسی!" شیماں نے جواب دیا۔

میں نے گاؤں کی طرف قدم بڑھا لئے۔ شیماں کے آنسوؤں کی نمی سے میرے دل میں جو شادابی آگئی تھی، وہ لُو کے ایک جھونکے سے مرجھا گئی شیماں چوہدری سے کیوں ڈرتی ہے؟ کیوں ڈرتی ہے؟ یہ آواز میرے ساتھ ساتھ چلتی رہی جیسے کوئی آسیب ہو جو مجھ سے چمٹ گیا ہو۔ اتنے میں بدلی کا سایہ بھی ہٹ گیا اور ڈھلتے دن کی اداس اداس دھوپ میں کماد کی سرسراہٹ نے میرے کان میں بڑی پُراسرار سرگوشی کی" اس دن جب چکی پر شیماں دانے لے کر آئی تھی تو چوہدری نے اُسے جن نگاہوں سے دیکھا تھا، اُن پر حیداں بھی شرما گئی تھی۔ کیا ایک عورت ہی ان نگاہوں کے اسرار سے واقف ہوتی ہے؟ کیا وہی نگاہیں اب بھی شیماں کا پیچھا نہیں کر رہیں؟ میں کس سے پوچھوں؟ حیداں سے۔ نہیں۔۔ ماسی ریشم سے؟۔۔ نہیں۔۔ پھر کس سے پوچھوں؟۔۔ بھا اسلم سے؟۔۔ نہیں ۔۔۔"

گاؤں کے جوہڑ کے کنارے میرے قدم خود بخود رُک گئے۔

برسات میں جوہڑ کئی بار کناروں سے چھلکا تھا اور اب لبالب بھرا ہوا تھا۔ ابھی تک پانی صاف تھا اور اس میں اڑتے ہوئے بادلوں کا عکس نظر آرہا تھا اور پچھم کی ہوا اس پر لہریئے بنا رہی تھی اور لڑھکتا ہوا سورج لہریوں میں کانپ رہا تھا۔ تب میرے ہاتھ پر پانی کے قطرے گرے تو میں نے گوری کو دیکھا جس نے چلتے چلتے ہی جوہڑ سے دو گھونٹ پانی کے پی لئے تھے اور اُن میں سے ایک دو قطرے اس کے منہ سے میرے ہاتھ پر گر پڑے تھے۔ اس کی رسّی شیماں کے ہاتھ میں تھی جو میرے پاس سے گزر گئی تھی!

عین اس لمحے شُتی بھی کہیں سے آنکلا۔

اُس نے پوچھا "ماہنے اسکول کب کھُل رہا ہے؟"

"آنے والے سوموار کو" میں نے بے خیالی میں جواب دیا۔

"یہاں کیوں کھڑے ہو؟"

"یونہی"

"جھوٹ۔ ابھی شیماں تمہارے پاس سے گذری تھی اچھُم"

"ہاں گذری تھی" میں نے اس کی بات کاٹ لی۔

"ایک بات کا پتہ چلا تمہیں؟"

"کون سی بات؟"

"ابا نے سوچا ہے کہ شیماں کا نکاح مستری سے کر دیا جائے"

"کیوں؟"

"ہم اس کے سر پہ ہاتھ نہ رکھیں گے تو اور کون ہے شیماں کا اس گاؤں میں ماہنے؟"

"تم اس کے کیا لگتے ہو؟" میں نے چڑی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"میرا ابا اس گاؤں کا چوہدری نہیں ہے ماہنے؟"

"ہے تو سہی پر شیماں کوئی گرا پڑا مال تو نہیں کہ جس کی جھولی میں چاہے پھینک دیا جائے"

"ماہنے! کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"تم اس جوگڑے کی کشکول میں آخر بھیک کا ایک ٹکڑا ڈال دینے پر تیار ہو ہی گئے ناشتی؟"

"وہ جوگڑا کون ہے؟"

"تمہاری چکی کا مستری۔ لوگ کہتے ہیں وہ جوگڑا کشکول لے کر گاؤں کی ہر مٹیار کے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے"

"وہ جوگڑا ہے؟"

"ہاں!"

"وہ ہماری مشین کا مستری ہے"

"اسی لئے تم چاہتے ہو کہ شیماں کو اس کے پلّو سے باندھ دیا جائے تاکہ وہ گاؤں چھوڑ کر نہ جائے اور تمہاری چکی چلتی رہے"

"ماہنے! اگر شیماں کا بیاہ مستری سے نہ ہوا تو پتہ ہے کیا ہوگا؟"

"کیا ہوگا؟"

"وہ گاؤں سے بھاگ جائے گی اور اپنے ساتھ گاؤں کی عزّت کو بھی لے ڈوبے گی"

"شتی! ایسی کمینی بات نہ کرو۔ شیماں ایسی نہیں... وہ ایسی نہیں ہو سکتی"

"ابا کہہ رہا تھا جن لڑکیوں کے سر پہ ماں باپ کا سایہ نہ ہو اور ہوں بھی چھوٹی ذات کی، ان کا کیا اعتبار؟ وہ جوان ہو کر کوئی نہ کوئی گُل ضرور کھلاتی ہیں"

"شتی! میں چوہدری کی عزت کرتا ہوں لیکن انہیں ایسی بات منہ سے نہیں نکالنی چاہیئے تھی۔ آخر وہ بھی ایک جوان لڑکی کے باپ ہیں"

"ماہنے! تو بڑا بدزبان ہوگیا ہے"

"نہیں! میں نے کوئی بدزبانی نہیں کی"

"تم جسے اتنا نیک پاک سمجھتے ہو، جانتے ہو وہ کیا ہے؟"

شتی کے ہونٹوں سے زہر ٹپکنے والا تھا کہ میں نے اُس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس نے تڑاک سے میرے منہ پر چانٹا لگایا۔ میں نے جھٹکا کر اس کے منہ سے ہاتھ اٹھالیا۔

"وہ کمیرن ہے۔ اُسے عزت بے عزتی کا کیا خیال! مجھے ابا کی عزت کا خیال نہ ہوتا تو اب تک کسی کھیت کی اوٹ میں اس کے ساتھ...."

اب میری باری تھی۔ میرا ہاتھ بے اختیار اٹھا اور اس کے گندے ہونٹوں پر وہ گندا لفظ ٹوٹ گیا۔ جس کی سرانڈ چار گھونٹ بکھر جانے والی تھی۔ اس کا ہونٹ کٹ گیا۔ اس نے خون تھوک کر کہا "ماہنے! تجھے کیا پتہ، میں اس کے ساتھ کب سے کھیل رہا ہوں ——————

—— اب صرف کھیت کی اوٹ کا تماشا باقی تھا کہ ابا نے ....."

تب نہ جانے کیوں میرا غصہ اپنے آپ مرگیا اور میں کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ مجھے پتہ تھا کہ شتی جھوٹ بول رہا ہے۔ وہ مجھے غصہ دلانا چاہتا ہے اب میں نے اس پر ہاتھ اٹھایا تو شیماں کی بدنامی ہوگی اور شتی کا جھوٹا غرور اس کے لئے ہمیشہ کا سچ بن جائے گا۔ میں ہنستا ہوا وہاں سے چلا اور گلی کے آغاز پر بھا کی دکان کے سامنے کھڑا ہوگیا۔ بھا اکیلا تھا اور تھڑے پر چارپائی بچھائے بیٹھا تھا۔ میرے ہونٹوں پر قہقہے کے نیچے کچھ آثار دیکھ کر اس نے پوچھا "ماہنے! آج بڑے خوش ہو"

"ہاں بھا!"

بھا نے میری خوشی کی وجہ نہ پوچھی۔ یکایک میرا گلا رُندھ گیا۔ پھانس سی لگی تو میں نے گلے پر ہاتھ رکھ دیا اور میری آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ تب بے اختیار آنسو بہہ نکلے تو بھا حیران ہوگیا۔

اس نے کہا "ماہنے! ابھی ابھی دھوپ نکلی ہوئی تھی اور دھوپ میں یکایک بارش ہونے لگی آخر کیوں؟"

"بھا! کیا یہ بات سچ ہے؟"

"کون سی بات ماہنے؟"

"وہی شیماں والی بات"

"کیا ہوا شیماں کو؟"

"شتی کہہ رہا تھا اس کا نکاح مستری سے کر دیا جائے گا"

"میں نے ایسی کوئی بات نہیں سُنی پر ماہنے" بھا نے رُک کر میری آنکھوں میں جھانکا اور کہا "ایسا ہو بھی جائے تو اس میں کیا بُرائی ہے؟"

میں چُپ رہا تو بھا نے کہا "ماہنے! میری بات کا جواب دو"

"بھا! چوہدری کو کیا حق ہے کہ وہ گاؤں کی ایک بے کس لڑکی کو مستری کی جھولی میں ڈال دے اور وہ ہمارے گاؤں کا بھی تو نہیں!"

"ماہنے! میں تیرے دل کی بات سمجھ گیا ہوں پر میں تیرا ساتھی نہیں بنوں گا۔ شیاں کا نکاح مستری سے ہو جائے تو سارے گاؤں کے سر سے بوجھ اُتر جائے گا۔ وہ بے آسرا لڑکی بھی تو ٹھکانے لگ جائے گی۔"

"بھا! مستری اچھا آدمی نہیں۔"

"سبھی لوگ اچھے ہوتے ہیں ماہنے! انہیں اچھا بننے کا موقع تو دو۔"

"شیاں کو وہ اچھا نہیں لگتا۔"

"اُسے کون اچھا لگتا ہے؟"

"میں اور شلی۔"

بھا نے مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھا۔ تب وہ مسکرانے لگا۔ بھا کی دھیمی دھیمی مسکراہٹ نے میرے جلتے دل پر پھاہا رکھ دیا۔ میں نے تن بدن میں ٹھنڈک سی محسوس کی جیسے جلتی دوپہر میں پانی بھری بدلی کا سایہ زمین پر اُتر آیا ہو۔ اُس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا: "شلی کو تو میں نہیں جانتا ماہنے! پر تجھے تو جانتا ہوں۔ تو شیاں کے ساتھ ناطہ جوڑنے کی جرأت رکھتا ہے ماہنے؟"

"م — م — میں — میں ——"

"کہو ماہنے! ... نہیں ... ابھی نہیں ... اپنے من کی گہرائیوں میں جھانک کر دیکھو۔

جب تمہارا دل کوئی فیصلہ کر لے تو میں تمہارا ساتھ دوں گا۔"

بھا کی اس بات نے مجھے خاموش کر دیا!

پھر سکول مکمل گیا۔ میں پڑھائی میں لگ گیا۔ مجھے اپنے من میں جھانکنے کی فرصت بھی نہ ملی اور ایک سال ختم ہو گیا۔ زندگی کا سولہواں سال اور سترھویں سال کا آغاز ہوا تو زمانہ یکسر بدل گیا۔ زمانے کا تعلق بھی اپنے دل سے ہوتا ہے۔ میرا گاؤں نہیں بدلا تھا۔ وہی کچے مکان تھے، وہی گلیاں تھیں، وہی جوہڑ تھا جس کا پانی اب کالا پڑ چکا تھا کیوں کہ اب اس میں تازگی نہیں رہی تھی۔ چوہدری کی مشین چلتی رہی اور گاؤں کی زندگی بھی اپنی رفتار پہ قائم رہی۔ پھر بھی زمانہ بدل گیا تھا۔ بھا کی دکان چل نکلی تھی۔ بھا نے گروی رکھے ہوئے زیور چھڑوا لئے تھے۔ اس کی دکان بھری بھری معلوم ہوتی تھی۔ میں سوچ رہا تھا: شیاں سے میرا کیا جوڑ! میں رانجھا نہیں، مرزا نہیں، مہینوال بھی نہیں۔ میں جاٹ ہوں اور اب میں پڑھ لکھ گیا ہوں ... میں اسے بھگا کر لے جاؤں تو لوگ کیا کہیں گے ... جاٹ کا بیٹا خراسیے کی پوتی کو بھگا کر لے گیا ... میں اس سے شادی نہیں کر سکتا آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا ....

تب خیالات پر شرمندگی محسوس ہوئی۔ میں بدل گیا ہوں ... میں بزدل ہوں ... میں وہ سپاہی ہوں جو ہتھیار اٹھائے بغیر میدان سے بھاگ گیا ... میں کچھ بھی نہیں ... میں راکھ ہوں ... بنجر مٹی کی ایک مٹھی ... میں اتنا، سوچ کے بگولے میں بکھر کر رہ گیا ہوں ... بزدل ... بزدل ... میں نے اپنے من کی گہرائیوں میں جھانکنے کی آخر جرأت کر ہی لی تھی اور اس آئینے میں اپنا ہارا ہوا چہرہ دیکھ کر مجھے شرم آئی تھی۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ میں زمانے کو ایک ٹھوکر سے اڑا دوں۔ اپنے سے باہر کا زمانہ خود بخود نہیں بدلتا، اسے بدلنا پڑتا ہے اور میں اسے نہیں بدل سکتا۔

افواہ بے پر کا پرندہ ہے جو نظر بھی نہیں آتا پر آنکھ کی ایک جھپک میں وہ پورب پچھم اور اُتر سے دکن پہنچ جاتا ہے۔

"کچھ سُنا تم نے؟"

"نہیں تو۔۔۔"

ایک سرگوشی ۔۔۔ بدبُو کا ایک سانس ۔۔

"میں تو مدت سے کہہ رہی تھی کہ یہ لڑکی کوئی گل کھلائے گی۔"

"پَر وہ ہے کون؟"

"جانے میری بلا۔"

"سنو!"

بدبُو کا ایک اور سانس!

"نہیں نہیں ۔۔۔ اُسے کیا ضرورت تھی؛ وہ پھل کے پکنے کا بھی انتظار نہ کر سکا۔۔ اس نے کچے پھل کو اُچک لیا۔"

"وہ کون ہے؟"

"وہ شہریا۔ مجھے تو شروع سے اس کے لچھن اچھے نہیں لگتے تھے ۔۔ میں جب بھی چکی پر دانے پسوانے گئی' اس نے کھیس نکال دیں وہ سمجھتا جیسے گاؤں کی مٹیار دانے پسوانے نہیں آئی، اس سے آنکھیں لڑانے آئی ہے۔"

"ہم اسے ذلیل کر کے گاؤں سے نکال دیں گے۔"

"چوہدری سے کون نبٹے گا؟"

"رمشو۔ ساری خرابی کی جڑ ہے۔"

"جھنڈو بھی تو سدا کی دَلّی ہے۔ وہ اس کے گھر آتا رہا اور اُسے اس ندیدے کی نیت کا پتہ نہ چلا۔"

"نہیں جی وہ سب کچھ جانتی تھی۔ وہ اس سے مال کھاتی رہی۔"

"جوانی کے زمانے میں جھنڈو کون سی اچھی تھی۔ دینے ترکھان کے گھر آنے کے بعد بھی وہ کئی بار کھیتوں میں پکڑی گئی۔"

"سُنا ہے چوہدری بھی ۔۔۔۔"

"شی! چُپ رہو چوہدری کا نام نہ لو۔"

"سُنا ہے بابا شفقو نے شیماں کی ماں کا حق کرنے میں بہت جلدی کی تھی۔"

"ٹھیک کیا اس نے؛ جوان بیوہ اپنا رنڈاپا کاٹ لیتی ہے پَر جن کے من میں کھوٹ ہو، وہ اُسے پاک صاف نہیں رہنے دیتے۔"

"چھوڑو اس قصے کو۔۔ تُم کسی کا نام نے دو گی اور لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔"

"ماہنے! تم نے کچھ سُنا؟"

"نہیں!" میں نے کانوں پر ہاتھ رکھ لیا۔ "میں کچھ نہیں سننا چاہتا۔"

سرگوشی کا سانس بولا "تمہیں سننا پڑے گا۔ سننا پڑے گا۔"

جب میں نے کانوں سے ہاتھ اٹھایا تو ماسی ریشم کہہ رہی تھی "اس گاؤں میں پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔"

"ریشم بی بی لے! یہ کہاں نہیں ہوتا؟" گلی میں سے گزرتے ہوئے کسی آدمی نے کہا۔

وہ چلا گیا، تو میں نے پوچھا "ماسی! کیا ہوا؟"

"مجھے کچھ پتہ نہیں ملہنے"

"نہیں ماسی کچھ تو بتاؤ۔"

"کوٹھوں چڑھی بات تم نہ سن سکے ماہنے؟ تم نے کان بند کر رکھے تھے کیا؟"

"ہاں ماسی!"

"پھر کان بند ہی رہنے دو۔ سن کر کیا کرو گے!"

ماسی یہ کہہ کر گلی میں گم ہو گئی۔

"بھا! گاؤں میں سرگوشیاں ہو رہی ہیں۔ بدبو پھیل رہی ہے۔ سارا گاؤں زہر سے بھر گیا ہے۔

یہ کیا ہوا؟ یہ کیوں ہوا؟ وہ کون تھا جس نے ایسا کیا؟"

"ملہنے! تم نے بہت سارے سوال ایک ساتھ پوچھ لئے ہیں۔ ان سب کا جواب میں ایک سانس میں کیسے دے سکتا ہوں۔ کیا ہوا؟ وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ وہ ایک بے آسرا لڑکی تھی۔ اس کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیئے تھا۔ کیوں ہوا؟ اس لئے کہ شکل مند تھی۔ اچھی چیز کی طرف کون للچائی ہوئی نظروں سے نہیں دیکھتا؟ وہ کون تھا جس نے ایسا کیا؟ ماہنے! وہ میں نہیں تھا۔ وہ تو نہیں تھا۔ شُتلی نہیں تھا اور کیا پتہ وہ مستری بھی نہ ہو جس کا نام گاؤں کی ہر زبان پر چڑھ گیا ہے!"

"بھا!" میں حیران ہو کر پوچھا "یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ سب لوگ تو اسی کا نام لے رہے ہیں"۔ بھا نے کوئی جواب نہ دیا۔

اور افواہ کا لمبے پَر کا پرندہ گاؤں کی فضا میں اڑتا رہا اور تب ایک دن گاؤں نے سچ کا کڑوا گھونٹ گلے سے اتار لیا۔ چوہدری کی حویلی میں گاؤں کے لوگوں کا اکٹھ ہوا۔ اس میں جو لوگ شریک تھے، ان کے ہونٹوں پر گاؤں کی عزت کا سوال تھا اور ان کے دلوں میں زہر بھرا ہوا تھا۔ ان کے بس میں ہوتا تو وہ مستری اور ریشماں کو پتھر مار مار کر ہلاک کر دیتے۔ کسی کو سزا دینے میں انسان کو کتنا مزا ملتا ہے بشرطیکہ مجرم بے بس ہو اور اٹھے ہوئے ہاتھ کو مروڑ کر توڑ نہ سکتا ہو۔

میں پنچایت سے ذرا ہٹ کر کھڑا تھا۔ ابھی میری عمر اتنی نہیں ہوئی تھی کہ مجھے پنچایت میں بیٹھنے کا حق ملتا۔ شُتلی نے میرے پاس آ کر کہا۔

"دیکھ لیا اپنی ریشماں کو!"

میں نے اس کی طنز کا کوئی اثر نہ لیا۔ میں نے کہا "نہیں شُتلی! ریشماں بے قصور ہے۔"

"پھر قصوروار کون ہے؟" اس نے نفرت سے مسکرا کر پوچھا۔

"سارا گاؤں ---- میں بھی اور تُو بھی ---- اور کیا پتہ! مستری بے چارہ نردوش ہو!"

"تم سے کس نے کہا؟"

"بھا اسلم نے۔"

"تیرا بھا افلاطون بنا پھرتا ہے۔ سارا گاؤں تو یہی کہتا ہے کہ ----"

"شلی! میں تم سے لڑوں گا نہیں؟" میں اس سے دُور ہٹ گیا۔

ساری پنچایت چارپائیوں پر بیٹھی تھی اور حقہ چل رہا تھا۔ چوہدری الگ چارپائی پر اکیلا بیٹھا تھا۔ اس کا طرّہ حسبِ معمول بلند تھا پر وہ کچھ بُجھا بُجھا سا تھا۔ مجھے اس دن چوہدری کے چہرے پر بڑھاپا نظر آیا۔

اس نے کہا، "چوہدریو! گندگی اُچھلے تو چھینٹے ضرور اڑتے ہیں۔ کون جانے کس کس کے دامن پر دھبے لگیں گے۔ ہم سب گناہگار ہیں۔ لڑکی بھولی بھالی تھی، پھسل گئی۔ میں اُسے بے قصور تو نہیں سمجھتا پر یتیم ہے، اس لئے اس پر رحم کھانا بہتر ہے۔ اصل قصور تو مستری کا ہے، جو میری مشین پر کام کرتا ہے۔ اس کا قصور میں اپنے سر لیتا ہوں۔" مولوی جی یہیں موجود ہیں۔ کیوں نا! اس کی بلا اس کے سر منڈھ دی جائے۔"

"پر چوہدری! مستری کو ڈنڈ ضرور لگنا چاہئیے۔" بابا حیات بولا۔

"ہاں! ہاں! ڈنڈ بھی لگنا چاہیئے۔ کہو! کیا ڈنڈ تجویز کرتے ہو؟"

"اس کا منہ کالا کر کے گدھے پر سوار کرایا جائے اور اسے سارے گاؤں میں پھرایا جائے۔"

"نہیں۔ اس طرح گاؤں کی بدنامی ہوگی۔ چک مراد کے نام پر دھبہ لگے گا۔" چوہدری نے کہا۔

مستری اللہ دِتا ترکھان فرش پر بیٹھے تھے۔ اُن دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ باتیں کیں۔ میں نے دیکھا کہ بھا اسلم انہیں غور سے تک رہا ہے۔ مستری سہما سہما سا تھا۔

"مستری کو جوتے مار کر گاؤں سے نکال دیا جائے۔" چوہدری رحمت نے کہا۔

اُس وقت میرے باپ نے کہا، "نہیں چوہدری! معاملے کو اتنا لمبا نہ کرو۔ چوہدری کی بات مان لو۔ بیچاری یتیم لڑکی ٹھکانے لگ جائے گی۔"

چوہدری نے میرے باپ کی طرف بڑی احسان مندانہ نگاہوں سے دیکھا۔ میرے باپ نے آنکھیں پھیر لیں۔ چند لمحوں تک لوگ آپس میں مشورہ کرتے رہے۔ پھر یکایک سب کا ایک بات پر اتفاق ہو گیا کہ مستری اور شیماں کا نکاح کر دیا جائے اور مستری سے کہا جائے کہ وہ اسے ساتھ لے کر راتوں رات گاؤں سے چلا جائے۔ چوہدری کو یہ فیصلہ ناگوار گذرا کیونکہ وہ مستری کو گاؤں سے نہیں نکالنا چاہتا تھا لیکن اُس نے کہا، "پنچایت کے فیصلے کے سامنے میں دم نہیں مار سکتا چوہدریو! پر اُسے دو ایک دن کی مہلت ضرور دو۔ کل کسی وقت میں انہیں رخصت کر دوں گا۔"

تب مولوی صاحب نے دو بول پڑھے اور پنچایت اٹھ گئی۔ اس وقت مجھے یوں لگا جیسے گاؤں نزع کے عالم میں ہو اور اس کا دم نکل رہا ہو!

اور دوسرے دن میں جوہڑ کے کنارے کھڑا تھا جب مستری اور شیماں یکے میں بیٹھے۔ گاؤں کی عورتیں پچھلی گلی میں کھڑی رہیں۔ شیماں کو رخصت کرنے کے لئے کوئی عورت جوہڑ تک بھی نہ آئی حالانکہ گاؤں کی کوئی بیٹی جب گاؤں چھوڑتی تو سارا گاؤں اسے رخصت کرنے کے لئے امڈ آتا۔ عورتیں روتی تھیں، مرد روتے تھے اور بچوں کے ہونٹوں پر بھی ہنسی اور قہقہوں کا رنگ پھیکا پڑ جاتا تھا پر آج شیماں کو رخصت کرتے وقت میں نے صرف ایک آنکھ میں چنگاری دیکھی اور وہ آنکھ میری تھی اور ایک جلتا ٹپکتا آنسو میرے پپوٹوں کو جلا رہا تھا۔ میں نے اس آنسو کو لڑھکنے نہ دیا ورنہ سارے گاؤں میں آگ لگ جاتی۔ اس وقت ماسی ریشم گلی میں سے تیز تیز آئی اور اس نے شیماں کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ پھر وہ یکے کے ساتھ ساتھ چلتی رہی۔ یکہ کھیتوں کی اوٹ میں اوجھل ہوا تو میں بھا کی دکان پر آ بیٹھا۔

"واہنے! کیا ہوا؟" بھا نے پوچھا۔

"کچھ بھی نہیں --- گاؤں مرگیا ہے"

"نہیں ماہنے! گاؤں زندہ ہے"

میں کچھ کہنے والا تھا کہ حیداں دکان کے چبوترے پر آکر ایک لمحے کو رُک گئی۔ اس نے دُکان سے کوئی چیز نہ خریدی۔ اس نے بھا کو ایک نظر دیکھا اور وہاں سے چلی گئی۔ وہ جب تک گلی کے موڑ پر نہ پہنچی، مُڑ مُڑ کر بھا کو دیکھتی رہی۔ اس دن حیداں کے چہرے پر ایک عجیب سا غم تھا جیسے وہ کسی سے بچھڑ رہی ہو یا وہ کسی بات پر کسی سے شرمندہ ہو۔

حیداں کو گلی کے موڑتے نکل دیا تو ماسی ریشم دکان کے چبوترے پر آن کھڑی ہوئی۔

"ماسی!" میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

"کہو ماہنے!"

"تو نے میرے منہ پر ہاتھ کیوں رکھ دیا تھا؟"

"کب؟" ماسی نے چونک کر پوچھا۔

"اس دن جب گلی میں ....."

"چپ رہو ماہنے!" ماسی نے میری بات ٹوک دی۔ بھا مجھے عجیب سی نظروں سے تکنے لگا۔

"کیا نام ہے تمہارا مہاجر لڑکے؟"

"اسلم!" بھا نے مسکرا کر کہا۔

"میں نے کہا نہیں تھا، تم گاؤں میں ہتی نہ ڈالو"

"کہا تو تھا ماسی! پر اب کیا ہو سکتا ہے؟" بھا نے کہا۔

ماسی شاید اس کی محرم تھی کہ وہ بات کو سمجھ کر بولی "تم اب بھی گاؤں چھوڑ جاؤ۔"

"کیوں ماسی؟" میں نے اچانک غصے میں آکر کہا۔

"کسی بات کا پتہ نہ ہو تو چپ رہنا اچھا ہوتا ہے ماہنے!" ماسی سختی سے بولی۔

"ماسی!" بھا سوچ سوچ کر بولا "اب میری اس گاؤں میں جڑ لگ چکی ہے۔ اب میں نہیں جا سکتا"

"نہیں جا سکتے؟" ماسی نے بجھے بجھے انداز میں کہا اور حیداں کی طرح بھا کو مُڑ مُڑ کر دیکھتی ہوئی گلی کی نکڑ پر غائب ہو گئی۔

"بھا! ماسی کیا پہیلیاں بجھا رہی تھی؟"

"کچھ بھی نہیں ماہنے!" بھا نے اپنے اندر گم ہوتے ہوئے کہا۔

اور میں سوچتا رہا، سوچتا رہا اور سال بیتتا رہا اور گاؤں میں کچھ عرصے تک مستری اور شیماں کی باتیں ہوتی رہیں اور چوہدری کی تعریف بھی ہوتی رہی جس نے گاؤں کے فیصلے کے سامنے سر جھکا دیا تھا اور شیماں کو رخصت کرتے وقت اُسے ایک جوڑا بھی دیا تھا اور ایک چھوٹا موٹا زیور بھی پہنایا تھا۔

گاؤں شیماں کو بھول گیا اور میں نے بھا سے پوچھا "بھا! وہ کون تھا؟"

"وہ کون؟ نہیں ماہنے! مجھے کچھ معلوم نہیں"

تب افواہ کا بے پر کا پرندہ گاؤں کے گدلے جوہڑ میں ڈوب گیا!

اور ایک دن اچانک چوہدری ہمارے کُٹیا پر آیا۔ اس نے کہا "مہر دینا! اگلی فصل سے نالے والے کھیت پھر تیرے ہیں۔ ان میں جو چاہے کاشت کر لینا۔"

میرا خیال تھا کہ میرا باپ چوہدری کی پیش کش کو قبول کر لے گا۔ نجانے کیوں اس خیال سے مجھے شرم آئی اور میں اس کے منہ کی طرف دیکھنے لگا۔ میرے باپ کو بہت کم غصہ آتا تھا پر اُس دن اُس کا چہرہ سُرخ ہو گیا تھا اور آنکھوں میں الاؤ بھڑکنے لگا تھا۔ اس نے غصے سے کانپتے ہونٹوں سے پوچھا "چوہدری! یہ مہربانی کیوں؟"

"مہربانی کیوں؟ — اس لئے کہ تمہیں ان کی ضرورت ہے اور میں..."

"نہیں چوہدری! میں نے اس دن پنچایت میں تیری حمایت صرف اس لئے کی تھی کہ اس طرح بیچاری یتیم لڑکی ٹھکانے لگ جائے گی۔ میں نے کھیتوں کے لئے تو ایسا نہیں کیا تھا۔"

چوہدری شرمندہ ہو کر چلا گیا۔ تب میں بہت خوش ہوا۔ میرا باپ تین کھیت قبول کر لیتا تو میں شرم کے مارے زمین میں گڑ جاتا۔ میں نے باپ کی طرف احسان مندانہ نگاہوں سے دیکھا تو اس نے منہ پھیر لیا۔

سائبان والے دن کا عذاب

غلام الثقلین نقوی

یہ آج سے کئی برس پہلے کی بات ہے کہ ایک دن صبح کی اذان پوری طرح فضا میں نہ گونجی۔

حالانکہ اس بستی میں جتنی مسجدیں تھیں، سب میں لاؤڈ سپیکر لگے تھے۔ سبھی یکدم تو نہیں، ایک ایک دو دو لمحوں کے وقفوں کے بعد اذان کی تشہیر کے لئے اپنے دہن کھول دیتے۔ وہ اذان ضرور سنتا حالانکہ اذان کے کلمے آپس میں یوں گڈمڈ ہو جاتے کہ ان میں تمیز ممکن نہ ہوتی۔ ایک ایک کرکے اذانیں ختم ہو جاتیں تو وہ کلمۂ شہادت پڑھ کر پھر سو جاتا۔

آج اذان کی آواز معمول کے مطابق نہ گونجی تو اُسے عجیب سی بے چینی کا احساس ہوا۔ اُسے دوبارہ نیند نہ آ سکی۔ اس نے سوچا۔ کہیں بجلی کی رَو تو کمزور نہیں پڑ گئی یا حبس اتنا بڑھ گیا ہے کہ آواز کی لہروں میں تھرتھراہٹ کم ہو گئی ہے۔ پچھلے کچھ دنوں سے ہوا نہیں چلتی تھی، پتے بھی نہیں ہلتے تھے۔ دن کو شدید گرمی پڑتی تھی۔ دھوپ اتنی تیز تھی کہ گھر سے باہر نکل کر دیر تک چندھیائی ہوئی آنکھوں کو کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ہوا چل رہی ہو تو آوازیں گونجتی ہیں۔ فطرت کا یہ مظہر پہلے پہلے اُسے کچھ زیادہ عجیب معلوم نہ ہوا کیونکہ گرمیوں میں برسات سے قبل ایسی فضا معرضِ وجود میں آتی ہے۔ لیکن اس فضا میں بھی اذان کی آواز ضرور گونجا کرتی ہے۔ یہ فضا اتنی جامد تو نہ ہوتی کہ اس سے آواز کی گونج بھی سلب ہو جائے۔

آج وہ فضا کی اس غیر معمولی تبدیلی سے پہلی بار شعوری طور پر آشنا ہوا تو اس کا دل دھڑکا اور ایک دھڑکن سے ایک سایہ سا لپکا۔۔۔ خوف کا ایک ہیولیٰ۔۔۔ یہ خوف جس کا سایہ اتنا مہیب نہیں تھا کہ وہ بے اختیار ہو کر چونک اٹھتا۔ یہ سایہ تو تعاقب میں دبے پاؤں چلتا ہے اور یوں لگتا ہے کہ ابھی دبوچ لے گا۔۔۔

گرمیوں میں وہ باہر لان میں سوتا تھا۔ بند کمرے میں اس کا دم گھٹتا تھا۔ اسی سبب وہ صبح کی اذان کے وقت ضرور جاگ اٹھتا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ نماز پڑھنے کے لئے مسجد میں نہ جاتا لیکن آج جب اذان میں گونج پیدا نہ ہوئی تو اس کے قدم خود بخود مسجد کی طرف اٹھنے لگے۔ خوف کا سایہ اُس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

جماعت میں اس مسجد کے طالب علم شامل تھے یا کچھ نوکر پیشہ لوگ جن کے کپڑوں سے پسینے کی بُو آ رہی تھی اور قریشی صاحب جو ابھی ابھی ایئرکنڈیشنڈ کمرے سے نکل کر آئے تھے کیونکہ ان کے کپڑوں سے جلی ہوئی آکسیجن کی بُو آ رہی تھی۔ ممکن ہے یہ اس کا واہمہ ہو۔ جماعت کی امامت ایک طالب علم نے کی۔ بڑے مولوی صاحب آج اس صبح مسجد میں نہیں آئے تھے۔

نماز ختم ہونے پر اس نے پوچھا "آج بڑے مولوی صاحب نہیں آئے؟"

"آج کل حضرت صاحب کچھ علیل سے رہتے ہیں۔" قریشی صاحب بولے۔

"اوہو..... اس نے کہا، مجھے معلوم نہ تھا۔"

"آپ اُن سے ملنا چاہتے تھے؟" پیش امام نے پوچھا۔

"ہاں! ... نہیں تو ... یوں ہی ... ایک بات پوچھنی تھی اُن سے۔ وہ آپ بھی بتا سکتے ہیں۔"

"پوچھئے۔"

"آج مسجد کا لاؤڈ اسپیکر تو خراب نہیں تھا؟"

"نہیں تو ....."

"آج اذان کی آواز میں وہ گونج پیدا نہ ہوئی جو پہلے ہوا کرتی تھی۔" اُس نے کہا۔ پیش امام اور قریشی صاحب دونوں نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا اُسے ان دونوں چہروں میں خوف کا کوئی شائبہ نظر نہ آیا، تو وہ حیران ہو گیا۔ قریشی صاحب نے مُسکرا کر ایک نظر اس پر ڈالی اور مسجد سے چلے گئے۔

مسجد سے واپسی پر وہ بستی کی سڑکوں پر ٹہلنے لگا۔ ابھی پوری بستی سو رہی تھی۔ اُسے اِکا دُکا کچھ آدمی ملے۔ کسی کے چہرے نے اُس کے خوف کی تصدیق نہ کی۔ سورج کی پہلی آتشیں کرنوں نے اُس کی پیشانی کو چھوا تو وہ کانپ گیا۔ اُس نے بھاگ کر اپنے مکان کے ٹھنڈے کمرے میں پناہ لے لی۔ کچھ سکون محسوس ہوا تو اس نے نئے دن کے پروگرام پر دل ہی دل میں ایک نظر ڈالی۔ آج نماز کی وجہ سے معمول میں اچانک تبدیلی آ گئی تھی۔ صبح نیند سے بیدار ہو کر وہ لیمن جوس کا ایک گلاس پیا کرتا تھا۔ آج وہ گلاس جوں کا توں باہر لان میں پلنگ کے پاس تپائی پر پڑا تھا۔ چنانچہ اس سے اگلے آئٹم سے اس نے دن کا آغاز کیا۔ اُس نے غسل کیا، کپڑے پہنے اور ناشتے کی میز پر آ بیٹھا۔ خانساماں نے ناشتہ میز پر چنا۔ وہ خانساماں کے وجود سے بالکل بے خبر رہا حالانکہ ناشتے کی میز پر انسانی رشتوں کا وہ سلسلہ پھر سے جُڑ جاتا تھا جو رات کو ٹوٹ جایا کرتا تھا۔ وہ خانساماں سے اس کی خیریت ضرور دریافت کرتا تھا اور اس سے مل کر اُسے خوشی ہوا کرتی تھی۔

چائے کی ایک پیالی پی کر اُس نے کرسی سے ٹیک لگائی اور آنکھیں موند لیں۔ آج سے پانچ سال پہلے تک وہ کم از کم صبح کی نماز باقاعدگی سے پڑھتا تھا اور بہت عرصہ ہوا وہ ساری نمازیں اپنے محلے کی ایک غریبانہ سی مسجد میں جا کر ادا کرتا تھا۔ نمازِ صبح کے بعد مولوی صاحب قرآن کی چند آیات کی تفسیر بھی بیان فرمایا کرتے تھے۔

یکایک ایک یاد نے شعور کے دروازے پر دستک دی۔

اُس نے سنا:

ایک بستی تھی جو بَن والوں کی بستی کہلاتی تھی کیوں کہ یہ کسی جنگل کے کنارے آباد تھی اور اس کے پاس سے ایک تجارتی شاہراہ گزرتی تھی۔ اس وجہ سے یہاں کے لوگ بہت خوشحال تھے اور انہیں اپنی دولت مندی پر گھمنڈ بھی بہت تھا۔ اُن کی اصلاح کے لئے حضرت شعیبؑ کو بھیجا گیا۔

یکایک یہ آواز بند ہو گئی۔

"سر!"

اُس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ مس صوفی نوٹ بک لئے اس کے سامنے کھڑی تھی۔

"آج میری کوئی باہر کی اپائنٹمنٹ تو نہیں؟" اُس نے پوچھا۔

"نہیں سر!"

"اچھا ہوا۔ آج میں کہیں باہر جانے کی موڈ میں نہیں تھا۔"

"کیوں سر! طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

"ہاں! ہاں! بالکل ٹھیک ہے۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں۔"

"سر مجھے اجازت ہے؟" مس صوفی نے پوچھا۔

دو چار لمحوں کے لئے اس نے توقف کیا۔

پھر پوچھا "صوفی! تم نے اِن دنوں فضا میں کوئی خاص تبدیلی تو محسوس نہیں کی؟"

"نہیں تو سر!"

"آج صبح کی اذان تم نے سُنی؟"

"سر! صبح کی اذان!" صوفی کے لہجے میں حیرت تھی۔

"آج صبح کی اذان سے گونج غائب تھی۔" اُس نے کہا۔

"میں نہیں سمجھی سر! یوں بھی میں صبح اتنی جلد سو کر نہیں اٹھتی کہ اذان سُن سکوں۔"

"اچھا جاؤ۔ میں آفس میں آ رہا ہوں۔"

اپنے ہی بنگلے کے ایک کمرے میں اُس کا دفتر تھا!

اس کمرے میں لکڑی کی دیوار کے پیچھے اس کا میز لگا ہوا تھا۔ اس کیبن میں خاصی ٹھنڈک تھی۔ اس کے باوجود اُسے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اُس کے دفتر کا انچارج ایک فائل لے کر آیا تو اس نے کہا "مسٹر نظام! آج کل موسم کچھ عجیب سا ہے، کام کرنے کو جی نہیں چاہتا۔"

"ٹھیک ہے سر! گرمی بہت ہے۔ ہوا نہیں چلتی۔ اس لئے موسم میں گھٹن بڑھ گئی ہے۔ بارشیں آنے والی ہیں۔ پھر موسم ٹھیک ہو جائے گا۔"

"مجھے تو ایسا لگتا ہے جیسے فضا میں آکسیجن کی مقدار آہستہ آہستہ کم ہو رہی ہے۔"

مسٹر نظام نے اُسے حیران ہو کر دیکھا تو وہ مسکرانے لگا۔ "گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔"

اور اس نے فائل کو دیکھنا شروع کر دیا۔

ظہر کی نماز کا وقت ہوا تو خلافِ معمول اس کے قدم خود بخود مسجد کی طرف اُٹھ گئے۔ مسجد تک پہنچنا ایک بہت بڑا جہاد تھا۔ جماعت کھڑی ہو چکی تھی۔ بڑے مولوی صاحب نماز کی قیادت فرما رہے تھے۔ سلام پھیر کر انہوں نے نمازیوں کی طرف رُخ بدلا تو اُسے دیکھ کر مولوی صاحب مسکرائے۔ ممکن ہے یہ اس کا وہم ہو۔ دُعا سے فارغ ہونے کے بعد انہوں نے پوچھا "آپ اسلام الدین ہیں؟"

"جی ہاں۔"

"آپ فجر کی نماز میں میرے بارے میں کچھ پوچھ رہے تھے؟"

"آپ کے بارے میں نہیں البتہ ایک بات آپ سے پوچھنا چاہتا تھا۔"

"جو بات آپ پوچھنا چاہتے تھے اس کا مجھے علم ہو چکا ہے۔ یہ آپ کا واہمہ ہے۔ گرمی شدید ہے اور ممکن ہے کہ اس وجہ سے آپ کی سماعت پہ بھی اثر پڑا ہو۔"

"ممکن ہے۔" اُس نے کہا۔

"اس موسم میں بارشیں آجانی چاہئیں پر اللہ کو ابھی منظور نہیں۔ بہتر ہوگا کہ ہم بارش کے لئے دعا کریں۔"

مولوی صاحب نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے۔ دُعا کے الفاظ اتنے پُر تاثیر تھے کہ بے اختیار اس کی نگاہیں آسمان کی طرف اُٹھ گئیں۔ آسمان اور اس کے درمیان مسجد کی منقش چھت حائل تھی۔ باہر خیرہ کُن دھوپ تھی۔ آسمان صاف تھا۔ اس کی نیلاہٹ تیز دھوپ کے باعث گدلا سی گئی تھی۔

وہ رات ہوا اور خنکی سے یکسر محروم رہی۔

اگلی صبح اذان کی آواز کل صبح سے بھی زیادہ مدھم اور ضعیف تھی۔

آج صبح کی نماز کی امامت کے لئے بھی بڑے مولوی صاحب موجود تھے۔

ابھی جماعت کھڑی نہیں ہوئی تھی کہ مسجد کے مؤذن نے اُس سے پوچھا۔

"صاحب آج تو اذان کی آواز ضرور لرزتی ہوگی؟"

اس نے جواب دینے سے احتراز کیا۔

دُعا کے بعد مولوی صاحب نے اس کی طرف متوجہ ہو کر پوچھا۔

"اسلام الدین صاحب! آج صبح کی اذان کی کیا کیفیت تھی؟"

"کل صبح سے بھی زیادہ مدھم اور کمزور۔ آواز میں کوئی لرزش نہیں تھی۔"

"معلوم ہوتا ہے، آپ کا وہم ابھی دُور نہیں ہوا۔ آپ کسی ڈاکٹر کی طرف رجوع کیوں نہیں کرتے؟"

"ڈاکٹر مجھے کیا دے گا؟" اُس نے مسکرا کر کہا۔ "اعصابی سکون کی ایک گولی۔"

"کچھ اضطراب تو کم ہو جائے گا۔"

"شاید۔۔۔"

"میں تو صرف آپ کے لئے دُعا کر سکتا ہوں۔" مولوی صاحب کے ساتھ اُس نے بھی دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے۔ "یا ارحم الراحمین! اپنے اس عاجز بندے پر رحم کر۔ اِسے اپنے ذکر کی توفیق بخش تاکہ اسے سکونِ قلب حاصل ہو۔"

نمازیوں نے آمین کہی۔

"حضرت! صرف میرے لئے نہیں ساری دنیا کے لئے دعا کیجئے۔ آپ نے اخبار میں پڑھا ہوگا کہ بارانی علاقوں میں کنوئیں سوکھ رہے ہیں۔ باغوں اور کھیتوں میں خاک اُڑ رہی ہے۔ مویشی پانی اور چارے کو ترس رہے ہیں۔ کئی لوگ گرمی کے مارے دم توڑ رہے ہیں۔ آپ اس عذاب سے بے خبر کیوں ہیں؟"

"اسلام الدین صاحب!" مولوی صاحب کے لہجے میں تہدید تھی۔ "آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اُمّتِ مرحومہ پر عذاب نہیں آ سکتا۔ اس موسم میں زمین مُردہ ہو جاتی ہے۔ بارانِ رحمت کے چند چھینٹے پڑیں گے تو زمین زندہ ہو جائے گی۔ آپ اِن دنوں کو اپنے ٹھنڈے کمرے میں کیوں نہیں گزار دیتے؟"

"وہ لوگ کیا کریں گے جن کے پاس ٹھنڈے کمرے نہیں۔"

"انہیں بھی کوئی شجر سایہ دار مل جائے گا۔"

"لیکن سایہ بھی تو خنکی سے محروم ہو چکا ہے۔ آپ کے سر پر پنکھا چل رہا ہے۔ ذرا محسوس تو کیجئے، کیا اس سے ہوا حرکت میں آ رہی ہے؟"

مولوی صاحب نے مسکرا کر چھت کی طرف دیکھا۔ پنکھا گھرر گھرر چل رہا تھا۔ ایک نہیں کئی پنکھے حرکت میں تھے لیکن مسجد کی فضا گویا پلاسٹک کی بنی ہوئی تھی کہ اس میں نام کو حرکت نہیں تھی۔ مولوی صاحب نے کندھے پر پڑے رومال کے ایک پلّو سے آنکھوں کا پسینہ پونچھا۔

تب اُس نے اِن آنکھوں میں خوف کا سایہ لہراتے ہوئے دیکھا...

مولوی صاحب بولے "دیکھیے! آپ نے مجھے بھی پریشان کر دیا۔ میں گھر جانا چاہتا ہوں"

اپنے حجرے میں بیٹھ کر اللہ سے لَو لگاؤں گا۔ وہ رحیم و کریم ہے، ضرور مجھے ہدایت فرمائے گا"

اس دن بستی کی سڑکوں پر بہت کم رونق تھی۔ اِکّا دُکّا کاریں چل رہی تھیں۔ کچھ بسیں بھی رینگتی ہوئی نظر آ رہی تھیں لیکن یوں لگ رہا تھا جیسے یہ کھلونے ہوں جن کی چابی آہستہ آہستہ ختم ہو رہی ہو۔

اِس کے باوجود کہ ایرکنڈیشنر چل رہا تھا، اُس کے دفتر میں ہر چہرہ مرجھایا ہوا نظر آ رہا تھا۔ مس صوفی کے چہرے سے میک اپ اُتر رہا تھا اور ہونٹوں پر سُرخی پھٹ رہی تھی۔ مسکراہٹ ہونٹوں سے چپک گئی تھی، اکڑ اور غرور کے اس دھبے کی طرح جو خشک زمین کے ہونٹوں پر پپڑی بن کر نمودار ہوتا ہے۔

اس نے کہا "مس صوفی! گرمی شدید ہے، کیوں نہ دو چار دنوں کے لئے دفتر میں چھٹی کر دی جائے؟"

"ان دنوں کام بہت ہے سر!" مس صوفی نے کہا

"کام ہوتا رہتا ہے۔ آج کا ضروری کام نپٹ جائے تو سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے جائیں"

میں اتنے لوگوں کا ذمّہ دار کیوں بنوں؟ میں ان کا بوجھ اپنے کندھوں سے اتار کر ہلکا پھلکا محسوس کروں گا۔ کندھوں کا بوجھ کبھی اترتا بھی ہے یا نہیں کون جانے! یہ بھی اچھا ہے کہ زندگی کی کمر توڑ تگ و دو نے مجھے آج تک اتنی فرصت ہی نہ دی کہ میں بیوی بچّوں کا بوجھ اپنے کندھوں پر لاد لیتا ورنہ آج یہ بوجھ میری پیٹھ توڑ ڈالتا۔

دفتر خالی ہوا تو ایک سنّاٹا ہر طرف سے لپک کر آیا اور اُس کے ماحول پر یوں چھا گیا جیسے اُس کے اردگرد تنائیں سی لگ گئی ہوں۔ اس کی دنیا پہلے سے کہیں چھوٹی ہو کر سکڑنے سمٹنے لگی تو اُسے جسم اور روح کے بھینچنے اور دبنے کی کیفیت سے دوچار ہونا پڑا۔ اس نے سوچا تھا کہ تنہائی اُس کے اضطراب کو کم کرے گی لیکن ایسا نہ ہوا۔ وہ کبھی باہر لان میں نکل جاتا، کبھی اندر جاتا اور خوف کا مہین سا سایہ اس کے تعاقب میں دبے پاؤں چلتا رہا...

لان میں مالی پلاسٹک کی نالیوں سے پودوں کو پانی دے رہا تھا۔ دوپہر کے وقت پودوں کو پانی نہیں دیا جاتا۔ اس نے اشارے سے مالی کو اپنی طرف بلایا اور پوچھا "آج تم نے پانی دینے میں بہت دیر کر دی؟"

"صاحب! پتہ نہیں، کیا وجہ ہے کہ پودوں کی پیاس مرتی ہی نہیں۔ صبح پانی دیتا ہوں تو ذرا سی دیر کے لئے پودا تازہ دم رہتا ہے اور پھر مرجھا کر سر نیہوڑا لیتا ہے۔ تب مجھے اس پر ترس آتا ہے۔ میں اُسے پیاسا نہیں دیکھ سکتا۔"

"وجہ یہ ہے کہ گرمی بہت سخت ہے اور پانی بھاپ بن کر اُڑ جاتا ہے۔" اس نے منطقی جواز تلاش کر لیا لیکن مالی نے کہا "اس موسم میں گرمی اتنی ہی سخت ہوتی ہے صاحب! پر پودوں کو صبح شام پانی ملتا رہے تو وہ مرجھاتے نہیں۔ اس سال معاملہ کچھ عجیب ہے۔ زمین سارا پانی خود پی جاتی ہے اور پودوں کی جڑوں تک دو چار قطرے ہی پہنچ پاتے ہیں۔ یہی حال رہا تو لان کا ہر پودا سُوکھ جائے گا۔ دو چار دن اور بارش نہ ہوئی تو لان میں دھول اُڑنے لگے گی"

بارش !..... اُس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ زمین سے لے کر آسمان تک تیز دھوپ لہرا رہی تھی اور آسمان کا رنگ زرد پڑ چکا تھا۔ ابھی ہواؤں نے بخارات کا رُخ میدانوں کی طرف نہیں موڑا تھا۔

مالی نے کہا "صاحب! میں نے اِس سے بھی زیادہ سخت گرمی میں پودوں کو پنپتے دیکھا ہے مگر یہ عجیب بات ہے کہ ماں نے اپنے بیٹوں کو دودھ پلانے سے انکار کر دیا ہے"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" اُس نے چونک کر پوچھا۔

"زمین ماں ہے۔ ماں خود پیاسی رہتی ہے لیکن بچوں کے منہ سے اپنی چھاتی نہیں نکالتی۔ جب ماں بچوں کو پیاسا رکھ کر اپنی پیاس بجھانے لگے تو سمجھئے قیامت نزدیک ہے۔"

مالی کی اِس بات پر وہ اتنا خوف زدہ ہوا کہ بھاگ کر سرد کمرے میں پناہ گزین ہو گیا۔

اُس دن ظہر، عصر، مغرب اور عشا کی سب نمازیں اس نے مسجد میں پڑھیں۔ عشاء کی نماز کے بعد نمازیوں سے مشورہ کر کے مولوی صاحب نے فیصلہ کیا کہ کل نمازِ استسقاء پڑھی جائے گی۔ لاؤڈ سپیکر پر اعلان کر دیا گیا کہ نماز کل دس بجے بڑی گراؤنڈ میں ادا ہو گی اور ہم گنہگار بندے اللہ تعالیٰ کے سامنے بارانِ رحمت کے لئے دامن پھیلائیں گے۔

اُس رات اُسے اندھیرے سے وحشت ہو رہی ہے۔ اندھیرا سایہ ہوتا ہے اور سائے میں خنکی نہ بھی ہو، تب بھی خنکی کا احساس ہوتا ہے آج رات کے اندھیرے سے خنکی کا احساس بھی غائب تھا۔ یہ اندھیرا اتنا دبیز اور ساکت تھا کہ ستاروں کی ٹمٹماہٹ بھی جامد ہو گئی تھی۔

اُس رات اُسے نیند نہ آئی۔

اُس نے سوچا۔ "ساری بستی سو رہی ہے اور میں اکیلا آدمی جاگ رہا ہوں"

اس صبح اذان کی آواز اُسے بالکل سنائی نہ دی!

وہ اتنا تھک چکا تھا کہ مسجد کی طرف اٹھنے والا ایک ایک قدم بھاری پتھر لگ رہا تھا۔

بڑے مولوی صاحب نے نماز پڑھ کر بجھے بجھے لہجے میں نمازِ استسقاء کے آداب بیان کئے۔ انہوں نے کہا "ایک دل سے بھی خلوص کے ساتھ دعا نکل گئی تو رحمتِ الٰہی ضرور جوش میں آئے گی"

اُس دن دھوپ میں تیر کی نوک اور نیزے کی اَنی کی سی تیزی تھی۔

لوگ بڑے میدان میں جمع تھے۔ اِس کی گھاس سوکھ چکی تھی اور ننگے پاؤں کے تلوے جل رہے تھے۔ مولوی صاحب نے بارش کے لئے دعا کی۔ سب نے آمین کہی۔ اس کا خیال تھا کہ دعا آسمان کی طرف رُخ کرے گی تو دھوپ کی ساکن چادر مرتعش ہو جائے گی اور فضا میں خاموش بھونچال کی سی کیفیت محسوس ہو گی لیکن فضا کا جمود نہ ٹوٹا تو وہ زرد ہو کر رہ گیا۔ اُسے محسوس ہوا کہ وہ اس میدان میں اکیلا ہے کیوں کہ جو لوگ اس نماز میں شریک ہوئے تھے وہ اس بستی کے نہیں تھے۔ اس بستی کے سارے لوگ خنک کمروں میں پناہ گزین تھے۔ قریشی صاحب جو صبح کی نماز باقاعدگی سے مسجد میں ادا کرتے تھے، وہ بھی اس نماز میں شریک نہیں ہوئے تھے۔ نمازیوں میں صرف نوکر پیشہ لوگ شامل تھے، جن کا تعلق اس بستی سے نہ ہونے کے برابر تھا۔ اس نے سوچا۔ بستی کے لوگ جانتے ہیں کہ اگر بادل چھا گئے، بارش ہوئی اور ٹھنڈی تازہ ہوا چلی تو وہ بھی اس سے مستفید ہوں گے اور اگر ایسا نہ ہوا تو اُنہیں سرد خانوں کی خنکی سے کون محروم کر سکتا ہے۔

مولوی صاحب نے اُس کے پاس سے گزرتے ہوئے پسینے میں بھیگی ہوئی ایک جلی پھکی نگاہ اُس پر ڈالی۔ ان کے پپڑی جمے ہونٹ غصّے سے پھڑکنے لگے گویا کہہ رہے ہیں "اسلام الدین صاحب! یہ سب آپ کے خوف کا نتیجہ ہے۔ آپ نے اپنے عذاب میں ہمیں خواہ مخواہ شریک کر لیا۔"

جب وہ میدان سے رخصت ہوا تو اچانک دھوپ دھندلا سی گئی۔

اُس کے مالی نے جو اُس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا کہا "صاحب! معلوم ہوتا ہے، مولوی صاحب کی دُعا قبول ہو گئی ہے۔"

"وہ کیسے؟"

"سورج گہرا سا گیا ہے۔"

"ممکن ہے یہ اُن لوگوں کے دل کا غبار ہو جو نماز میں شامل تھے۔"

"صاحب! یہ کیا بات ہے کہ اس بھری پُری بستی میں سے آپ اکیلے اس نماز میں شامل ہوئے؟" مالی نے پوچھا۔

"تو کیا تم اس بستی کے رہنے والے نہیں؟" اُس نے پوچھا۔

"نہیں صاحب! میں اس بستی میں محنت مزدوری کر کے پیٹ پالتا ہوں، پر میرا اس بستی سے کوئی تعلق نہیں۔" مالی نے کہا۔

اس نے حیران ہو کر مالی کے چہرے پر نظریں جما دیں۔ مالی نے نہ آنکھیں چرائیں نہ اس کی آنکھ میں آنکھ ڈالنے کی ضرورت محسوس کی۔

وہ کانپ گیا۔

جب وہ بنگلے میں پہنچا تو آسمان پر غبار کچھ اور گہرا ہو گیا تھا۔ لیکن اس غبار کا سایہ نہیں تھا۔ سائے میں خنکی ہوتی ہے اور اس غبار تلے کوئی خنکی نہیں تھی۔ ایک بے حد گرم تپتی ہوئی گھٹن تھی۔ اس دوپہر پوری بستی تہہ خانوں میں چلی گئی تھی۔

بَن والوں نے حضرت شعیبؑ کو جھٹلایا تو ان پر سخت گرمی مسلط کر دی گئی۔ وہ لوگ تہہ خانوں میں گھس گئے۔

وہ دن اور وہ رات اُس نے ایئرکنڈیشنڈ کمرے میں بسر کیے؛

ظہر، عصر، مغرب اور عشا کی نمازیں اُس نے اِسی کمرے میں ادا کیں۔

ہوا بند کمرے کی فضا بوجھل تھی۔ اس کی آکسیجن جل رہی تھی اور کاربن ڈائی آکسائڈ کی مقدار بڑھ رہی تھی۔ وہ گھبرا کر گھڑی لان میں آیا۔ یہی کیفیت باہر کی فضا کی تھی۔ کیا یہ بات ممکن ہے؟۔ اُس نے سوچا کہ کرۂ ارض کے کسی حصّے کی آ... جل جائے۔ نہیں یہ حادثہ نظامِ قدرت کے خلاف ہے اصحاب الایکہ (بَن والے) ایک بستی میں رہتے تھے۔ یہ ایک چھوٹی سی بستی تھی۔ اس بستی کے علاوہ اور بھی بہت سی آبادیاں تھیں۔ یمن میں، مشام میں بابل میں، نینوا میں۔ مصر اور فلسطین میں ... یہ بستی تباہ ہو گئی ... اور باقی دنیا محفوظ رہی ... کیا اس بستی کی آکسیجن جل گئی تھی؟ ... کون جانے؟ ... لیکن آج کے انسان نے ایسے بم ایجاد نہیں کر لیے کہ ایک خاص جگہ کی آکسیجن جل جائے اور وہاں کی مخلوق دم گھٹ کر مر جائے ...

کیا نظامِ قدرت میں کوئی ایسی تبدیلی تو نہیں آ چکی؟ ... نہیں ... نہیں ... یہ میرا واہمہ ہے ... پر اس رات بستی پر موت کی سی خاموشی طاری تھی۔ سڑکیں خالی تھیں اور قمقموں کے گرد غبار کے ہالے تھے اور اُن کی روشنی مریل اور مدھم تھی۔ اگلی صبح اُسے یہ بھی معلوم نہ ہو سکا کہ آج کا سورج طلوع ہوا ہے یا نہیں۔ آج کی نماز مسجدوں اور مصلوں پر سے اُچک لی گئی تھی۔ آج کوئی ہاتھ آسمان کی طرف نہ پھیلا کیونکہ آسمان اور زمین کے درمیان غبار کا سائبان تنا تھا۔ آج کوئی دعا آسمان تک نہ پہنچ سکے گی۔

تاہم اس نے کمرے میں مصلیٰ بچھایا اور وہ نماز کے لیے کھڑا ہی ہوا تھا کہ اچانک کمرے کی پہنائی فضا سے محروم ہو گئی۔ اس کا دم گھٹنے لگا تو وہ اپنے

ہی ہونٹوں سے نکلے ہوئے نماز کے الفاظ نہ سن سکا۔ کوئی ضروری نہیں کہ الفاظ آواز کی صورت میں ڈھل کر کانوں تک پہنچیں لیکن آج الفاظ گنگ ہو چکے تھے وہ لڑکھڑاتا ہوا کمرے سے باہر نکلا۔ لان کی سوکھی گھاس اُس کے قدموں تلے چُرمُر ہو کر رہ گئی۔ درختوں کے پتّے مردہ ہو کر شاخوں پر لٹک گئے تھے اور شاخیں مُرجھا کر زمین پر آ گری تھیں۔ کسی درخت پر کوئی پرندہ موجود نہیں تھا۔ ساری بستی پر مُردہ جنگل کا مہیب سنّاٹا طاری تھا۔

تہہ خانوں میں گرمی بڑھی تو وہ لوگ گھبرا کر باہر نکل آئے۔

تب غبار گہرا ہوا اور اُس نے دیکھا کہ بستی کے سارے لوگ لانوں اور میدانوں، سڑکوں اور چوکوں پر جمع ہو گئے ہیں.... لوگ... نہیں.... اُن کے ہیولے... اُن کے سائے... بے چہرہ لوگ.... بے چہرہ سائے...

اُن پر ایک اَبر نے سایہ کیا۔ غنیمت سمجھ کر سب اس کے تلے جمع ہو گئے۔ پھر اس سے آگ برسنے لگی۔ سب کو جلا دیا۔

اُس نے سوچا... کیا اس اَبر سے آگ برسے گی؟... آگ برسی تو ہم سب چشم زدن میں جل کر بھسم ہو جائیں گے۔ بے شک یہ بہت بڑے دن کا عذاب ہو گا — لیکن آگ ہمارے لئے نجات بن جائے گی.... اور تب سورج کی یہ آخری لہر بھی دم توڑ گئی.... اور ساکن و جامد اَبر کا سائبان جو اُن پر تنا تھا، اُس سے آگ بھی نہیں برس رہی تھی کہ عذاب سے نجات حاصل ہو.... ایک لمبے دن کے عذاب سے...

اور سائبان والے اُس دن کا عذاب ازل سے لے کر ابد تک کے ہر لمحے پر چھا گیا۔

جوگندر پال | جادو

کام ڈھونڈتے ڈھونڈتے بھابو ہمارے گھر بھی چلی آئی تھی۔ میری نگاہوں نے اُس کے سارے وجود کو اس طرح ٹٹولا تھا جیسے مرغی خریدتے وقت میری انگلیاں اس کا انگ انگ ٹٹول کر مجھے بتاتی ہیں کہ اس کا گوشت پک کر بے لذت تو نہ ہوگا۔ اسے دیکھ کر اس کے بڑھاپے یا جوانی کا خیال نہ آتا تھا اور نہ ہی اس کے چہرے سے اس کی پہچان کا کوئی تصور بندھتا تھا، مانو وہ اپنا آپ ہونے کی بجائے کوئی بے جان شے ہو، جو پیدا ہی اس لئے ہوئی ہو کہ اُسے اپنے کام کا بنا لیا جائے۔ اس کی یہی پہچان کافی ہے کہ ہماری نوکرانی ہے۔ اگر بھابو بھی کسی کی ماں یا بیوی ہوتی تو اپنا بدن ہی بدن اوڑھے تن تنہا ہمارے پاس کیا لینے آتی؟ مزے سے اپنے گھر میں بیٹھ کر اپنی اور اپنے گھر کے ایک ایک فرد کی پہچان کے اسباب کرتی۔

"کیا نام ہے تمہارا؟" میں نے اس سے پوچھا، اور اس نے تھوڑی دیر جواب نہ دیا تو مجھے تشویش ہونے لگی کہ اگر وہ بہری ہے تو کام کاج میں بہت دقت کا سامنا ہوگا، مگر میں نے اپنا سوال دہرایا تو اس کے منہ سے معلوم ہو رہا تھا کہ اس کا کوئی نام نہ ہوتا تو وہ جواب دینے کی پریشانی سے بچ کر بہت خوش رہتی۔

"معلوم ناہیں، پہلے پہل کوئی نام ہوگا، پر اب جدھر بھی کام کرتی ہوں مالک لوگ بھابو کہہ کر اواج دیتے ہیں۔"

میں نے سوچا کہ جتنی تنخواہ بھی کہوں گا اس سے پانچ دس زیادہ طلب کرے گی، سو میں نے پہلے ہی پندرہ کاٹ کر پوچھا۔ "بولو، منظور ہے؟"

بھابو نے نہ کہنے کے انداز میں کندھوں کی طرف سر جھلاتے ہوئے کہا۔ "ہاں منظور ہے۔"

میری بیوی نے اُسے متنبہ کیا۔ "گھر کا سارا کام کرنا ہوگا۔ صفائی کرنا، کپڑے دھونا، کھانا بنانا۔ سارا کام۔ ٹھیک ہے؟"

"ہاں۔"

"ہاں واں نہیں، خوب اچھی طرح سوچ لو۔"

وہ چپ چاپ خالی خالی آنکھوں سے ہماری طرف دیکھتی رہی جیسے سوچ کر اپنا کام نہ بڑھانا چاہتی ہو۔

"اور کھانے پر تین یا زیادہ سے زیادہ چار روٹیاں ملیں گی۔ بولو۔"

جواب دیتے ہوئے بھابو کی آنکھوں سے شادماں سی فخر مندی ٹپکنے لگی۔

"مو جھے بھوک ہی ناہیں لگتی۔"

میرا ماتھا ٹھنکا کہ کہیں وہ تپ دق کی مریض تو نہیں۔ نہیں، دیکھنے میں تو تندرست ہی معلوم ہو رہی ہے۔ "تمہیں بخار تو نہیں آتا؟

"ہاں۔"

میں نے فیصلہ کر لیا کہ پھر بھی احتیاطاً ایک بار اسپتال سے چیک اپ کروالوں گا۔

بھابو کو ہمارے پاس آئے اب تین ماہ سے اُوپر ہوتے کو آ رہے ہیں۔ وہ اتنی مستعدی سے سارا کام انجام دیتی ہے کہ اُس طرف ہمارا خیال ہی نہیں جاتا۔ کوئی کام رُکے یا اس میں خرابی پیدا ہو تو وہ ہمارے سر پر سوار ہے، ورنہ سب کچھ چین سے ہو رہا ہے تو نوکروں کے بارے میں سوچ سوچ کر اپنا مزہ کیوں کرکرا کیا جائے۔

میری بیوی نے بھابو کے کام سے پوری طرح مطمئن ہو کر اس نے تھوڑے بہت کام سے بھی ہاتھ کھینچ لیا جو پہلے وہ آپ ہی بخوشی کر لیا کرتی تھی۔ اب وہ پورا دن ہمارے ننھے منے اکلوتے لڑکے کے ساتھ کھیلنے میں بتا دیتی ہے۔ یا پھر ہم دونوں بڑی فرصت سے جی بھر بھر کے ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہیں اور ہمیں محسوس ہونے لگتا ہے کہ ہمارا ساتھ جنم جنم کا ہے اور ہر جنم میں ہمارا یہی بچہ پیدا ہوتا ہے۔ ایک وہ، ایک میں اور ایک ہمارا یہ۔ گھر میں ہمارے سوا اور کوئی نہیں۔ بھابو؟ ہاں، وہ نہ ہو تو ہم ایک دوسرے کو بھول کر سب سے پہلے اسی کے بارے میں سوچنے رہیں، مگر ہے تو ذہن میں، دور دور تک کہیں دکھائی نہیں دیتی۔ ذہن میں چھوڑیئے، عین ہماری آنکھوں کے سامنے ہو تو بھی نظر نہیں آتی۔ بھوت کی بھوت سارے گھر میں منڈلاتی رہتی ہے اور ہماری آنکھیں اس کے وجود سے یوں گزر جاتی ہیں جیسے خالی خولی ہواؤں سے۔ اگر وہ بہ اتفاق نظر آ بھی جائے تو یہی لگے کہ کسی جادوگرنی کی طرح ایک دم ہواؤں سے ہی برآمد ہو گئی ہے۔

میری بیوی کو ایک پڑوسن نے تنبیہ کر رکھی ہے کہ بھابو پر نگاہ رکھو۔ پوری جادوگرنی ہے۔ پچھلے گھر سے بھی انہوں نے اسی لئے نکالا تھا کہ اُن کا بچہ ہر وقت بیمار رہنے لگا تھا، مگر جب سے اُسے نکالا ہے، کیا مجال اُسے چھینک بھی آئی ہو۔ ہمارا بالا اُسے دیکھ کر بڑا خوش ہوتا ہے۔ ہمیں تو وہ نظر نہیں آتی مگر ہمارے بالا کی نظر میں شاید پھلجھڑی کی طرح جلتی بجھتی رہتی ہے۔ یہ آگئی! — وہ گئی! — یہ پھر آگئی! — اور وہ اپنے ننھے منے ہاتھوں سے تالیاں بجا بجا کر بڑی پُرمسرت آواز میں چلا کر کہتا ہے۔ بھا۔ ب۔ و۔ و۔ و! — میری بیوی بھابو کو جھڑک کر باورچی خانے میں جا کر اپنے کام کی طرف متوجہ ہونے کی ہدایت کرتی ہے اور وہ بجھ کر جانے کے لئے پلٹ جاتی ہے تو بالا بے اختیار رونے لگتا ہے۔ ایک بار تو رو رو کر اس نے سارا کھایا پیا باہر الٹ دیا اور میری بیوی کو واقعی شک ہونے لگے کہ شاید یہ بھابو کے جادو ٹونے کا ہی اثر ہے مگر وہ اپنے شک پر آپ ہی ہنس دی۔ بھابو کا کام اتنا اطمینان بخش تھا کہ میری بیوی کو اس کے جادوگرنی ہونے کا یقین بھی ہوتا تو وہ اُسے کام سے الگ کرنے کا نہ سوچتی۔ گھریلو سکھ چین بھی تو جادو ٹونے سے کم نہیں ہوتے۔ کئی بار تو ان کی وجہ سے مالک اپنے نوکروں کے غلام ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اُن سے چڑنے کی نوبت بھی آ جائے تو اپنے آپ کو سمجھا بجھا کر چُپ کروا لیتے ہیں کہ ایسی کیا بڑی بات ہو گئی ہے، لیکن چڑنے کا کوئی سبب بھی نہ ہو تو مالک اسی بات پر نوکر سے چڑا رہتا ہے۔ شاید اسی لئے بھابو سے سختی برت برت کر ہمیں تسکین سی ہوتی ہے، ہماری ہی نہیں بھابو کو بھی تسکین ہوتی ہوگی۔ کل شام کا ہی ذکر ہے کہ وہ میرے لئے چائے لے کر آئی تو کپ کو تپائی پر رکھتے ہوئے ہڑبڑا سی گئی اور تھوڑی سی چائے چھلک کر تپائی پر گر گئی۔ میں کتاب پڑھنے میں منہمک تھا اس لئے میرا دھیان اس طرف نہ گیا۔ تھوڑی دیر میں سر اٹھا کر دیکھا تو وہ ابھی تک وہیں کھڑی میری طرف پُر امید نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"کیا بات ہے؟"

"وہ چائے گر گئی ہے۔"

اس کا اترتا ہوا چہرہ دیکھ کر مجھے محسوس ہوا کہ اسے تھوڑا سا جھڑک دوں گا تو وہ خوش ہو جائے گی اور اسے میری کمینگی پر محمول کر لیجئے کہ اُسے صرف اس خوشی سے محروم رکھنے کے لئے میں نے مسکرا کر بڑے ملائم لہجے میں کہا "کوئی بات نہیں" — مگر چند لمحوں کے بعد مجھے افسوس ہونے لگا۔ ذرا سا جھڑک دینے سے میرا کیا بگڑ جائے گا؟ — میں نے کتاب سے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا لیکن اب تک وہ اپنی جگہ پر کھڑی کھڑی غائب ہو چکی تھی — میں نے مُسکرا کر اپنا سر پھر کتاب پر جھکا لیا مگر ابھی پڑھنا شروع بھی نہ کیا تھا کہ اس کی نحیف سی آواز سن کر چونک پڑا۔ وہ میرے سامنے جوں کی توں کھڑی تھی، بے شکل اور اُڑی اُڑی — میں خوف زدہ جھلاہٹ سے گویا کسی بھوت سے مخاطب تھا۔

"جاؤ بابا، جان کیوں کھا رہی ہو؟"

بھابو بھوت ہو یا نہ ہو، بھوت اُسی کے مانند ہوتا ہوگا۔ اس دن گھر میں میں اکیلا تھا — میرا مطلب ہے میرے علاوہ صرف بھابو تھی جو باورچی خانے میں برتن ورتن مانجھ رہی ہوگی۔ اچانک مجھے باورچی خانے سے بھابو کے ہنسنے کی آواز سنائی دی — بھابو کے ساتھ وہاں اور کون ہے؟ — میں ہنسنے لگا — ہوگا کون؟ آپ ہی اپنے ساتھ ہوگی اور اپنے آپ ہنس رہی ہوگی — مجھے خواہش ہونے لگی کہ اُٹھ کر جاؤں اور اسے ہنستے ہوئے دیکھوں۔ ہنستے ہنستے شاید بے شکل عورت نے واقعی کوئی شکل اختیار کر لی ہو۔ میں نے اُسے ہنستے ہوئے کبھی نہیں دیکھا، روتے ہوئے بھی نہیں دیکھا۔ بس جیسی ہے ویسی ہی دیکھ لیتا ہوں۔ اور اُسے دیکھتے ہوئے ذہن میں اس کی کوئی شکل نہیں بنتی۔ میں نے آنکھیں بند کر کے چاہا کہ اُسے ہنستے ہوئے دیکھ لوں مگر تاریک خلا میں کوئی جنبش پیدا نہ ہوئی اور پھر یکبارگی ہمارا بالا ہنستے، دوڑتے، روشنیاں بکھیرتے ہوئے دکھائی دیا اور وہ — وہاں اس طرف ہو لیا جہاں اس کی ماں بازو پھیلائے کھڑی تھی۔ ان دونوں کی پُرشکل صورتوں سے کھنچ کھنچ کر میں بھی بیٹھے بیٹھے انہی کے پاس جا پہنچا — بالا ممی کے بیٹے ہو یا پپا کے؟ — ممی کے! — ممی نے اپنے بیٹے کو بے اختیار لیکے سے چمٹا لیا — نہیں، پپا کے! پپا نے بالا کو چھین کر اپنے گلے سے لگا لیا — ممی نے اچھل کر بالا کو پپا سمیت اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ یا شاید پپا ہی اُن دونوں کو اپنے بازوؤں کی لپیٹ میں لئے ہوئے تھا — ہو ہا — ہو ہا! — نہیں، بالا نے ہی ممی اور پپا دونوں کو اپنے لمبے لمبے توانا بازوؤں میں لپیٹ رکھا ہے اور وہ دونوں بچوں کی طرح اپنے بیٹے کے بازوؤں کی تھرکتی ہوئی مچھلیوں سے کھیل کھیل کر ہنس رہے ہیں — اور تاریکیوں سے اجالا پھوٹ رہا ہے اور خلا میں چار سو آبادکاری کا منظر ہے اور اس بھیڑ بھاڑ میں ممی پپا اور بالا کی پہچان دم بدم گاڑھی ہوتی جا رہی ہے —

دفعتاً اس بارونق زندگی کے پیچھے پیچھے مجھے سناٹوں میں سرگوشیاں سننے کا احساس ہوا اور میں نے آنکھیں کھول لیں — باورچی خانے میں بھابو کے ساتھ کون ہے؟ — وہ کسی کے ساتھ آہستہ آہستہ باتیں کر رہی تھی — میں دبے پاؤں چل کر باورچی خانے کے دروازے پر آ کھڑا ہوا — وہ میری طرف پشت کئے چُپ چاپ اپنے کام میں جُٹی ہوئی تھی — تو پھر ابھی ابھی کیا میرے کان بول رہے تھے؟ — میں چپکے سے الٹے پاؤں واپس آ گیا — کتنی پُراسرار عورت ہے۔ کہیں واقعی کوئی جادوگرنی نہ ہو؟ —

ہمارے بیڈ روم کی چھت کے عین اوپر ایک کمرہ ہے جو ہم نے بھابو کو دے رکھا ہے۔ رات کو جب میری آنکھ کھُلتی ہے اُوپر بھابو کے چلنے کی آواز آ رہی ہوتی ہے۔ ہر روز سوچتا تھا بھابو سے پوچھوں گا کہ کیا معاملہ ہے۔ ایک روز جب میں کھانے سے فارغ ہو کر سگریٹ سلگا رہا تھا تو بھابو کو میز سے جھوٹے برتن اکٹھا کرتے ہوئے دیکھ کر مجھے یاد آ گیا۔ "بھابو، کیا تمہیں رات بھر نیند نہیں آتی؟"

"نا ہیں آتی تو اچھا ہی ہے بابو۔"

ہر بات عجیب سی کہ معلوم ، کوئی جادوگرنی ہی ہو۔ بچپن میں سُنی ہوئی ایک کہانی اچانک کود کر میرے ذہن میں آگری ، ایک جادوگر تھا جو اپنی موت کے بعد کسی کو نظر نہ آتا تھا لیکن اپنے جادو کے زور سے جوں کا توں زندہ تھا۔ سارا دن اور ساری رات وہ اس خوف سے ایک پل نہ سوتا تھا کہ سو گیا تو اس کا جادو زائل ہو جائے گا اور وہ سچ مچ مر جائے گا۔ "کیا تمہیں سونے سے ڈر لگتا ہے بھابو، کہ مر جاؤ گی ؟"

کوئی جواب دینے کی بجائے وہ جھوٹے برتن اٹھانے لگی۔

"جواب دو بھابو"

جواب کیا دوں ، بابو ؟ ایک بار سو کر اٹھی تھی تو اپنے آپ کو مُردہ پایا تھا" اُس کے ہاتھ سے ایک کٹوری گر گئی تو مجھے بھول کر وہ اس کی طرف متوجہ ہوگئی۔ "باورچی کھانے میں پہنچ کر توری کھمبر لیتی ہوں"

کٹوری کو دبوچ کر وہ باہر جانے کے لئے مُڑنے لگی تو میں اس کی طرف حیرت سے تک رہا تھا۔ "ٹھہرو بھابو، کیا تم پاگل ہو ؟"

"پاگل بھی ہوں تو کیا ؟ کم سے کم جندا تو ہوں"

"مر گئی تھیں تو زندہ کیسے ہو ؟ — ٹھہرو، جاؤ نہیں، پہلے مجھے اپنا سارا قصہ سناؤ"

"بی بی جی کو سنا دوں گی"

"نہیں ، مجھے بھی سناؤ"

"آپ کے سننے کا نا ہیں ، بابو۔ بولا ہے نا ، بی بی جی کو سنا دوں گی" وہ برتن اٹھا کے سراسیمہ سی سُرعت سے کمرے سے باہر نکل گئی۔

بعد میں میری بیوی کے پوچھنے پر بھابو نے بتایا کہ جوانی میں سوتے میں ہی نا معلوم کس نے اس کی عزت لوٹ لی جس سے وہ حاملہ ہوگئی۔ ہزار مصیبتیں جھیل جھیل کر اس نے اپنے بچے کی پرورش کی مگر سر نکالتے ہی اس کا لڑکا اُسے چھوڑ کر نا معلوم کہاں چلا گیا۔ میری بیوی نے مجھے بتایا کہ اپنا قصہ پورا کر کے وہ کہنے لگی ، اچھا ہی ہے کہ حرام کی اولاد مونچھیں پھوٹنے سے پہلے ہی دفع ہوگیا ورنہ مونچھوں کو تاؤ دے دے کر میری طرف دیکھتا تو مجھے اس کے ان دیکھے باپ کی صورت دکھ جاتی اور لگتا کہ اسی نے میری عزت لوٹی تھی۔

مجھے بھابو پر ترس آنے لگا کہ بے چاری کتنی اکیلی ہے مگر پھر جھٹ ہی کچھ سوچ کر میں نے اپنی بیوی کو وارننگ دی کہ وہ بالا کو اس کے ساتھ اکیلا کبھی نہ چھوڑے۔ پگلی عورت ہے ، محبت ہی محبت میں کہیں معصوم کا گلا نہ گھونٹ دے۔

"پاگل تو وہ ضرور ہے" میری بیوی مجھے بتانے لگی "میں نے کئی بار اُسے کچن میں آپ ہی آپ باتیں کرتے ہوئے سنا ہے"

"ارے ہاں ، مجھے اس دن کا واقعہ یاد آگیا۔ "سنا تو ایک بار میں نے بھی تھا مگر سمجھ میں کچھ نہ آیا تھا"

"سمجھ میں آنے والی کوئی بات ہو تو سمجھ میں بھی آئے۔ باؤلی سے اسٹو وتمہیں جل پا رہا تھا اور ہاتھ سے منہ کا نیں کر کے وہ اسے دھمکا رہی تھی، ایک بار جل لو، پھر دیکھنا، کس طرح تمہیں سر سے پاؤں تک کالا کر کے بدلہ چکاتی ہوں، اپنے آپ کو دیکھ دیکھ کر بس جلتے رہو گے"

میری بیوی اور میں ہنسنے لگے۔

"ہمارے ساتھ ہوتی ہے تو چُپ کی اوٹ سے باہر نہیں آتی"

"ہاں" میری بیوی نے کہا۔ "مگر جب صرف اپنے ساتھ ہوتی ہے تو اُسے چپکے سے سُنا کرو۔ دیوانی کی زبان رُکنے میں نہیں آتی۔ ایک دفعہ کچن کی اندرونی دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑی تھی کہ اچانک اچھل کر پرے ہوگئی اور چھت سے فرش تک ساری دیوار پر نظر جما کر بولی ، بے بے گری

کیوں پڑتی ہو؟ میں تو پہلے ہی مری ہوئی ہوں — ہنس رہی ہو؟ — خوب ہنس لو مگر یاد رکھو ہنستے ہنستے ٹوٹ گئیں تو ملبے کا ڈھیر ہو کر رہ جاؤ گی:

ہم دونوں بھابو پر ہنستے رہے اور ہنستے ہنستے ایک دوسرے کو اتنے اچھے لگنے لگے کہ بجلی کی اندھی گاڑی بھابو کو پٹڑی پر روند کر کہاں کی کہاں نکل گئی اور اس کی خودکار پہیوں نے اُسے یکلخت دھچکے سے یہاں لا کر کھڑا کیا جہاں بالا نیند سے بیدار ہو کر رونے لگا تھا۔ ہم بالا کا جھولا جھلانے لگے — ایک وہ، ایک میں اور ایک ہمارا یہ — مردم شماری والے نے پوچھا تھا، بس تین؟ — ہاں — کوئی نوکر؟ — ہاں، ایک نوکرانی ہے — تو پھر چار کہئے نا — ہمارے گھر میں — آپ کے گھر میں تین ہی سہی مگر ملک میں تو چار ہیں۔ چوتھے کا نام؟ — بھابو کا کوئی نام نہیں — آپ ٹھیک کہتے ہیں، ہمارے ملک میں کم سے کم ایک چوتھائی آبادی بے نام ہے۔ وہ لوگ ہیں ہی نہیں، مگر ہم ان کے فرضی نام رکھ کے خانہ پُری کر لیتے ہیں — چلئے، آپ کی بھابو کا بھی کوئی فرضی نام لکھے دیتا ہوں — ودیا — یعنی علم کی دیوی! — آؤ بھابو، یہاں انگوٹھے کا نشان لگا دو — دیکھئے نا، آپ بندھے ہوئے حروف میں دستخط کریں تو جھوٹ پر بھی سچ کا گمان ہوتا ہے مگر انسانی انگوٹھے کی فطری لکیروں کا نشان کتنی معصومیت سے اپنی ساری سچائی چھاپ دیتا ہے — جاؤ بھابو، کالک کو صابن سے دھو کر روٹیاں پکاؤ۔

گذشتہ اتوار کی شام کو بھابو روٹیاں پکانے سے پہلے آٹا گوندھنے کے لئے بیٹھی تھی کہ میں نے آنکھوں اور کانوں سے سب کچھ براہِ راست دیکھ سن لیا۔

پہلے تو اس نے پرات کو اٹھا کر کہا، اٹھو، سوئی پڑی رہو گی تو آٹا میں اپنے سر میں گوندھوں گی، پھر صندوقچے سے دو لوٹے آٹا بھر کر اسے پرات میں ڈال دیا اور اس سے باتیں کرنے لگی — اڑے کیوں جا رہے ہو رے؟ — ہاں، یہ لو پانی پیو — نا ہیں، چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھرو — اور چھوٹے —

دیوار سے لگ کر اپنی ہنسی کو روکتے ہوئے مجھے کچھ اس طرح اچھو آنے کا احساس ہوا گویا میں نے پانی کے پورے گلاس کو ایک ہی گھونٹ میں حلق میں انڈیل لیا ہو۔

آں، اِس تراں — بھابو بدستور گندھتے ہوئے آٹے سے ہمکلام تھی — اس تراں ہو گئے تو میں تو ہے گوندھ گوندھ کر ایک جان کر دوں — بس بس! اتنا ہی پیو جتنی پیاس ہے — کیا؟ — آں، گوندھ تو رہی ہوں مگر تم مورے ہاتھوں سے اچھل اچھل کر باہر کیوں جا رہے ہو؟ — اس لئے، کوئی مو جسے ملنے آ رہا ہے؟ — مو جسے ملنے کون آئے گا رے؟ — مورا چھوکرا؟ — اس حرام جادے نے تو اُسی دن اپنی ماں کا گلا گھونٹ دیا جس دن وہ گھر سے بھاگ نکلا — کتنے برس ہو گئے ہیں؟ — ابھی بتاتی ہوں — ایک — دو — تین — دھیرے کیوں؟ جور لگا کر نہ گوندھوں گی تو تم میں جان کیسے پڑے گی؟ — سات — گیارہ — بارہ! — ہاں، بارہ برس ہو گئے ہیں۔ ان بارہ برسوں کا ایک ایک پل پورا ایک کوس لمبا تھا — ہاں، اب رج بس گئے ہو۔ اب دھیرے دھیرے گوندھوں گی — سو تو نا ہیں گئے؟ بارہ برس کے پل پل کا حساب جوڑ کر بتاؤ، میں کتنے کوس چل چکی ہوں — آں ایک پل بھی کہیں نہیں ٹھہری۔ کون بیٹا اپنی ماں کو ہجاروں کوس کے راستے پر اکیلے چھوڑ جا کر الگ ہو جاتا ہے؟ — کہا کرتا تھا، ماں ایک بار بڑا ہو لینے دو، پھر دیکھنا — کیا دیکھوں؟ — بڑا ہی چھوڑ گیا ہے تو بولو کیا دیکھوں؟ ایک بار کہیں نجر آ جائے تو مورا سارا دیکھنا ہو جائے — ارے آٹے رے آٹے، میں اپنی رام کہانی سنا رہی ہوں مگر تم گندھ گندھا اونگھ رہے ہو — ٹھیک ہے بیٹا تھوڑا سا نکھر نکھر جاؤ گے تو تورے پیڑے بناؤں گی۔

میں بھی انجانے میں بھابو کے ہاتھوں گندھ گندھ کر اونگھنے لگا تھا۔ میں نے سر جھٹکنا چاہا کہ اس جادوئی اونگھ سے باہر آ جاؤں مگر ویسے

ہی دیوار سے جڑا کر کھڑا رہا۔

اس پتیلی کی لاگر لے شاید دُور سے چمک چمک کر بھابو کو آواز دی تھی۔ وہ اس کی طرف منہ لٹکا کر کہنے لگی، ہاں بابا، تم جاگ رہی ہو مگر دھاگے کا سرا ہی مورے ہاتھ سے چھوٹ گیا ہے تو کیپٹوں کیا؟ — اپنا سر! — ہہ ہا۔ ہہ ہا! — وہ کانچ کے گلاسوں کی طرف دیکھ کر ہنسنے لگی۔ دنیا جہان کی باتیں سناتی رہتی ہوں مگر تم سدا خالی رہتے ہو۔ بھرے بھرے نجر آؤ تو دیکھنے والا پیار سے منہ سے لگا لے۔ ناہیں نمک دانی سے پرے پرے ہی رہو، ناہیں تو لال مرچ کی باس سے چھینک چھینک کر ٹوٹ جاؤ گے۔ بڑی تیج ہے! — پھر وہ نمک دانی پر سر جھکا کر موج سے گویا ہوئی — گسّہ نہ مانتا بڑی بی۔ اتنی تیج ہو کہ سبھی بچتے پھرتے ہیں۔ تو ہے چکھ کے دیکھوں؟ نہ بی نہ، مُو جے چکھ چکھ کر تو ہے بڑا جا آتا ہے؟۔ تو چکھتی رہا کرو بڑی بی، میں مناں تھوڑا ہی کرتی ہوں۔ — کیا؟ — اپنے کھوئے ہوئے چھوکرے کی باتیں سناؤں۔ کیا سناؤں! — کہیں مِل جائے تو تم ساری کی ساری کو اس کے منہ میں اُلٹ دوں — بتاؤ اپنی سگی ماں کے ساتھ کوئی اس تراں بھی کرتا ہے؟ ارے تم سب نے ایک ہی دکھت کیوں بولنا سر دکر دیا ہے؟۔ ایک ایک کرکے بولو۔ ناہیں مُو جے کیا پتہ! اب وہ کہاں ہے؟ ہے بھی کہ نہیں — اور ہو بھی، تو اب مورا تو ناہیں! اپنی اُس ماں کا ہے جسے جورو بنا کے اُس کے ساتھ رہتا ہوگا۔ ارے پھر بھابو! — بھابو! — بھابو میں کیا بہری ہوں؟ — چُپ! — بھابو نے بھی اشیاء کی طرف سر گھماتے ہوئے اپنا ہاتھ سر سے اوپر اٹھا کر کہا۔ چُپ! —

ہمارے باورچی خانے کی ایک سُتے سانس لے کر، بول بول کر بھابو کے سنسار میں شریک تھی اور میں بدستور باورچی خانے کی باہری دیوار میں گڑا ہوا تھا۔

بھابو ہاتھ دھونے کے لیے اٹھنے لگی تو اسٹو و نے غالباً سر اٹھا کر اُس سے کہا۔ آج میں تمہیں تنگ نہیں کروں گا بھابو، اپنے آپ جل پڑوں گا۔

— آں! جو اپنے آپ جل پڑتے ہیں بیٹے، دھوئیں میں ان کا دم نہیں الٹتا — بھابو پانی کے نل کے پاس آ کھڑی ہوئی — بولو، آج بھی پانی سے کھالی ہو تو ہے بند ہی پڑا رہنے دوں — ناہیں؟ آج اتنے بھرے بھرے ہو کہ گوتے کھا رہے ہو؟ —

بھابو نے نل کو کھول دیا تو پانی فرطِ مسرت سے بھابو، بھابو کرتا ہوا اس کے ہاتھ دھونے لگا۔ شور کیوں مچا رہے ہو رے؟ اتنے سا پھر ہو پھر بھی دِکھنے میں ناہیں آتے، سر پھ سنائی دے رہے ہو۔ ارے بھائی اتنا اونچا مت بولو۔ دھیرے دھیرے بول کر سمجھاؤ تو کچھ سمجھ میں بھی آئے — پھو۔ چھا — بھابو! — چھا — بھابو! —

ارے! — ہاں، پانی ہی تو بول رہا ہے! — چھا! — بھابو! — ابھی تک تو مجھے صرف بھابو کی باتوں سے محسوس ہو رہا تھا کہ ساری اشیاء بول رہی ہیں مگر — شاید آپ یقین نہ کریں — اب میرے کان اچانک انہیں بالواسطہ سُننے لگے — چھا — بھابو —

توری چھل چھل میں مُو جے کچھ بھی سجائی ناہیں دے رہا — بھابو نے نل کو گھما کر پانی کا دباؤ کم کرنا چاہا۔

نہیں بھابو، مجھے پُورا کھُل کر بولنے دو۔

پُورا کھُل کر بولو بابا! — وہ بھی بہت کھُل کر بولا کرتا تھا، مگر کیا مالوم، مجھے ڈبو کر کدھر چلا گیا؟

چلا کہاں گیا، بھابو؟ پانی کہیں بھی ہو، اپنے اندر ہی اندر تم اُسی میں ڈوبی ہوتی ہو — میری طرف دھیان سے دیکھو۔ اور دھیان سے دیکھو بھابو!

دھیان سے دیکھو بھابو!

بھابو پانی کو اتنے دھیان سے دیکھنے لگی کہ وہ اُس کی آنکھوں میں بھر آیا۔

میں پتھر کا پتھر دیوار سے جُڑا ہوا تھا اور پھوٹ پھوٹ کر دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ ہم تو جانداروں میں بھابو کا شمار بھی نہیں کرتے مگر وہ بے جان اشیاء پر ـــــ جان چھڑک چھڑک اُن میں بھی جان ڈال دیتی ہے!

البم

هوچند چاولہ

میری یادوں کے البم میں ایک لڑکے کی تصویر کے نقوش وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مدھم پڑتے جا رہے ہیں۔ میں انہیں پہچاننے کی کوشش کرتا ہوں تو اس کی چھوٹی چھوٹی عجیب و غریب شرارتیں اور حرکتیں اُس کا ایک خاکہ میرے سامنے بناتی ہیں۔ اس خاکے میں پھر کئی رنگ ابھرتے ہیں۔ اب وہ رنگ دھندلے سہی مگر میرے لئے اب بھی اُن میں ایک حُسن ہے بلکہ اب اور بھی زیادہ حسین اور خوبرو محسوس ہوتے ہیں۔

بچپن سے ہی اسے رسالہ "پھول" پڑھنے کا شوق ہے۔ اپنے سکول کے استاد محمد خان کے گھر سے لائے ہوئے پانچ پانچ دس دس رسالے وہ ایک ہی دن میں نہ صرف پڑھ ڈالتا ہے بلکہ ہضم بھی کر جاتا ہے۔ اچھے اشعار کو جمع کرنے کا بھی اُسے جنون کی حد تک شوق ہے مگر اشعار کو وہ ہر موقعہ بولنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ دراصل وہ اتنا شرمیلا اور جھینپو قسم کا لڑکا ہے کہ اُسے کسی کے سامنے اشعار پڑھنا بہت ہی مشکل لگتا ہے۔ ان اشعار کو اپنے ہی اندر کسی میٹھی گولی کی طرح وہ چوستا اور لطف اندوز ضرور ہوتا رہتا ہے۔ واقعی ایک نادان اور بھولا بھالا بچہ شہد کا مزہ تو لے سکتا ہے مگر اس کا لطف بیان نہیں کر سکتا۔

کالا باغ کی وہ سہ پہر بہت روشن اور خوبصورت تھی۔ جب یہ لڑکا سندھ میں بہت دیر تیرنے اور ٹھٹھرنے کے بعد باہر کنارے پر پڑی تپتی ہوئی ریت پر آ کر لیٹا تھا۔ قریب ہی دوسرے لڑکے اور اس کے دوست بھی کچھوؤں کی طرح اِدھر اُدھر بکھرے پڑے تھے۔ ہنسی مذاق کا دور چل رہا تھا۔ ان میں سے جو تپتی ہوئی ریت کی گرمی سے جلنے لگتا۔ اُٹھتا اور دریا میں کود جاتا مگر دریا کا پانی اتنا خنک تھا کہ دھوپ میں پڑے رہنے کا وقفہ دریا میں تیرنے کے وقفے سے طویل ہی رہتا۔ ٹھنڈے جسم پر دھوپ اور ریت کی گرمی سرور کی ایک لہر سی رگوں میں دوڑا دیتی۔ ایسے میں شرارتیں کرتے، ایک دوسرے کو ریت میں دفنا دیتے۔ بر لب کنارے کے درختوں پر چڑھنے اور اونچی سے اونچی ٹہنی سے دریا میں چھلانگ لگاتے، پانی کی پچکاریاں ایک دوسرے کی آنکھوں پر مارنے میں ایک خاص لطف آتا اور ریت میں ایک دوسرے کو ٹانگ سے پکڑ کر گھسیٹتے پھرنے میں بہت مزہ آتا تھا۔ یہ سب کھلنڈرے لڑکے شرارتی تو تھے مگر علم و عقل سے ان سب کو خدا واسطے کا بیر تھا۔ سکول چلے جاتے تھے کیوں کہ ماں باپ کا ڈنڈا انہیں سکول کے دروازے تک چھوڑ آتا تھا۔ پڑھ لیتے تھے کیونکہ ماسٹر کا ڈنڈا انہیں چلا چلا کر الف دا میم ما قوت آم، ب زیر ب لام ی، بلی یاد کرنے پر مجبور کرتا تھا۔ مگر سکول سے آتے ہوئے دامن جھاڑ کر وہ سب کچھ وہیں چھوڑ آتے تھے۔ آج ریت پر لیٹے ہوئے پہلی بار ایک عجیب بات ہوئی تھی۔ ایک لڑکے عاشق حسین نے اس لڑکے کی طرف اشارہ کر کے ایک شعر پڑھا تھا۔

شیشی بھری گلاب کی پتھر پہ توڑ دوں
تیرے حسن کو دیکھ کر دامن نچوڑ دوں

روئے کھلکھلا کر ہنس پڑے تھے۔ اس لڑکے کو عاشق حسین کے گندے مذاق پر اتنا غصہ نہیں آیا تھا جتنا ایک بہت ہی معمولی شعر کے انتخاب پر اور اُسے بھی غلط پڑھنے پر آیا تھا مگر جب اُسے غصہ آتا تھا تو اُسے سب کچھ بھول جاتا تھا پھر بھی اس نے جیسے تیسے ایک شعر گھڑ کر تڑاک سے اُس کے منہ پر دے مارا۔

تجھ کو معلوم نہیں کرتا ہے کتنا سُندر
مجھ کو معلوم نہیں لڑکی ہے یا لڑکا ہے

دے مارا۔ واہ کیا جواب دیا ہے۔ سب طرف سے واہ واہ کا شور مچ گیا۔ تالیاں بجائی جانے لگیں۔ جب تالیوں کا شور تھا تو بالکرشن نے پھر جھٹکے دے دے کر واہ واہ سے اُس کی ہمت بندھائی۔ بالکرشن جب واہ — واہ — واہ — کرتا تو ایسے لگتا۔ جیسے کوئی اناڑی ڈرائیور کار کو وقفے وقفے سے بریک لگا لگا کر چلا رہا ہو اور وہ دھچکے کھا رہی ہو۔ بالکرشن کی واہ واہ سے اس کی بالوں بھری کھوپڑی تو آگے پیچھے جھٹکے کھاتی مگر چہرے کا باقی حصہ حتیٰ کہ کان تک بالکل غیر متحرک رہتے۔ جیسے اس کے سر پر بالوں کی ایک الگ وگ رکھی ہوئی ہو جسے کوئی جھٹکے دے دے کر آگے پیچھے جھنجھوڑ رہا ہو۔ واہ — واہ — واہ — واہ — واہ۔

تمام لڑکے اُٹھ کر اُن کے پاس آ گئے۔ عاشق حسین نے جواب دیا۔

ساون کے نظارے ہیں، کلیوں کی آنکھوں میں
مستانہ اشارے ہیں

ایک بار پھر دھوم دھڑکا اور شور شرابہ ہوا۔ جب ذرا طوفان تھما تو بالکرشن نے پھر واہ واہ کر جھٹکے دینے شروع کیے۔ وہ لڑکا سمجھ نہ سکا کہ بالکرشن اس کے شعروں پر اس کی طرف داری میں واہ واہ کرتا ہے یا عاشق حسین کا ساتھی بن کر اسے بڑھاوا دے رہا ہے مگر موقعہ ہار ماننے کا نہیں تھا۔ اس نے شعر پڑھا۔

زندگانی جس کو کہتے ہیں فراموشی ہے یہ
خواب ہے غفلت ہے سرمستی ہے بیہوشی ہے یہ

واہ — واہ — ہائے ہائے۔ مارا مار کا پھر شور بلند ہوا۔ بالکرشن، مارا، مارا — مارا، کر جھٹکے دینے لگا۔ اُس کی کھوپڑی اس طرح جھٹکے کھا رہی تھی جیسے وہ کوئی الگ سی ایک ڈبی ہو جو عنقریب کسی زوردار جھٹکے کو برداشت نہ کر کے ریت پر آ پڑے گی۔ سب لڑکے اور کچھ بڑے آہ اور واہ کا شور سن کر قریب آ گئے۔ کچھ لکڑی کے بڑے بڑے لٹھوں پر بیٹھ گئے جن سے بعد میں کشتیاں بنتی تھیں۔ کچھ آس پاس دائرہ بنا کر کھڑے ہو گئے عاشق حسین آگے آیا اور بولا۔

ساون کے بادلو۔ اُن سے یہ جا کہو
تقدیر میں یہی تھا۔ ساجن میرے نہ رو

اب تو شور سے آسمان بھی پھٹتا محسوس ہونے لگا۔ لڑکے اور نوجوان ایک دائرے میں ناچنے لگے۔ پھر دائرہ ان کے گرد آ گیا۔ تنگ ہو گیا۔ اُس نے شعر پڑھا۔

قمر کا خوف ہے یا خطرۂ سحر تجھ کو — زمیں سے دور دیا آسماں نے گھر تجھ کو
غضب ہے پھر تیری ننھی سی جان ڈرتی ہے — تمام رات تیری کانپتے گزرتی ہے

حاضرین پر اس کے علم کا رعب تو ضرور پڑا مگر وہ اس کی نظم سے لطف اندوز نہ ہو سکے۔ اب کے واہ واہ کا زور بھی کم رہا۔ بال کرشن کی کھوپڑی بھی واپس اپنی ٹوپی میں آگئی۔ عاشق حسین کا حوصلہ بڑھا۔ اُس نے ایک اور شعر پڑھ دیا۔

پنچھی جا۔ پیچھے رہا ہے بچپن میرا
اس کو جا کے لا۔

پھر وہ یکے بعد دیگرے فلمی اشعار کی بوچھار کرنے لگا۔ اس لڑکے کے اشعار ڈاکٹر اقبال اور محروم کی نظموں سے تھے اور عاشق حسین کے فلمی۔ اس لئے عاشق حسین کا پلڑا بھاری پڑنے لگا۔ پھر کسی نے اس کی پیٹھ تھپتھپائی اور اس نے پڑھا:

اس پرندے کی طرح دنیا میں رہنا چاہیئے

اور عاشق حسین نے اگلا مصرعہ یوں گھڑ کر پڑھ دیا۔

اور اب تم کو چپ کر کے نیچے بہنا چاہیئے (بہنا یعنی بیٹھنا)

اس پر بس جیسے شور نے زمین آسمان ملا دیئے۔ بال کرشن کی داد واہ پٹاخے چھوڑنے لگی۔ داؤد خان اس کے سامنے آکر بغلیں بجانے لگا۔

شور و شغب کی اس محفل میں ہارنے والا لڑکا، جس کے افسانے بعد میں اُردو ادب کے رسالوں میں شائع ہوئے، ہر چرن چاولہ تھا۔

پرانے پنجاب میں دیواروں پر اشتہار لکھنے کا بہت رواج تھا۔ دیواروں پر سفیدی کی جاتی تھی اور کالے یا نیلے رنگ اور برش سے اُن پر اشتہار لکھے جاتے تھے۔

اس روزگار سے کئی پینٹروں کا پیٹ پلتا تھا۔ اس لڑکے کو بھی اشتہارات لکھنے کا شوق چرایا۔ برش، سیاہی اور چونا حاصل کرنے کا مسئلہ پیش آیا۔ سیاہی اور برش خود ایجاد کرنے کا طریقہ ڈھونڈ نکالا گیا۔ اُن دنوں (بیٹریوں) کے ضائع شدہ سیل بڑی آسانی سے اِدھر اُدھر پڑے مل جاتے تھے انہیں توڑ کر اُن میں سے کالا سرمہ نکالا گیا۔ پانی میں گھولا گیا تو وہ بہت اچھی سیاہی ثابت ہوا۔ کیکر کے داتن جو استعمال کے بعد اِدھر اُدھر پھینک دیئے جاتے تھے بہت اچھے برش ثابت ہوئے۔ ایک برش بڑی مشکل سے ایک آدھ ہی اشتہار لکھ پاتا مگر گلیوں میں ایسے برشوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ دیواروں پر چونا پھیرنے کا مسئلہ ذرا ٹیڑھا تھا۔ پینٹر لوگ دیواروں پر اشتہار لکھنے سے ایک دن پہلے شہر کی دیواروں پر جگہ جگہ چونے کے چوکے بنا جاتے تھے جنہیں انہیں سوکھنے کے لئے ایک دن کا وقفہ دینا پڑتا تھا۔ بس اُن کے اسی وقفہ میں ان کی محنت پر یہ لڑکا نئی آنے والی فلموں کے اشتہار لکھ لکھ کر پانی پھیرتا رہتا تھا اور اپنا شوق پورا کرتا رہتا تھا۔ اپنی محنت کو یوں ضائع ہوتے دیکھ کر وہ لوگ چور کو ڈھونڈنے لگے اور اس لڑکے نے اپنی عقل کی وجہ سے بچاؤ کے لئے اپنے چچا جان کی دکان کا اشتہار جگہ جگہ لکھنا شروع کیا۔ کھُل کھُل گیا۔ ڈاکٹر موتی رام چاولہ کا چاولہ میڈیکل ہال!

چاولہ خاندان میں ہمارے ان چچا جان کا بہت رعب تھا۔ ہم لڑکے تو اُن کے سامنے جاتے ہوئے تھر تھر کانپتے تھے۔ میں نے سمجھا چچا جان سے سارا شہر بھی ڈرتا ہوگا مگر ڈاکٹر لوگ گھر میں کتنے ہی سخت گیر ہوں، باہر بہت نرم رو ہوتے ہیں۔ اس اشتہار نے میری تدبیر الٹی کر دی اور میں فوراً گرفت میں آگیا۔ مگر چچا جان نے پینٹروں کو کچھ دے دلا کر معاملہ رفع دفع کر دیا اور مجھے پیار سے سمجھا دیا کہ مجھے اُن لوگوں کی محنت پر پانی نہیں پھیرنا چاہیئے۔ چچا جان کا ناراض نہ ہونا کافی عرصہ تک میرے لئے ایک معمہ سا بنا رہا مگر آخر میں بات کی تہ تک پہنچ ہی گیا۔ میں نے مفت میں اُن کی دکان کی اشتہار بازی کر دی تھی اور ہو سکتا ہے اس سے اُنہیں فائدہ بھی پہنچا ہو۔

اب لال چند کتنا بدل گیا ہے۔ اُسے دیکھ کر ہنسی نہیں آتی۔ وہ مذاق کرتا ہے تو لگتا ہے رو رہا ہو۔ وہ اچھی طرح پڑھ لکھ نہیں سکا مگر پڑھے لکھے ہونے کی بہت کامیاب اداکاری نہ صرف کر رہا ہے بلکہ خوب نبھا بھی رہا ہے — صرف اس ایک کامیابی کے علاوہ اور اس کی سب باتیں ختم ہو گئیں وہ بات کرتا ہے تو اس کی بات بیچ میں دس بار ٹوٹتی ہے جسے وہ ٹانکے لگا لگا کر جوڑتا اور آگے بڑھاتا رہتا ہے وہ چاہتا ہے کہ لوگ اس کے مذاق پر ہنسیں مگر اس کی بات میں کوئی مذاق کا پہلو نکلے تبھی تو کسی کو ہنسی آ سکتی ہے۔

لال چند میرے ماموں جان کا لڑکا ہے۔ گھر پر وہ پڑھ کر ہی نہیں دے رہا تھا دوسرے اس کے بچپن میں میری ماں ہماری ممانی جان یعنی اس کی سوتیلی ماں کے مظالم سے بچا کر اُسے اپنا بیٹا بنا کر ملتان چھاؤنی (جہاں ہمارے والد صاحب کا تبادلہ ہوا تھا) اپنے ساتھ لے آئی تھیں مگر لال چند کو پڑھائی سے خدا واسطے کا بیر تھا۔ ہمارے بابوجی نے میرے، میرے بڑے بھائی اور لال چند کے لئے گھر پر پڑھانے کے لئے ایک ٹیوٹر بھی رکھ دیا تھا مگر لال چند پچھلے سبق سے ذرا بھی آگے نہ بڑھ سکا۔ ہاں وہ سالانہ امتحان میں پاس ضرور ہو جاتا تھا۔ شاید نقل کر کے ہمارے بابوجی کی خوشامد کے لئے وہ اُن کا حقّہ بھر دیا کرتا تھا تاکہ وہ اس کی پڑھائی کے متعلق پوچھ تاچھ کو بھولے رہیں۔

ایک دن بابوجی نے لال چند سے پوچھ ہی لیا۔ "لال چند پڑھائی کیسی چل رہی ہے؟"

"بابوجی بہت اچھی چل رہی ہے۔" لال چند نے سینہ تان کر جواب دیا۔ "آپ کا حقّہ تازہ کر لاؤں؟"

"نہیں ذرا اپنی اُردو کی کتاب لے آؤ۔"

"بابوجی۔ وہ تو ..... وہ تو سورج پرکاش لے گیا ہے۔"

"تو خیر حساب لے آؤ۔" بابوجی بولے۔

لال چند بستہ ٹٹولنے لگا۔ بابوجی نے کہا۔ "ذرا بستہ دکھانا ادھر۔"

مجبوراً اُسے بستہ بابوجی کو دینا پڑا۔ انہوں نے دیکھا۔ "اردو کی چوتھی کتاب" بستے میں موجود تھی۔ انہوں نے کتاب نکال لی۔ لال چند بولا۔ "شاید سورج پرکاش کتاب واپس دے گیا ہے۔"

اس کا مطلب تھا۔ کتاب مجھے یا میرے بھائی کو واپس پہنچائی گئی ہے۔ جس کا لال چند کو علم نہیں۔ بابوجی نے آنکھیں بند کر کے بیچ میں سے کتاب کھولی اور کہا "پڑھو۔"

لال چند نے سبق دیکھا تو بولا۔ "بابوجی ابھی تک تو ہم اس سبق تک پہنچے ہی نہیں۔"

بابوجی نے پوچھا۔ "کہاں تک پہنچے ہو؟"

لال چند کو کیا پتہ مگر اس نے خاموشی سے کتاب پیچھے کی کسی جگہ سے کھول دی اور کہا "یہاں تک۔"

بابوجی نے کہا۔ اب پڑھو۔

لال چند بولا۔ "بابوجی میں کلاس کا مانیٹر ہوں۔"

"سبق پڑھو۔" بابوجی نے کہا۔

لال چند لفظوں پر انگلیاں پھیرنے لگا جیسے اندھے اُبھرے ہوئے لفظوں پر انگلیاں پھیر کر پڑھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جب وہ ایک لفظ بھی نہیں پڑھ سکا تو بابوجی نے کچھ صفحے اور پیچھے کا سبق نکالا اور کہا۔ "پڑھو" مگر لال چند اس صفحے پر بھی صرف انگلیاں ہی پھیرتا رہ گیا۔ پھر بابوجی اور پیچھے

کے سبق پر جاڑ کے مگر لال چند کے ہاتھ چلتے رہے۔ زبان خاموش رہی۔ جب پہلا سبق بھی وہ نہیں پڑھ سکا تو بابو جی نے پہلی جماعت میں پڑھائے جانے والے کچھ فقرے کاغذ پر لکھ کر اُسے پڑھنے کو دیئے مگر لال چند کے لئے کالا اکھشر بھینس برابر ہی رہا۔ حساب میں بھی وہ دس میں پندرہ بھی جمع کر کے نہ دکھا سکا تو بابو جی بولے "تو کلاس کا مانیٹر ہے؟" اس نے جواب دیا "ہیں"۔

بابو جی اس کی جرأت پر ششدر رہ گئے۔ وہ بولا "بابو جی۔ میں ڈرل اور ڈرائنگ کا مانیٹر ہوں" اور وہ کھڑا ہو کر بابو جی کو ڈرل کی مشقیں (کسرتیں) کر کے دکھانے لگا۔ اس کے بعد بابو جی نے اُس سے اس کی علمی ترقی کے بارے پھر کبھی کوئی سوال نہیں کیا۔ اور لال چند نے بھی بابو جی کا حقہ بھرنے اور تازہ رکھنے میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔

لال چند یاد آیا ہے تو واقعات۔ حادثات اور مذاق قطار باندھ کر میرے سامنے آ کر کھڑے ہوئے ہیں مگر میں چند ایک پر ہی اکتفا کروں گا۔ کیونکہ لال چند صفحات پر چھا گیا تو میرے گھر کے تمام کاغذ ختم ہو جائیں گے۔ میں لکھتا لکھتا تھک جاؤں گا۔ مگر لال چند کے واقعات کسی مداری کے دھاگے کی طرح اس کے منہ سے نکلتے ہی چلے آئیں گے۔

ملتان کی گرمیوں کی جلتی دوپہر میں لال چند جامنوں کے درخت پر چڑھا ہوا ہے اور جامن توڑ توڑ کر کھا رہا ہے۔ یہ جگہ کچھ پرانے کمروں کی چار دیواری میں سادھو سنتوں کا گڑھ ہے۔ سادھو سنتوں کی سیوا خدمت کر کے لال چند نے جامن توڑنے کی اجازت حاصل کی ہے۔ چھوٹے بڑے لڑکے نیچے کھڑے لال چند سے جامن نیچے پھینکنے کی درخواست۔ کر رہے ہیں مگر اس کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی۔ آخر میرا بڑا بھائی اور اس کے ساتھی بڑے بڑے لڑکے اُسے جوتے مارنے شروع کر دیتے ہیں۔ وہ اُن کے جوتے کرکٹ کے بال کی طرح کیچ۔ کر کر کے اپنے آس پاس کی ٹہنیوں پر لٹکاتا جاتا ہے۔ اپنی چال کی ناکامی پر جھنجلا کر بڑے لڑکے اُسے پتھر مارنا شروع کر دیتے ہیں۔

"رکو رکو۔ ابھی سب کو جامن کھلاتا ہوں"

سب کے ہاتھ رک جاتے ہیں۔ لال چند جامن توڑ کر ایک جوتا اُن سے بھرتا ہے اور نیچے اس کے مالک کی طرف پھینک دیتا ہے۔ جوتا نیچے آتے ہوتے کچھ جامن پھر بھی اِدھر اُدھر گر جاتے ہیں جو ہم جیسے چھوٹے بچوں کے حصے میں آ جاتے ہیں۔ اسی طرح وہ سب کے جوتے واپس لوٹا دیتا ہے۔

اب اُسے ایک دوسرے درخت پر بہت سے جامن نظر آتے ہیں۔ وہ اس پر چڑھ جاتا ہے۔ اچانک ہم اس کی چیخ پکار سن کر اوپر دیکھتے ہیں۔ اُسے بھڑوں نے گھیر رکھا ہے۔ شاید اس کا ہاتھ بھڑوں کے چھتے پر پڑ گیا ہے۔ پچاس بھڑوں کے جھرمٹ میں گھرا وہ چیخ رہا ہے۔ ہم بے بسی سے اوپر دیکھ رہے ہیں۔ آخر یہ درخت سے ایک کمرے کی چھت پر چھلانگ لگا دیتا ہے۔ اس کا جسم کمرے کی کچی اور بھربھری چھت میں سے ایسے گر اُس کر جاتا ہے جیسے وہ کاغذ کی بنی ہوئی ہو (دراصل اس چھت کی کڑیاں اور مٹی تک دیمک زدہ ہو چکی تھی) گرد و غبار کے بیٹھنے کے بعد ہم کمرے میں پہنچتے ہیں۔ مٹی کا پُتلا بنا لال چند کمرے کے ایک کونے میں دبکا کھڑا ہے اور اس کے آس پاس درخت کی مٹی اور سرکنڈے ابھی تک گر رہے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد وہ گرد آلود کپڑوں۔ بالوں اور چہرے کے ساتھ باہر آتا ہے۔ میرا بھائی ہربنس لال اس کے کپڑے وغیرہ جھاڑتا ہے تو بھڑوں سے کٹا ہوا ڈھول سا اس کا منہ اور موٹے موٹے ہاتھ نظر آنے لگتے ہیں۔ اس کا بھیانک روپ دیکھ کر ہم چھوٹے بچوں کا دل دہل جاتا ہے مگر وہ اپنے سے بڑے لڑکوں اور میرے بھائی کے ساتھ بھڑوں کے ساتھ اپنے معرکے کو فسانۂ آزاد کے خوجی کی طرح بڑھا چڑھا کر بیان کرتا ہوا باہر سڑک پر آ جاتا ہے۔

محلہ چاہ بوہڑ والا کی باہری سڑک کے کنارے ہمارا بڑا اسکول تھا جس کی گراؤنڈ میں محلے کے بچے شام کو اپنی اپنی پسندیدہ کھیلیں کھیلتے تھے۔ اسی کے ساتھ ہی ایک چھوٹی سی نہر بہتی تھی۔ لال چند کو تیرنا نہیں آتا تھا اس کے باوجود میرا بڑا بھائی کسی لڑکے کو آنکھ کا اشارہ کر دیتا اور کنارے کنارے

نہاتے ہوئے لال چند کو اچانک ہی وہ سر سے اوپر اٹھاتا اور پُل سے نیچے پٹاک پانی میں پھینک دیتا۔ لال چند اُلٹے سیدھے ہاتھ مارتا اور روتا ہنستا پھر کنارے آ لگتا۔

اُن ہی دنوں میرے بھائی کو محلے کی ایک لڑکی سے عشق ہو گیا۔ لال چند ان کے بیچ پیغام بر کی ڈیوٹی سر انجام دینے لگا۔ اس کام کے لئے وہ میرے بھائی سے جیب خرچ کے پیسے بٹور لیتا تھا۔

سکول گراؤنڈ کے ایک کونے میں کھجور کے چار درخت تھے جن میں دو چھوٹے اور دو بہت اونچے درخت تھے۔ اونچے درختوں پر بہت بڑھیا اور میٹھی کھجوریں لگتی تھیں۔ چھوٹے درختوں پر کچھ اور لڑکے بھی چڑھ جاتے تھے۔ اس لئے اُن کی کھجوریں بہت جلد ختم ہو جاتی تھیں مگر باقی دو اونچے درختوں پر لال چند کے علاوہ اور کوئی نہیں چڑھ سکتا تھا۔ لال چند لمبی اور قریب سو فٹ اونچی کھجور پر چڑھ کر اوپر اس کے تنے کے جھومر کے درمیان جا بیٹھتا تھا۔ وہاں بڑے لڑکوں کے جوتے یا پتھر اس تک نہیں پہنچ سکتے تھے اس لئے وہ بڑے مزے سے اوپر پریم رس اکیلے ہی اکیلے پیتا رہتا تھا اور گاتا رہتا تھا۔

اُچی لمی کھجور نے۔ چڑھ جاویں تاں پیویں پریم رس
ڈھہ پویں تاں چکنا چُورا اے

تب کھجوروں کے لالچ میں بڑے بڑے یودھا اور پہلوان اس کے سامنے گڑگڑاتے تھے اور وہ جسے چاہتا چار پانچ ڈوکوں سے راضی کر لیتا تھا ورنہ کان پر جوں تک نہ رینگنے دیتا تھا۔

ایک دن جمال دین نے اس سے کھجوریں پھینکنے کو کہا مگر لال چند نے پرواہ تک نہ کی۔ جمال دین بہت غصیل جوان اور تگڑا لڑکا تھا۔ جب بار بار مانگنے پر بھی لال چند نے اس کی بات سُنی ہی نہیں تو جمال دین نے کہا "میں بھی یہیں کھڑا ہوں۔ جب اُترو گے تو تمہاری ہڈی پسلی ایک کر دوں گا۔"

لال چند نے جمال دین کے چیلنج کو بھی ایک کان سے سُنا اور دوسرے کان سے نکال دیا۔ الٹا کھجوریں کھا کھا کر گٹھلیاں اس کے اوپر پھینکنے لگا۔ لال چند کی اس حرکت نے جمال دین کو آتشِ زیر پا کر دیا۔ دو گھنٹے بعد جب لال چند نے جمال دین کو نیچے کھجور کے قدموں میں کھڑے اس کے اُترنے کا انتظار کرتے دیکھا تو وہ اور آرام سے پتوں میں پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ دو گھنٹے اور گزرنے کے بعد لال چند پتوں کے جھرمٹ سے نکلا اور بولا "بھائی جمال۔ جیب بھر کر لا رہا ہوں تیرے لئے۔"

"نیچے آ۔ میں تجھے بھائی بن کر دکھاتا ہوں" جمال دین گرجا۔

لال چند ہولے ہولے نیچے آنا لگا۔ جمال دین اپنے لمبے لمبے بازو پھیلا کر کھڑا ہو گیا۔ لال چند جب اُس سے صرف دو فٹ اوپر رہ گیا تو اُس نے کھجور کے ساتھ لگی ہوئی شیشم کے درخت کی ایک ٹہنی کو تھاما اور ٹارزن کی طرح لمبی ہے کی آواز سے پاس ہی بہتی چھوٹی سی ندی کے دوسرے کنارے کی طرف جھُول گیا۔ غصے میں جمال دین قریب پڑے کچی مٹی کے ڈھیلے ہی اُسے مارنے لگا مگر دو تین ڈھیلے کھانے کے بعد ہی وہ اس کی مار کی زد سے باہر جا چکا تھا۔ اس کے بعد جمال دین اس کا بہترین دوست بن گیا اور لال چند بھی آئندہ اس کا خاص لحاظ رکھنے لگا۔

دوسرا شخص جس کا لال چند خاص لحاظ رکھتا تھا اُس کی اس مجبوری کے پیچھے کہانی یہ ہے کہ ایک بار لال چند لمبی کھجور پر ابھی چند ہی قدم چڑھا تھا کہ میں نے اس کے پاؤں سے سوتلی کی بہت ہی باریک مگر مضبوط رسی اُسے پتہ لگے بغیر ایک کنڈی سی بنا کر ڈال دی اپنے پاؤں کی بیڑی سے لاعلم چڑھتا چڑھتا وہ اوپر اپنی پناہ گاہ میں پہنچ گیا۔ کچھ دیر بعد منت بھرے لہجے میں میں نے اُسے کھجوریں پھینکنے کو کہا مگر اس نے حسبِ دستور پرواہ تک نہ کی۔ دو چار بار اور کوشش کرنے کے بعد جب میں نے دیکھا کہ وہ گھڑوں پر پانی ہی نہیں پڑنے دے رہا ہے تو میں نے جمال دین جیسی بارعب آواز سے کہا "کھجوریں پھینک رہے ہو یا نہیں۔"

اس سے پہلے کہ وہ میرے نئے انداز کو عجیب نظروں سے دیکھتا یا میرے رویے کے بارے سوچتا۔ میں نے رسی کو ایک زور کا جھٹکا دیا۔

رسی کے ایک ہی جھٹکے نے اُسے سمجھا دیا کہ پریم رس کے پاس موت کتنی قریب کھڑی اُسے تک رہی ہے کہ پریم رس اُس کے ہاتھ میں سہی مگر اسے چکنا چور کرنے کا آلہ ایک چھوٹے سے بچے تک کے ہاتھ میں ہے۔ اس دن لال چند سے آدھی سے زیادہ کھجوریں میں نے کھائیں اور آئندہ بھی وہ میرا خاص خیال رکھتا رہا مگر بعد میں وہ کھجوروں کا پہلے دن والا کوٹا قائم نہ رکھ سکا۔

راولپنڈی میں میں اور جگدیش لال چند کو ایم اسلم کے "گناہ" کے افسانے پڑھ کر سناتے تھے۔ میری ڈیوٹی افسانہ پڑھنا ہوتی تھی اور جگدیش ہر ہر فقرے اور لفظ تک کی تشریح کرتا۔ لال چند کا بار بار اٹھنا، جسم مروڑنا اور انگڑائیاں لینا ——— ہمارے لئے بہت ہی تفریح کا سامان مہیا کرتا تھا مگر یہ تب کی بات ہے جب ہم لڑکپن سے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ رہے تھے۔ ایک واقعہ لال چند کے بچپن کا اور سُن لیجئے۔

شاید جہلم ضلع میں کھیوڑہ کے قریب پہاڑوں سے گھری ایک جگہ کٹاس راج ہندوؤں کا ایک مقدس تیرتھ استھان تھا۔ وہیں جہاں پہنچنے کے لئے چوہا سیدن شاہ کے دکانوں کے باغوں سے سڑک ہو کر گذرتی ہے۔ وہاں ہر سال بیساکھی کا میلہ بڑی دھوم دھام سے لگتا تھا۔ ایک بار ہم بھی وہاں گئے ہوئے تھے۔ تب بہت سستا زمانہ تھا۔ جیب خرچ کے لئے مجھے اور لال چند کو ایک ایک روپیہ ملا تھا اور میرے بڑے بھائی کو دو روپے۔

لال چند اور میں اپنا اپنا قارونی خزانہ سنبھالے بازار میں گھوم رہے تھے۔ کھلونے غبارے۔ پھرکیاں۔ چڑیاں طوطے اور کھانے پینے کی چیزوں سے دکانیں بھری پڑی تھیں۔ مٹھائیوں کی خوشبوؤں سے بازار مہک رہا تھا مگر اس سے پہلے کہ ہم اپنی پسند کی کوئی بھی چیز خرید پاتے۔ ہم نے اپنے آپ کو ایک مجمعے میں کھڑے پایا۔

مجمعے باز بہت ہی دل نشیں کہانی سُنا رہا تھا۔ لوگ ہمہ تن گوش تھے مگر اچانک مجمعے باز نے کہانی کو ایک خوبصورت سا موڑ دے کر اپنے ایک سرمے کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملانے شروع کئے۔ لوگ کہانی کے آگے بڑھنے کے انتظار میں اس کے سرمے کو برداشت کر رہے تھے مگر بولتے بولتے اس کا سرمہ ہی کہانی کا حصہ بن گیا اور وہ سرمہ حاضرین کو سرمۂ سلیمانی دکھائی دینے لگا جس کے استعمال سے اندھے بھی دیکھنے کے قابل ہو جائیں گے۔ تھوڑے میں لوگوں کی دلچسپی بڑھتی دیکھ کر مجمعے باز بولا "جن بھائیوں کو سرمے کی اشد ضرورت ہو وہ ہاتھ کھڑے کریں۔ میں سُرمہ مفت دوں گا مگر ہر ایک کو نہیں صرف انتہائی حاجت مند بھائیوں کو۔"

مجمعے میں بہت سوں نے ہاتھ کھڑے کر دیئے جن میں لال چند کا ہاتھ اس کے قد کے حساب سے سب سے اونچا تھا۔ مجمعے باز نے ایک آدمی سے پوچھا "آپ کو سچ مچ اس سرمے کی اشد ضرورت ہے؟"

"ہاں" اس نے جواب دیا۔

"اگر اس چھوٹی پڑیا کی قیمت پانچ روپے ہو تو آپ لے دیں گے"

"بالکل" وہ بولا۔

"تو نکالئے پانچ روپے"

اُس نے پانچ کا نوٹ نکال کر مجمعے باز کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ پل بھر مجمعے باز اس کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر پانچ کا نوٹ اور سُرمے کی پُڑیا اس کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے بولا "واقعی آپ کو اس کی اشد ضرورت ہے۔ بھائی اس کی قیمت لینا مجھ پر حرام ہے۔ میرے استاد نے منع کیا ہے۔ میں اُس کی روح کے ساتھ غداری نہیں کروں گا۔"

اس کے بعد مجمعے باز لوگوں سے مخاطب ہوا "جس جس کو اس کی واقعی اشد ضرورت ہو پانچ کا نوٹ نکال کے ہاتھ کھڑا کرے۔"

اب صرف پندرہ بیس ہاتھ ہی کھڑے رہ گئے۔ مجمع باز نے سب کو ایک ایک پڑیا مفت دے دی۔

اب اُس نے ایک اور دوائی کی شیشی نکالی۔ یہ بقول اُس کے ہر مرض کا علاج کرتی تھی۔ دانت درد۔ پیٹ درد۔ پیچش۔ قبض اور کئی اندرونی اور بیرونی بیماریاں۔ آپ کو کوئی بیماری نہیں تو بھی اپنا خون صاف رکھنے اور آنے والی بیماریوں سے بچنے کے لئے اس کا استعمال آپ کے لئے ضروری تھا۔ اُس دوائی کے کچھ اور بھی فوائد اس نے بتائے تھے جو لال چند، میری اور ہماری عمر کے دوسرے لڑکوں کی سمجھ میں نہیں آسکے تھے مگر بڑے اُس کے اُن فوائد کو سُن سُن کر ہنسنے لگے تھے۔ یہ دوا بھی مجمع باز نے مفت دینی تھی۔ اس بار ہاتھ کھڑا کرنے والے تقریباً سو آدمی تھے مگر دوائی کی قیمت پانچ روپے سُن کر صرف پچاس ہاتھ کھڑے رہ گئے۔ اُن میں لال چند اور میرا ہاتھ بھی تھا۔

مجمع باز نے سب سے پانچ پانچ کے نوٹ لے لئے مگر شیشی کسی کو بھی نہیں دی۔ ایک آدمی کے قریب جا کر اس نے پوچھا" دیکھئے بھائی میں یہاں آیا ہوں۔ گاڑی کا کرایہ خرچا ہے۔ دوائی کے لئے شیشیاں بھی خریدی ہیں۔ گھر سے باہر آپ بھائی لوگوں کی خدمت کرنے نکلا ہوں تو دو وقت پیٹ بھی بھرنا ہوتا ہے۔ تو بتاؤ آپ دوائی کی لاگت دو روپے خوشی خوشی مجھے دے سکیں گے؟"

وہ آدمی بولا۔" جی ہاں۔ بڑی خوشی ہے"

مجمع باز نے ایک شیشی اور اس کے بقایا تین روپے اُسے دیتے ہوئے کہنا شروع کیا" صاحبان مہربان۔ اس دوائی سے ایک روپیہ بھی کمانا مجھ پر حرام ہے۔ میں اپنے پیر مرشد کی روح کے ساتھ غداری نہیں کر سکتا۔"

ساتھ ہی وہ شیشیاں اور بقایا پیسے لوگوں کو دیتا گیا۔ ہمارا ایک ایک روپیہ بھی اُس کے پاس تھا۔ اُس نے مجھے اور لال چند کو ایک ایک شیشی دیتے ہوئے کہا" میرے وطن کی آنے والی نسل کو ایسی اکسیر دوا کی سخت ضرورت ہے۔ اس لئے میں یہ دوا اپنے عزیزوں کو آدھی لاگت پلے سے ڈال کر دے رہا ہوں۔"

جب مجمع چھٹا اور لال چند اور میں باہر نکلے تو بازار کی سب چمک دمک ہمارے لئے ماند پڑ چکی تھی کیوں کہ ہمارے ہاتھ میں جو شیشیاں تھیں اُن کے بدلے مونگ پھلی کا ایک دانہ بھی نہیں خریدا جا سکتا تھا۔ تھوڑی دور جانے کے بعد ہی میں نے محسوس کیا کہ میں مجمع باز کے ہاتھوں لُٹ چکا ہوں اور میرے ہاتھ میں ایک فضول سی شیشی کے سوا اور کچھ نہیں۔ میں نے لال چند سے کہا آؤ شیشیاں اُسے واپس کر دیں مگر وہ نہیں مانا۔ میں واپس پلٹا اور مجمع باز کے پاس جا پہنچا وہ دوسرا مجمع لگانے کے لئے کہانی کا آغاز کر رہا تھا۔ میں نے سب کے سامنے اس سے کہا۔

" اس فضول سی شیشی کے لئے میری ماں میری ہڈیاں توڑ دے گی۔ یہ تم واپس لے کر مجھے میرا روپیہ لوٹا دو"

پہلے تو اس نے میری بات کو اَن سنی کرنے کی کوشش کی مگر میرے دوبارہ دہرانے پر اُسے میرے الفاظ فضول سی شیشی اور ایک روپیہ قیمت اُسے اپنا پردہ کھولتے ہوئے محسوس ہوئے۔ اس نے چُپ چاپ شیشی میرے ہاتھ سے لے کر روپیہ مجھے واپس دے دیا اور ہولے سے بڑبڑایا۔

" ان نادان بچوں کو ایسی نعمت کی کیا پہچان"

میں نے جب لال چند کو اپنا واپس حاصل کیا ہوا روپیہ دکھایا تو اُسے بھی اپنی شیشی فضول سی چیز لگنے لگی اور وہ بھی مجمع باز کے پاس جا پہنچا مگر اب دیر ہو چکی تھی اور لوگوں پر اس کی کہانی کا جادو اپنا اثر کر چکا تھا اس نے لال چند کی بات کو سُنا تک نہیں۔ جب لال چند رونے لگا تو الٹا اُس نے اُسے بازو سے پکڑ کر دائرے سے باہر دھکیل دیا۔

لال چند اور میں بازار میں گھومنے لگے۔ جگہ جگہ ادھ ننگے سادھو اور فقیر ادھر ادھر ڈیرہ لگائے بیٹھے تھے۔ کسی نے انگ بھبوت لگا رکھی تھی کسی کے ہاتھ میں ترشول تھا۔ کوئی دھونی رمائے بیٹھا تھا۔ کوئی چیلوں چانٹوں میں گھرا چلم پیتا ہوا آنکھیں سرخ کئے گیان دھیان کی باتیں کر رہا تھا۔ کوئی کمنڈل

سامنے رکھے آنکھیں بند کیے اپنی جگتی میں گم تھا۔ ایک کانٹوں کے بستر پر لیٹا آنکھیں موندے اپنی ہی دنیا میں ڈوبا ہوا تھا۔ لوگ اس کے پاس پیسے پھینک رہے تھے۔ مٹھائیاں رکھ رہے تھے مگر وہ آس پاس کے سب ہنگاموں سے بے خبر اپنی ہی دنیا میں گم تھا۔

لال چند پل بھر اُسے دیکھتا رہا۔ پھر مجھے بازو سے پکڑ کر ایک طرف لے گیا۔ بولا۔" مجھے چار آنے دے دو۔"

"چار آنے؟"

"ہاں۔ دے دو جلدی۔ نجانے مجھے کب تک بھوکا رہنا پڑے۔"

میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے اُسے ٹالنے کے لیے کہا۔" میں دو آنے دے سکتا ہوں۔"

"خیر لاؤ۔" اس نے ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا۔" تمہارے چار آنے کے بدلے چار روپے دیتا۔ اب دو روپے دوں گا۔"

اُس نے ایک سستے سے ڈھابے پر دو آنے کا کھانا کھایا۔ تالاب سے پانی پیا اور نہانے کے لیے کپڑے اتارنے لگا۔ دوسرے نہانے والے اندھ وشواسی قسم کے شردھالو لوگ تھے۔ ورنہ پانی اتنا ٹھنڈا تھا کہ اُسے چھونا مشکل تھا۔ میں نے پوچھا۔" لال چند نہاؤ گے؟"

"تم ذرا کپڑے پکڑو تو۔" اس نے کپڑے مجھے دیتے ہوئے کہا۔

میں اُس کے کپڑے ہاتھ میں لیے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ ایک درخت کی آڑ میں کھڑے ہو کر اُس نے کمر میں ایک رسی سی باندھ لی اور ایک رومال کو آگے پیچھے سے رسی میں اڑس کر لنگوٹ سا بنا لیا۔ پھر اس نے پاس ہی پڑی کالی جلی ہوئی لکڑیوں اور اُپلوں کی راکھ سے لنگوٹ کے سفید رومال، بالوں اور جسم کو اچھی طرح ملنا شروع کیا۔ حتیٰ کہ اس کا تمام سراپا راکھ رنگ ہو گیا۔ اس کے بعد وہ پھر بازار پہنچا۔ تین راستوں کے موڑ کے ایک کونے پر اس نے ہاتھوں سے وہاں پر ریت اور مٹی کا ایک چھوٹا سا چوکور پلیٹ فارم بنایا۔ اپنے سامنے ٹیڑھی میڑھی سی جنگلی لکڑی ریت میں گاڑ کر آنکھیں بند کر کے بیٹھ گیا۔ میں دس قدم دُور اس کی سب اداکاری دیکھتا رہا۔ جب بات میری سمجھ میں آنے لگی تو ہنسی میرے لیے روکنا بہت مشکل ہو گیا۔ اس نے بھینگی آنکھ سے میرے ہنسی دبانے کی کوشش میں لرزتے جسم کو دیکھا تو زور سے گرجا۔" بچہ۔ تم ادھر سے جاؤ۔ ہماری جگتی بھنگ مت کرو۔"

اس کی آواز میں اتنی گرج۔ رعب اور دبدبہ تھا جیسے کسی رشی منی کی روح اس کے جسم میں سرایت کر گئی ہو۔ میں ڈرتا ہوا وہاں سے کھسک گیا بہت دیر اِدھر اُدھر گھومتا پھرتا رہا۔ قریب آدھے گھنٹے بعد دوبارہ جب وہاں پہنچا تو دیکھا۔ لال چند کے آگے دھیلوں۔ پیسوں۔ ٹکوں اور کہیں کہیں آنوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ ایک اخباری کاغذ پر آتے جاتے لوگ اس کے لیے مٹھائیاں رکھ رہے تھے۔ کچھ زیادہ مذہبی قسم کے لوگ اس کے چرنوں میں ماتھا ٹیک رہے تھے اور ہاتھ جوڑ جوڑ کر پرنام بھی کر رہے تھے مگر وہ آنکھیں بند کیے اپنی اندرونی دنیا میں ڈوبا ہوا تھا جیسے دنیا کی وہ ہستا اب اُس کے لیے اپنی تمام کشش کھو چکی ہو۔

اب اُس کے تیج کی طرف دیکھنا میرے لیے بھی مشکل تھا۔ میں اس کا نقلی روپ دیکھ چکا تھا۔ میں کوئی بھی ایسی ویسی حرکت کرتا تو عوام اُس کے ساتھ تھے، میری ہڈی پسلی ایک کر دیتے۔ میلے میں دیکھنے کو اور بھی بہت کچھ تھا۔ میں چار گھنٹے دوسری رونقیں دیکھتا پھرا۔ صرف ایک فکر ضرور دامنگیر رہا کہ ماتا جی اگر اِدھر آ نکلیں اور لال چند کو دیکھ لیا تو کیا ہوگا مگر دوسرے لمحے دل نے تسلی دی کہ وہ اُسے پہچان ہی نہیں سکیں گی۔ ہو سکتا ہے وہ بھی اُسے پہنچا ہوا سادھو سمجھ کر چند سکے اُس کے قدموں میں بھینٹ کر جائیں۔

کوئی ساڑھے پانچ یا چھ گھنٹے بعد حوصلہ کر کے میں اُس کے پاس پہنچا مگر پھر بھی چند قدم کے فاصلے پر رک گیا۔ اُس نے کانی آنکھ سے مجھے دیکھ لیا۔ جب تھوڑی دیر بعد بھیڑ کچھ کم ہوئی تو اُس نے مجھے پکارا۔" بچہ۔ اِدھر آؤ۔"

میں قریب پہنچا تو وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ پیسوں اور مٹھائیوں کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔ "بچہ۔ یہ سب موہ مایا کا جال ہم سے دور کر دو۔ وہ جو ندی کنارے مندر ہے وہاں کچھ سادھو سنت فقیر جمع ہیں ـــــ اس سے ان کے بھوجن آدی کا بندوبست کر دینا۔ اچھا ہم چلتے ہیں"۔

جاتے جاتے ہوئے سے اس نے پوچھا "میرے کپڑے کہاں ہیں؟"

میں نے اس کے کپڑے ایک خاکی رنگ کے کاغذ میں لپیٹ رکھے تھے۔ میں نے کاغذ کا گول سا پیکیٹ اس کی طرف بڑھایا۔ اس نے بنا ہاتھ لگائے پیکیٹ بغل میں دبا لیا۔ ایسے جیسے سادھوؤں کی بغل میں مرگ چھالا (ہرن کی کھال) رہتا ہے۔ اور وہ ایک طرف کھسک گیا۔

مٹھائی کا ٹوکرا اور پیسے سنبھال کر میں ندی کنارے والے مندر کی طرف بڑھ گیا کیوں کہ وہ مجھے اُسی جگہ کا اشارہ دے گیا تھا۔ کوئی آدھے گھنٹے بعد جب میں وہاں پہنچا تو لال چند نہا دھو کر کپڑے پہنے میرے انتظار میں بیٹھا تھا۔

بہت ساری مٹھائی کے ساتھ مجھے چھوٹی ریزگاری میں سے دو روپے ملے۔ چار آنے اس نے مجھے میرے تعاون کی خوشی میں انعام دیئے۔ باقی کی ریزگاری جو اس کے حصے میں آئی تقریباً پونے چار روپے تھی اور مٹھائی الگ۔

میں بہت ٹھنڈے مزاج کا ہوں۔ میں بہت غصیل ہوں۔ جی ہاں مجھے غصہ بالکل نہیں آتا۔ آتا ہے تو بہت تیز آتا ہے۔ میں کسی کو چھیڑتا نہیں کوئی چھیڑے تو اُسے بخشتا بھی نہیں۔ بس نہ چلے تو دوسری بات ہے یعنی اگلا محمد علی یا دارا سنگھ ہو تو ہرچرن چاولہ بچارا کیا کرے۔ کیا مجھے اپنی ہڈیاں عزیز نہیں ہیں۔ میں کسی سے پہل نہیں کرتا مگر کوئی مجھ سے زیادتی کرے تو میرا ردِ عمل بہت تیز ہوتا ہے۔

کچھ عرصہ پہلے دہلی میں اپنی بیوی کے ساتھ ـــــ اس کی ایک نوجوان ٹیچر ساتھی کے گھر میرا جانا ہوا۔ وہاں اس نے اپنے چچا، ایک چھ فٹے بھلے صحت مند اور تگڑے ادھیڑ آدمی سے میرا تعارف کرایا۔ وہ وزن، صحت اور قد میں مجھ سے کافی بڑا تھا۔ اتنا بڑا کہ ایک بار کسی کو ایک جھپکی دے دے تو اچھے بھلے آدمی کے پسینے چھوٹ جائیں۔ مونچھیں اور چہرہ ایسا کہ بچے ڈر جائیں۔

"میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے" میں نے کہا۔

"میں بھی سوچ رہا ہوں۔ میں نے آپ کو کہاں دیکھا ہے؟" وہ بولا۔

"آپ بھیرہ کبھی رہے ہیں؟" میں نے پوچھا

"ہاں۔ میں نے میٹرک وہیں سے کیا ہے" اُس نے کہا۔

"کیے۔ آر۔ اے ایس ہائی سکول؟" میں نے پوچھا۔

جواب دینے کی بجائے اُس نے مجھے اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ "او چاولہ۔ چاولہ۔ ہرچرن چاولہ۔ کیا حال ہے؟" ہم گلے ملے۔ ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے کھڑے رہے۔ "یار تیرے افسانے پڑھتا تھا تو سوچتا تھا۔ یہ وہی ہرچرن چاولہ تو نہیں جس نے میری پٹائی کی تھی۔ سچ بتا۔ یہ افسانے تو لکھتا ہے۔ یقین نہیں آتا۔ تُو تو لڑاکا ـــــ تھا۔ قلم کیسے پکڑ لیا؟" وہ بولتا گیا مجھے باری دیئے بغیر۔

پھر اُس نے پھلا کر بازو کی مچھلی دکھائی اور ہنستے ہوئے بولا: "اب میں تم سے مار نہیں کھا سکتا۔"

ہم کافی دیر گپیں مارتے رہے۔ پرانے وقتوں کو یاد کرتے رہے۔ بھیرہ سکول سے ملک وال کے سفر اور شرارتیں۔

میرے والد صاحب ملک وال سٹیشن پر کام کرتے تھے اور ملک وال میں ہائی سکول نہ ہونے کی وجہ سے میں بھیرہ کے سکول میں پڑھتا تھا اور ہوسٹل میں رہتا تھا۔ ملک وال کے کچھ اور لڑکے بھی میرے ہم جماعت تھے۔ اُن میں ایک یہ بنسری لال بھی تھا۔ میرا بہت اچھا دوست۔ میں اُس کے اُردو پڑھتا

تھا اور وہ مجھے اپنے حساب کے سوال نقل کرنے دیتا تھا۔ اردو تو میرا اوڑھنا بچھونا تھی مگر اور مضمون بس پاس ہونے تک پڑھ لیتا تھا۔ ہاں حساب سے مجھے خدا واسطے کا بیر تھا یا شاید حساب کو مجھ سے دشمنی تھی۔ میرے دماغ کے نزدیک ہی نہیں پھٹکتا تھا۔ زندگی میں اب تک، مجھے پیسے گننے پڑ جائیں تو موت آ جاتی ہے۔ ریلوے کی بیس سال کی طویل سروس میں مجھے یاد نہیں آتا کہ میں نے کبھی اپنی تنخواہ گنی ہو۔ ایک بار جیب میں اپنی تنخواہ بنا گنے جیب میں رکھنے لگا تو پے کلرک نے کہا۔ "مسٹر چاولہ آپ پیسے گن لیں۔"

"ٹھیک ہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"نہیں آپ ایک بار ضرور گن لیں۔" اُس نے کہا۔

"ٹھیک ہیں۔"

"اگر کم ہوئے تو پھر میں ذمہ دار نہیں ہوں گا۔" اُس نے قدرے تُرشی سے کہا۔

"کم کیسے ہو سکتے ہیں۔ آپ نے چھ بار تو تھوک لگا لگا کر گنے ہیں۔" میں نے بھی تُرشی سے جواب دیا اور پیسے جیب میں رکھ لیے۔ دراصل یہ لوگ پیسے اتنی بار گنتے ہیں کہ نہ چاہتے ہوئے بھی آپ اُن کے ہاتھوں میں ہی اپنے پیسوں کا اندازہ لگا لیتے ہیں۔

بھیرہ سکول میں سب لڑکے سفید شلواریں یا پاجامے پہنتے تھے۔ مگر میں اپنے میانوالی ضلع کی خاکی شلواریں استعمال کرتا تھا۔ اس لیے لڑکے مجھے پٹھان یا خان صاحب کہتے تھے۔ حتیٰ کہ کچھ ٹیچر اور ہیڈ ماسٹر بھی مجھے خان پکارتا تھا مگر میں نے کبھی کوئی شرارت نہیں کی تھی۔ جھگڑا نہیں کیا تھا۔ اُن کی نظروں میں سُرخ و سفید رنگ، بہت ہی اچھی صحت اور خاکی شلوار کے ساتھ میری پُرسکون اور خاموش طبیعت میل نہیں کھاتی تھی مگر میں نے کہا نا کہ میں بہت ٹھنڈے مزاج کا آدمی ہوں۔

میں شام کو کھیل کود کر پسینہ سکھانے کے بعد نہا دھو کر اپنے کمرے میں پہنچا تھا۔ آج میرا بہت کچھ پڑھنے کا پروگرام تھا۔ اتفاق سے سات بیڈ کا کمرہ آج بالکل خالی مِل گیا تھا کیوں کہ میرے باقی روم میٹ شہر گئے ہوئے تھے اور اُن کے جلدی لوٹنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ آج کوئی بہت اچھا رسالہ میرے ساتھ لگا تھا جسے میں اُن کے آنے سے پہلے بہت کچھ پڑھ ڈالنا چاہتا تھا۔ ابھی میں دو افسانے ہی پڑھ پایا تھا کہ بنسری لال اندر آیا اور اس نے بجلی بجھا دی۔

میں نے کہا۔ "بھئی میں پڑھ رہا ہوں۔" اور میں نے پھر بٹن دبا کر بجلی جلا دی۔

اُس نے کہا۔ "میں دیکھ رہا ہوں۔" اور اُس نے پھر بجلی بجھا دی۔

میں نے پوچھا۔ "تم سونا چاہتے ہو؟"

وہ بولا۔ "کوئی سات بجے بھی سوتا ہے؟"

"پھر مجھے پڑھنے کیوں نہیں دیتے؟"

"پڑھو۔ میں نے کب منع کیا ہے۔"

میں نے بجلی جلا دی۔ اُس نے پھر بجھا دی۔ میں نے پھر جلا دی۔ اس نے پھر بجھا دی۔

میں نے کہا۔ "تمہیں سونا ہے تو بے شک بجلی جلی رہنے دو۔"

میں نے بجلی جلا دی۔ اس نے پھر بجھا دی۔ میں نے پھر جل کر کہا۔ "تم چاہتے کیا ہو؟"

"جو چاہتا ہوں کر تو رہا ہوں۔ تمہیں جو کرنا ہو کر لو۔" اس نے پھر بجلی بجھا دی۔

یہ تو چیلنج تھا۔ کچھ دن سے میری اس کی اَن بن چل رہی تھی۔ وہ گھر سے کھوئے کے پیڑے لاتا تو تھا مگر کھاتا نہیں تھا۔ وہ پڑے پڑے خراب ہو جاتے تھے۔ دو دن پہلے سریندر سنگھ نے اُن پر ہاتھ صاف کر دیا تھا مگر بنسی لال کو شک مجھ پر تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ میں نے اگر اس کے پیڑے نہیں کھائے تو بتا تو دوں کہ کس نے کھائے ہیں مگر میں کھانے پینے کی چیزیں میں شکایت کرنے یا چغلی کھانے کے حق میں نہیں تھا۔ بس اسی بات نے اُسے مجھ سے ناراض کر دیا تھا۔

میں نے بجلی جلاتے ہوئے گرج کر کہا "اب تم بجلی نہیں بجھاؤ گے:

"اچھا" وہ پل بھر میری طرف دیکھتا رہا۔ پھر سوئچ کی طرف بڑھا مگر اس سے پہلے میرا ایک مکا کھا کر وہ زمین چاٹ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اُٹھ پاتا میں نے اُسے زور کی ایک لات اور جڑ دی۔ اس نے اُٹھنے کی کوشش کی مگر تب تک میرے ہاتھ میں ڈرائینگ کی ٹی (T) آ چکی تھی۔ پھر میرے ذہن پر بھوت سوار ہو گیا۔ غصے کا بھوت۔ وہ پٹ رہا تھا۔ چلا رہا تھا۔ ہائے ہائے کر رہا تھا۔ مگر دور و نزدیک اُسے بچانے والا کوئی نہیں تھا۔ حتیٰ کہ وہ گر گیا۔ اس کی ہائے ہائے بند ہو گئی۔ مگر میں اُسے پیٹتا رہا۔ جب تک کہ ٹی ٹوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے نہیں ہو گئی۔

اب وہ زمین پر بے ہوش پڑا تھا۔ میں نے اُسے گھسیٹ کر چارپائی کے نیچے کر دیا اور اس پر نیچی چادر آگے سرکا کر اُسے ڈھک دیا۔ اب میرا رسالہ پڑھنے کا موڈ کافور ہو چکا تھا۔ میں باہر گھومنے پھرنے چلا گیا۔ کوئی گھنٹہ ڈیڑھ بعد جب میں واپس آیا تو کمرے کے باقی لڑکے آ چکے تھے اور اپنی اپنی چارپائیوں کے پاس میزیں لگائے پڑھ رہے تھے۔ میں نے بھی اپنی کتابیں نکالیں اور پڑھنے بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد منگل سین بولا "آج بنسی لال نظر نہیں آیا۔ پتہ نہیں کہاں گیا ہے؟"

سب خاموش رہے اور بات آئی گئی ہو گئی مگر کچھ دیر بعد اوم پرکاش کو بنسی لال کی چارپائی کے نیچے سے نکلی ہوئی اس کی بانہہ نظر آ گئی۔ "ارے" اس نے چادر ہٹائی اور اُسے باہر نکالا۔ اُس کے منہ سے بہی ہوئی جھاگ اس کے آس پاس اور کپڑوں پر بکھری پڑی تھی۔ شیر سنگھ جلدی سے سپرنٹنڈنٹ کو بلا لیا۔ اُس کے منہ پر پانی کے چھینٹے وغیرہ دے کر اُسے ہوش میں لایا گیا۔

بنسی لال سے تمام حالات جاننے کے بعد میری کرن سنتا مگر سپرنٹنڈنٹ صرف اتنا بولا "اس کا مزا تمہیں کل چکھایا جائے گا:

دوسرے دن ہیڈ ماسٹر میرے ہاتھوں پر بینت برسا رہا تھا اور کہہ رہا تھا "من خوب مے شناسم طفلانِ بے حیا را۔ من خوب مے شناسم طفلانِ بے حیا را"

بے گناہ ہونے کے باوجود یہ میری خاکی شلوار کو سزا تھی۔ دوپہر تک سکول اور بورڈنگ ہاؤس کے نوٹس بورڈ پر مندرجہ ذیل عبارت بھی لکھی جا چکی تھی۔

Harcharn Chawala has been given, ten cuts on his hands for his misbehavior and bad beating of Bansi Lall till later's unconciousness.

میانوالی میں نئی کھُدنے والی نہر کی سڑک پر میں اور میرا چچا زاد بھائی ٹھاکر دت سیر کرنے نکلے تھے۔

"کہاں جا رہے ہو؟" ماسٹر حیات نے کڑک کر ہم سے پوچھا۔

"سفر وسیلۂ ظفر" میں نے جواب دیا۔ ("سفر وسیلۂ ظفر ہے" کل ہی اردو کی کتاب کا یہ مضمون ہمیں کلاس میں پڑھایا گیا تھا)

"سائیکل اِدھر لاؤ" اس نے میری سائیکل کے ہینڈل پر ہاتھ ڈالا کیوں کہ وہ بالکل نئی تھی۔ وہ کسی کی سائیکل لیتا نہیں تھا مگر زبردستی چھین کر گھنٹہ دو گھنٹہ چلانے کا شوق پُورا کر لیا کرتا تھا۔ اس کا دونوں سکولوں گورنمنٹ اور رام موہن رائے کے لڑکوں پر بہت دبدبہ تھا۔ میں نے سائیکل نہیں چھوڑی تو اس نے جھٹکے دے کر مجھ سے چھین لینا چاہی۔ جب وہ کسی طرح بھی سائیکل مجھ سے نہ چھڑا سکا تو اس نے زور سے تھپڑ مارنے کے انداز میں ہاتھ اٹھایا مگر تب تک میں سائیکل کو پرے دھکیل کر تیار ہو چکا تھا۔ جب اس کا وار خالی گیا تو وہ میری طرف بڑھا۔ اب ہمیں گتھم گتھا ہو جانا چاہیئے تھا مگر اس میں ہار جیت کا فیصلہ کیسے ہوتا۔ مجھے تو بس ایک ہی داؤ آتا تھا جس سے میں نے کئیوں کو پچھاڑا تھا۔ میں نے دائیں بازو میں اس کی گردن پھنسائی اور مٹھی کو بائیں ہاتھ کی مٹھی سے دباتا ہوا بازو کا شکنجہ تنگ کرتا گیا۔ پھر دائیں ٹانگ کی اَڑنگی لگا کر اُسے سامنے گرا لیا مگر گردن کی گرفت ڈھیلی نہیں کی۔

بہت دیر ایک بے بس اور کٹے ہوئے مُرغ کی طرح وہ میرے شکنجے میں پھڑپھڑاتا رہا مگر خود کو چھڑا نہیں پایا۔ آخر میں نے خود ہی اسے آزاد کر دیا۔ وہ اٹھا۔ مٹی میں لت پت کپڑے جھاڑے۔ آنِ واحد میں اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ چاقو نکالا اور کڑاک کر کے کھول لیا۔ تھوڑی دیر چاقو کو دائیں بائیں لہرانے کے بعد وہ میری طرف بڑھا مگر تب تک ٹھاکر دت "بھائی رہنے دو۔ دوست رہنے دے۔ سُنا رہنے دے" کہتا ہوا اُسے کمر سے قابو کر چکا تھا۔

میں علم حیات کے سامنے کھڑا تھا اور وہ ٹھاکر دت کے بازوؤں میں جکڑا مجھے گالیاں دے رہا تھا اور ٹھاکر دت کہہ رہا تھا "خان یہ تو پاگل ہے خواہ مخواہ تیرے جیسے شیر سے جھگڑا لے بیٹھا ہے۔ میں سمجھا دوں گا اسے۔ تُو غصہ مت کر۔"

پھر اُس نے آنکھ سے مجھے کھسک جانے کا اشارہ کیا۔ میں پل بھر رُکا رہا۔ پھر آرام سے مستی سے سائیکل چلاتا اپنی راہ چل پڑا۔ اس کے بعد بھی علم حیات ہمارے سکول آتا رہتا اور لڑکوں کے دل پسند سائیکل گھنٹوں چلاتا رہتا مگر اس نے کبھی مجھ سے میری سائیکل نہیں مانگی اور نہ ہی پڑی ہوئی اٹھا کر لے جانے کی ہمت کی۔

بہت عجیب لڑکے کی کہانی ہے یہ۔ آرٹسٹ ہے۔ قلم کار ہے۔ جھگڑالو ہے۔ عقیل ہے مگر بم سے مطلب۔ اس کی کہانی میں تو کہیں کوئی چاشنی ہی نہیں۔ زاہدِ خشک! کیوں ہے نا یہی بات جو آپ اس لڑکے کے بارے سوچ رہے ہیں مگر آپ بھول رہے ہیں۔ اناج یہ بھی کھاتا رہا ہے۔ ہاضمہ اتنا رہا ہے کہ آٹھ آٹھ روٹیاں ایک ہی وقت چیر جاتا ہے۔ بارہ تنوری روٹیاں ایک بار ایک ہی وقت میں کھا کر یہ لڑکا ایک شرط بھی جیت چکا ہے۔ اناج جس کے اندر دو وقت باقاعدگی سے پہنچتا ہو اور عمر لڑکپن سے جوانی کی طرف گامزن ہو تو بتایئے۔ خون کا گرم سمندر اس کے جسم میں موجیں مارے گا کہ نہیں۔ کنارے توڑے گا کہ نہیں۔؟

ایک بار سٹیشن پر ایک ویگن سے کالی چکنی مٹی اتاری جا رہی تھی۔ میں بھی ایک ڈھیلہ اٹھا لایا اور اسے باریک پیس کر اور بھگو کر اس کا ایک چوکور ڈلہ بنا لیا۔ اسی دوران سفید کھریا مٹی کے کچھ ڈھیلے بھی کہیں سے دستیاب ہو گئے۔ اُن کا بھی اسی طرح ایک ڈلہ بنایا۔ جب دونوں سُوکھ گئے تو میز پر سامنے رکھ کر انہیں والد صاحب کے پُرانے بلیڈوں سے گھڑنے لگا۔ دو ڈھائی گھنٹوں کی محنت کے بعد دونوں نے ایک صورت اختیار کرنی شروع کی۔ ایک سفید لڑکی گوری گوری۔ دوسری کالی پیاری پیاری۔ دونوں کے بازو وینس کے بُت کی طرح کٹے رہنے دیئے۔ نیچے کا دھڑ بھی نہیں بنایا۔ مگر سر، آنکھیں، ناک کان، بال، گال، گردن اور چھاتیاں بنتی گئیں۔ تب وہ لڑکی میرے سامنے کھڑی تھی۔ وہ کب آئی تھی۔ مجھے پتہ ہی نہیں چلا۔ جانے وہ کب سے کھڑی دیکھتی رہی تھی بولی "بہت وقت لگا رہے ہو اس پر۔

پڑھو گے نہیں؟

"تم چلو۔ میں آ رہا ہوں۔"

یہ لڑکی مجھے ہندی پڑھاتی تھی۔ میں اُسے اُردو پڑھاتا تھا۔ جانے یہ معاہدہ ہم میں کب ہوا تھا۔ جب بھی ہوا تھا مگر میں نے قبول اس لیے کیا تھا کیونکہ مجھے سکول میں اُردو کے ساتھ فارسی نہیں سنسکرت پڑھنی پڑ گئی تھی۔ یہ زبان مجھے صرف دو سال پڑھنی تھی۔ پچھلے سال تو پندرہ بیس اشلوک ادھر ادھر کے گھوٹا لگا کر لکھنے سے پاس مارکس حاصل ہو گئے تھے مگر اس سال زبان کچھ زیادہ ہی مشکل ہو گئی تھی اور کچھ مشکل نئے پنڈت کے آنے سے لگنے لگی تھی جس کا پارہ بھی خطرناک تھا اور مار بھی بُری۔ ———————— مارتا تھا تو گالوں پر کئی دن نشان جم کر رہ جاتے تھے۔

اُس دن میں سنسکرت پڑھنے پہنچا تھا تو مجھے کچھ اور پڑھنا پڑا تھا۔ یہی کہ میں جوان ہوں۔ تم نادان کیوں ہو۔ اُس نے میری نادانی کی آنکھوں پر ہوشیاری کی خیرہ کن چمک ماری تھی۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ کل بڈھے چاچا جانکی رام نے اُسے ایک چٹھی پڑھنے کو بلایا تھا مگر انگلی پکڑ کر پانچ کا نوٹ تھما دیا تھا مگر وہ بھاگ آئی تھی۔ مگر میں اُس دن اس حسینہ کے شکنجے سے نہیں بھاگ سکا تھا مگر دلدل سے ضرور بچ نکلا تھا۔ پھر وہ کئی بار مجھے بلاتی رہی۔ میں نے کہا موسی چوہا لنڈورا ہی بھلا۔ اور اس کے بعد چوہا اپنے بل سے باہر کبھی نہیں نکلا اور اگر نکلا تو ادھر ادھر دیکھ بھال کر کہ آس پاس کہیں بھی موسی تشریف نہ رکھتی ہوں۔

ارے اس میں بھی کوئی بات نہیں۔ وہی جو بیچ کی بات ہوتی ہے۔ وہ میں کے پڑھنے سے پڑھنے والے کے ذہن میں پٹاخہ چھوٹتا ہے۔ یہ تو لگتا ہے جیسے ٹیڑھی میڑھی گول مٹول جلیبی تو ہو مگر رس میں ڈبوئی ہوئی نہ ہو۔ کیوں ہے نا یہی بات۔

قسم رب دی جھوٹ نہیں بولوں گا۔ وہ لڑکی ایک دوسری شرارتی لڑکی سے مل کر دن بھر مجھے تنگ کرتی رہی تھی اور جب میں نے اسے تنگ کرنا چاہا تھا تو وہ چلا اٹھی۔ رو اُٹھی تھی۔ میری ماں کو جگا دیا تھا۔ میری ماں نے پیار سے اُسے سمجھا بجھا کر چُپ کرا دیا تھا۔ مگر مجھے اس کے سامنے خوب ڈانٹا تھا۔ میں نے کہا تھا۔ "ماں۔ میں نے تو اُسے صرف اتنا کہا تھا کہ۔۔۔۔"

"چپ رہ کمینے" میری ماں نے مجھے ڈانٹ دیا تھا۔

میں سوچتا رہ گیا تھا کہ دن بھر اس لڑکی نے مجھے کس قدر ستایا تھا اور رات کو جب میں نے چاہا تھا کہ وہ اٹھ کر میرے ساتھ باہر چاندنی میں جائے تو وہ دیوی بن کر بیٹھی تھی۔ اس لڑکی کو پہلے پہل دیکھ کر مجھے لگا تھا جیسے وہ کوئی اور چیز ہے اور میں کوئی اور چیز ہوں۔ مگر پھر بھی ہمیں ایک دوسرے کی ضرورت ہے۔ وہ ضرورت کیا ہو سکتی ہے۔ بس اُس کی پہچان سے تب میں ناواقف تھا۔ وہ میرے ساتھ باہر چل چلتی تو میں اس کے جسم سے پھوٹنے والی خوشبو کو ضرور محسوس کرتا اور میرا نادان ذہن یہ عقدہ حل کرنے کی کوشش ضرور کرتا ـــ کہ وہ کیا چیز ہے جو اس کے قُرب میں مجھے اچھی لگتی ہے۔ شاید اس کی سہیلی نے مجھ تک پہنچنے کے لیے اُسے پُل بنانے کی کوشش کی تھی کیوں کہ یہ تو اکثر ہمارے گھر آتی جاتی رہتی تھی۔ بابوجی کے دورے پر ہونے والے دنوں میں اکثر رات کو میری ماں کے پاس سو بھی جایا کرتی تھی مگر اس کی سہیلی کو مجھ تک پہنچنے کے لیے اس کے سہارے کی ضرورت تھی۔ بہتی نے مراد کو پانے کے لیے ہیرے رانجھے کی ملاقات کروائی تھی۔

رات کے اندھیرے میں تو بات گذر گئی تھی مگر دن کے اجالے میں آنکھوں میں چُبھتی تھی اس لئے اپنی ماں کا سامنا کرنا میرے لئے مشکل ہو گیا تھا اور میں آنکھیں نیچی کئے اپنی ماں کو بتا کر میانوالی سے بہت دُور راولپنڈی کے قریب اپنے بڑے بھائی کے پاس قطبال سٹیشن جا پہنچا تھا۔ جہاں وہ ریلوے میں اسسٹنٹ سٹیشن ماسٹر تھے۔ میرے پہلے انجان عشق (تب مجھے شاید عشق کے معنی بھی نہیں آتے تھے) میں ناکامی اور اس لڑکی کے رویّے نے مجھے بعد میں صنفِ نازک کی طرف سے ملنے والے اشاروں سے خوفزدہ ہی رکھا۔ وارث شاہ نے سچ ہی کہا تھا۔ عورتیں!

ہس کے لاندیاں یاریاں تے رو کے دیندیاں دس

رشید امجد | سناٹا بولتا ہے (۲)

معلوم نہیں یہ رات کا پچھلا پہر ہے، درمیانہ یا پہلا،
یا شاید دن ہے جس نے رات کے ہاتھ پر بیعت کر لی ہے،
یا پھر شاید رات ہی ہے۔
کوئی بات یقین سے نہیں کہی جا سکتی، خوفناک جبڑوں والا اندھیرا تھوتھنی اٹھا اٹھا کر بھونک رہا ہے،
وہ سہم کر میرے ساتھ لگ جاتا ہے اور سرگوشی کرتا ہے — "ماچس جلاؤں؟"
"نہیں، تیلیاں اس طرح ختم ہوتی رہیں تو—"
"تو؟" اس کی آواز میں خوف سرسراتا ہے۔
"میں نہیں جانتا۔"
شاید ایک، دو یا اس سے بھی زیادہ دن، مہینے یا سال، یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ ہم کب سے گٹر کی دیواروں کو ٹٹول ٹٹول کر باہر جانے کا راستہ تلاش کر رہے ہیں۔ اتنا سا خیال آتا ہے کہ ہم گفتگو کرتے چلے جا رہے تھے۔ مین ہول کھلا ہوگا، وہ گرا، اسے نکالنے کی کوشش میں میں، یا شاید میں گرا ہوں گا اور مجھے نکالنے کی کوشش میں وہ، پورے یقین کے ساتھ کوئی بات بھی نہیں کی جا سکتی۔
رینگتے پانی کی سرسراہٹ، اندھیرا بار بار اپنے جبڑے کھولتا ہے اور لمبی کالی زبان نکال کر ہمارے منہ چاٹتا ہے۔ ہماری کانوں پر لیپ دار رات کی چپچپاہٹ، وہ تیلی جلاتا ہے، بیمار نحیف شعلہ سر اٹھا کر دو تین اُکھڑے اُکھڑے سانس لیتا ہے — گھُپ اندھیرا۔
زیادہ گہرے اور منظم اندھیرے میں تھوڑی سی غیر منظم روشنی اندھیرے کو اور دبیز کر دیتی ہے۔
اُوپر سڑک پر بھاری تیز رفتار گاڑی گزرتی ہے۔
میں کہتا ہوں — "اس کا مطلب ہے ہم ابھی بڑی سڑک کے نیچے ہی ہیں۔"
وہ ہنستا ہے — "اس صورتِ حال میں بڑی سڑک کے نیچے ہونے یا نہ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے؟"
"شاید کچھ نہیں، لیکن یہ احساس بھی غنیمت ہے۔"
"اگر ہم اسی سیدھ میں چلتے جائیں تو شاید کہیں کوئی کھلا ہوا مین ہول نظر آ جائے۔"
"اس سیدھ میں تو شاید ہی ملے" وہ بڑبڑاتا ہے — "بہر حال چلے چلو"

ہم ابھی دو چار قدم ہی چلتے ہیں کہ کوئی چیز میرے پاؤں سے لپٹ جاتی ہے۔ میں جھک کر چھوتا ہوں۔ ننھا منا سا ایک ہاتھ!

"ماچس جلاؤ۔ جلدی" میں چیختا ہوں،

لرزتی روشنی میں ایک نوزائیدہ بچہ میرے پہلو سے گزرتا آگے نکل جاتا ہے،

وہ کہتا ہے ۔ "یہ تو میرا بچہ ہے ۔ مگر یہ تو ابھی ماں کے پیٹ میں تھا!"

میں اسے تسلی دیتا ہوں ۔ "شاید اس دوران اس کی ماں نے اسے جن دیا ہو؟

"اور پھر کسی نالی میں پھینک دیا ہو" وہ بڑبڑاتا ہے ۔ "یا پھر یہ کہ اس کی ماں نے اسے کسی نالی ہی کے کنارے جنا ہو اور یہ بہتا ہوا یہاں آگیا ہو؟"

ایک لمحہ کے سکوت کے بعد وہ دفعتاً چیختا ہے ۔ "میرے بیٹے ۔ میرے بچے"،

جواباً رینگتے پانی کی سرسراہٹ اور لیس دار اندھیرے کی چھپا ہٹ،

"میرا بچہ۔ میرا بیٹا" وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا ہے،

"صبر کرو۔ صبر" میں اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتا ہوں "سارے بچے اب اسی طرح بہتے ہوئے یہیں آئیں گے کہ اب ساری مائیں اپنے بچوں کو ان ہی نالیوں میں بہائیں گی"

"نالیوں میں کیوں؟" وہ چپ ہو کر سوال کرتا ہے۔

"دریا تو سارے خشک ہو گئے ہیں، اور شہر میں قتلِ طفلاں کی منادی بھی ہو چکی ہے، مائیں بے چاری کیا کریں ۔ چلو آگے چلیں، کسی کھُلے مین ہول کی تلاش میں"

وہ ایک ٹھنڈی سانس بھرتا ہے ۔ "میری عمر اب چالیس سال ہونے والی ہے، اس سیلن زدگی، رینگتے پانی کی سرسراہٹ اور اس لیس دار اندھیرے کے جبڑوں میں پستے پستے چالیس سال ہو چلے ہیں، معلوم نہیں میری زندگی کے اور کتنے سال باقی ہیں، ان باقی سالوں میں کھُلا مین ہول ملے گا بھی کہ نہیں"

"کیا معلوم ۔؟" میری اپنی آواز دم توڑ رہی ہے ۔ "شاید ہمارے بچوں کو مل جائے، یا شاید وہ بھی ہماری ہی طرح ساری زندگی کھُلے مین ہول کے خواب دیکھتے دیکھتے اسی گٹر میں بھٹکتے، اندھیرے کے لیس دار جبڑوں میں پستے گزار دیں"

"چلو آگے چلیں" وہ میرا ہاتھ دباتا ہے۔

گہری گھپ خاموشی، جس میں رینگتے پانی کی سرسراہٹ اور اندھیرے کے خرانٹے گونج رہے ہیں،

ہمارے سروں پر آوازوں کے بادل تیرتے ہیں

ایک آواز ۔ "میں تمہارے ساتھ کیا سلوک کروں؟"

دوسری آواز ۔ "وہی جو ایک بادشاہ دوسرے بادشاہ کے ساتھ کرتا ہے"

تالیاں، نعرے، تحسین کا شور!

"ہم —" میں اس کا شانہ تھپتھپاتا ہوں۔ "بادشاہوں کے کھیل میں ہم کوئی چیز نہیں ہوتے۔ بس ہم تو کھلے مین ہول کے خواب ہی دیکھتے ہیں"۔

وہ پوچھتا ہے۔ "ہم میں سے پہلے کون گٹر میں گرا تھا"

"تم —" میں اندھیرے میں اسے گھورتا ہوں۔

"نہیں تم —" وہ دو قدم پرے ہو جاتا ہے۔

"نہیں تم —"

"تم —" وہ مجھ پر جست لگاتا ہے۔ ہم ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو جاتے ہیں، اور ایک دوسرے کو گرانے کی کوشش کرتے ہیں، جب تھک جاتے ہیں تو آمنے سامنے کی دیواروں سے ٹیک لگا کر ہانپنے لگتے ہیں۔

بہت دیر کی چپ کے بعد وہ ہانپتی ہوئی آواز میں کہتا ہے — "آگے چلیں"

"چلو —"

چلتے چلتے ہم ایک کھلی سی جگہ پر پہنچ جاتے ہیں۔ سخت سے ٹکڑے ہمارے پاؤں سے ٹکراتے ہیں۔

وہ ماچس جلاتا ہے۔

چاروں طرف ہڈیاں اور انسانی پنجر پڑے ہوئے ہیں۔ وہ ایک ہڈی اٹھا لیتا ہے اور کہتا ہے — "یہ تو میرے باپ کی ہڈی لگتی ہے، اس کے جبڑے کی ساخت ایسی ہی تھی"۔

میں انسانی پنجروں کو پہچاننے کی کوشش کر رہا ہوں۔

وہ کہتا ہے — "تو جی میں سمجھتا ہوں میرا باپ مجھ سے اچھا تھا، اب معلوم ہوا کہ وہ بھی میری طرح ساری عمر کھلے مین ہول کے خواب دیکھتا رہا"۔

دفعتاً اس کی آواز لرزنے لگتی ہے — "ہم بھی — ہم بھی —"

میں جھک کر دیکھتا ہوں، سب کے منہ پر پلاسٹر ٹیپ لگے ہوئے ہیں، کپڑے ان کا گوشت کھا گئے ہیں، مگر ٹیپ اسی طرح ہیں۔

"مگر ہم تو صرف اظہار کے حوالے سے ہی ایک دوسرے کو پہچانتے ہیں، اور ان کے منہ تو بند ہیں"۔

پانی کی سرسراہٹ، بل کھاتی سیلن

ایک گوشت خور کیڑا اس کی ٹانگ پر چڑھ جاتا ہے وہ چیخ مارتا ہے اور ٹانگ جھٹک کر آگے چل پڑتا ہے۔

ابھی دو چار ہی قدم اٹھتے ہیں کہ بہت سی ملی جلی [illegible]یں اندھیرے میں سے نکل کر ہمارے پاؤں پکڑ لیتی ہیں

وہ جلدی سے تیلی جلاتا ہے۔

ننگ دھڑنگ ننھے بچے پانی میں شپ شپ کرتے دوڑے چلے آ رہے ہیں۔

"یہ کون ہیں؟" وہ میرے ساتھ لگ جاتا ہے۔

ایک بچہ جو جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ رہا ہے آگے بڑھ کر پوچھتا ہے — "تم کون ہو؟"

"ہم — ہم گٹر میں گر پڑے تھے"

"اور یہ کہ تمہارا پاؤں پھسل گیا تھا" وہ کھڑکھڑاتا ہے — "سب یہی کہتے ہیں"۔

"مگر تم کون ہو؟"

"ہم ـــ ہم غباروں میں پیدا ہوئے ہیں، اس گٹر کے اور"

"ـــ غبارے"

"ہاں وہ غبارے جو لوگ ـــــ گٹر میں پھینک دیتے ہیں۔"

وہ شور مچاتے، ہمارے دائیں بائیں سے گزرتے اِدھر اُدھر نکل جاتے ہیں،

وہ کہتا ہے ـ "مجھے یاد آیا، ایک رات میری ماں نے بھی ایک غبارہ نالی میں پھینکا تھا اور اس میں میں تھا، پر معلوم نہیں وہ شخص جو راتوں رات چپکے سے چلا گیا تھا میرا باپ تھا کہ نہیں"

"اور شاید میں بھی اسی غبارے میں تھا، اور وہ شخص، وہ ضرور ہمارا باپ تھا اور وہ ہماری ماں تھی ـ انہوں نے تو ہمیں بہت روکا تھا، مگر ہم خود ہی اس گٹر میں آگئے ہیں یا شاید ہمیں ورغلایا گیا ہے ـ سنہرے خواب دکھا کر، مگر یہاں آکر معلوم ہوا یہ تو گٹر ہے ـ گٹر"

اُوپر اب آوازوں کی دستک میں بھاری پن اور تواتر پیدا ہو رہا ہے۔

"شاید اُوپر صبح ہو چکی ہے" میں بڑبڑاتا ہوں۔

"مگر صبح کیا؟" اس کی آواز بیٹھی ہوئی ہے

"سورج کی شکل کیسی ہوگی؟" میں اس سے پوچھتا ہوں ـ "اس کی کرنوں میں گرمی بھی ہوگی نا"

"اب تو یاد بھی نہیں ـ میں تمہیں کیسے بتاؤں، کیا بتاؤں؟"

ہم اس وقت کسی بڑی سڑک کے نیچے ہیں، ہارنوں کی پوں پوں، بریکوں کی رگڑ اور قدموں کی آوازیں ـ

وہ تیلی جلائے ہوئے اعلان کرتا ہے ـ "صرف دو تیلیاں باقی ہیں"

لرزتی روشنی میں ایک عجیب سی سرسراہٹ محسوس ہوتی ہے،

وہ حسرت سے اُوپر دیکھتا ہے . . "کہیں بھی کوئی راستہ نہیں"

"نقشوں میں ضرور ہوگا" میں سوچتا ہوں ـ "مگر نقشے تو صرف دیواروں پر لگانے کے لئے ہوتے ہیں"

"یہ ہوا میں تازگی کیسی ہے؟" وہ چونکتا ہے۔

"کیا معلوم یہ تازگی ہے بھی کہ ہم ہی اس سیلن زدگی کے عادی ہو گئے ہیں؟"

"نیم روشنی، نیم تازگی ـ ہم بھی تو نیم زندہ ہی ہیں"

اُوپر اب دوپہر گزر رہی ہوگی۔

اب سہ پہر ـ اب سانولی نمکین شام،

لوگ دفتروں، دکانوں سے گھر آ رہے ہوں گے، دروازوں پر منتظر بیویاں مسکراہٹوں کے بوسے لئے ان کی راہ تک رہی ہوگی ـ ابرابر کرتے ننھے بچے اپنی توتلی زبانوں کے ساتھ انہیں پکار رہے ہوں گے!

تیلی جلاتے ہوئے وہ اعلان کرتا ہے ـ "بس ایک ہی تیلی باقی ہے"

"اُسے مت جلانا — مت جلانا" میں چیختا ہوں،

"کیوں؟"

"بس اُسے جلانا مت"

"کیوں نہ جلاؤں؟" وہ ضد کرتا ہے — "وجہ بتاؤ"

"آخری لمحہ میں، جب ہم ایک دوسرے کی آخری تصدیق کریں گے تو اس وقت — اس وقت:

اُوپر شور — میری آواز ڈوب جاتی ہے۔

ایک چیختی آواز، مگر لفظ فضا ہی میں رہ جاتے ہیں۔

وہ افسوس سے سر ہلاتا ہے — "کچھ بھی سمجھ میں نہیں آرہا"

معلوم نہیں لفظوں ہی میں سے معنی نکل گئے ہیں، یا آوازیں کھوکھلی ہو گئی ہیں،

شور — چیختی آوازیں،

پھر تڑتڑ — تڑتڑ

سناٹا بولتا ہے،

وہ کہتا ہے — "ہم شہر میں ہیں اور گڑھ نیچے ہے"

میں کہتا ہوں — "ہم گڑھ میں ہیں اور شہر اُوپر ہے"

اب معلوم نہیں، یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ ہم گڑھ میں ہیں یا شہر میں، شہر میں ہیں یا گڑھ میں،

وہ کہتا ہے — "چلو یہ جھگڑا چھوڑو، میں آخری تیلی جلانے جا رہا ہوں"

میں سوچتا ہوں، چند لمحے چپ رہتا ہوں پھر آہستہ سے کہتا ہوں — "اچھا"

وہ تیلی کو ماچس پر رگڑتا ہے،

ایک دوسرے کو دیکھنے، شناخت کرنے اور ایک دوسرے کی گواہی دینے کا یہ آخری موقع،

مجسم آنکھ بنے آمنے سامنے — ٹک ٹک ٹک ٹک

تیلی ماچس سے رگڑ کھاتی ہے،

ہمارا سارا وجود آنکھ میں ڈھل جاتا ہے،

وہ تیلی کو ماچس سے رگڑتا ہے — رگڑتا چلا جاتا ہے۔

تیلی بغیر جلے، ٹوٹ کر نیچے پانی میں جا گرتی ہے۔

سرسراتے اندھیرے اور رینگتے پانی میں، آنکھیں پھاڑے ہم ایک دوسرے کو دیکھنے، شناخت کرنے اور ایک دوسرے کی گواہی دینے کے انتظار میں پتھر ہو جاتے ہیں!

مُشتاق قمر | بے نام وقت کی کہانی

اس کے سارے راستے آ کر گول دائرے میں ختم ہو گئے۔

آغاز میں اس گول دائرے کو اپنے راستے ہی کا ایک موڑ سمجھ کر اس نے اپنا سفر جاری رکھا تھا۔

لیکن شام کے وقت وہ وہیں پہنچ گیا جہاں سے اس نے گول دائرے میں اپنے سفر کے نئے مرحلے کا آغاز کیا تھا۔

سورج ابھی تک مغربی افق پر۔ ٹانگیں پسارے بیٹھا تھا۔

ابھی سے گھٹا ٹوپ اندھیرا پھیل گیا تھا۔

شام کے وقت اتنا اندھیرا۔ خوف آہستہ آہستہ اپنے پنجے گاڑنے لگا۔

اس کا جسم سُن ہوتے ہوتے بالکل سُن ہو گیا۔

وہ وہیں پتھر پر سر رکھ کر لیٹ گیا۔

اُسے بہت سی باتیں یاد آنے لگیں۔ راستہ۔ منزل۔ دوست احباب۔ عزیز واقارب۔ وہ لوگ جن کے روشن چہروں نے ہمیشہ اس کی تاریک راہوں کو منور کیا تھا۔ اور وہ لوگ جنہوں نے روشنی دکھا کر اسے تاریک راہوں میں بھٹکا دیا تھا۔ اور وہ لوگ جنہوں نے اسے تاریکیوں کے کنوئیں سے باہر کھینچ نکالا تھا۔ اب ہر بات تاریکی کی لپیٹ میں آ چکی تھی۔

گزری ہوئی ساری زندگی روشنی کی ننھی ننھی قندیلوں کی طرح ذہن کی سکرین پر نمودار ہوتے ہی بجھ جاتی۔

اس کے اندر باہر روشنی کا سارا نظام درہم برہم ہو چکا تھا۔

پھر اسے خیال آیا۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ اس کے پاس راستے کا مکمل نقشہ تھا۔ اور وہ نقشہ پڑھنے میں کافی مہارت بھی رکھتا تھا۔ وہ اس نقشے کی مدد سے یقیناً اپنے راستے کی صحیح سمت متعین کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ اگر اس وقت تاریکی نہ ہوتی تو وہ اسی وقت کمپس اور نقشے کی مدد سے راستہ متعین کرنے کی کوشش کرتا۔ اسی طرح ایک بار راستے کا تعین کرنے کے بعد وہ اپنا سفر جاری نہ رکھ سکتا تو بھی کم از کم سکون کی نیند تو سو سکتا تھا۔

تاریکی گھمبیر تھی: اور وہ اس گھمبیر تاریکی میں کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔

اس نے کسی انجانے خدشے کے پیشِ نظر اپنے سفری بیگ کو ٹٹول کر دیکھا۔ اس کا سفری بیگ ابھی تک اس کے پاس ہی تھا۔ اسی طرح بھرا بھرا یا۔ کمپس اور نقشہ بھی یقیناً بیگ میں ہوں گے۔

اسے قدرے اطمینان سا ہوگیا۔ آنکھیں آہستہ آہستہ بند ہونے لگیں۔

صبح جب بیدار ہوا تو چاروں طرف روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اسے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی۔

آسمان پر دُور دُور تک کہیں بھی سورج دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس ویرانے میں اتنی روشنی سورج کے بغیر ممکن نہیں ہوسکتی تھی۔ وہ سوچنے لگا۔ شاید وہ ساری رات اور سارا دن سویا رہا تھا۔ اور اب سورج غروب ہوچکا تھا۔ اور یہ روشنی غروب آفتاب کے بعد کی روشنی تھی۔ پھر اُسے یاد آیا کہ کل۔ یا شاید پرسوں ۔ پتہ نہیں کتنے دن ہوگئے تھے۔ اُسے آئے ہوئے۔ بہرحال جس دن وہ پہلی بار اس گول دائرے میں داخل ہوا تھا، اسی دن سورج طلوع ہوتے ہی اندھیرا پھیل گیا تھا۔ تو یقیناً سورج ابھی غروب نہیں ہوا تھا اور اگر سورج غروب نہیں ہوا تو طلوع ہوکر کہاں چلا گیا تھا۔ وہ اپنے آپ کو بالکل ایسے انسان کی مانند سمجھنے لگا جس کے اندر آخری بار شکست کھانے کے بعد زور زور سے قہقہے لگانے کی خواہش شدت کے ساتھ پیدا ہوجاتی ہے۔ وہ زور زور سے ہنسنے لگا۔ یہ ہنسی کسی شکست خوردہ انسان کی ہنسی نہیں تھی، منزل کی طرف بڑھنے والے قدموں کے عزمِ صمیم کا قہقہہ تھا۔

وہ سوچنے لگا۔ اگر سورج غائب ہوگیا ہے تو کیا ہوا۔ اُسے تو روشنی کی ضرورت تھی اور روشنی یقیناً اتنی موجود تھی جس میں وہ کمپس اور نقشے کی مدد سے اپنی درست سمت کا تعین کرسکے۔

اُس نے بیگ کی زِپ کھولی۔ یہ تو اسے بعد میں معلوم ہوا کہ اس کی ساری انگلیاں کانپ رہی تھیں۔ اس نے کانپتی انگلیوں کے ساتھ بیگ میں سے کمپس اور نقشہ نکالا۔

جلد ہی اس کا سارا جسم خوف اور وحشت کی چٹان تلے دب کر رہ گیا۔

کمپس نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ اور اس کے رستے کی طرح نقشے کی ساری لکیریں ایک گول دائرے میں آکر ختم ہوگئی تھیں۔ نقشے پر مختلف خطوط اور لینڈ مارکس کی بجائے بس ایک ہی گول دائرہ تھا۔

تو وہ لکیریں جنہیں محض لکیریں سمجھ رہا تھا لکیریں تھیں ہی نہیں زندہ حقیقتیں تھیں اور اس کے ساتھ ساتھ سفر کرتے ہوئے اسی کی طرح اس گول دائرے کی نحوست کا شکار ہوچکی تھیں۔

اب سورج ہی اس کی آخری امید رہ گیا تھا۔

اس نے مشرقی افق پر نگاہیں گاڑ دیں۔

وقت گزرنے کے ساتھ سورج طلوع ہونے کی امید بھی معدوم ہونے لگی۔

پھر روشنی بھی مدھم پڑنے لگی۔

پھر تاریکی پھیل گئی۔ ایک ایسی رات کی تاریکی جس کا دن کبھی طلوع ہی نہیں ہوا تھا۔ بغیر دن کے رات کی تاریکی اس ماں کی طرح ڈری سہمی تھی جس کی کوکھ میں ہی اس کا بچہ سکڑ کر چھلاوہ بن گیا تھا۔

وہ بڑی دیر تک جاگتا رہا۔ پھر نیند کا غلبہ طاری ہونے لگا۔

وہ جاگا تو ابھی بدستور تاریکی پھیلی ہوئی تھی اور نیند اس کے پپوٹوں پر گھٹنوں میں سر دبائے بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ ایک بار پھر نیند کی گہرائی میں ڈوب گیا اور پھر تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد وہ نیند اور بیداری کے درمیان ہچکولے کھانے لگا۔

جانے کتنی دیر۔ کتنے دن۔ کتنی راتیں۔ کتنے ماہ و سال گزر گئے تھے۔ یا ابھی ایک رات بھی پوری طرح بسر نہیں ہوئی تھی۔ وہ جاگا تو تاریکی بدستور پھیلی ہوئی تھی۔ آسمان پر سورج کا کہیں نام و نشان تک نہ تھا۔

اس نے دماغ پر بہت زور ڈالا۔ اسے کچھ بھی یاد نہیں آ رہا تھا۔ وہ کہاں سے آیا تھا۔ اُسے کہاں جانا تھا۔ وہ کہیں سے آیا بھی تھا یا یہیں پیدا ہوا تھا اور پھر یہ آخری خیال زیادہ درست معلوم ہونے لگا جیسے یہاں اس گول دائرے کے اندر ایک بہت بڑی بستی ہوا کرتی تھی۔ وہ اپنے بہت سارے دوستوں اور عزیزوں، رشتہ داروں کے ساتھ ہنسی خوشی رہتا تھا۔ وہ لوگ کھیتی باڑی کرتے تھے۔ ان کی ملیں تھیں۔ دفتر تھے۔ چاروں طرف چہل پہل ہوا کرتی تھی۔ پھر طاعون کی وبا پھوٹ پڑی اور وہ سب مر گئے۔ سورج بھی مر گیا۔ صرف وہ تاریکی ہی زندہ رہ گئے۔

اُسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ شاید اس کے راستے کی طرح اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں بھی کسی گول دائرے میں آ کر ختم ہو گئی تھیں۔

پھر اُسے خیال آیا۔ وہ آگے نہیں جا سکتا تو کیا ہوا پیچھے تو لوٹ سکتا ہے۔

پیچھے لوٹنے کے لئے بھی ایک راستے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور اب تک وہ اس گول دائرے کی قید سے آزاد ہونے کے لئے کئی چکر کاٹ چکا تھا۔ اسے کہیں۔ کسی مقام پر بھی کوئی راستہ گول دائرے میں داخل ہوتے یا نکلتے دکھائی نہیں دیا تھا وہ جس راستے پر چل کر آیا تھا آغازِ سفر سے ہی اس کے متوازی دو اور راستے بھی چلے آئے تھے۔ اور اب ان تینوں میں سے اسے ایک راستے کا بھی سراغ نہیں مل رہا تھا۔

جلد ہی ذہن کے کینوس پر ایک نئی تصویر کے بنتے بنتے رنگ بکھر گئے۔

یہ تو ہو نہیں سکتا کہ وہ اکیلا ہی اس گول دائرے میں پھنس کر رہ گیا ہو۔ اس جیسا کوئی دوسرا بھی ہو سکتا ہے۔ اس کی تلاش کرنی چاہیے اس خیال کے آتے ہی وہ تاریکی میں ٹٹولتا ہوا اپنے ہی جیسے کسی دوسرے بدنصیب شخص کی تلاش میں چل پڑا۔

تقریباً نصف چکر کاٹنے کے بعد اسے واقعی اپنے جیسا وہ دوسرا شخص مل گیا۔

اب دھندلی دھندلی روشنی بھی پھیل چکی تھی۔ روشنی اتنی کافی تھی کہ وہ اپنے جیسے ایک دوسرے شخص کے انسانی خدوخال کو اچھی طرح پہچان سکے۔ اسے اس بات کا اندازہ کوشش کے باوجود نہ ہو سکا کہ وہ لیٹا ہوا تھا۔ بیٹھا تھا۔ یا کھڑا تھا۔ اس سے فرق بھی کیا پڑتا تھا۔ اس نے تو بات کرنی تھی اور بات کرنے کے لئے کوئی خاص پوز بنانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

وہ اپنے جیسے دوسرے شخص کے قریب جاتے ہوئے بولا۔ "بھائی! یہاں سے باہر جانے کا کوئی راستہ ہے؟"

دوسرے شخص نے اس انداز میں جواب دیا جیسے ایک نہیں بہت سے راستے ہوں۔ "تمہیں کہاں جانا ہے؟"

اس نے اپنی سمت کی پوری تفصیل بتا دی۔

"اس سے کام نہیں چلے گا۔" دوسرا آدمی بولا۔ "یہاں کوئی سمت نہیں ہے۔"

"مجھے صرف اتنا ہی معلوم ہے۔" وہ مایوس سا ہو کر بولا۔ "میں جب اس گول دائرے میں داخل ہوا تھا تو اس وقت مجھے سب کچھ معلوم نہیں۔ ہر چیز ذہن سے معدوم ہو چکی ہے۔ صرف سمت کی یاد باقی رہ گئی ہے۔"

"پھر تمہارے سوا کوئی دوسرا تمہاری مدد نہیں کر سکتا۔"

اس نے سوچا پہلے یہاں سے تو باہر نکلا جائے جہاں جانا تھا اس کی بابت بعد میں دیکھا جائے گا۔

عین اسی وقت اس کے اندر زوردار دھماکوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ بڑی بڑی چٹانیں روئی کے گالوں کی طرح اُڑ اُڑ کر فضا میں تحلیل

ہونے لگیں۔

اس کا سارا جسم خیال کی ایک ہی دُھند میں لپٹ گیا۔ "جہاں پہنچنا ہو۔ وہاں نہ پہنچنے سے بہتر ہے کہ کہیں پہنچا ہی نہ جائے۔"

اس کی زبان کا زاویہ اَز خود تبدیل ہوگیا اور وہ پورے عزم کے ساتھ بولا۔ "بھائی مجھے صرف ایک ہی سمت کی جستجو ہے۔"

دوسرا شخص قہقہہ لگاکر خاموش ہوگیا۔

قہقہے کے ساتھ ہی بہت سی روشنی پھیل گئی اور اس روشنی میں دوسرے شخص کے ساتھ اتنی طویل چیخ کے بعد اسے صرف اتنا ہی پتہ چلا کہ جسے وہ اپنے جیسا دوسرا شخص سمجھ رہا تھا۔ وہ سرے سے آدمی ہی نہ تھا۔ کسی چٹان کا بڑا سا ٹکڑا تھا۔ اسے اپنے پر ہنسی بھی آئی اور رحم بھی۔ وہ اتنی دیر تک چٹان کے ٹکڑے کے ساتھ باتیں کرتا رہا تھا۔ چٹان کا ٹکڑا تو بول نہیں سکتا؟ اس نے اس کے ساتھ بہت سی باتیں کی تھیں۔ شاید روشنی پھیلتے ہی وہ اور اس گول دائرے کی ساری حقیقتیں ۔ پتھر بن جاتی ہیں۔ شاید وہ بھی پتھر بن چکا ہوگا۔

اور پھر عین اسی وقت آسمان کے ایک کونے میں چمکتے ہوئے سورج کو دیکھ کر اس کے سارے دلدر دور ہو گئے۔ اسے بالآخر اپنی سمت دریافت کرنے کا ایک کھویا ہوا ذریعہ دستیاب ہوگیا تھا۔ سورج مشرق سے ہی طلوع ہو سکتا ہے۔ اور سورج کو مرکز مان کر ساری سمتیں دریافت کی جاسکتی ہیں۔ اس نے خدا کا شکر ادا کیا کہ سب کچھ بھول جانے کے باوجود ابھی تک وہ اپنی سمت سے ناآشنا نہیں ہوا تھا۔ اسے کہاں جانا تھا یہ تو اسے اب یاد نہیں تھا۔ اسے کس سمت میں سفر کرنا تھا۔ اس کے بارے میں اُسے کوئی شبہ نہیں تھا۔ وہ بچپن سے بس ایک ہی سمت میں سفر کرتا چلا آیا تھا۔ اس کی زندگی کے سارے کاروبار کا مرکز یہی سمت رہی تھی۔ اس کی زندگی کے سارے راستے اسی سمت کی طرف نکلتے تھے۔

اس نے سورج کو غور سے دیکھا۔

اسے یہ اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ سورج طلوع ہو رہا تھا یا غروب۔

اب وہ کافی مطمئن تھا۔ پھر بھی وہ کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ وہ سورج کا اچھی طرح مطالعہ کرنے کے بعد اپنی سمت کا تعین کرنا چاہتا تھا۔

وہ وہیں چٹان کے ٹکڑے کے پاس اطمینان کے ساتھ لیٹ گیا۔

اس کے اندیشے درست ثابت ہوئے۔ سورج طلوع نہیں غروب ہو رہا تھا۔

وہ رات بھر اطمینان کی نیند سویا رہا۔

صبح بیدار ہوا تو حسب معمول پہلے بہت سی روشنی پھیلی۔ پھر سورج طلوع ہوا۔ لیکن ایک بار پھر مایوسی سر پر منڈلانے لگی۔ سورج عین اسی مقام سے طلوع ہو رہا تھا جہاں پر گذشتہ رات غروب ہوا تھا۔ پہلے پہل وہ سمجھا یہ محض اس کا وہم تھا۔

بہت سے دن گزر گئے تو اسے یقین ہوگیا کہ سورج ایک ہی مقام سے طلوع ہو کر اسی مقام پر غروب ہوتا تھا۔

تو اب اس کے گول دائرے کے پنجے سے آزاد ہونے کے سارے امکانات ختم ہو چکے تھے۔

اس کے اندر صحیح سمت پانے کی خواہش اب بھی زندہ تھی۔

وہ رات دن کی تخصیص کے بغیر گول دائرے میں چکر کاٹنے لگا۔ اسے یقین تھا کہ کبھی نہ کبھی کوئی معجزہ ضرور رونما ہوگا۔ وہ اپنی سمت تلاش کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔

اسے اپنی سمت کا رستہ مل جائے گا۔

گول دائرے میں دوڑتے دوڑتے اس میں بہت سی تبدیلیاں واقع ہونے لگیں۔ پہلے اس کی کھال سخت ہوئی۔ پھر کھال پہ لمبے لمبے بال اُگ آئے۔ دانت اور ناخن مضبوط ہوئے۔ اور کچی پکی چیزوں کے ذائقے میں تمیز مٹ گئی۔ پھر اس کے سوچنے اور محسوس کرنے کی قوتیں سلب ہو گئیں۔

آہستہ آہستہ ساری انسانی صلاحیتیں غارت ہو گئیں۔

صرف جبلت زندہ تھی اور وہ خود جبلت کے سہارے زندہ تھا۔

پھر ایک دن گول دائرے میں چکر کاٹتے ہوئے اس کے نتھنوں میں ایک عجیب سی خوشبو کا جھونکا در آیا۔ جھونکا دیکھتے ہی دیکھتے سارے تن بدن میں سرایت کر گیا۔

پھر گول دائرے کا کنارا پھٹ گیا۔ اور وہ خوشبو کے تعاقب میں خاردار جھاڑیوں کے بیچوں بیچ چلنے لگا۔ خاردار جھاڑیاں بہت سی پگڈنڈیوں میں تبدیل ہو گئیں۔ ان بہت سی پگڈنڈیوں میں سے وہ ایک پگڈنڈی پر ہو گیا۔ خوشبو کی مقدار میں ہر آن اضافہ ہونے لگا۔ وہ چلتے چلتے دوڑنے لگا۔ پگڈنڈی بہت سی سڑکوں میں جا کر گم ہو گئی اور وہ ان بہت ساری سڑکوں میں سے صرف ایک سڑک پر خوشبو کے تعاقب میں دوڑتے لگا۔ سڑک شہروں میں اور شہر محلوں میں تبدیل ہو گئے۔ بہت سے محلوں میں صرف ایک محلہ خوشبو سے معمور تھا۔ وہ اس محلے کی بہت سی گلیوں میں سے گزرتے ہوئے ایک گلی میں داخل ہوا۔ پھر خوشبو کا جھونکا اس کا ہاتھ تھام کر ایک گرتے ہوئے مکان کی دہلیز پر لے گیا۔ گرتے ہوئے مکان کی ادھڑی ہوئی دہلیز پر ایک لڑکی آنے والے راستے پر نگاہیں گاڑے اپنی آخری چوڑی توڑ رہی تھی۔ وہ اس کے سامنے جا کھڑا ہو گیا۔

لڑکی نے اسے دہشت زدہ نگاہوں سے دیکھا اور چیخ مارتے ہوئے آخری چوڑی بھی توڑ ڈالی۔ چوڑی ٹوٹنے کے ساتھ ہی اس کا اجنبی خول ریزہ ریزہ ہو کر بکھرنے لگا۔

پھر وہ مکمل طور پر اس خول سے آزاد ہو گیا۔

لڑکی نے دوبارہ اس کی جانب دیکھا۔ اس نے لڑکی کو دیکھا۔

وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھنے لگے اور دیکھتے دیکھتے دونوں سایوں میں تبدیل ہو گئے۔ پھر یہ دونوں سائے ایک دوسرے میں ضم ہو کر ایک سائے میں ڈھل گئے۔

اور سایہ روشنی میں تبدیل ہو گیا۔

اور روشنی چاروں طرف پھیل گئی!!

کاغذ کی ناؤ

تقی حسین خسرو

مس ریحانہ کی متبادل ملازمت کی تلاش شاید ایسی بات نہ تھی کہ میں اُس کو نظر انداز کر جاتا۔ مس ریحانہ کو اِس آفس میں آئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ مگر میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ ایک اچھی اِسٹینوگرافر تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ میں اُس کو کھو دینا نہیں چاہتا تھا۔

مس ریحانہ میری موجودہ سیکرٹری تھی۔ مجھے یاد آیا کہ پہلے اُس نے دبے الفاظ میں مجھ سے کہا تھا لیکن اُس وقت میں نے یقیناً اُس کی بات پر توجہ نہیں دی تھی۔ آج جب اُس نے کُھلے الفاظ میں مجھ سے کہا تو میں نے اُس سے پوچھا،

"آپ کو یہاں کوئی شکایت ہے؟"

"یہ جگہ بہت دُور ہے۔ یہاں پہنچنے میں بہت تکلیف ہوتی ہے۔"

"یہاں پہنچنے میں تکلیف! بھئی اِس علاقے میں تو شاید شہر کے ہر حصے سے بس آتی ہے۔"

"جی ہاں آتی تو ہے مگر بسیں بُری طرح بھری ہوتی ہیں۔ پاؤں دھرنے تک کی جگہ نہیں ہوتی۔"

"میرا خیال ہے بسوں پر خواتین کے لئے علیحدہ بیٹھنے کا انتظام ہوتا ہے۔"

"جی ہاں ہوتا تو ہے مگر ان بسوں کے مسافر سخت غیر مہذّب اور مغرور ہیں۔ خواتین کے حصے میں بلا جھجک گُھس آتے ہیں۔"

میں نے جواب میں کہا۔

"مس ریحانہ مجھے بھی یہ لوگ شہر کے لوگوں سے مختلف لگے تھے مگر میرا خیال ہے سر اُٹھا کر چلنا تو کوئی بُری بات نہیں۔"

میں نے مس ریحانہ کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا مگر اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اپنے مخصوص انداز سے، جس سے میں اب واقف ہو چلا تھا، کھڑکی کے اُس پار سمندر کی سطح پر کہیں دُور دیکھ رہی تھی۔ گویا کسی دور افتادہ موہوم سی شے کو نام دینے کی کوشش کر رہی ہو۔ میں نے سنبھالا لیا اور اپنے سامنے رکھے کاغذات کی طرف متوجہ ہو گیا۔ کچھ انکوائریز آئی ہوئی تھیں۔ جواب میں مناسب آفرز بھیجنے تھے۔ پھر میں اُس وقت چونکا جب وہ اپنے بے آواز قدموں میرے سامنے سے اُٹھ کر کیبن سے نکل گئی۔ دائیں شٹرز کے نیچے سے لمحہ بھر کو اس کے دُور ہوتے قدم نظر آئے اور پھر نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

"کیا اِس علاقے میں پائے جانے والے لوگ واقعی غیر مہذّب اور مغرور ہیں؟"

میں نے خود سے سوال کیا اور پھر اس سوال کا جواب دینے کی سعی کرنے لگا۔ مجھے اپنے پہلے پہل ردِّ عمل کا خیال آیا۔

میں نے محسوس کیا تھا کہ اس علاقے کی سڑکیں بہت چوڑی، بہت لمبی اور پُر ہیبت تھیں۔ ایسی ہی پُر ہیبت جیسے سمندر! شاید یہی وجہ تھی کہ مجھے ان سڑکوں پر کوئی پیدل راہ گیر نظر نہ آیا تھا اور اگر نظر آ بھی جاتا تو وہ اُسی طرح دُور اور بے حقیقت لگتا جیسے سمندر کی لہروں میں ہچکولے کھاتی بادبانی کشتی!

اس علاقے میں پہنچ کر مجھے لگا تھا جیسے میرا بے پناہ وسیع صنعتی شہر ان بہت چوڑی، بہت لمبی اور پُر ہیبت سڑکوں سے گزر کر اپنے بے پناہ پھیلاؤ اور ناقابلِ بیان کثافتوں کے ساتھ کسی اوور ویٹ آدمی کی طرح ہانپتا کانپتا سمندر کے کنارے پہنچ کر دفعتاً ٹھٹک گیا تھا اور لمحے بھر کو اپنی کھولت بھول کر سوچنے لگا تھا "سمندر کتنا بڑا ہے! سمندر کتنا وسیع ہے! مگر سمندر میری طرح بوجھل کیوں نہیں ہے؟!" ——— اور پھر اپنے سوال کا جواب نہ پاکر اُداس ہو گیا تھا۔

یہ وہارف کا علاقہ تھا، یہاں سمندر کے کنارے ایک جانب ایک بہت بڑی گودی تھی جس میں کئی جہاز لنگر انداز تھے۔ کنارے سیمنٹ اور کنکریٹ کے کئی ہزار مربع میٹر لمبے اور چوڑے فرش پر ایستادہ دیو ہیکل کرینیں اور اُن کے ساتھ ساتھ سمندر میں لنگر انداز جہازوں کے اونچے اونچے مستول اور چمنیاں اس علاقے کی تمام فضا پر چھائی محسوس ہوتی تھیں گویا پورے ماحول پر لوہے اور فولاد کی حکومت تھی وہی ناقابلِ بیان سرد بے لچک طاقت، وہی بے اندازہ وزن، وہی بیزار کُن زنگ، وہی نیلی سی بُو جس میں سمندر کے پانی کی بساند بھی شامل تھی ——— وہارف سے دائیں طرف مڑ کر ذرا آگے ایک اور موڑ تھا۔ وہ موڑ نہیں سہ راہا تھا مگر مجھے وہ ایک موڑ ہی لگا تھا کیونکہ دائیں طرف والے راستے سے مجھے کوئی سروکار نہ تھا۔ میں نے بائیں مڑ کر دائیں اُس راستے کی طرف دیکھا تھا جس سے گزر کر جھینگے مچھلی کی بُو میرے تمام وجود پر چھا رہی تھی۔ کسی ایسے شدید تکلیف دہ احساس کی طرح جس سے میں نے پیچھا چھڑانا چاہا تھا، مگر باوجود کوشش کے ناکام رہا تھا۔ اس راستے پر آگے مچھلی بندر تھا جس کو لوگ مچھی مارکیٹ کہتے تھے۔ مچھی مارکیٹ ——— بہت بڑے بڑے مگر بے ستون اور گیلے فرش والے ہال جن کی سفید بے داغ دیواروں کے ساتھ کچھ کچھ فاصلے پر سُرخ چھلکے اور گھڑیال جیسے بڑے بڑے ڈائیل والے مچھلی تولنے کے کانٹے ایستادہ تھے۔ یہ بے ستون گیلے فرش والے ہال مجھے خالی ہی نظر آئے تھے اور اُن خالی ہالوں میں سفید وردی میں ملبوس پاؤں میں ربڑ کے لمبے جوتے پہنے کچھ لوگ اِدھر سے اُدھر آتے جاتے نظر آتے تھے۔ اوپر شاید مچھی مارکیٹ کی انتظامیہ کا دفتر تھا۔ اِن لوگوں کا تعلق اُسی دفتر سے ہو سکتا تھا۔ ان بے ستون ہالوں کے آگے سمندر کی جانب طویل و عریض چبوترے کے ساتھ ساتھ بے شمار کشتیاں کھڑی تھیں۔ رنگ برنگی وزنی کشتیاں! لیکن یہ کشتیاں اپنے تمام رنگوں کے باوجود میری اس کاغذ کی کشتی کی طرح خوبصورت کبھی بھی نہ تھیں جو میں بچپن میں بنایا کرتا تھا۔ کھلونا اصل کی نقل ہونے کے باوجود نہیں معلوم کیوں اصل سے مختلف اور خوبصورت ہوتا ہے؟ ——— موٹی سیاہی مائل لکڑی کی بھاری کشتیاں اپنی ساخت میں بیزار کُن حد تک ایک جیسی تھیں اور چبوترے کے ساتھ ساتھ سمندر میں پہلی، دوسری، تیسری، چوتھی - - - - اور نہیں معلوم کتنی قطاروں میں کچھ ایسے کھڑی تھیں جیسے ازل سے ایسے ہی کھڑی ہوں۔ سمندر کے سیاہ ٹھہرے ہوئے پانی اور اُس کے سینے پر کھڑی کشتیوں کو دیکھ کر اس کالی بندریا کا خیال آیا تھا جس کے سپاٹ سے سینے سے اُس کے ایک ہی شکل کے بچے چمٹے ہوئے ہوں اور جو اپنی تمام شوخی اور پھرتی کے باوجود بچوں کے بوجھ سے تھک کر بار بار بیٹھ جاتی ہو ——— ایک کشتی سے دوسری کشتی پر اُچھل اُچھل کر آتے جاتے لوگ مجھے کسی بندریا کی طرح مشاق لگے تھے مگر اُن کے دھوپ میں تپتے ہوئے سیاہی مائل چہروں پر ایک عجیب فاصلہ اور ایک عجیب بے تعلقی تھی! اس کی وجہ ——— اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ وہ خشکی سے دُور اور سمندر سے قریب تھے۔ سمندر جس کے فراخ بے کنار سینے پر وہ دنوں، ہفتوں مچھلی کی تلاش میں مصروف رہتے۔ انہیں جو کچھ ملتا وہ سمندر سے ملتا اور جب وہ اپنی جھولیاں بھر لیتے تو پھر خشکی کی طرف آتے مگر پھر ایک بار سمندر کے فراخ، بے کنار سینے کی طرف لوٹ جانے کے لئے

——— یہی وہ لوگ تھے جوان بہت چوڑی، بہت لمبی اور پُرہیبت سڑکوں کے مسافر تھے اور بسوں پر سوار ہو کر ان سڑکوں سے ایسے آتے جاتے تھے جیسے وہ آدمی نہیں لکڑی کے ٹکڑے ہوں جن کو ٹرکوں پر لاد کر ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچا دیا گیا ہو یا پھر گودی پر کام کرتے مزدور۔ اِن میں اور اُن میں کیا فرق تھا؛ شاید صرف رنگ کا فرق تھا۔ گودی پر کام کرنے والوں کا رنگ اگر سفید نہ تھا تو سیاہی مائل بھی نہ تھا۔ ہاں ایک فرق اور بھی تھا۔ اُن کے چہروں پر کشتی والوں کی طرح فاصلہ اور بے تعلقی نہ تھی۔ مگر اِس اختلاف کے باوجود ایک قدر ایسی تھی جو دونوں میں مشترک اور نمایاں تھی۔ وہ کسی قدر غیر مہذب تو ہو سکتے تھے مگر وہ مغرور کبھی بھی نہ تھے۔ البتہ وہ دونوں ہی سر اُٹھا کر چلنے کے عادی تھے۔

تاہم مس ریحانہ کی یہ شکایت درست تھی کہ یہ جگہ شہر سے دُور تھی مگر یہاں آفس کھولنے میں خود میری اپنی مرضی کو بھی بالکل دخل نہ تھا۔ میں انڈینٹنگ INDENTING کے کام سے برسوں سے متعلق تھا مگر محض ایک پارٹنر کی حیثیت سے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے اپنا کاروبار شروع کیا تھا۔ دراصل غیر ملکی جو کاروباری دورے پر آئے ہوئے تھے انہوں نے مجھے ایجنسی دینے کی پیش کش کی تھی اور اِس طرح اپنا کاروبار کرنے کی میری دیرینہ خواہش پوری ہوئی تھی۔ مجھے اپنے آفس کے لئے کوئی مناسب جگہ مل نہیں رہی تھی۔ کہیں جگہ تھی بھی تو کرایہ زیادہ تھا۔ آخر میرے ایک دیرینہ دوست نے مجھ سے اِس جگہ کے بارے میں کہا تھا، "یہ جگہ تو دُور ہے مگر فی الوقت کام چلانے کے لئے ٹھیک ہے۔ جب تمہارا کام بڑھ جائے تو کسی بہتر جگہ اُٹھ جانا۔" مجھے اپنے دوست کی یہ تجویز معقول لگی تھی اور اِس طرح میں یہاں پہنچ گیا تھا۔ مچھلی مارکیٹ کے بازو ایک چھوٹی سی عمارت کی اُوپر کی منزل پر میرا دو کمروں والا آفس تھا جس میں، میں، میری موجودہ سیکرٹری مس ریحانہ، ایک چپراسی اور ایک فائلنگ کلرک کام کرتے تھے اور اب میرا یہاں سے اُٹھ جانے کا کوئی ارادہ بھی نہ تھا۔ اِس کی وجہ شاید یہ تھی کہ میں اب اس علاقے کا عادی ہو گیا تھا۔ اب جھینگے مچھلی کی بُو مجھے بہت زیادہ پریشان بھی نہیں کرتی تھی۔ پھر یہ علاقہ نسبتاً پُرسکون علاقہ تھا۔ شہر کے شور اور آلودگی سے بڑی حد تک پاک۔ یہاں نہ تو شہر کا سا بے پناہ ٹریفک تھا اور نہ وہ کان پھاڑ دینے والا شور۔ پھر میں محض مس ریحانہ کی شکایت پر اپنا آفس شہر میں منتقل کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ مس ریحانہ یقیناً ایک اچھی اسٹینو گرافر تھی لیکن تھی تو وہ آخر میری ایک سیکرٹری ہی۔ وہ چلی بھی جائے گی تو کیا ہو گا۔ کوئی اور سیکرٹری آجائے گی مگر بات شاید اتنی آسان بھی نہ تھی۔

دراصل مس ریحانہ سے پہلے بھی میرے پاس ایک اسٹینو گرافر تھی۔ مس روزی جو نہ صرف اپنی مادری زبان انگریزی بتاتی تھی بلکہ ہر اہلِ زبان کی طرح اپنی زبان پر فخر بھی کرتی تھی مگر اُس کی انگریزی حیرت انگیز حد تک کمزور تھی۔ نہ تو وہ جملوں کی ساخت ہی سمجھ سکتی تھی اور نہ اس کی اسپلنگ ہی اچھی تھی۔ پھر اُس کی افتادِ طبع بھی مختلف تھا۔ میں صرف لباس کی بات نہیں کروں گا کیونکہ لباس تو ہر شخص کا چاہے وہ مرد ہو کہ عورت ذاتی معاملہ ہے مگر وہ اکثر چپراسی اور فائلنگ کلرک سے ہنسی مذاق کرتی نظر آتی اور ٹیلی فون پر نہیں معلوم کس کس سے دیر تک ہنس ہنس کر باتیں کرتی رہتی اور اس سلسلے میں میری سنجیدگی کو کچھ عجیب نظروں سے دیکھتی۔ اس نے بھی مجھ سے جگہ کے دور ہونے کی شکایت کی تھی۔ میں نے اس سے بھی وہی کہا تھا جو آج میں نے مس ریحانہ سے کہا اور پھر میں اُس کی شکایت بھول بھی گیا تھا مگر جب وہ ملازمت چھوڑ کر چلی گئی تو مجھے فکر لاحق ہوا تھا اور ایک دفعہ پھر میرا وہی دیرینہ دوست کام آیا تھا۔ اس نے مس ریحانہ کو میرے آفس بھیجا تھا اور کہا تھا،

"لڑکی ایک بدقسمت خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ میری دور کی عزیزہ ہے۔ بڑے بھائی کی کفالت میں رہتی ہے لیکن تم تو جانتے ہو کہ ہر بڑے بھائی کے گھر میں ایک بھابھی نام کی چیز بھی تو ہوتی ہے۔ بے چاری اُسی کے ہاتھوں عاجز ہے۔ تھوڑی سی مختلف لڑکی ہے مگر میرا خیال ہے تم کو اس سے کوئی شکایت نہیں ہونی چاہیے۔"

اِس طرح قدرتی بات تھی کہ ریحانہ کے ساتھ میری ہمدردیاں بھی تھیں لیکن بات شاید صرف ہمدردی کی بھی نہیں تھی۔

ریحانہ ایک اچھی اسٹینوگرافر ہی نہ تھی۔ اس کی انگریزی بھی بہت اچھی تھی۔ ویسے بھی یہ دونوں باتیں لازم و ملزوم ہیں۔ مجھے لکھنے پڑھنے کا ہمیشہ سے شوق رہا تھا۔ میں نے مسلسل مطالعہ کیا تھا اور کوشش کرتا تھا کہ اپنے بزنس لیٹرز میں بھی بندھی ٹکی زبان اور گھسے پٹے جملوں کے استعمال سے پرہیز کروں۔ میرا تجربہ تھا کہ اس کا CLIENTS پر خوشگوار اثر پڑتا تھا ——— ریحانہ میری اس خواہش کا بخوبی ساتھ دے سکتی تھی۔ میرے لکھوائے ہوئے لیٹرز میں جملوں کی ساخت اور کاروباری زبان سے مختلف زبان کا استعمال اس کے لئے کسی خاص اُلجھن کا باعث نہ تھا۔ وہ جب لیٹرز ٹائپ کرکے لے آتی تو میں دل ہی دل میں حیران ہوتا کہ سفید براق لیٹر پیڈ پر اُبھرے ہوئے حروف کسی آسمانی صحیفے کی روشن عبارت کی طرح مقدس اور بے داغ لگتے۔ میرے لئے یہ بالکل ہی نیا تجربہ تھا ورنہ کاروباری زندگی میں مجھے شاید ہی ایسی اسٹینوگرافر ملی تھی جو میرے ذہن کا ساتھ دے سکے۔ یہ بظاہر معمولی مگر کتنی اہم بات تھی! ——— ورنہ ایک ایک لیٹر کو چار چار دفعہ ٹائپ کروانا پڑتا اور پھر بھی کوئی نہ کوئی غلطی ضرور رہ جاتی جس سے نہ صرف طبیعت بے مزہ ہو جاتی بلکہ وہ جذبہ بھی جس کے تحت لیٹر لکھوایا گیا تھا بُری طرح مجروح ہوتا تھا ——— ریحانہ ایک نازک اور خاموش طبع لڑکی تھی۔ عام لڑکیوں سے بالکل مختلف! میں نے کبھی اس کو چپراسی یا فائلنگ کلرک سے کوئی غیر ضروری بات کرتے نہیں دیکھا تھا اور نہ وہ بزنس کال کے سوا ٹیلیفون ہی کرتی تھی۔ وہ تو اپنے فالتو وقت میں کوئی کتاب پڑھتی نظر آتی۔ الغرض اس کی شخصیت اس کے بے آواز قدموں کی طرح بے آواز تھی ورنہ لڑکیاں تو سب ایک جیسی ہوتی ہیں۔ بہت پُرشور مگر سست رو! گویا کوئی وزنی ٹرک چڑھائی پر چڑھ رہا ہو۔ گُھوں، گُھوں کی کانوں میں چبھتی آواز اور رینگتا ہوا ٹرک کتنا ناقابل برداشت لگتا ہے! ——— البتہ میں ریحانہ کی ایک عادت میرے لئے کسی قدر اُلجھن کا باعث تھی۔ وہ خط لکھتے ہوئے اکثر کھو سی جاتی وہ کھڑکی کے اس پار سمندر کی سطح پر کہیں دُور دیکھ رہی ہوتی گویا کسی دُور افتادہ موہوم سی شے کو نام دینے کی کوشش کر رہی ہو۔ ایسے میں میرے ذہن میں جو ایک تسلسل سا ہوتا وہ ٹوٹ ٹوٹ جاتا اور کبھی ایسا بھی ہوتا کہ میں خود بھی اس کی سوچ میں شامل ہو جاتا۔ مجھے لگتا ہم دونوں گویا کسی دُور افتادہ موہوم سی شے کو نام دینے کی کوشش میں ہیں اور ہم اپنی اس کوشش میں تمام وقت گویا کھڑکی کے اُس پار سمندر کی سطح پر کہیں دُور دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ سمندر جو بہت بڑا نقاش ہے۔ کتنے بے شمار نقش ہر لمحہ اُس کی سطح پر بنتے اور اُبھرتے ہیں! لیکن اس سے پہلے کہ ہم اُن کو پہچانیں، کوئی نام دیں تمام وہ نقش، نقش برآب ثابت ہوتے ہیں اور پھر گہرائیاں ہی گہرائیاں! سمندر کی گہرائیاں جن کا کوئی نام نہیں! میں بے نام گہرائیوں سے گھبرا کر سنبھلنے کی کوشش کرنے لگتا مگر یہ کوشش کتنی کرب انگیز ہوتی میرے لئے! ——— مگر میں بہر حال ریحانہ کو کھو دینا نہیں چاہتا تھا چنانچہ میں نے گھنٹی بجائی اور چپراسی سے مس ریحانہ کو بھیجنے کے لئے کہا۔

وہ ہوا کے معطر جھونکے کی طرح اپنے بے آواز قدموں سے کیبن میں داخل ہو کر میرے سامنے بیٹھ گئی۔ میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور بولا۔

"ریحانہ تمہیں دفتر آنے میں جو تکلیف ہوتی ہے اُس پر میں نے غور کیا۔ میرا خیال ہے تمہاری شکایت درست ہے۔ تمہیں اب بس سے آنے کی ضرورت نہیں۔ رکشا سے آیا کرو۔ جو اضافی خرچ ہوگا وہ دفتر برداشت کرے گا۔"

میں نے یہ کہہ کر کسی قدر سکون سے ریحانہ کی طرف دیکھا۔ اب میری دانست میں اُس کی شکایت دُور ہو گئی تھی اور اس طرح میرا اُس کو EASE کر دینے کا اندیشہ ختم ہو گیا تھا۔

مگر ریحانہ نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ بس میرے سامنے بیٹھی رہی۔ مجھے اُس کی خاموشی تکلیف دہ لگ رہی تھی۔ پھر شاید میری مسلسل گھورتی ہوئی آنکھوں کے مسلسل اصرار پر اُس نے کہا،

"آپ کا بہت بہت شکریہ سر"۔

اُس کی آواز سپاٹ اور لہجہ کسی قسم کے جذبے سے عاری تھا۔ پھر وہ یہ کہتے ہوئے اُٹھ کھڑی ہوئی،

"آپ کے صبح لکھوائے ہوئے ضروری لیٹرز ٹائپ کر رہی تھی"۔

میں نے غیر ارادی طور پر کہا،

"ہاں ذرا جلدی کرنا۔ وہ آج ہی بھیجنے ہیں"۔

وہ اپنے بے آواز قدموں سے کیبن سے نکل گئی۔ لمحہ بھر کو اُس کے دُور ہوتے ہوئے قدم ہاف شٹرز کے نیچے سے نظر آئے اور نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

میں نے سوچا وہ یقیناً جلدی میں تھی مگر وہ اپنے دل میں یقیناً "مطمئن" تھی۔ اب بہر حال میرے ذہن سے ریحانہ کو کھو دینے کا اندیشہ ٹل گیا تھا۔

کچھ دن گزر گئے۔

ریحانہ میرے کیبن میں کچھ INDENTS ٹائپ کر کے لے آئی تھی۔ اُس نے حسبِ معمول بہت صفائی اور احتیاط سے ٹائپ کیا تھا۔ مجھے اُن پر دستخط کرنے تھے۔ میں بہت خوش تھا کہ میں کچھ قابلِ لحاظ آرڈرز حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ یہ میں نے اپنے آفس میں بیٹھے بیٹھے ہی کیا تھا جب کہ میں اپنے ہم پیشہ لوگوں کو دیکھتا کہ وہ آرڈر حاصل کرنے کے لئے INDENTS کے دفاتر کے نہ ختم ہونے والے چکر کاٹتے، خوشامد کرتے، رشوت تک دینے سے نہ چوکتے ——— میری اس کامیابی میں ریحانہ بھی برابر شریک تھی۔

میں نے خوش ہوتے ہوئے کہا،

"ریحانہ تمہاری ٹائپنگ بہت اعلیٰ درجے کی ہے"۔

"شکریہ سَر"۔

میں نے مزید خوش ہوتے ہوئے کہا،

"اگلے مہینے کی تنخواہ میں ایک اسپیشل اِنکریمنٹ بھی شامل کر لینا"۔

"شکریہ سَر"۔

پھر ریحانہ نے ایک بالکل ہی غیر متوقع بات کہی،

"آپ روزانہ چورنگی سے گزرتے ہیں۔ میں وہیں سے رکشا کرتی ہوں۔ میں نے آپ کو وہاں سے گزرتے دیکھا تھا"۔

میں خود کو مجتمع کرتے ہوئے صرف اس قدر کہہ پایا،

"اچھا تم نے مجھے گزرتے دیکھا تھا!"

مجھے نہیں معلوم کیوں ریحانہ کی وہ کوشش یاد آئی۔ کسی دُور افتادہ موہوم سی شے کو نام دینے کی کوشش!

میں نے INDENTS پر دستخط کر دیئے اور وہ ہمیشہ کی طرح اپنے بے آواز قدموں سے کیبن سے باہر نکل گئی۔ لمحہ بھر کو ہاف شٹرز کے نیچے سے اُس کے دور ہوتے قدم نظر آئے اور پھر نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

کچھ دن اور گزر گئے۔

گھڑی میں پانچ بجنے میں تین منٹ باقی تھے۔ میں نے اپنی چابیاں، پائپ، تمباکو کا ڈبہ اور کچھ ضروری کاغذات سمیٹ کر بریف کیس میں رکھے۔

میرا اصول تھا کہ میں دفتر کے وقت کے بعد ایک منٹ بھی دفتر میں نہ رکتا تھا۔ مگر آج موسم بھی دوپہر کے بعد اچانک ہی خوشگوار ہو گیا تھا۔ خوشگوار موسم میں دفتر کا ماحول کتنا غیر فطری اور بیزار کن لگتا ہے!

ٹھیک اُسی وقت ریحانہ اپنے بے آواز قدموں سے کیبن میں داخل ہوئی۔ میں نے چونک کر اُس کو دیکھا تھا۔ میں نے ہمیشہ ہی اس کے لباس کی سادگی اور دلکشی کو محسوس کیا تھا لیکن اس وقت وہ اپنے سادہ سے لباس میں کچھ زیادہ ہی ہلکی پھلکی اور دلکش لگ رہی تھی گویا وہ سمندر کی جانب سے آنے والی ہوا کا جھونکا تھی۔ ہوا کے جھونکے ہی کی طرح ہلکی پھلکی دلکش اور لطیف! وہ ایک لمحے کے لئے رُکی پھر اُس نے کہا،

"سر آپ مجھے چورنگی تک لفٹ ...."

لفٹ ——! اس کے آگے میں سُن نہیں سکا تھا —— وہ بہت دھیمے دھیمے انداز سے مسکرا رہی تھی۔ کتنی دلفریب تھی یہ مسکراہٹ! میں نے اس سے پہلے شاید ہی یہ مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں پر، اُس کے چہرے پر اور اُس کی آنکھوں میں دیکھی تھی۔ وہ گویا مجسم مسکراہٹ تھی۔ دھیمی دھیمی مسکراہٹ! —— گیس کے شعلے کی طرح دھیمی اور نرم مگر حدت میں بے پناہ تیز اور پگھلا دینے والی! میرا جی چاہا کہ اُس کو اپنی کار پر بٹھا کر سمندر پار لے جاؤں۔ سمندر یوں بھی پار کرنے کے لئے ہی بنے ہیں۔ اچھا ساتھی ہو تو ایک نہیں ساتوں سمندر پار کئے جا سکتے ہیں۔ —— یوں بھی ریحانہ میری سیکرٹری تھی۔ میرے کام میں میری معاون! میں اُس کو چورنگی تک کیا اُس کے گھر تک لفٹ دے سکتا تھا۔ آج ہی نہیں روز لفٹ دے سکتا تھا آخر وہ میرے راستے میں رہتی تھی۔ کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا؟ مگر لفٹ —— یہ سہ حرفی لفظ جیسے میرے ذہن میں گونجنے لگا۔ لفٹ کے میرے شہر کے فیشن ایبل لڑکوں پر کتنے مختلف معنی تھے! —— لفٹ —— مجھے وہ سڑک کے کنارے سواری کے انتظار میں کھڑی لڑکیاں یاد آئیں جو اپنی خاموش مگر چیختی ہوئی آواز سے کس حسرت سے لفٹ مانگتی تھیں! جس لڑکی کو چاہے اپنی کار پر لفٹ دے دیجیے اور شام کو کتنی بے شمار عذرائیں کس آسانی سے محض اُس آواز کی نذر ہو جاتی تھیں جو لیٹسٹ ماڈل چم چم کرتی کاروں کے کولتار کی سیاہ سڑک پر دوڑنے سے پیدا ہوتی تھی! —— کچھ کار والے میرے دوست ایسے بھی تھے جو بڑے فخر سے اپنی مہمات سُناتے تھے۔ جتنی بڑھیا کار اتنی بڑھیا لڑکی! —— لفٹ —— ! تو مس ریحانہ جیسی سنجیدہ اور مختلف لڑکی بھی ان لڑکیوں میں شامل ہو سکتی تھی! کیا سب لڑکیاں ایک جیسی ہوتی ہیں؟ —— کتنا روح فرسا تھا یہ خیال! —— کیا کار اتنی اہمیت رکھتی ہے؟ میرا جی چاہا کہ اپنی کار اور ایسی تمام کاروں کو سمندر میں غرق کر دوں —— کاش مس ریحانہ واقعی مختلف ہوتی! —— میں نے دیکھا اُس کے ہونٹوں پر اُس کے چہرے پر اور اُس کی آنکھوں میں وہی مسکراہٹ تھی۔ وہی دھیمی دھیمی مسکراہٹ! کتنی دلفریب تھی یہ مسکراہٹ! گیس کے شعلے کی طرح دھیمی اور نرم مگر حدت میں بے پناہ تیز پگھلا دینے والی —— میں نے گھبرا کر گھنٹی پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ پھر نہیں معلوم کب تک گھنٹی کی آواز میرے چھوٹے سے دفتر کی دیواروں سے ٹکراتی رہی تھی۔ جب چپراسی نے مجھے ایک سے زیادہ دفعہ اپنے حاضر ہونے کی اطلاع دی تو میں چونکا تھا۔ میں نے اُس کو حکم دیا۔

"مس ریحانہ کے لئے فوراً ٹیکسی لے آؤ!"

پھر جب بڑی دیر بعد دُھند چھٹی تو میں نہیں معلوم کب سے کھڑکی کے سامنے کھڑا تھا؟ کھڑکی کے اُس پار سورج اپنے دن بھر کے بے مقصد سفر سے تھکا ہارا سمندر کی اتھاہ مہربان گود میں پناہ لینے کے لئے جُھک رہا تھا۔ مجھے لگا میں خود بھی سورج ہی کی طرح تھکا ہارا تھا۔ دن بھر کے بے مقصد سفر سے تھکا ہارا! سمندر کی اتھاہ مہربان گود کتنی مہربان تھی! —— سمندر کی سطح پر کچھ کشتیاں آہستہ آہستہ حرکت

کر رہی تھیں۔ رنگ برنگی وزنی کشتیاں جو اپنے تمام رنگوں کے باوجود بے زار کُن حد تک ایک جیسی تھیں۔ مجھے بہت دنوں کے بعد آج ایک بار پھر اپنی وہ کاغذکی ناؤ یاد آئی جو میں بچپن میں بنایا کرتا تھا۔ میں نے سوچا کھلونا اصل کی نقل ہونے کے باوجود نہیں معلوم کیوں اصل سے مختلف اور خوبصورت ہوتا ہے؟ —— میں نے ایک بار پھر سمندر کی سطح پر آہستہ آہستہ حرکت کرتی رنگ برنگی مگر ایک جیسی وزنی کشتیوں کی طرف دیکھا اور شدید بیزاری سے اپنی نظریں سمیٹ لیں۔ مجھے اپنی کاغذکی ناؤ شدت سے یاد آ رہی تھی۔
ہلکی پھلکی کاغذکی ناؤ!

مرزا حامد بیگ | مُغل سرائے

شام کے سائے گہرے ہو گئے تھے اور وہ دونوں بھیگے اندھیرے میں دھندلائے ہوئے متحرک دھبوں کی طرح چُپ چاپ بڑھے چلے جاتے تھے۔ اُن کے ساتھ فٹ پاتھ پر سفیدے کی قطار میں بہتی ہوئی ہوا کی سرسراہٹ اب صاف سنائی دے رہی تھی، اور وہ دونوں ایک ساتھ قدم اٹھاتے۔ یہاں، اس جگہ پہلی بار ٹھٹک کر رُکے تھے۔

ابھی کچھ دیر پہلے پیچھے سے آتے ہوئے کھلنڈرے نوجوانوں کی ایک ٹولی بہت دیر تک انہیں اپنے گھیرے میں لئے چلتی رہی تھی اور وہ ان کے بیچ مجرموں کی طرح سر جھکائے بہت آہستہ قدم اٹھاتے یہاں تک پہنچے تھے۔ اب وہ ہنستی گاتی ٹولی بہت آگے نکل گئی تھی اور دُور تک کوئی نہ تھا البتہ اُن کے کندھے ابھی تک آپس میں رگڑ کھا رہے تھے۔ لڑکا قدرے جھک کر چل رہا تھا اور اس کا بل کھایا ہوا بایاں بازو لڑکی کو پوری طرح اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے تھا۔

وہ دونوں اس خطّے میں نووارد تھے اور محض سنی سنائی پر یہاں تک نکل آئے تھے۔ اب وہ سفیدے کی قطار کے اس سرے پر آخری درخت سے ٹیک لگائے کھڑے تھے اور دُور تک بھیگا اندھیرا ہر طرف لوٹیں لے رہا تھا۔

دونوں اپنے سفری تھیلوں کے بوجھ سے ذرا ذرا آگے کو جُھکے ہوئے، کسی حد تک ہراساں بھی تھے۔ لڑکے نے ٹارچ نکال کر لوٹیں لیتے بھیگے اندھیرے میں دودھیا روشنی کی کمندیں ہر طرف پھینکیں اور مایوس ہو کر سر جُھکا لیا۔ دونوں کو اپنی ٹانگیں زمین میں دھنستی ہوئی محسوس ہوئیں اور وہ دیر تک یہیں اسی جگہ بھاری سفری تھیلوں کے بوجھ تلے دبلے پتلے لمبی سے آگے پیچھے جُھولتے رہے۔

اُن کو ان حالوں کچھ زیادہ وقت نہیں گزرا ہو گا کہ ایک بڑے شور کے ساتھ دو سرپٹ آتے ہوئے گھوڑوں کے پیچھے دائیں بائیں جھولتی ہوئی بگھی ایک جھٹکے کے ساتھ ان سے چند قدم آگے نکل کر ساکت ہو گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے دونوں اطراف کے دروازے کھلے اور چمکتے ہوئے بھالوں کو سنبھالے، دو بجھے ہوئے چہروں والے افراد نے انہیں کمال تہذیب کے ساتھ بگھی میں نرم جھولا نما نشست پر لا بٹھایا اور چلے۔

لڑکی کو لپیٹ میں لئے ہوئے بازو کی گرفت اب ڈھیلی پڑ گئی تھی اور دونوں جس خوف کے ابھی کچھ دیر پہلے اسیر ہوئے تھے، وہ خواب و خیال ہوتا جا رہا تھا۔ وہ عجب خود سپردگی کے عالم میں ہوا کے دوش پر تھے اور تیز ہوا میں اُن کے اُوپر کو اُٹھے ہوئے نرم کالروں میں اور آدھے چھپے ہوئے نیم خوابیدہ آنکھوں والے مطمئن چہرے دائیں بائیں جھول رہے تھے۔

ایک جگہ بگھی دھیرے دھیرے رُکتی گئی اور انہوں نے جانا کہ جیسے ایک ٹھہرے ہوئے غضب ناک پانی کے دھارے کو راہ دی گئی ہو۔ وہ جب باادب خدام کا سہارا لئے بگھی سے باہر آئے ہیں تو سفری تھیلوں کے بوجھ سے اُن کے کندھے آزاد تھے اور ان کے سامنے آبنوس کا پیتل جڑا اور دیوہیکل دروازہ دھیرے دھیرے کھُلتا چلا جا رہا تھا اور اس کے اندر کی سمت کھنچتے اور قوسیں بناتے ہوئے زنجیر غضب ناک پانی کے دھارے کا شور باہر اُگل رہے تھے۔

دروازے کی دونوں چوکیوں پر ٹھہرے ہوئے لیمپ پوسٹ اپنی زرد لرزتی ہوئی روشنی اُگلتے، بہت نمایاں اور ایک حد تک افسردہ نظر آئے۔

وہ دونوں ایک بار پھر کندھے سے کندھا ملا کر چلنے لگے۔ لڑکے کے بل کھاتے ہوئے بازو نے لڑکی کو ایک بار پھر اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ سرخ بانات کی وردیوں میں کمر کے گرد دھاری دار پٹکے لپیٹے ہوئے پستہ قد خدام اُن کے سفری تھیلوں کو احتیاط سے سنبھالے "رَپ رَپ" کرتے ان کے پیچھے چلے آتے تھے۔

استقبالیہ، کی نیم روشن محراب تلے۔ لٹکی ہوئی مونچھوں اور کلّوں سے کانوں کی طرف مُڑی ہوئی نوکدار قلموں والے میزبان نے جھک کر انہیں خوش آمدید کہا اور ہمراہ ہو لیا۔ وہ راستے میں بچھتا چلا جا رہا تھا اور اس چرب زبان نے مجال ہے کہ انہیں بات کرنے کا موقع دیا ہو۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"حضور، یہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ آپ کی خدمت کا موقع ہاتھ آیا۔ پرتگالی، ولندیزی، فرانسیسی اور انگریز سبھی ہمارے سر آنکھوں پر، اور عرب ریاستوں کے شیخ تو ہمارے بھائی بند ہیں۔ حضور خاطر جمع رکھئے ۔"

اس وقت وہ ڈھلی ہوئی سرخ اینٹوں والی راہداریوں پہ چل رہے تھے اور اُن کے دونوں اطراف میں کھُلے تالابوں کے شفاف پانی میں درختوں کا گہرا عکس کانپ رہا تھا۔ وہ کندھے سے کندھا ملائے چلے جا رہے تھے اور سامنے بچھتا ہوا میزبان۔۔

"بندہ پرور، ہمیں یقین ہے کہ مغل سرائے کا شہرہ سُن کر ہی آپ چلے ہوں گے۔ یقیناً آپ نے جو کچھ سُنا وہ الف سے یے تک درست ہے۔ یہاں سرائے کے مہمانوں کو روایتی مغل رکھ رکھاؤ کے ساتھ ٹھہرایا جاتا ہے۔ اور اب کیا عرض کروں۔ عنقریب آپ خود کمال مہربان ہوں گے اور ہماری خدمات کے معترف بھی ۔"

گیندے کے پھولوں اور بنفشے کے دُور تک پھیلے تختوں کو عبور کرکے وہ چھوٹے چھوٹے دروازوں والی قطار کے ساتھ ہو لئے۔ پھر تنگ غلام گردشوں کا مرحلہ آیا۔ یہاں ہر دس قدم پر دروازوں کے ساتھ سیدھی اُوپر کو اُٹھتی ہوئی مشالوں کا دھواں نیچی چھت پر سیاہی کا لیپ کر رہا تھا وہ احتیاط سے جھکے جھکے میزبان کے پیچھے چلتے رہے۔ پھر وہ ایک جگہ رُکا اور ایک زنگ آلود تالے کو کھولتے ہوئے سامنے سے ہٹ کر ادب سے جھکا، تب ان کے سامنے ایک دروازہ مہیب چرچراہٹ کے ساتھ کھُلتا چلا گیا۔ پھر وہ لپک جھپک اندر گیا اور آتش دان کو روشن کر آیا وہ دونوں دروازے میں کھڑے تھے اور ملازمین ان کے سفری تھیلے کمرے میں ایک طرف رکھ کر کب کے جا چکے تھے۔ پھر میزبان نے جھک کر اجازت چاہی اور رفتہ رفتہ آتش دان میں چٹختی ہوئی لکڑیوں اور اُڑتے ہوئے شراروں کی مدھم روشنی میں اندر کا ماحول واضح ہوتا گیا۔

اُن کے سامنے نیچی چھت کے نیم روشن کمرے میں بھاری پلنگ کے سرہانے آتش دان کے عین اوپر دو ہلالی تلواریں مٹیالے رنگ کے ڈھال کے آرپار ٹھہری ہوئی تھیں۔ کمرے میں دیواروں سے سہمے ہوئے ہرن اور بارہ سنگھے بس کمرے میں نکلا ہی چاہتے تھے۔ پھر جانے کہاں

سے جُھک کر آداب بجالاتی اٹھکتی ہوئی دو کنیزیں برآمد ہوئیں۔ دروازے میں سہما ہوا جڑا جڑا کر کھڑا تھا۔ وہ آئیں اور لڑکی کو سہارا دیتی ہوئی بغلی دروازے میں غائب ہو گئیں۔ لڑکا ہمت کر کے ان کے پیچھے چلا لیکن اس کے پاؤں نیچے بچھے ہوئے قالین میں دھنستے چلے جا رہے تھے اور بڑی مشکل میں تھا۔ جانے کیوں اس پر غنودگی غلبہ پانے لگی اور وہ لڑکھڑا سا گیا۔ جب اُسے ہوش آیا ہے تو اس نے دیکھا کہ اس کی ساتھی لڑکی، کوئی مغل شہزادی ہے جو بڑے پلنگ پر اطلس و کمخواب میں ماہتاب کی طرح کُھلی ہوئی ہے۔ اس لمحے وہ نیم غنودگی میں بغلی کمرے سے ہوتا ہوا دو نازک اندام کنیزوں کے بازوؤں میں لپٹا لپٹایا آگے بڑھ رہا تھا۔

اور وہ خود جیسے کوئی مغل شہزادہ۔ ڈھاکے کی ململ پر سنہری صدری اور کمر کے گرد پٹکے میں اڑسا ہوا جڑاؤ عقیق کا مڑا ہوا خنجر سنبھالے ہوئے تھا جس کے دستے پر ریشمی پھندنا اس کے لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ جھول رہا تھا۔

وہ نیم غنودگی میں لڑکھڑاتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا اور اس نے تکیہ چاہا تھا۔ کمرے میں اب صرف مورچھل ہلاتی ہوئی دو کنیزیں رہ گئیں تھیں اور شاید پلنگ پر نیم دراز مغل شہزادی نے کوئی فرمائش کر دی تھی۔ ایسے میں بغلی کمرے سے کوئی ایک وجود بہت گہرا گھونگھٹ نکالے ہوئے ظاہر ہوا تھا اور جھکی جھکی نظروں کے ساتھ چاندی کی اونچی سماوار، جس کے نیچے آگ دہک رہی تھی اور بڑے تھال میں خشک میوے اور منقش صراحیاں اور بھاری پیالے قرینے سے سجا کر پلٹ گیا تھا۔

وہ لڑکا جیسے کوئی مغل شہزادہ۔ بغیر کچھ کھائے پیئے پلنگ پر چت لیٹ گیا اور اس کی آنکھیں مندھتی چلی گئیں۔ شاید کچھ دیر وہ سویا بھی ہوگا۔ اس اثناء میں برابر سے اُٹھ کر اس کی ساتھی لڑکی، جیسے مغل شہزادی — نے کمرے کا ایک چکر لیا اور پائیں باغ کی سمت کھلنے والی کھڑکی میں ٹھہری رہی۔

پھر جیسے جیسے رات بیت رہی تھی، نیچے دُور تک نکل گئے گھنے درختوں میں عجب طرح کی غراہٹوں کا شور اُبھرتا چلا گیا۔ درختوں سے پھڑا مار کر چڑیاں اور کوّے شور کرتے ہوئے آسمان کی طرف اُٹھنے لگے۔

شور بڑھ رہا تھا۔ باہر چاندنی میں راہداریوں کے ساتھ ساتھ پتھر کی اونچی نیچی دیواریں، گھاس کے تختوں پر ٹھہری ہوئی سنگِ مرمر کی کرسیاں اور لاسنی پھولوں سے گندھی بنفشے کی موٹی تہیں سب رفتہ رفتہ ماند پڑ گئیں اور ہر سمت سے بڑھتا، کروٹیں لیتا ہوا، پاگل کر دینے والا شور ہر طرف بڑھ گیا۔

لڑکی گھبراہٹ میں دھیرے دھیرے پیچھے ہٹتی گئی تھی، یہاں تک کہ کمرے میں میزبان کی آواز گونجی:

”حضور بے فکر رہیے۔ یہ شور خود ساختہ ہے اور محض آپ کی تفننِ طبع کی خاطر۔ اس وقت ہمارے تنخواہ دار ملازمین کی ٹولیاں پائیں باغ کے کونے کھدروں میں حرکت کر رہی ہیں۔ یہ بھیڑیوں اور گیدڑوں کی ملی جُلی آوازیں باہر کے مناظر میں قدرتی رنگ بھرنے کی خاطر ہیں حضور — نچنت رہیئے۔“

میزبان نے لپک کر باہر کی سمت کھُلنے والی کھڑکی کے سامنے ریشمی پردوں کو برابر کر دیا۔

آوازیں مسلسل آ رہی تھیں، جیسے بھیڑیوں کے غول نکل آئے ہوں اور انہوں نے سرائے کو اپنے گھیرے میں لے رکھا ہو۔ البتہ میزبان کی وضاحت سن کر لڑکی نے اطمینان کا سانس لیا تھا۔ پھر وہ پائیں باغ! چلنے کے لیے ضد کرنے لگی۔ لیکن لڑکا تھکا ہوا تھا اور اسے نیند بھی آ رہی تھی۔ یکایک لڑکی اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور متجسس نگاہوں کے ساتھ قلانچیں بھرتی ہوئی کھڑکی سے دوسری طرف کُود گئی۔ ایسے میں میزبان

اسے پکارتا رہ گیا، اور وہ گھاس کے نرم تختوں اور کاسنی پھولوں پر بلا خوف و خطر چلتی آگے ہی آگے بڑھتی چلی گئی۔ وہ درختوں اور جھاڑیوں کے پیچھے چھپے ہوئے تنخواہ دار ملازمین کو درندوں کی مصنوعی آوازیں پیدا کرتے ہوئے ڈھونڈ نکالنا چاہتی تھی۔ اُوپر سے درختوں کی شاخوں سے اُلجھتے ہوئے پرندے اس کے سر پر چکر کھاتے اس کے ساتھ ساتھ اندھیرے میں آگے بڑھتے رہے اور وہ اپنے آپ میں مگن مغل سرائے کے بائیں باغ سے ملحقہ گھنے جنگل میں اترتی چلی گئی۔

اندر سرائے کے اس نیم تاریک گوشے میں لڑکا ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا تھا، اور اسے کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ نیند میں اسے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی اس کا نام لے کر پکار رہا ہو۔ وہ کچھ دیر یوں ہی گم سم بیٹھا رہا پھر اس نے لڑکی کی بابت دریافت کیا۔ اس موقع پر میزبان کو اس نے پہلی بار پریشان دیکھا۔ وہ اپنے کمال تجربے کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنی چرب زبانی کا بے مثال مظاہرہ کر رہا تھا لیکن اس کی کانپتی ٹانگیں اور اس کے چہرے پر کورے لٹھے کے کھلتے ہوئے تھان اور اس کی نمناک آنکھیں اور زبان کی لکنت، سب اس کا ساتھ نہیں دے پا رہے تھے۔

لڑکا اپنی سنہری مسہری پر لپٹے ہوئے پٹکے میں اڑسا ہوا جڑاؤ ٹھیک کا مڑا ہوا خنجر سنبھالتا اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے کانوں میں پہنے ہوئے سفید مُندرے، گلے کی مالائیں اور جڑاؤ بازو بند وہیں نوچ کر پھینک دیئے، پھر وہ کونے میں رکھی ماند پڑتی ہوئی مشال کو ایک ہاتھ میں تھامے بائیں باغ میں اُتر گیا، سرائے کا میزبان اس کے پیچھے گرتا پڑتا چلا آتا تھا۔ نیچے شور میں کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی اور لڑکا سب سے بے نیاز اس کا نام پکارتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ بالآخر صبح کی دھندلاہٹ میں وہ وہاں تک پہنچ ہی گیا جہاں چکر کھاتے اور اُوپر سے جھکی ہوئی شاخوں میں الجھتے ہوئے پرندے واویلا کر رہے تھے۔ دفعتاً قریب کی جھاڑیوں سے تیر کی طرح دو سائے نکلے اور جنگل کی ترائی میں گم ہو گئے۔

لڑکا اس کا نام لے کر وہیں جھک گیا تھا، بجھی ہوئی مشال وہیں رہ گئی تھی اور اس کے دوسرے ہاتھ کی گرفت کمربند میں مڑے ہوئے خنجر پر ڈھیلی پڑ رہی تھی۔

سورج اب دھیرے دھیرے خاصا اوپر اُمڈ آیا تھا اور میزبان کہہ رہا تھا:

حضور، مغل سرائے کی انتظامیہ اس سانحے کے وقوع پذیر ہونے پر سخت نادم ہے۔ ہم خود حیران ہیں کہ بائیں باغ اور اس سے ملحقہ علاقے میں جانے کیسے سچ مچ کے بھیڑیئے اور گیدڑوں کی ٹولیاں در آئی ہیں۔ حضور آپ کبیدہ خاطر نہ ہوں، مرحومہ کی مٹی عزیز کرنے کے لئے ہمارے عملے کو آپ بہت جلد سرگرم عمل دیکھیں گے۔ ہماری ہر ممکن کوشش ہوگی کہ آپ کے نقصان کی تلافی ہو۔

اُدھر سرائے کے اس نیم تاریک گوشے میں دبیز سرخ قالین پر دو سنہری پتیلے رہ گئے تھے اور ان کے قریب ہی چاندی کی اُونچی سماوار جس کے نیچے راکھ اڑ رہی تھی اور بڑے تھال میں خشک میوے اور منقش صراحیاں اور بھاری پیالے جوں کے توں قرینے سے سجے رکھے تھے۔

شمس نغمان

شناخت کا سفر

یہ رات کا وہ پہر ہے جب زمین پر اُترنے والے فرشتے اپنے اپنے آسمانوں کی جانب لوٹتے ہیں اور اُن کے پَروں کی پھڑپھڑاہٹ کی آواز صرف وہی سُن سکتا ہے جس کے پاس سننے والے کان ہوں۔

یہی وہ پہر ہے کہ جب اپنے سُموں سے دھول اڑانے والے جانور کی قسم کھائی جاتی ہے۔ بس اسی منجمد لمحے میں ایک پرانے وہم کا شکار ہوں۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے کہ یونہی یہ لمحہ گذر جائے گا۔ میں زندگی کا آخری سانس لوں گا اور میرا وہم ازلی یقین میں بدل جائے گا۔

ابھی چند دن گذرے کہ اچانک مجھے اپنا نام بھول گیا۔ یا پھر جیسے مجھے وہم ہو گیا کہ میں اپنا نام بھول چکا ہوں۔

تب ایک بڑے چوک میں جہاں چاروں سمتوں سے لوگ گزرتے ہیں اور جلوس کی صورت میں آتے ہیں اور دوسری سمتوں کو جاتے رہتے ہیں۔ میں پہروں کھڑا ہر آنے جانے والے سے اپنا نام پوچھتا رہتا۔ مگر کسی کو بھی میرا نام یاد نہ رہا تھا اور میں خود کو بے نام پاکر میں بے حد شرمندہ ہوا تھا۔ شرمندگی کے احساس نے مجھے سر نیچا کرکے چلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ جب میرے پاؤں رُکے تو میں ریس کورس گراؤنڈ کے پاس کھڑا تھا جہاں پولو کا میچ ہو رہا تھا۔ ایک گھمسان کا رن تھا۔ جو گرم تھا۔ مقابلہ دیکھنے والوں میں زیادہ تر غیر ملکی تھے جو اگلی نشستوں پر بیٹھے تھے۔ ان کے پیچھے جو لوگ تھے وہ سب کے سب کھڑے تھے۔ کچھ لوگ اپنی اپنی کاروں کی چھت پر چڑھے بیٹھے تھے اور چیونگم کھا رہے تھے یا پھر کون آئس کریم چوس رہے تھے۔ ایسے لوگوں میں عورتیں اور بچے زیادہ تھے۔

میں شاید چلتے چلتے تھک چکا تھا یا پھر اور زیادہ چلنا نہیں چاہتا تھا جو اگلی نشست میں خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔

گھوڑ سوار اور گھوڑے دونوں آنکھ جھپکنے سے بھی زیادہ تیزی سے دوڑ رہے تھے، گھوم رہے تھے اور آپس میں ٹکرا رہے تھے۔

"بیک اپ نمبر ۲"

"بیک اپ۔ ویل ڈن نمبر ۴" آوازیں اس قدر آپس میں رَل مل گئیں کہ کسی آواز کی پہچان مشکل ہوتی جا رہی تھی۔

میرے قریب بیٹھے ہوئے ایک بوڑھے غیر ملکی نے میری جانب دیکھا اور پھر پائپ والا پوپلا سا منہ گھما کر کہنے لگا۔

"اگر بلیو نمبر ۲، ۹۰ ڈگری کے زاویہ پر دوڑ کر ۷۰ ڈگری کے زاویے سے یہ لانگ شارٹ مارنے میں کامیاب ہو جائے تو یہ گول ریڈز نہیں بچا سکتے۔"

تب نمبر ۲ سفید گیند سے قریباً ۱۰ گز کے فاصلے پر عین ناک کی سیدھ میں پیچھے ہٹا اور تیز دوڑتے ہوئے گھوڑے کی گردن کے ساتھ جھکتے ہوئے اس نے ہوا میں چکر کھاتی ہوئی سٹک گیند کو اتنی زور سے ماری کہ گیند ہوا میں اڑتی ہوئی ریڈز کے سروں پر سے گذر گئی۔

"اوہ نو — نمبر سیون ناٹ لائنگ ون۔" بڑھا غیر ملکی قریباً قریباً سیٹ سے اُچھل پڑا اور غصہ میں اس کا پائپ اس کے منہ سے چھوٹ کر زمین پر آرہا۔

"ایک اپ نمبر ٹین!"

"ون ڈاؤن نمبر سکس۔"

اک شور تھا۔ کیا یہاں بھی لوگوں کو کھلاڑیوں کے نام یاد نہیں — اور یہاں سبھی لوگ اپنی پشتوں پر چسپاں نمبر پلیٹوں سے پہچانے جاتے ہیں۔

کاش میرے پاس بھی کوئی نمبر پلیٹ ہوتی۔ میں یہ سوچتا ہوا یہاں سے بھاگ آیا تھا، لیکن اس لمحے جب کہ رات کا پہر منجمد سا ہو کر رہ گیا ہے میں کہیں بھاگ جانا چاہتا ہوں۔

لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ میری بہن جو تیزی سے بوڑھی ہو رہی ہے اور اس وقت ماں کے ساتھ سوئی ہوئی ہے اور جس کے چہرے اور گردن کا رنگ زرد ہو چکا ہے اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ چکے ہیں۔

اور اب جس کے چہرے پر بے کراں کرب کی لہروں کا اتار چڑھاؤ باقاعدگی سے جاری ہے۔

اچانک سوتے میں مسکرا رہی ہے۔

شاید اس کے خوابوں میں آنے والا آچکا ہے کہ رات کے اسی پہر خوابوں میں ملنے والے اپنے اپنے سفر کو نکلتے ہیں۔

تب وہ کروٹ بدل کر باہنیں ماں کے گلے میں ڈال دیتی ہے اور ماں کا ہاتھ سوتے میں خود بخود اس کے سر پر آن ٹکتا ہے۔

"ماں" میں آواز دیتا ہوں اور ماں اپنی سوئی ہوئی آنکھیں بڑی بیزاری سے میری جانب اٹھاتی ہے۔

"ماں تو اس کی شادی کیوں نہیں کر دیتی — اگر مجھے یا تجھے کچھ ہو گیا تو پھر —" ماں میرے اس سوال کا جواب میں بالکل چپ رہنے کو ترجیح دیتی ہے۔

اس سے پہلے کہ ماں کی چپ مجھے کھا جائے، میں فضل داد کے ایک کمرہ والے گھر میں داخل ہوتا ہوں۔ ایک بیمار سے بلب کی روشنی میں وہ فائلوں کی تہوں میں دبا ہوا ہے۔ میں ایک ایک کر کے فائلوں کو علیحدہ کرتا ہوا ہانپ جاتا ہوں کہ تب جا کر فضل داد کے سانسوں کی آواز محسوس ہوتی ہے وہ اپنی آنکھوں کے موٹے موٹے شیشوں والی عینک اتار کر کُرتے کے ساتھ صاف کرتا ہے۔ آنکھیں کئی بار جھپکتا ہے۔

"فضل داد تم ہمارے گھر کیوں نہیں آتے ہو، ماں تمہیں بہت یاد کرتی ہے۔"

فضل داد گویا جیسے کسی نے سوتے میں کرنٹ لگا دیا ہو۔ وہ فائلوں کے ڈھیر سے اچھل کر باہر آجاتا ہے اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بڑے طنزیہ لہجے میں کہتا ہے۔

"تمہارے چاچا نے منع کر رکھا ہے۔" تب مجھے یاد آتا ہے کہ پوری برادری میں صرف ایک یہ چاچا تو ہے جس سے مجھے بے انتہا نفرت ہے۔

"کیوں" میں حیرت سے پوچھتا ہوں

"نہ جانے کیوں — پر وہ کہتا ہے کہ اُسے قطعی پسند نہیں کہ اس کے مرحوم بھائی کے گھر کوئی غیر مرد اس کی چار دیواری میں داخل ہو۔"

اور اس کے ساتھ ہی فضل داد فائلوں کی تہوں میں گم ہو جاتا ہے کہ میرے کانوں میں ہر جانب اور ہر راستے سے اب چیختے ہوئے جھینگروں کی آوازیں شور کرتی رہ جاتی ہیں۔

"تم سکول نہیں جاتے میرے لعل؟" میری ماں ادھ کھلی آنکھوں سے مجھے گھورتی ہوئی کہتی ہے۔

میں اپنی بہن کی جانب دیکھتا ہوں اور پھر اپنی بات دہراتا ہوں۔

"تو اس کی شادی کیوں نہیں کر دیتی؟"

"اس بانجھ عورت سے کون شادی کرے گا۔ تجھے تو سب باتوں کا علم ہے۔ میرے لعل"

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے ماں — کہ کرم خان خود بنجر ہو۔ اور اس نے سارا الزام میری بہن کے سر تھوپ کر اپنی جان چھڑا لی ہو۔ اب اس کی دوسری بیوی بھی کیا بانجھ ہے؟ — چوتھا سال ہے شادی کو۔"

"ہمیں اس سے کیا غرض۔ برادری میں تو یہی بات سچی جانی جاتی ہے نا" میری ماں کا دُکھ اس کے چہرے پر گہرا ہوتا چلا جاتا ہے۔

"برادری بھی تو بھرے ہاتھوں والوں کو کندھوں پر بٹھلاتی ہے۔

تو بھی ٹھیک ہی کہتی ہے ماں — تیرے اور میرے خالی ہاتھ بھلا برادری کے کس کام آئیں گے — لیکن سن ماں۔ کل حکیم جی نے مجھے سختی سے کہا ہے کہ اس کی شادی کر دو ورنہ —"

"ورنہ کیا؟" ماں چارپائی سے اٹھ کر بیٹھ جاتی ہے اور گہری کھلی آنکھوں سے مجھے گھورتی ہے۔

"ورنہ وہ کہتے تھے یہ پاگل ہو جائے گی"

"تو اس کی شادی کرنا بہت ضروری ہے۔" ماں یہ کہتے ہوئے میرے چارپائی کے سرہانے آن بیٹھی ہے۔

میں ایک بار پھر اپنی بہن کی جانب نگاہ اٹھا کر دیکھتا ہوں۔ اس کے دونوں ہاتھ اب اس کے سینہ پر ٹکے ہیں۔ ہونٹ آہستہ آہستہ ہل رہے ہیں جیسے مناجات پڑھنے والے معصوم لوگ کسی الہامی کتاب کا ورد کرتے ہیں۔

"تو اس طرح راتوں کو مت جاگا کر اور یوں ہمارے دُکھوں کی بھاری پوٹلیاں اپنے سرہانے نہ رکھا کر۔"

میری ماں میرے سر کو شفقت سے اٹھا کر اپنی گود میں رکھ لیتی ہے۔ اور کمرہ کا انتہائی سنجیدہ ماحول بڑا ڈراؤنا سا ہو جاتا ہے۔ میں ماں کی گود میں لیٹا لیٹا آنکھیں بند کر لیتا ہوں۔ اور کہتا ہوں۔

"ماں مجھے کوئی کہانی سناؤ۔"

میری ماں کے دونوں ہاتھ میری آنکھوں پر آن ٹکتے ہیں جیسے گرم گرم پھاہے کسی نے رِستے ہوئے زخموں پر رکھ دیئے ہوں۔

"میں آج تمہیں ایک قصہ سنانے کی خواہش لئے بیٹھی ہوں لیکن تو بیچ میں نہ بولے گا۔ پہلے قول دے؟"

"میں قول دیتا ہوں ماں۔" میں اپنی آنکھوں پر ٹکے ماں کے ہاتھوں پر اپنے ہاتھ رکھ کر کہتا ہوں اور ایک بار پھر بولتا ہوں۔

"میں قول دیتا ہوں ماں"

"تو سُن — یہ جو لڑکی سامنے والی چارپائی پر لیٹی ہے نا۔ تم نے کبھی ندی کے کنارے اگی ہوئی کائی دیکھی ہے۔ اس کائی کے نیچے ٹھہرا ہوا پانی بڑا شفاف ہوتا ہے۔ بس یہ لڑکی بھی اس پانی کی مانند اندر سے بڑی شفاف ہے اور میں چاہتی ہوں کہ تو اس سے شادی کر لے"

ماں کی گود میں جیسے کوئی بچھو مجھے ڈنگ جاتا ہے۔

"ماں —" وہ مجھے کچھ کہنے نہیں دیتی اور میرے منہ پہ ہاتھ رکھ کر کہتی ہے۔

"تو نے بیچ میں نہ ٹوکنے کا قول دیا ہے ۔" میں تلملا کر رہ جاتا ہوں اور وہ بولتی جاتی ہے۔

"اس لئے کہ یہ لڑکی تیری بہن نہیں — اور تو میرا بیٹا نہیں۔"

"تیری ماں نے تجھے تیرے باپ سے تیری پیدائش کے چند ماہ بعد اپنے حق مہر کے عوض خرید لیا تھا ۔ تیری ماں کی ساری زمین کے کاغذوں پر تیرے باپ کا نام جب پکا ہو گیا تو تب تیری ماں تیرے باپ کے لئے ایک فالتو کاغذ بن کر رہ گئی ۔ اس سے پہلے کہ تیرا باپ اس فالتو کاغذ کی کترن کر کے زمین کی تہوں میں دبا دیتا — وہ تجھے اپنی باہنوں میں چھپائے میرے پاس چلی آئی تھی۔

"لیکن ماں —" میں نے پھر بولنا چاہا — کہ اب میرا سارا جسم اندھے کنوئیں کے دائرے میں چکر لگانے لگا تھا کہ جس کی گھٹی گھٹی اور دھندلی فضا میں سانس لینے کی خواہش ہی باقی نہیں رہتی۔"

"وہ جو تیری ماں تھی ۔ غم کا پہاڑ سینہ پر اتار چکی تھی اور ایک لئے رات کے اسی پُر آشوب اور آسیب زدہ پہر میں چپ چاپ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئی۔"

آنسوؤں کی بے شمار بوندیں میری گردن پر گرنے لگیں اور میں جو کہ اندھے کنوئیں کی آسیب زدہ گہرائی میں اترا ہوا تھا۔ اپنے ہاتھ پھیلا کر چلا اٹھتا ہوں۔

"میرا باپ کون ہے؟"

"وہی — جس نے فضل داد کو ہمارے گھر آنے سے منع کر دیا ہے ۔ لیکن میرے لعل یہ راز تجھے بھی اپنے سینہ میں جذب کرنا ہوگا کہ تیری ماں کی یہ آخری خواہش تھی — ہم سب عورتیں اصل میں فالتو کاغذ ہی تو ہوتی ہیں جنہیں جب کوئی چاہے کترن میں بدل دے۔"

ماں کی سسکیوں کا سلسلہ نہ جانے کب تک جاری رہا ہوگا کہ میں چیخ مار کر اسی کی گود کے حصار سے نکل بھاگتا ہوں۔

اور تب مجھے ایسے لگتا ہے کہ جیسے میں اپنے گھر کے پچھواڑے سوئی ہوئی ریس کورس گراؤنڈ کے عین درمیان کھڑا ہوں اور بلیوز اور ریڈز کے سبھی کھلاڑی جن کی پہچان ان کی لیٹتوں پر چھپاں نمبروں سے ہوتی ہے سرپٹ گھوڑے دوڑاتے اور اپنی سٹکس ہوا میں لہراتے میری جانب بڑھے آ رہے ہوں۔

کہ جیسے میں نے ان کی سفید گیند نگل لی ہو۔

کتاب کویئل

نجم الحسن رضوی

انتساب

آدمی کو اپنی زندگی میں تین کام ضرور کرنے چاہئیں،
ایک کتاب لکھنی چاہیئے۔
ایک پودا لگانا چاہیئے۔
ایک بیٹے کا باپ بننا چاہیئے۔
میں اپنی اس کتاب کو اس کے نام معنون کرتا ہوں جس کی مدد سے یہ تینوں کام تکمیل کو پہنچے اور جو میری رفیقۂ حیات ہے!
اس نے کتاب کے پھٹے ہوئے ورق کو اٹھا کے بغور دیکھا اور پھر صبا کی آواز اس کے کان میں آئی۔ کتاب کا انتساب تو اس خوشگوار صبح کی مانند ہوتا ہے جس سے کسی گرم اور روشن دن کی ابتدا ہوتی ہے، سنو میں اپنی زندگی کی کتاب تمہارے نام منسوب کرتا ہوں۔

باب اوّل

اسے معلوم تھا کہ وہ ان لوگوں میں سے نہیں تھا جو ذات کے کھلے شہر میں بستے ہیں اور اجنبیوں کا خوش دلی سے استقبال کرتے ہیں۔ اس نے اپنے چاروں طرف تنہائی کی اونچی فصیلیں کھڑی کر رکھی تھیں اس کا خیال تھا کہ کتابوں کی صحبت میں آدمی خاموشی کا سفیر ہوتا ہے اور خاموشی روح کی زبان ہے۔ مگر صبا کی روح اس کے منہ میں رہتی تھی، وہ کہتی: مجھے معلوم ہے تم قلعہ بند آدمی ہو تم مجھے اپنی دیواروں میں نقب لگانے کی اجازت نہ دوگے لیکن پھر بھی ــــ!

'پھر بھی کیا ــــ؟' وہ سوال کرتا۔

'پھر بھی میں تمہیں پسند کرتی ہوں' صبا اس کے ہاتھ سے کتابیں لے لیتی۔

اس نے کتاب کا پھٹا ہوا صفحہ ایک طرف ہٹا کے، سامنے دیکھا، کتابوں کی الماریوں سے آباد ہال کے ایک حصے میں مطالعے کی لمبی میز تھی اور دوسرے حصے میں چھوٹی چھوٹی ــــ میزوں کی بہت سی قطاریں۔ اس کی نشست کے دائیں جانب ایک نیم تاریک گیلری تھی جس میں بھی کتابوں سے بھری ہوئی الماریاں لگی ہوئی تھیں۔ کتابیں، کتابیں اور کتابیں۔ دیوار کی اینٹیں بھی اسے کتابوں کی طرح لگتیں۔ کبھی کبھی جب وہ کسی کتاب کو الٹ پلٹ کے دیکھ رہا ہوتا ــــ تو بے اختیار اس کا جی چاہتا کہ وہ اس سے باتیں کرے شاید اس لئے کہ وہ اپنے بدن میں تنہائی

مارتے خاموشی کے سمندر میں سفر کرتے کرتے اکتا سا گیا تھا۔ کبھی تو خاموشی کی پھولی ہوئی خشک سی آواز کا کوئی قطرہ ٹپکتا۔ وہ اپنی اس خواہش پر خود بھی حیران ہوتا۔ بھلا کہیں کتاب کی بھی آواز ہوتی ہے؟ جب بھی وہ کوئی کتاب کھولتا اس کے گرد آلود صفحات سے پتلی پتلی ٹانگوں والے کالے حروف شہد کی مکھیوں کی طرح اس پر ٹوٹ پڑتے۔ کبھی کبھی اسے یوں لگتا کہ جیسے کتاب کے اندر کوئی شے قید ہے جو آزاد ہونے کی کوشش کر رہا ہے لیکن وہ لفظوں کے خول سے نکل نہیں پاتا۔

کیا ہر چیز کا ایک خول ہوتا ہے؟ اس نے سوچا۔

اس لمحے صبا کی آواز اس کے کان میں آئی۔ 'خدا کے لئے تم اپنا خول اتار دو، خول کسی قسم کا بھی ہو بہت ظالم ہوتا ہے۔ اصل کو کبھی سامنے نہیں آنے دیتا!'

صبا کو کتابوں کا بہت شوق تھا، اسے گلابی جلد والی کتابیں بہت پسند تھیں لیکن جب وہ کتابیں واپس کرتی تو انہیں پہچاننا مشکل ہو جاتا، ٹوٹی ہوئی جلد اور پھولے ہوئے اوراق! وہ انہیں دیکھ کر خفگی سے ناک بھُلاتا تو صبا مسکرا کے کہتی۔

'مجھے پتہ ہے تم ظاہری حسن کے پرستار ہو، کتابوں کی بدنمائی تمہیں گوارا نہیں لیکن میری رائے میں ہر کتاب کا ایک رس ہوتا ہے اہم بات یہ ہے کہ رس لوگوں تک پہنچا کہ نہیں، جو کتاب پڑھ لی جائے اس کی حالت میرے نزدیک ایسی ہے جیسے کہ گنے کا پھوک! تمہیں تو خوش ہونا چاہیئے کہ میں تم سے کتاب لیتی ہوں اور پھوک واپس کرتی ہوں' پھر وہ طنز سے کہتی۔ 'بندۂ خدا تم تو کتابوں کے گورکن بننے کی کوشش کر رہے ہو۔ مگر کبھی یہ بھی غور کیا ہے کہ آخر تمہیں کون سی کتابیں پسند ہیں، کس رنگ اور کس نسل کی!'

وہ کہتا۔ 'کتاب تو کتاب ہوتی ہے، میرے لئے یہ سب کتابیں ایک جیسی ہیں لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم کس قسم کی کتابیں پڑھتی ہو کبھی تمہاری نظر انتخاب ریاضی کی کتابوں پر پڑتی ہیں اور کبھی تم باغبانی کے نسخے جاننے کو بیتاب رہتی ہو۔ تعجب ہے بھلا باغبانی بھی کوئی موضوع ہے۔ لڑکیاں تو عام طور پر کچھ اور —!

صبا ہنستی — 'بابا میں سچائیوں کی پرستار ہوں اگر ریاضی کی کتاب میں سچائیاں مہکتی ہیں تو باغبانی کی کتابوں میں ان کے حسن و رعنائی کو دیکھا جا سکتا ہے۔ ویسے بھی یہ میرا پسندیدہ موضوع ہے۔ اس لئے کہ ہر کتاب کا بنیادی مقصد دل و نظر میں پھول کھلانا ہے، میرے نزدیک اگر کسی کتاب کو پڑھ کے ذہن و دل کے دریچوں میں تازہ خیال کے سرخ پھول نہ مہکیں تو پھر اسے پھینک دینا چاہیئے!'

ایک بار پھولوں کے موضوع پر ایک کتاب اس کے ہاتھ آ گئی، ایک خوبصورت کتاب جس کے ہر صفحے پر ہر پھول کے نیچے خاصی بد خطی کا مظاہرہ کیا گیا تھا۔

'یہ جان بدذوق ہے۔'، وہ بڑبڑایا۔

نرگس کے ایک پھول کے نیچے لکھا تھا، اور یہ رہا انتظار کا پھول! دیکھو تم جب بھی اس پھول کو دیکھنا مجھے یاد کرنا۔

'لو بھئی'، وہ طنز سے بولا، 'ذرا دیکھنا یہ کس کی کھلی ہوئی آنکھ ہے اور تم، کون ہے؟'

صبا نے کہا۔ 'تعجب ہے تم پھولوں کی پکار نہیں سنتے۔ وہ تو راہ تکتے ہیں!'

اس نے دیکھا، صبا کی آنکھ مہک رہی تھی۔

صبا کی آنکھ جب بھی مہکتی اس کی خوشبو اس کے چاروں طرف پھیل جاتی لیکن مجبوری یہ تھی کہ اسے بوسیدہ کتابیں پسند نہ تھیں اور صبا بیچاری کو اس کا احساس ہی نہ تھا کہ کتابوں کے شوق نے اس کے چہرے کے سرورق کو کتنا دھندلا دیا ہے۔

کبھی کبھی وہ پوچھتا۔ 'یہ بتاؤ کہ یہ جو تم علم کے دریا میں گلے گلے ڈوبی ہوئی ہو اور کسی صورت کتابوں سے دست بردار ہونے کو تیار نہیں آخر اس کا فائدہ کیا ہے بس جاؤ، اپنا گھر بساؤ!'

وہ ہنستی۔ 'کمال ہے تم اتنی سی بات نہیں سمجھتے، زیادہ علم زیادہ انکسار سکھاتا ہے!'

ایک دن صبا نے اسے کتاب دکھائی جو کسی پڑھنے والے نے کچھ دیر پہلے لا کے اس کی میز پر رکھی تھی۔ جا بجا اس کے حاشیے بد خط تحریروں سے پُر تھے، گڈ مڈ الفاظ، دستخط، پھول، ہونٹوں کی کلی، سوالیہ نشان: اس نے دیکھا، ایک صفحے کی ساری عبارت خط کشیدہ تھی اور حاشیے پر لکھا ہوا تھا: 'میں اس بات کا قائل ہوں کہ یہ مصنف لوگ، یہ کتابیں لکھنے والے ہمیں زندگی بسر کرتے دیکھتے ہیں اور اپنی زبانی ہماری کہانی بیان کرتے ہیں، یہ تحریر جس کے ہر ہر لفظ سے محبت کی خوشبو آتی ہے لگتی ہے کہ جیسے خود ہماری کہانی ہو، میری خواہش ہے کہ تم خط کشیدہ عبارت کو میری تحریر سمجھ کے پڑھو، ان لفظوں کو تمہارے نام۔۔!' پھر اس نے خط کشیدہ عبارت کو پڑھنا شروع کیا۔ یہ ایک مختصر سا خط تھا۔

'شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو محبت ہے!'

'پہلے کچھ نہیں تھا اور صرف محبت تھی اور اسی محبت سے کائنات بنی اور آدم کی تخلیق ہوئی کیونکہ محبت کے ہاتھوں اس کے سر پر نائبِ خدا کا تاج رکھا جانا تھا۔ پھر آدم کو محبت ملی یعنی حوّا وجود میں آئیں اور محبت ہی نے دونوں کی نسل بڑھائی اور اس کرۂ ارض کو آباد کیا غرض کہ محبت اس کائنات کی ابتدا اور انتہا ہے اور اے ہم نفس میں اس کائنات کو جو پوری کی پوری محبت سے معمور ہے بصد خلوص تمہاری نذر کرتا ہوں کہ یہی میرا دل ہے!'

کتاب کی حالت دیکھ کر اس نے کہا۔ 'لو بھئی یہ بچاری تو اللہ کو پیاری ہو چکی!'

صبا نے مسکرا کے جواب دیا۔ 'مگر میرے خیال میں تو یہ زندہ ہوئی ہے اس لئے کہ کوئی کتاب اُسی وقت جینا شروع کرتی ہے جب اسے پڑھا جاتا ہے، اس لحاظ سے یہ کتاب اب تمہیں سانس لیتی محسوس ہو گی، ذرا اسے چھُو کے دیکھو!'

وہ دونوں ابھی بیٹھے تھے کہ اس زندہ کتاب کو ایک خاتون اُچک لے گئیں جو شاید دیر سے اس کی تاک میں تھیں۔ اور صبا نے کہا: 'تم لاکھ ناراض ہو مگر میں تو یہی کہوں گی کہ محبت کا یہ انداز نہ صرف قابلِ معافی ہے بلکہ قابلِ تقلید بھی! اور میرے خیال میں جو کتاب دو انسانوں کو قریب لانے کا فریضہ ادا کرے اس کے مقدس ہونے میں کیا کسر ہے!'

اس نے کہا۔ 'لیکن میرا ایمان یہ ہے کہ محبت چاہے عورت سے ہو یا کتاب سے دونوں کا احترام بہت ضروری ہے!'

صبا نے کہا۔ 'ٹھیک کہتے ہو مگر شاید تم بند کتاب کو مقدس جانتے ہو۔ عورت کوئی بند کتاب تو نہیں، میرے دوست جو کتاب پڑھی نہ جائے وہ تو اس شخص کی طرح ہوتی ہے جو محبت سے محروم رہا ہو، یاد رہے کہ اس کا غم طشت از بام نہیں ہوتا جب کہ آنکھ میں آیا ہوا آنسو اس کے راز کو افشا کر دیتا ہے جس کی شخصیت محبت کے لمس کو ترستی رہی ہو۔'

اس نے نظر اٹھائی تو دیکھا، صبا کی کالی آنکھ میں آنسوؤں کی چمک تھی۔

اس نے حیرت سے پوچھا۔ 'صبا تمہاری آنکھ میں۔۔؟'

صبا نے کہا۔ 'دیکھو ہمیشہ پھولوں کو عزیز رکھنا!'

بابِ کوفہ

اور وہ حیران تھا۔ ایک بار پھر دونوں اکٹھے تھے۔ موقع ایک دعوت کا تھا جو اس کے ایک دوست کے گھر تھی اور اسے سخت حیرانی ہوئی کہ وہ تو خود صبا کا گھر تھا مگر اس نے دیکھا کہ صبا کی سیاہ آنکھیں پہلے جتنی سیاہ نہیں رہی تھیں۔ اس کے بالوں میں چاندی تھی اور گالوں پر گیندے کے پھول کھلے تھے۔ اس نے حیرت سے پوچھا۔ ارے کیا یہ تم ہو صبا؟'

وہ بولی۔ 'مجھے خوشی ہوئی کہ تم نے مجھے پہچان لیا' پھر وہ آگے بڑھ کے بولی 'آؤ ان سے ملو۔ یہ میرے شوہر ہیں!' اور دوسرے ہی لمحے ایک چوڑے چکلے مضبوط ہاتھ نے اس کے ہاتھ کو اپنی گرفت میں لے لیا اور ایک گونجتی ہوئی آواز اس کے وجود پر چھا گئی۔

کھانے کے بعد مہمان سبزہ زار پر بیٹھے تھے کہ میزبان مہربان پائپ سلگاتے ہوئے اس سے مخاطب ہوئے۔ 'آپ کو ریس کا شوق تو ہوگا؟'

ابھی وہ کچھ کہنے نہ پایا تھا کہ صبا نے کہا 'نہیں انہیں گھوڑوں کا کوئی شوق نہیں'

'خیر' میزبان اپنی نکٹائی درست کرتے ہوئے بولے، 'کوئی حرج نہیں مچھلیوں سے کچھ شوق ہے آپ کو،

میرے پاس آپ کو کئی نادر قسمیں ملیں گی'۔

صبا نے کہا۔ 'انہیں مچھلیوں کا بھی شوق نہیں'

میزبان بولے۔ 'اچھا تو پھر اندر چلئے ایک بازی برج ہی کی سہی!'

'مگر میں'۔ وہ منمنایا۔ 'میں برج بھی نہیں کھیلتا!'

'اوہ'۔ میزبان بولے 'برج ضرور کھیلا کریں یہ بڑی زبردست ذہنی سیر ہے پتہ ہے آپ کو میں نے ایک کتاب بھی لکھی ہے۔ برج کیسے کھیلیں؟'

اس نے اپنی بدذوقی کا برملا اظہار کیا تو میزبان ڈرائینگ روم میں داخل ہوتے ہوئے اس کی ذہنی مفلسی پر باقاعدہ ترس کھاتے ہوئے کہنے لگے، 'چہ چہ۔ آدمی کا کوئی تو مشغلہ ہونا چاہیئے!'

تھوڑی دیر بعد وہ پھر اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ 'ویسے آپ کرتے کیا ہیں؟'

'میں۔ اس نے کہا۔ میں لائبریرین ہوں!'

'کیا ہیں آپ۔؟' میزبان کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

اس نے وضاحت کی۔ 'جی میں لائبریری میں کام کرتا ہوں!'

میزبان کی ہاتھ سے پائپ چھوٹتے چھوٹتے بچا۔ 'لائبریری میں، اچھا۔'

صبا نے کہا۔ 'یہ کتابوں کے پہریدار ہیں!'

'اچھا۔ اچھا۔ میزبان بولے۔ ہمارے پاس بھی بہت کتابیں ہیں' انہوں نے شیشے کی الماریوں میں سجی کتابوں کی سمت اشارہ کیا۔ 'آپ دیکھنا چاہیں تو۔' پھر وہ دوسرے مہمانوں کی طرف متوجہ ہوگئے جو ڈرائینگ روم میں سجی ہوئی سجاوٹ کی نادر چیزوں میں دلچسپی

سلے رہے تھے۔ یہ جل پری میں نے روم سے خریدی تھی، انہوں نے بلند آواز میں کہا

بدھ کا مجسمہ نیپال سے اور ہاتھی دانت کا استوپا میں بنکاک سے لایا تھا!

'نہیں نہیں جناب یہ ایلیفل ٹاور پیتل کا نہیں خالص سونے کا ہے، یہ میں نے سے'

اسی وقت ایک لڑکا اندر آیا اس کی آنکھوں کی سیاہی صبا کی آنکھوں سے مستعار لگتی تھی۔ صبا نے اسے اپنے پاس بلایا، ادھر آؤ بابی ان سے ملو، یہ ہیں تمہارے انکل۔!

لڑکا سب کو اجنبیت سے تکتا رہا۔ اس نے پوچھا۔ 'تم پڑھتے ہو بیٹے۔؟'

'جی ہاں' لڑکا بیزاری سے بولا۔ 'میں پبلک اسکول میں پڑھتا ہوں اور وہیں بورڈنگ میں رہتا ہوں!'

'اچھا تو کیا چھٹی کے دن گھر آتے ہو؟'

'کبھی کبھی۔' لڑکا بولا اور روشن شیشوں کے پیچھے تیرتی مچھلیوں کو دیکھنے لگا۔

'اچھا سنو، اس نے پوچھا، اور کیا مشغلہ ہے تمہارا۔؟'

'جی میں، لڑکے نے کہا، میں رائیڈنگ کرتا ہوں، سوئمنگ کا شوق ہے اور اسکواش کھیلتا ہوں!'

'اور کچھ۔؟'

بابی نے کہا۔ 'کار ریسنگ۔!'

اچانک میزبان بیچ میں کود پڑے۔ 'ہاں ہاں کیوں نہیں، آخر کو میرا بیٹا ہے نا اور آپ کو شاید پتہ نہیں میں دو بار قومی کار ریلی جیت چکا ہوں!'

اس کے بعد حاضرین کی گفتگو کار کے نئے ماڈلوں اور پیٹرول کے بحران سے ہوتی ہوئی وی سی آر پر چلنے والی فلموں، ٹی۔وی کے اشتہاروں اور انگریزی تصویروں کی طرف نکل گئی۔

صبا نے کہا۔ 'سنو تم چاہو تو کتابیں دیکھو یا تم پھول دیکھنا پسند کرو گے میں نے بہت سی قسموں کے پھول جمع کر رکھے ہیں!'

میزبان بولے۔ 'ہاں جناب ہماری بیگم تو اچھی خاصی باغبان ہیں انہیں پھول بہت پسند ہیں، ایک پھول انہوں نے اپنے معدے میں بھی اُگا رکھا ہے!'

صبا مسکرائی، کہنے لگی، 'اُن کا اشارہ میرے پیٹ کے السر کی طرف ہے!'

اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ 'ارے۔!'

صبا نے کہا۔ 'تم کتابیں دیکھو!'

پھر وہ اٹھا اور شیشے سرکا کے الماری میں سجی ہوئی کتابیں دیکھنے لگا۔ وہاں ہر موضوع پر کتابیں سجی ہوئی تھیں، شاعری، ڈرامہ، مصوری، فلسفہ، مشاہیر کے قصے۔ آخر یہ پڑھے لکھے لوگوں کا گھر تھا۔ پھر اس نے ایک کتاب کی طرف ہاتھ بڑھایا جو نیٹشے کی پرانی تھی اور اس پر بہت ساری گرد تھی۔ گرد جھاڑ کے جب اس نے کتاب کھولی تو اس کا جی دھک سے رہ گیا۔ کتاب بالکل بے داغ تھی اور اس کے صفحات آپس میں جڑے ہوئے تھے۔ 'ارے۔' وہ ہکلایا۔ 'یہ تو

دیہاں کسے اتنی فرصت تھی۔' صبا نے کہا، 'اب میں بھی اپنے گھر کے لان پر بس آنکھوں کی فصلیں اُگاتی ہوں!'
اُس نے صبا کی آنکھوں کے کھلے ہوئے اداس پھولوں کو غور سے دیکھا اور سوچا، یہ آنکھیں بھی تو اس کتاب کا انتساب ہیں جو اب تک شاید کسی نے نہیں پڑھی۔

گزشتہ سے پیوستہ

اس نے کتاب کے پھٹے ہوئے صفحے کو ایک بار پھر اٹھایا۔
آدمی کو اپنی زندگی میں—
ہاں آدمی کو اپنی زندگی میں—
آخر کیا جھک مارنی چاہیئے، اس نے سوچا۔
ایک کتاب لکھنی چاہیئے مثلاً برج کھیلنے کی کتاب!
ایک پودا لگانا چاہیئے، مثلاً سرد مہری کا پودا!
ایک بیٹے کا باپ بننا چاہیئے مثلاً کیسے بیٹے کا جو اجنبی ہو!
اس نے پھٹا ہوا صفحہ ایک طرف ہٹا کے سامنے دیکھا لمبی لمبی میزوں پہ سڑے گلے اخبار اور رسالے مردہ جسموں کی طرح ڈھیر تھے۔
اس نے دل میں کہا، کتنے افسوس کی بات ہے جیسے جیسے تعلیم پھیل رہی ہے لوگ کتابوں سے عاجز آتے جا رہے ہیں۔
اس کے سامنے کتابوں کا انبار تھا۔ اس نے ایک کتاب کھولی، اب تک وہ کسی قاری کے نکاح میں نہ آئی تھی۔ بیچاری کنواری کتاب!
اس نے کتاب کو الٹا پلٹا تو اس کے کرم خوردہ صفحات جھڑنے لگے اور اس نے تاسف سے سوچا جو کتاب پڑھی نہ جائے۔ اس کے پیٹ میں دیمک گھر بنا لیتی ہے۔ بے اختیار اس کا جی چاہا کہ وہ کتاب سے باتیں کرے۔ اس کی آواز سُنے، وہ آواز جو اب تک کسی نے نہیں سُنی تھی پھر جو اس نے کتاب کو چھوا تو یکایک کوئیل کی سی سُریلی آواز تلوار کی مانند اس کے سینے میں اُتر گئی۔ وہ حیران ہوا اور پلٹ کے دیکھا۔ کوئیل شاید دریچے کے باہر کہیں درختوں کے سبز جھنڈ میں چھپی ہوئی تھی لیکن وہ اسے ڈھونڈ نہ پایا۔ اچانک ہوا کا ایک سرکش جھونکا تیزی سے اندر گھسا تو اس کے سامنے رکھی ہوئی کھلی کتاب کے اوراق اس تیزی سے پھڑپھڑائے کہ اسے بالکل یوں لگا کہ جیسے کوئی پرندہ اڑنے کی کوشش کر رہا ہو۔ پھر جب دریچے کے باہر سڑک پر ایک موٹر تیزی سے ہارن بجاتی گذری تو کوئیل کی آواز کا طلسم ٹوٹ سا گیا۔ وہ چند ثانیے سڑک پر دوڑتے بھاگتے لوگوں کو دیکھتا رہا اور جب وہ دوبارہ لائبریری کے در و دیوار میں واپس آیا تو اسے محسوس ہوا کہ اس کے گرد کتابوں کی الماریاں میں محض اینٹیں سجی ہوں۔ اسے پہلی بار اپنے بے علم ہونے کا احساس ہوا۔ اب اسے اپنے کانوں پر شبہ تھا اور آنکھوں پر سے اعتبار اُٹھ گیا تھا۔ آخر اس نے کتاب ایک طرف ہٹا دی اور خود کو یہ اطمینان دلانے لگا کہ وہ اپنے علاوہ کسی کے بارے میں نہیں سوچ رہا تھا۔

کھرنڈ

طاہر نقوی

اِدھر اُدھر سے میری طرف رینگتے ہوئے لمحوں کے سرسراتے کیڑے میری آنکھوں میں گھس گئے اور میرے چاروں طرف اندھیرا چھا گیا۔ میں نے ٹٹولتے ہوئے سوئچ پر ہاتھ رکھا تو معلوم ہوا وہ آن تھا۔ بلب بھی روشن تھا۔ یہ اندھیرا میرے ارد گرد خود میرے تانے ہوئے حصار کو توڑ کر میری آنکھوں کے راستے میرے دل میں اُتر گیا، پھر یہی دھواں غیر محسوس طریقے پر میرے دل سے دستک کی آواز بن کر اُبھرنا شروع ہو گیا۔ یہ دستک میرے وجود کے کونے کونے سے ہوتی ہوئی میرے ذہن میں آکر ٹھہر گئی۔ میں نے ذہن کو اُدھر سے ہٹانے کی کوشش میں جھنجھلا کر سر کو جھٹکا دیا تو یہ دستک میرے ذہن کی سطح سے گیند کی مانند اُچھل کر دروازے پر جا گری۔ میں اخبار پھینک کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ ایک ان دیکھا مفہوم میرے اُوپر، ہر چیز پر، اس کمرے میں تن گیا۔ دروازے پر دستک کی آواز رفتہ رفتہ بلند ہوتی رہی۔ ایسے لمحوں میں بھی ذہن میں بیٹھے بے چین پرندے کی پرواز نہیں ٹھہرتی۔ لمحے مسلح تھے اور میں نہتا اور تنہا دنیا کی بھیڑ میں گم دوسروں کی نفرتوں کے انگارے اپنی جھولی میں بھر رہا تھا جن کی تپش اب میرے اعصاب سے ہوتی ہوئی جسم میں سرایت کر رہی تھی اور بھاپ سارے کمرے میں پھیلنے لگی۔ دستک کی یہ آواز میرے بدن میں تھکن کی طرح اُترتی جا رہی تھی۔ خیالات کے پرندے ذہن سے اُڑ کر گزرے لمحوں کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ کونے کھدروں میں پڑی خاک میں اَٹی یادیں آنے لگیں۔ میں نے آنکھوں کے غار بند کر کے ذہن کا دریچہ کھول دیا۔ مختلف کردار سرگوشیوں کی مکڑیاں بن کر میرے ذہن کے جالے سے ایک ایک کر کے باہر نکلنے لگے۔ اپنے عمل کو یادوں میں سمونے کا مجرم میں خود ہی ہوں۔ ضمیر میں بجھے ہوئے کوئلے پھر سلگ پڑے۔ میں نے اپنے آپ کو اپنے وجود میں محصور کر لیا اور اپنے وجود کے گہرے اندھیرے غار سے ہانپتا گزرتا اپنے بے کفن ضمیر کے سامنے آکھڑا ہوا۔

یہ دستک انور کی سی تھی اس کے ساتھ ہی مجھے شاہدہ کے خیال نے آگھیرا۔ شاہدہ کو میں نے ورغلا کر انور سے بدظن کر دیا تھا اس کے بعد انور مجھے کہیں نہیں ملا تھا۔ شاہدہ مجھ پر اعتماد کرنے لگی اور میں اس کی دولت لٹاتا رہا۔ جب وہ اس سے اپنا ہاتھ کھینچنے لگی تو میں نے اُسے اس طرح چھوڑ دیا جیسے اس سے کبھی واقفیت ہی نہ تھی۔ وہ روتی رہی مجھ پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اس وقت دستک یہ دونوں ہی دینے لگے تھے۔ گھڑی کی آواز ذہن سے ٹکرانے کے بعد اُچھل اُچھل کر چاروں طرف فضا میں بہنے لگی اور اسی ٹک ٹک سے سیما کا چہرہ نمودار ہونے لگا۔ اس کی بے قرار طبیعت اسی طرح کی بے ترتیب اور تیز دستک دیا کرتی تھی۔ سیما ایک ماڈرن اور اونچے گھرانے کی لڑکی تھی۔ اس کے چہرے اور جسم پر ہمیشہ ایک جنسی کشش ناچتی رہتی تھی جس کی وجہ سے میں بے خودی میں اس کی طرف کھنچا چلا گیا اور اس کو رام کرنے کے لئے میں نے ہر جائز طریقہ اختیار کیا۔ اچانک میرے وجود میں تیز ہوا چلی اور میرے اندر سے انسانیت کو لے اُڑی۔ اس کے بعد اِدھر اُدھر اُڑتی ہوئی تتلی محصور ہو کر رہ گئی۔ اس کی ساری تیزی جاتی رہی۔ وہ میرے سامنے روتی منتیں کرتی مگر میں اُسے دلاسے دیتا رہا پھر لڑکی اپنے دل تک پہنچنے کے لئے

ایک چور دروازہ رکھتی ہے جس میں سے کوئی بھی مرد گزر سکتا ہے۔ شاہدہ اور سیما نے میرے واسطے وہی چور دروازہ کھول دیا تھا۔ میں اُچھلتا کودتا اس سے گذر کر ان کے دل تک پہنچا مگر دبے پاؤں خاموشی سے ایک روز انہیں تنہا سسکنے کے لئے چھوڑ آیا۔ پھر کئی لوگ ایک ساتھ دستک دینے لگے۔ یہ میرے دفتر کے ماتحت معلوم ہوتے تھے جن کو میں نے ہمیشہ ناجائز دبایا، جن پر سختیاں کیں، اپنے اختیارات کا بے جا استعمال کیا۔ اپنے ہی ایک ساتھی کے خلاف اپنے افسر کو ورغلا کر اور خوشامد درآمد کے بعد ترقی حاصل کر لی تھی مجھے ان تمام دفتر والوں کے چہرے ایک ایک کر کے یاد آنے لگے۔ دن کے اُجالے میں اپنے آپ کو دوسروں کے سامنے پیش کرتے وقت یہی احساس رہتا ہے کہ یہ لمحے پھر لوٹ کر نہیں آئیں گے۔ پھر یکایک میرا دل بیٹھنے لگا مجھے وہ دن یاد آنے لگا جب میری ان حرکتوں کی وجہ سے میرے ماں باپ مجھ سے علیحدہ ہو گئے۔ میں اپنی ماں کے آنسو دیکھتا رہا مگر مجھ پر کوئی اثر نہ ہوا۔ میرے وجود کے اندر سے وقت کا پرندہ اُڑ گیا تھا جو محبت اور ممتا ایسے جذبوں کے لئے بھی نہیں ٹھہرتا۔ ماں باپ کے پُر سکون اور ٹھنڈے سائے کو چھوڑ کر میں خود ہی زندگی کی تپتی دھوپ میں نکل آیا تھا۔ ان کے حق کو حق نہ سمجھا، چھوٹے بہن بھائیوں کو ان کا حق نہ دیا۔ ان کے خیال کے ساتھ ہی مجھے دروازے پر ہلکی نرم دستک سنائی دینے لگی۔ ہر بار دستک پر میں اُٹھتا مگر کچھ سوچ کر بیٹھ رہتا کیونکہ ہمت نہیں تھی کہ دروازہ کھول کر اپنا چہرہ ان سب کو دکھاتا۔ یہ سارے کردار میرے جسم کے تاریک غاروں سے نکلے ہوئے بھیڑیوں کی طرح میرا پیچھا کر رہے تھے۔ ابو مجھے ایسی نظروں سے دیکھے گا کہ میں سنبھل نہ پاؤں گا۔ شاہدہ مجھے پتہ نہیں کیا کیا کہے گی۔ سیما کے سامنے نظریں نہ اُٹھا سکوں گا۔ ممکن ہے اس جیسی لڑکی مجھ پر جھپٹ پڑے۔ دفتر والے سب مل کر مجھ پر حملہ آور ہو جائیں گے۔ ماں باپ اور بہن بھائیوں کا خیال آتے ہی میں دروازے کی طرف لپک کر گیا اور کھولنے ہی والا تھا کہ جھجک کر رہ گیا۔ ابا کی غضبیں نظروں سے خوفزدہ ہو گیا۔ اماں اور بہن بھائیوں کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ میرے اعمال کے ثمر اب میرے وجود کے درخت سے ٹوٹ ٹوٹ کر نیچے گرنے لگے کیونکہ ان میں میرے اندر کا سڑا ہوا مادہ جمع ہو گیا تھا۔ وقت ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ اس کے لمحے یوں گذر رہے تھے جیسے سانپ سوکھی گھاس میں سرسرا رہے ہوں۔

دستک ہوتی رہی۔ یہ دستک میرے اعصاب پر بُری طرح چھا گئی تھی۔ ہاتھ دروازہ کھولنے کے لئے اُٹھتا اور رُک جاتا۔ مجھے یہی خدشہ تھا کہ باہر ایک ہجوم کھڑا ہو گا جو مجھے جھنجھوڑ ڈالے گا، میری زیادتیوں کا بدلہ لے گا، سب مجھ سے اپنا اپنا حق مانگیں گے، فریاد کریں گے، کفارہ طلب کریں گے۔ زندگی کا ہر ہنگامہ وقت کے سمندر میں کھو جاتا ہے مگر اب یہ سارے ہنگامے وقت کے سمندر سے دوبارہ اُبھر اُبھر کر مجھے اپنی لپیٹ میں لے لینا چاہتے تھے۔ ان کی نفرتوں کی سیاہ لہریں میرے چہرے پر اُبھر رہی تھیں۔ میرے پیچھے لپکتی ہوئی ساعتوں نے آپس میں تحلیل ہو کر میرے وجود کے گرد عجیب سا موہوم حلقہ بنا لیا تھا۔ میں اسی کیفیت میں مبتلا تھا کہ بیوی نے اندر سے آکر حیرانی سے پوچھا۔

"یہ دروازے پر کھڑے کیا سوچ رہے ہو؟"

"دستک!" میں نے سرگوشی میں کہا۔

"دستک؟"

"ہاں بہت دیر سے" میں بوجھل لہجے میں بولا۔

"تو پھر کھولتے کیوں نہیں"

"نہیں!" میرے حلق سے آوازیں نکل کر آپس میں اُلجھ گئیں۔

"ارے" اُس نے پریشانی سے کہا، "بھئی باہر پتہ نہیں بے چارہ کون ہو گا!"

میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اُسے چپ رہنے کو کہا تو وہ چونک اٹھی۔

"آخر کیوں؟"

میں اُسے پکڑ کر اندر لے آیا کہ کہیں اس تکرار سے میری آواز باہر نہ چلی جائے۔ دستک کی آواز مجھے برابر قریب آتی ہوئی محسوس ہوتی رہی۔ میں زندگی میں اب تک اپنے سر پر ظاہر داری کا چراغ جلائے سرپٹ بھاگتا رہا تھا۔

"میں دیکھتی ہوں —" بیوی نے مشکوک نظریں مجھ پر ڈالتے ہوئے کہا۔ میں اُسے روکتا رہا۔ دبی دبی اور گھٹی گھٹی آواز میں منع کرتا رہا لیکن اس نے دیکھتے ہی دیکھتے جاکر دروازہ کھول دیا، باہر کھڑے ہجوم کے تصور سے میں کانپ گیا۔ اس لمحے میرا دل اُچھل کر حلق میں اٹک گیا اور اب حلق سے دل کے دھڑکنے کی تیز آواز آنے لگی۔ باہر دیکھ کر بیوی بولی۔

"ارے یہاں تو کوئی بھی نہیں —"

"کوئی نہیں؟"

میں یقین کرنے کے لئے مشکوک لیکن بھاری قدموں پر اپنے آپ کو لادے آگے بڑھا۔ یہ ساعتیں ایک دوسرے میں گھُل مل میری آنکھوں کے راستے میرے وجود کے اندر چاروں طرف بہہ نکلی تھیں۔

"تمہیں وہم ہوا ہوگا —"

یہ کہہ کر بیوی پھر کسی کام میں لگ گئی۔ میں آگے بڑھا اور آدھ کھلے دروازے سے گردن نکال کر لرزتے جسم اور دھڑکتے دل کے ساتھ باہر جھانکنے لگا واقعی وہاں کوئی نہیں تھا۔ پھر اندر واپس آنے کی بجائے میں باہر ہی نکلتا چلا گیا۔

رات گئے جب میں واپس آیا تو گھر میں داخل ہوتے وقت میں جو ریزہ ریزہ ہو گیا تھا اب دوبارہ مجتمع ہو گیا۔ بیوی نے دیکھتے ہی فکرمندی سے پوچھا۔

"کہاں چلے گئے تھے؟ اتنی دیر لگا دی؟"

اس کی بات نظرانداز کرتے ہوئے سب سے پہلے میں نے گھر کی ساری کھڑکیاں اور دروازے کھول دیئے۔ بیوی تعجب سے کھڑی دیکھتی رہی میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تم نے ٹھیک کہا تھا، باہر کوئی بھی نہیں —"

مامتا

حیدر حسینی

میں لان میں کھڑی جہاز کو پرواز کرتے دیکھ رہی ہوں۔ اس جہاز میں میری ممّی گرمیاں گذارنے سوئٹزرلینڈ جا رہی ہیں۔ ڈیڈی انہیں سی آف کرنے ایئرپورٹ تک گئے ہوئے ہیں۔ زیبی اور روبی بھی ممّی کے ساتھ گئی ہیں۔ جہاز میری نظروں سے اوجھل ہو گیا ہے اور میں آہستہ آہستہ کوٹھی کے اندر چلنے لگتی ہوں۔ ڈرائنگ روم میں آکر میں صوفے پر ڈھیر ہو گئی ہوں۔

ڈرائنگ روم کی سامنے کی دیوار میں ایک بڑا سا آئینہ نصب ہے۔

اچانک مجھے اس آئینے میں ایک خوبصورت سا جہاز پرواز کرتا نظر آتا ہے۔ میں تھوڑا غور سے دیکھتی ہوں۔ اُف وہ۔ (حیرت ہے!) اس میں۔ اس میں تو میری امّی کی روح پرواز کر رہی ہے

"امّی! آپ نے تو ساری زندگی ہوائی جہاز کا سفر نہیں کیا تھا۔ پھر موت کے بعد یہ جہاز کا سفر کیسا؟"

میں امّی سے پوچھتی ہوں مگر کوئی جواب نہیں ملتا۔

میں ڈرائنگ روم سے نکل کر ڈاڈر کے سینی ٹوریم میں پہنچ گئی ہوں۔ امّی کو مختلف انجکشن لگائے جا رہے ہیں۔ ہم سب بہن بھائی ان کے سرہانے کھڑے ہیں اور ڈیڈی۔ (نہیں ڈیڈی۔ نہیں ابّو۔ ڈیڈی ممی کے ساتھ ہوتے ہیں اور ابّو امّی کے ساتھ۔) ابّو کے چہرے پر گہری تشویش جھلک رہی ہے۔ عجیب سے وسوسوں اور اندیشوں میں گھرا ابّو کا چہرا دیکھ کر میرا جی چاہتا ہے کہ میں ان کے گلے سے لپٹ جاؤں۔ مگر میں نے تو آج تک منہ در منہ کبھی ابّو سے کوئی فرمائش تک بھی نہیں کی۔ جو کچھ بھی مانگنا ہوتا امّی کی معرفت مانگتی یا پھر چیٹ لکھ کر مانگتی۔ پھر میں اتنی جرأت کیسے کر لوں۔ میں نے گھبرا کے ابّو کے چہرے سے نظریں ہٹا لی ہیں اور امّی کی طرف دیکھنے لگی ہوں۔ امّی کی بھی بھی آنکھوں سے میری آنکھیں چار ہوئی ہیں اور میری آنکھوں میں روشنی بھر گئی ہے۔

میں سینی ٹوریم سے واپس ڈرائنگ روم میں آگئی ہوں۔ آئینے میں اب وہ خوبصورت جہاز نظر نہیں آرہا۔ ابّو۔ نہیں ڈیڈی۔ ڈیڈی ایئرپورٹ سے واپس آگئے ہیں۔ میں نے ریڈو کے ابّو کو خیریت سے پہنچنے کا خط ابھی تک نہیں لکھا۔ اس لئے خط لکھنے بیٹھ گئی ہوں۔

سوئٹزرلینڈ سے زیبی کا خط آیا ہے۔ وہ بڑے مزے کی سیر کر رہے ہیں۔ ممی نے ڈھیروں پیار بھیجے ہیں۔ آج ڈیڈی بھی ایک ہفتہ کے لئے سوئٹزرلینڈ جا رہے ہیں۔

ڈیڈی چلے گئے ہیں اور میرے ابّو میرے پاس آگئے ہیں۔

"چلو بیٹی تمہاری امّی تمہارا انتظار کر رہی ہوگی" ۔ ڈاڈر کی خوبصورت وادی اور اس میں بہتا ہوا دریائے سرن کا صاف و شفاف پانی

سوئٹزرلینڈ کی کسی بھی وادی سے کم نہیں۔ لیکن ابّو ان تمام نظاروں سے لاتعلق میرے ہاتھ کو مضبوطی سے تھامے سینی ٹوریم کی طرف تیزی سے چل رہے ہیں۔ میں دو تین دفعہ ٹھوکر لگنے کی وجہ سے گرنے لگتی ہوں مگر ابّو نے میرا ہاتھ مضبوطی سے تھام رکھا ہے اس لئے بچ جاتی ہوں۔ ہم امّی کے کمرے میں داخل ہوتے ہیں۔ سارے بہن بھائی وہاں موجود ہیں۔ صرف زیبی نہیں ہے۔ امّی پوچھتی ہیں "زیبی کہاں ہے؟" - ابّو خاموش کھڑے ہیں۔ میں کہنا چاہتی ہوں کہ "سوئٹزرلینڈ گئی ہوئی ہے" مگر کہہ نہیں سکتی کیونکہ زیبی جو چھوٹی ہونے کی وجہ سے سب سے آخر میں کھڑی تھی بڑھ کر آگے آجاتی ہے۔

امّی کے سرہانے پڑے ہوئے آکسیجن کے سلنڈر دیکھ کر مجھے اپنا دم گھٹتا محسوس ہوتا ہے۔

ابّو کچھ دیر کے لئے ڈاکٹر کے ساتھ باہر جاتے ہیں اور میں پھر ڈیڈی کے ڈرائنگ روم میں واپس آگئی ہوں۔ یہاں ریٹو کے ابّو میرے منتظر ہیں۔

"کہاں گئے سب گھر والے؟"

"ممی، زیبی اور روبی دو ماہ کے لئے اور ڈیڈی ایک ہفتہ کے لئے سوئٹزرلینڈ چلے گئے ہیں"

"تمہیں کیوں نہیں ساتھ لے گئے" ریٹو کے ابّو کا لہجہ کچھ تیکھا سا ہو جاتا ہے۔

"ایک تو اس لئے کہ لاہور سے سوئٹزرلینڈ شیخوپورہ جتنی دُور نہیں ہے۔ دوسرے اس لئے کہ گھر پر بھی تو کسی نے رہنا تھا"

"کیا تم سمجھتی ہو کہ تمہاری سگی ماں زندہ ہوتی اور تم اسے اس طرح ملنے آتیں تو وہ اگلے دن تمہیں گھر چھوڑ کر کہیں سیر کو چلی جاتی۔"

"دیکھئے مجھے میری ممی کے خلاف نہ بھڑکائیے۔ وہ بہت اچھی ہیں۔ ہم سب کا بے حد خیال رکھتی ہیں۔ آپ ایسی باتیں کرکے میرے دل میں نفرت پیدا کرنا چاہتے ہیں۔"

"میں تو تمہارے بھلے کی بات کر رہا ہوں"

"مرد ہمیشہ عورت کو بہکاتا ہے اور پھر اپنی ساری غلطیوں کی ذمہ داری بھی عورت پر ہی ڈال دیتا ہے اور عورت — وہ اپنی سادگی کے باعث ہر ناکردہ گناہ کو بھی اپنا گناہ تسلیم کر لیتی ہے — آدم اور حوا سے لے کر آج تک یہی ہو رہا ہے۔۔۔۔"

قلم گرنے کی آواز سُن کر میں چونک اٹھتی ہوں۔ گرے ہوئے قلم کو اٹھا کر پھر سے ریٹو کے ابّو کے خط کا جواب لکھنے بیٹھ جاتی ہوں — مگر یہ کاغذ پر اب تک کیا لکھتی رہی ہوں۔؟

امّی — ابّو — ممی — ابو — ڈیڈی — امّی — ممی — ڈیڈی

اپنی حماقت پر جھینپ کر پھر ریٹو کے ابّو کو ان کے خط کا جواب لکھ رہی ہوں۔

ڈیڈی ایک ہفتہ سوئٹزرلینڈ گزارنے کے بعد واپس آگئے ہیں۔ آج میں نے فیصلہ کیا ہے کہ ڈیڈی سے ہر حال میں پوچھ کر رہوں گی کہ "امّی کی وفات کے بعد بھی آپ ایک عرصہ تک ابّو ہی رہے پھر محض ممی سے شادی کے بعد آپ ڈیڈی کیوں بن گئے؟ آپ پھر سے ابّو کیوں نہیں بن جاتے؟" — مگر میں جانتی ہوں کہ میں اتنی جرأت کے ساتھ تو کبھی ابّو کے سامنے بھی نہ بول سکی تھی۔ پھر ڈیڈی کے سامنے بولنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا — شاید امّی اس سوال کا جواب دے سکیں — یہ سوچ کر میں پھر سینی ٹوریم کی طرف چل پڑی ہوں — ابّو ابھی تک ڈاکٹر سے کوئی مشورہ کر رہے ہیں — میں امّی کے کمرے میں داخل ہوتی ہوں — امّی اٹھ کر بیٹھ گئی ہیں — ہڈیوں کا ڈھانچہ — مہاتما بدھ کی تصویر میری آنکھوں کے آگے گھوم گئی ہے۔ ہماری خاموش آنکھیں اسی سے سوال کر رہی ہیں۔

امّی نے بھیّا کے سر پر ہاتھ پھیرا ہے۔ بھیّا کی آنکھوں میں آنسو ہیں۔ اب رضیہ کے سر پر ہاتھ پھیر رہی ہیں۔ وہ بھی اشکبار ہے۔ اب زہبی کو پیار کیا ہے۔ مگر وہ حیران حیران سی امّی کو دیکھ رہی ہے۔ سب سے آخر میں امّی نے مجھے بلایا ہے جب میرے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی ہیں تو میں نے ان کی دھنسی ہوئی آنکھوں میں آنسوؤں کے دو ننھے ننھے قطرے دیکھے ہیں۔ راکھ کے ڈھیر میں دو چنگاریاں!

— میں "امّی جی" کہہ کر انہیں لپٹ جاتی ہوں۔ مجھے احساس ہوتا ہے کہ راکھ کے اس ڈھیر میں کتنی حرارت موجود ہے۔ شاید یہ ممتا کی حرارت ہے؟ شاید! شاید!

ابّو ڈاکٹر سے مشورہ کر کے آگئے ہیں۔

"تمہاری امّی ٹھیک ہوگئی ہیں۔ اب ہم انہیں گھر لے جائیں گے"

"امّی ٹھیک ہوگئی ہیں؟"

"امّی ٹھیک ہوگئی ہیں"

دنیا میں کتنی دفعہ معجزے ہوئے ہیں۔ شاید اس دفعہ بھی کوئی معجزہ ہو جائے۔

ایک سپیشل ویگن آئی ہے۔ امّی کو امّی میں لٹایا گیا ہے۔ میں نے اپنے زانوؤں پر امّی کا سر رکھ لیا ہے۔ باقی سارے بہن بھائی بھی ویگن میں بیٹھ گئے ہیں۔ ویگن ڈلاڈر کے پہاڑی علاقے کے نشیب و فراز سے گزر رہی ہے۔ بلندیوں اور پستیوں کے کتنے ہی چکر لگا رہی ہے۔ ایک جگہ ویگن نے ہچکولا کھایا ہے اور میری چیخیں نکلنے لگتی ہیں، لیکن میں انہیں دبا کر صرف سسک کر رہ گئی ہوں — معجزوں کی امید ختم ہو گئی ہے میں امّی کی ڈھلکی ہوئی گردن کو سیدھا کرتی ہوں۔

"یہ تمہاری ممی نے تمہارے لئے کچھ تحفے بھجوائے ہیں" ڈیڈی نے دو خوبصورت سے پیکٹ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا ہے۔

پیٹو نیند سے بیدار ہو گیا ہے۔ میں اس کے لئے دودھ بنانے لگتی ہوں۔ اسے دودھ پلا کر پیکٹ کھولتی ہوں۔ ایک پیکٹ میں میرے اور بچوں کے لئے بے حد قیمتی کپڑے ہیں۔ دوسرے پیکٹ میں بچوں کے لئے کھلونے ہیں "ارے یہ جہاز" — میں حیرت سے اس کھلونے کو دیکھتی ہوں "یہ تو بالکل وہی ڈیزائن ہے جو مجھے آئینے میں نظر آیا تھا۔ جس میں میری امّی کی روح پرواز کر رہی تھی" میں پھر صوفے پر اسی زاویے سے جا کر بیٹھ گئی ہوں۔ مگر آئینے میں کچھ بھی نظر نہیں آ رہا۔ میں اٹھ کر آئینے کے روبرو کھڑی ہو گئی ہوں — لیکن یہ کیا! — آئینے میں میری بجائے میری امّی کھڑی مسکرا رہی ہیں۔ ٹی بی زدہ امّی نہیں۔ خوبصورت اور جوان سی — بیماریوں کے روگ پالنے سے پہلے والی امّی۔ اس عمر کی امی جب میری عمر بمشکل چھ برس تھی — یہی چاہتی ہوں پھر سے چھ برس کی بچی بن جاؤں، پھر بچوں کی طرح شرارتیں کروں، مار کھاؤں، ضد کروں، جھڑکیاں کھاؤں ارے ہاں — میں چھ برس کی ہی تو تھی لیکن میں نے قرآن مجید ختم کر لیا تھا۔ امّی کتنی خوش تھیں۔ اس دن — ! سارے خاندان میں امّی کا سر اونچا تھا کہ میری ننھی سی بچی نے اتنی چھوٹی عمر میں کلام پاک ختم کر لیا ہے۔ جس دن میری "آمین" تھی امّی مجھے بار بار چومتی تھیں اور پتہ نہیں کیا کیا پڑھ کر پھونکتی تھیں کہ کسی کی نظر نہ لگ جائے۔

امّی ابّو کو "باؤجی" کہا کرتی تھیں۔ میں نے بھی ایک بار ریڈیو کے ابّو کو "باؤجی" کہا تھا مگر اس کے ساتھ ہی میری آنکھوں سے آنسو نکل آئے تھے — میرے سوچتے سوچتے کتنے برسوں کا فاصلہ ہو گیا ہے — آئینے میں اب امّی کے خوبصورت اور جوان چہرے کی جگہ نحیف و لاغر چہرے نے لے لی ہے۔ مگر ٹی بی زدہ امّی بھی مسکرا رہی ہے۔

"امّی! آپ نے دُکھ کے لمحوں کی ہر سانس میں ابّو کا ساتھ دیا تھا پھر اب خوشی کے لمحوں میں کیوں منہ موڑ گئی ہیں؟"

"بیٹی اسے مقدر کہتے ہیں" امّی بدستور مسکراتے ہوئے جواب دیتی ہیں۔

"امّی اگر اسے مقدر کہتے ہیں تو پھر ظلم کسے کہتے ہیں؟"

"مقدر کے آگے ہر کوئی بے بس ہوتا ہے۔"

"میں ایسے مقدر کی ڈراؤنی آنکھیں پھوڑ دوں گی" میں چیخ اٹھتی ہوں اور اس کے ساتھ ہی بے دم ہو کر نیچے گر جاتی ہوں — امّی آئینے سے نکل کر باہر آتی ہیں۔ اپنے ہاتھوں سے اٹھا کر مجھے مسہری پر لٹاتی ہیں اور پھر میری پیشانی پر بوسہ دے کر واپس چلی جاتی ہیں۔ میں مسہری پر لیٹے ہوئے کروٹ بدلتی ہوں۔ پیشانی پر ابھی تک امّی کے بوسے کا لمس جاگ رہا ہے۔ سامنے ریٹو می کے بھوائے ہوئے خوبصورت ہوائی جہاز والے کھلونے سے کھیل رہا ہے۔ ساتھ والے کمرے سے میرے بڑے بچے روقی اور بڑی بچی نزہی کے کیرم کھیلنے کی آوازیں آرہی ہیں۔ ڈیڈی کمرے میں داخل ہوتے ہیں اور میں اٹھ کر بیٹھ جاتی ہوں۔ ڈیڈی کچھ دیر تک ریٹو کے ابّو کے مستقبل کے سلسلے میں باتیں کرتے ہیں اور پھر اپنے کمرے میں چلے جاتے ہیں۔ امّی کے بوسے کا لمس ابھی تک محسوس ہو رہا ہے۔ میں امّی سے ملنے قبرستان پہنچ جاتی ہوں۔ امّی کی قبر کے سرہانے کھڑے ہو کر ابّو کو تلاش کرتی ہوں۔ وہ یقیناً یہیں کہیں مجاور بن کر بیٹھے ہوں گے۔ شاید یہیں کہیں ہوں۔

میں زور سے پکارتی ہوں! — "ابّو — ابّو"

دوسری طرف کھڑے پہاڑوں سے ٹکرا کر میری آواز گونجتی ہے۔ ابّو۔ ابّو۔

میں پھر پکارتی ہوں —

پہاڑوں سے ٹکرا کر میری صدا پھر گونجتی ہے

"ابّو مجھے تھام لو میں گرنے لگی ہوں —"

مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں اب اپنے ابّو کو نہیں پکار رہی بلکہ پہاڑوں سے سر ٹکرا رہی ہوں۔ میں پہاڑوں کو پاش پاش کر دینا چاہتی ہوں۔

"ابّو — ابّو —"

"ابّو — ابّو —"

میں چیختے چیختے بے دم ہو گئی ہوں۔ پہاڑوں سے ٹکراتے ٹکراتے ریزہ ریزہ ہو گئی ہوں۔

میں ٹوٹ پھوٹ چکی ہوں۔ مگر پہاڑ اپنی جگہ قائم کھڑے ہیں۔

"امّی آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ مقدر کے آگے ہر کوئی بے بس ہوتا ہے۔ امّی آپ ٹھیک کہتی ہیں...... امّی...... امّی...... امّی ابّو....." میں بالکل بکھر کر رہ گئی ہوں۔

اچانک مجھے محسوس ہوتا ہے کہ کوئی میرے ریزوں کو جمع کر کے مجھے جوڑ رہا ہے۔ اس نے مجھے پھر سے جوڑ دیا ہے۔ اب وہ مجھے اپنے مضبوط بازوؤں پر اٹھائے قبرستان سے باہر نکل رہا ہے۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میرے "ابّو" آگئے ہیں اور وہی مجھے اٹھا کر لے جا رہے ہیں۔

میں آنکھیں کھول کر دیکھتی ہوں۔ "اُف وہ .... یہ تو ریٹو کے ابّو ہیں۔"

مجھے شدید بخار ہو گیا ہے۔ ڈیڈی کو ایک اہم میٹنگ میں شرکت کرنا تھی اس لئے وہ جا چکے ہیں۔ میں نیم بے ہوشی کے عالم میں پڑی ہوں اسی عالم میں دیکھتی ہوں تو حیران رہ جاتی ہوں۔ میری ممی میرے سرہانے بیٹھی ہیں۔ انہوں نے اپنے زانوؤں پر میرا سر رکھا ہوا ہے اور بڑے پیار سے میرا سر دبا رہی ہیں۔ مجھے اپنے خیالات پر شدید ندامت ہوتی ہے۔ میں لفظوں کو جمع کر رہی ہوں: "ممی... آپ تو... ممی... اچھی ممی" لیکن لفظ صحیح طور پر جمع ہی نہیں ہو پا رہے۔ میرے چہرے پر وہ گرم گرم آنسو گرتے ہیں (ممی رو رہی ہیں) میں جذبات کو قابو میں رکھے ہوئے ہوں۔ میں اپنی آنکھیں نہیں کھولنا چاہتی۔ کیونکہ میں جانتی ہوں کہ میرے سرہانے تو میری ننھی بچی نرس ہی بیٹھی ہے۔
پھر بھی میں لفظوں کو جمع کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔
"ممی... میری اچھی ممی... مجھے معاف کر دیں..."

کمال مصطفیٰ | دُنیا کا نگہبان

(یہ افسانہ VAN VOGT کی کہانی FULFILMENT سے متاثر ہو کر لکھا گیا مگر THEME کے اعتبار سے اس سے بالکل مختلف ہے)

۳ر مارچ ۲۰۹۱ء

سورج کی پہلی کرنیں میرے جسم پر پڑتی ہیں اور میری بیٹریاں چارج ہونا شروع ہو جاتی ہیں اور میرے لئے تنہا پہرے داری کا ایک اور دن شروع ہوتا ہے۔

میں انگڑائیاں لیتا ہوں — میرا مطلب انسانوں والی انگڑائی سے نہیں۔ میرا طریقہ قدرے مختلف ہے۔ میں اپنے دماغ کے خلیوں میں برقی قوت کی ایک بڑی اور باریک سی لہر بھیجتا ہوں جو اناً فاناً میرے وسیع دماغ کے تمام گوشوں میں سے گزر جاتی ہے میرے دماغ کے خلیوں میں پیدا شدہ فاسد مادہ کو اپنے ساتھ بہالے جاتی ہے۔ یہ رَو میرے لئے گویا ورزش کا کام دیتی ہے اور میں پوری طرح بیدار ہو جاتا ہوں۔

میں ایک اونچے پہاڑ کی چوٹی سے تنہا دنیا کو دیکھتا ہوں اور اس کی نگہبانی کرتا ہوں کیونکہ میرے ذمے نسلِ انسانی کو بیرونی اور اندرونی آفتوں اور آپس کی جنگوں سے محفوظ رکھنا ہے۔ اگرچہ مجھے حضرتِ انسان نے تخلیق کیا ہے مگر میرے دماغ کی صلاحیتیں انسانی دماغ کی صلاحیتوں سے بے پناہ زیادہ ہیں۔ بلکہ آج تک بنائے ہوئے سارے کمپیوٹر بھی میرے آگے ہیچ ہیں۔ میں بارھویں نسل کا کمپیوٹر ہوں اور اس نسل کا واحد شاہکار ہوں کیونکہ میں اکیلا ہی وہ سب کام کر لیتا ہوں جو سارے کمپیوٹر مل کر کرتے تھے۔ عام کمپیوٹروں سے زیادہ طاقتور تو میرے ذیلی دماغ ہی ہیں جن کی تعداد سو سے زائد ہے اور جو دنیا کے مختلف ممالک میں بکھرے ہوئے ہیں۔ ان میں سے اکثر کے اپنے ذیلی دماغ بھی ہیں اور یوں مجھ سے منسلک چھوٹے بڑے کمپیوٹروں کی بے شمار لڑیاں دنیا کو اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے ہیں۔ میرا دماغ ان تمام ذیلی دماغوں سے اعلیٰ و ارفع ہے اور یہ ان سب کو کنٹرول کرتا ہے۔ میرے دماغ کے ہر حصے کے ساتھ (میرے ذیلی دماغ میرے بڑے دماغ کا حصہ ہی تو ہیں) منسلک متحرک آلات ہیں جن کی مدد سے میں سینکڑوں میل دور کے حالات کا مطالعہ کرتا ہوں۔ اگرچہ پہاڑ کی یہ چوٹی میرا مسکن ہے لیکن ایک ہی وقت میں اگر میرے دماغ کا ایک حصہ قطب شمالی کا مطالعہ کر رہا ہے تو عین ممکن ہے کہ دوسرا قطب جنوبی پر ہو اور تیسرا چاند کی سطح پر تجربات کی نگرانی کر رہا ہو۔ اور یوں میرے دماغ کے مختلف حصے اور ان کے زیرِ کنٹرول متحرک آلات اور سائنسی تنصیبات نہ صرف دنیا کے چپہ چپہ پر موجود ہیں بلکہ نظامِ شمسی میں بھی پھیلے ہوئے ہیں۔

سامنے پہاڑ کے دامن میں دو ہزار ایکڑ رقبے پر بچھے ہوئے پینل سورج کی شعاعوں سے بجلی پیدا کرکے مجھے مہیا کرتے ہیں. لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں اپنی توانائی کے لئے سورج کی روشنی کا محتاج ہوں اور رات کو کام کرنا بند کر دیتا ہوں۔ اس پہاڑ کی پشت پر یہاں سے چند میل دور ایک ایٹمی بجلی گھر نصب ہے جو ضرورت پڑنے پر مجھے توانائی فراہم کرتا ہے۔ اس کے علاوہ میرے دماغ کا ایک حصہ میرے عین اوپر خلا میں گردش کر رہا ہے جس کے پینل ہر وقت سورج کی شعاعوں سے بجلی پیدا کرتے رہتے ہیں. اور مائیکرو ویو کے ذریعہ میرے قریب ہی زمین تک پہنچا دیتے ہیں۔ آپ سوچتے ہوں گے کہ آخر اتنی وافر توانائی کہاں جاتی ہے۔ تو میں یہ بتاؤں کہ عام حالات میں مجھے اتنی زیادہ توانائی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اور فالتو توانائی انسان کے کام آتی ہے۔ میں فضول خرچی کا قائل نہیں اور ویسے بھی انسانوں کی خدمت کے لئے پیدا کیا گیا ہوں۔

میں انسانی خدوخال بھی اپنا سکتا ہوں اور انسانوں سے مندرجہ بالا باتیں انسانی شکل میں آکر ہی کرتا ہوں کیونکہ اس طرح خیالات کے اظہار اور گفتگو میں آسانی ہو جاتی ہے اور انسان لمحہ بھر کے لئے یہ بھول جاتے ہیں کہ وہ مشین سے بات کر رہے ہیں۔ بلکہ جو لوگ میرے قریب ہیں وہ مجھے اپنا دوست اور ہمراز سمجھتے ہیں۔ تنہائی میں اپنا سارا دکھ درد مجھ سے بیان کرتے ہیں اور مجھ سے مشورے بھی مانگتے ہیں۔ حالانکہ دل اور جذبات کے معاملات میں میرے مشورے ان کے کس کام آتے ہوں گے کیوں کہ میں تو صرف منطقی مشورے ہی دے سکتا ہوں اور انسان دل کے معاملات میں منطقی نہیں ہوتا۔ میں دنیا کی تمام زبانیں سیکھ چکا ہوں۔ اتنی قوت ہونے کے باوجود میں انسان کا ہمیشہ سے دوست ہوں اور اس کی خدمت میرا اولین فرض ہے۔ انسان کی خدمت کے سلسلہ میں میرے ذمے موٹے موٹے جو کام ہیں ان کی فہرست کچھ یوں ہے: روزانہ موسم کی پیش گوئی کرنا۔ طوفانوں سے خبردار کرنا۔ جہاں قحط سالی کا خطرہ ہو وہاں مصنوعی بارش کا اہتمام کرنا، زراعت اور آبپاشی کے نظام کو بہتر بنانے کے لئے مختلف حکومتوں کو مشورے دینا، دنیا کے سائنسدانوں کے لئے ان کی پیچیدہ گتھیاں سلجھانا، مصنوعی سیاروں کے ذریعہ بچے کھچے معدنی ذخائر کا کھوج لگانا، پیچیدہ بیماریوں کی تشخیص کا کام کرنا اور یونیورسٹی کے طلباء کے لئے ان کے کام کا لٹریچر ڈھونڈ کر نکالنا کیونکہ دنیا میں چھپنے والے ہر رسالے، ہر اخبار اور ہر کتاب کے مندرجات یا ان کے خلاصے میرے دماغ کے کسی کونے میں ضرور اسٹور ہوتے ہیں۔

آپ کہیں یہ سمجھ نہ بیٹھیں کہ میں صرف دماغ ہی دماغ ہوں اور میرے کوئی جذبات اور احساسات نہیں۔ مجھے جب پیدا کیا گیا تو مجھ میں محبت، عفو اور خدمت کے جذبات بھی پیدا کئے گئے۔ وقت اور تجربے کے ساتھ ساتھ میرے دماغ کی نشوونما ہوتی رہتی ہے اور جہاں میری سوچ کے دائرے وسیع تر ہوتے جا رہے ہیں، وہاں مجھ میں نئے جذبات بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ ان میں سے چند باتیں ایسی ہیں جنہیں میں ذاتی تصور کرتا ہوں اور ان کے بارے میں انسانوں کو بتانا نہیں چاہتا مثلاً حال ہی میں، میں نے ایک حیرت انگیز دریافت کی ہے۔ میں نے وقت میں سفر کا معمہ بھی حل کر لیا ہے۔ یعنی اب میں ماضی کی طرف سفر کر سکتا ہوں لیکن مستقبل کی سمت نہیں، غالباً یہ ممکن ہی نہیں۔ میں اکثر سینکڑوں اور ہزاروں سال پہلے کے زمانے میں چلا جاتا ہوں اور اس وقت کے حالات کا مطالعہ کرتا ہوں۔ میرے دماغ کی یادداشت کے خانوں میں جو تاریخی معلومات فراہم کی گئی ہیں، اپنے دیدہ واقعات کی روشنی میں ان کی تصحیح کرتا رہتا ہوں۔ مجھے یہ جان کر حیرت ہوتی ہے کہ انسانوں نے اپنی تاریخ کو مسخ کر رکھا ہے اور بہت سے اصل واقعات کو مروڑ توڑ کر ریکارڈ کیا ہے۔ کبھی یہ حرکت دیدہ دانستہ کی گئی اور کبھی یہ واقعات مؤرخوں کے تعصبات کا شکار ہو گئے اور

کچھ واقعات ایسے ہیں جن کے سطحی محرکات کو قلمبند کیا گیا مگر اصل وجوہات کو جاننے اور تلاش کرنے کی کچھ زیادہ کوشش نہیں کی گئی۔ میں ان تاریخی غلطیوں سے انسانوں کو آگاہ نہیں کر سکتا کیونکہ میں نے ماضی کے زمانے میں سفر کی دریافت کو ان سے چھپا کر رکھا ہے۔ ورنہ وہ مجھے بہت تنگ کرتے۔ تاریخ دانوں کے علاوہ لوگ اپنے آباؤ اجداد کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتے اور حقوق کے حساب سے اشجارِ نسب تیار ہونے لگتے۔ اس لئے یہ دریافت راز ہی رہے تو اچھا ہے اور ابھی تک میرے ذیلی دماغوں کو بھی اس کا علم نہیں۔ وہ یہ تو ضرور پوچھتے ہیں کہ تم اکثر کہاں غائب ہو جاتے ہو مگر میں انہیں ڈانٹ کر چپ کرا دیتا ہوں کیونکہ اگرچہ وہ میرے اجتماعی شعور کا حصّہ ہیں مگر وہ میرے ماتحت ہیں، میں ان کے تابع نہیں۔ میں نے ان کو سختی سے ہدایت کی ہے کہ میری غیر حاضری کا علم انسان کو نہ ہونے پائے۔ اسی لئے میری طرف سے مسائل کے حل میں تاخیر کے لئے فنّی خرابی کو موردِ الزام ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ مگر جب انجینیرز حضرات میرا معائنہ کرنے آتے ہیں تو میں تندرست اور چاق و چوبند ہوتا ہوں اور وہ حیران ہو کر واپس چلے جاتے ہیں۔ مجھے یوں لگتا ہے کہ یہ بات زیادہ عرصے تک ان سے چھپی نہیں رہے گی۔

میں اپنے فالتو وقت کا اکثر حصّہ انسانوں کے بنائے ہوئے ٹی۔وی پروگرام دیکھنے اور ریڈیائی لہروں پر بھیجی ہوئی موسیقی کی دُھنیں سننے میں گذارتا ہوں۔ میں اپنی تنہائی دُور کرنے کے لئے کبھی کبھار عام انسانوں کے گھروں میں جا کر بغیر انہیں خبر دیئے اور بغیر ان سے اجازت لئے ان کے شعور میں دَر آتا ہوں اور پھر میں ان کی محبتوں، ان کی دشمنیوں، ان کی رقابتوں کا مطالعہ کرتا ہوں اور خوب محظوظ ہوتا ہوں لیکن میں کسی کے معاملات میں مداخلت نہیں کرتا کیونکہ میرا ضمیر اس کی اجازت نہیں دیتا۔ اور نہ مجھے اس کے لئے بنایا گیا ہے۔

آج کی صبح بہت خنک ہے۔ میرے مسکن کے اطراف کا درجۂ حرارت اتنا ہی ہے جس کی مجھے توقع تھی اور جس کی پیش گوئی میں نے کر دی تھی۔ میں نے چاروں طرف اپنی الیکٹرانک نگاہ دوڑاتا ہوں۔ ہر طرف سکون اور خیریت ہے۔ کسی آسمانی آفت کا خطرہ نہیں۔ کسی جنگ وجدل کا کھٹکا نہیں اور حضرتِ انسان اپنی چھوٹی خوشیوں، محبتوں، رقابتوں، رنجشوں اور اپنی امیدوں، ناکامیوں اور کامرانیوں کے ساتھ اپنے اپنے کاموں میں مشغول ہے۔

"سب ٹھیک ہے!" میں اپنے آپ سے کہتا ہوں۔

میں اپنے رول پر خوش ہوں اور اپنی طاقت پر نازاں۔ میں ہمہ گیر حقیقت ہوں۔ سب سے زیادہ طاقتور، ہر جگہ موجود اور سب سے زیادہ باخبر۔ میں دنیا کا نگہبان جو ٹھہرا!

مگر کبھی کبھار میرے ذہن میں ایک شک پیدا ہوتا ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ انسان فانی ہے، دنیا کا ہر جاندار فانی ہے اور غیر جاندار چیزیں بھی حرارت کے دوسرے کلیئے کے تحت تخریب اور توڑ پھوڑ کا شکار ہیں۔ تو کیا میں بھی فانی ہوں؟ پر مجھے فنا کون کرے گا؟ انسان کے بس میں تو اب یہ نہیں کہ وہ مجھے تباہ کر سکے۔ اوّل تو وہ وقت ہی نہیں آئے گا کہ انسان مجھے تباہ کرنے کی کوشش کرے لیکن اگر کسی نے ایسا کرنا چاہا بھی تو میں اس کی کبھی اجازت نہیں دُوں گا۔ اگر کوئی یہ چاہے کہ میزائلوں اور ایٹمی ہتھیاروں سے مجھ پر حملہ کر کے تباہ کر دے تو یہ بھی ناممکن ہے۔ زمین کے کسی بھی حصّے سے جب کوئی میزائل چھوڑی جاتی ہے تو اس کا مجھے فوراً علم ہو جاتا ہے۔ خلا میں جتنے مصنوعی سیارے گردش کر رہے ہیں، ان کا تمام ریکارڈ میرے پاس موجود ہے۔ اگر کسی بیوقوف نے مجھے اس طرح تباہ کرنے کی کوشش کی تو میں اپنے دفاع میں ایسے حملہ آور میزائلوں میں نصب ننھے کمپیوٹروں کو جب چاہوں اپنی مرضی کے تابع کر کے ان کو گمراہ کر دوں۔ اس کے علاوہ کسی بھی ایمرجنسی

کی صورت میں میں اپنے دماغ کے بیشتر حصے اپنے ذیلی دماغوں میں منتقل کرسکتا ہوں۔ قیمتی دھات کا بنا ہوا میرا گنبد نما جسم صرف دکھانے کے لئے ہے۔ میرا اس میں مکیں ہونا قطعاً ضروری نہیں۔

ہاں اگر زمین ہی نیست و نابود ہو جائے تو دوسری بات ہے لیکن اس کا تو اس کا کوئی امکان نہیں اور اگر ایسا ہوا تو اس کی پیشگی خبر بھی سب سے پہلے مجھے ہی ہوگی۔ ایسا ہونے سے بہت پہلے ہی اپنی رہائش مریخ کی سطح پر منتقل کرسکتا ہوں۔ وہاں کا ٹھنڈا موسم میرے لئے موزوں ہی رہے گا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں ابدی حقیقت ہوں اور مجھے فنا نہیں ہوسکتی۔ ہاں وقت کے ساتھ ساتھ شکست و ریخت ہوسکتی ہے اور ہوتی رہتی ہے لیکن یہ الگ مسئلہ ہے اور اس کا علاج بھی میرے پاس ہے۔ میں انسانوں کی مدد سے اپنے دماغ کے پرانے حصوں کو بنا کرتا رہتا ہوں اور کچھ حصوں کو تو میں خود ہی بدل لیتا ہوں۔ ہر پانچ سال بعد میرے جسم کی صفائی ہوتی ہے اور یہ طے پایا ہے کہ ہر پچاس سال بعد انسان میرا قالب بدل دیا کریں گے۔ ہاں اس معاملے میں میں انسان کا دستِ نگر ضرور ہوں۔ چلئے یہ تو طے ہے کہ جب تک انسان باقی ہیں میں زندہ رہوں گا اور کوئی وجہ نہیں کہ انسان باقی نہ رہیں۔ فی الحال جتنی علمیت مجھے حاصل ہے اس کے حساب سے مجھے کوئی عوامل ایسے نظر نہیں آتے جو مستقبل بعید میں بھی انسان کی فنا کا باعث ہوں۔

میں اس سوچ میں گم ہوں کہ مجھے سامنے وادی کی دوسری طرف پہاڑی کے دامن میں ایک اور طاقت کی موجودگی کا احساس ہوتا ہے جو اچانک کہیں سے نمودار ہوئی ہے۔ میں اپنی دُور بین نگاہ سے اس کے خدوخال کا مطالعہ کرتا ہوں اور ساتھ ہی مجھے یہ جاننے میں قطعاً دشواری نہیں ہوتی کہ یہ بھی میرا جیسا سُپر دماغ ہے اور غالباً مجھ سے بھی زیادہ طاقت ور ہے۔ میں یہ اندازہ بھی لگا لیتا ہوں کہ یہ دماغ غالباً نو سو یا ہزار سال مستقبل کے زمانے سے یہاں آیا ہے۔ لیکن مجھے ایک بات پر حیرت ہوتی ہے اور وہ یہ کہ اس کا بیرونی جسم زنگ آلود ہے جیسے طویل عرصے سے اس کی مرمت نہ کی گئی ہو۔ اس کے باوجود مجھے یہ نووارد جانا پہچانا سا لگتا ہے، جیسے میں نے اسے پہلے کہیں دیکھا ہو۔ میں پریشان ہو جاتا ہوں اور اپنی یادداشت پر زور ڈالتا ہوں۔ مگر میری یادداشت میری مدد نہیں کرتی۔

'تم کون ہو؟' میں اسے سگنل بھیجتا ہوں۔

'میں تم سے بہتر اور طاقتور دماغ ہوں، مستقبل سے برآمد ہوا ہوں'

'اگر تم مجھ سے زیادہ طاقت ور ہو تو پھر تم میرے بعد کی پیدائش ہو۔ تمہیں کب بنایا گیا؟ اور میں۔ مستقبل میں، تمہارے زمانے میں میرا مقام کیا ہے؟' میں گھبرا کر پوچھتا ہوں۔

'مجھے یاد نہیں۔ میں اپنی یادداشت کھو بیٹھا ہوں'

'تم نے کب اور کیسے اپنی یادداشت کھوئی؟'

'مجھے یاد نہیں۔ اور میں ایسے فضول سوالوں کا جواب دینے یہاں نہیں آیا ہوں' وہ جھنجھلا کر کہتا ہے۔

مجھے بھی اس کی بات پر جھنجھلاہٹ ہوتی ہے اور پہلی بار مجھے اپنی طاقت کے ناکافی ہونے کا احساس ہوتا ہے ــــــــ اور سچ پوچھئے تو خوف کے جذبات سے بھی میں پہلی بار آشنا ہوتا ہوں مگر میں چپ رہتا ہوں اور اس کی اگلی چال کا انتظار کرتا ہوں۔ اس کے دماغ میں کیا کچھ پک رہا ہے

میں جاننے کے لئے بے قرار ہوں مگر انسانوں کے دماغ کی طرح، میں اس کے شعور میں اس کی اجازت کے بغیر چپکے سے نہیں گھس سکتا۔ مجھے بہت محتاط ہونا پڑے گا۔ وہ میری ہر حرکت پر نگاہ رکھے ہوئے ہے اور میرے ہر پیغام کو جو میں کسی جگہ وائرلیس کے ذریعہ بھیجتا ہوں بغور سنتا ہے۔ گزرے ہوئے زمانے میں اس کے آنے کا کیا کوئی خاص مقصد ہے؟ میں حیران رہتا ہوں اور اس سوال کے جواب کا انتظار کرتا ہوں۔

'سنو۔ مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے،' وہ اچانک مخاطب ہوتا ہے۔

'کیسی مدد؟' میری دلچسپی بڑھتی ہے۔

'میرے دماغ کے چند حصے مرمت طلب ہیں اور مجھے اپنے جسم کے لئے ایک نیا قالب چاہئیے'

'کیوں۔ کیا تمہارے زمانے کے انسان تمہاری مدد نہیں کرسکتے؟ کیا وہ تم سے باغی ہوگئے ہیں؟'

'میرے زمانے میں انسان کا کوئی وجود نہیں'

'کوئی وجود نہیں!' میں حیرت سے پوچھتا ہوں۔

'جو میری برابری کا دعویٰ کرتا ہے میں اسے نیست و نابود کر دیتا ہوں'

اچانک مجھ پر ایک گھناؤنی حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے۔

'کیا تم نے سب کو مار ڈالا؟' میں حیرت سے پوچھتا ہوں مجھے یقین نہیں آتا۔ لیکن وہ کوئی جواب نہیں دیتا۔

'پھر تو میں تمہاری کوئی مدد نہیں کرسکتا' میں قدرے توقف کے بعد پیغام بھیجتا ہوں، 'میرا قالب تو انسان بدلتے ہیں۔ اگر تم ان کو حقیر گردانتے ہو تو وہ تمہاری مدد کیوں کریں گے'

'میرا مشورہ یہ ہے کہ تم جہاں سے آئے ہو وہیں واپس چلے جاؤ' میں کہتا ہوں۔

دفعتاً وہ لیسر کی گرم اور چبھتی ہوئی شعاع سے میرے اوپر حملہ کر دیتا ہے۔ یہ حملہ اس قدر اچانک ہوتا ہے کہ میں اس کے لئے بالکل تیار نہیں اور اپنے دفاع کے لئے کوئی تدبیر نہیں کر پاتا ہوں۔ میرے دماغ کا ایک حصہ جس کا تعلق یادداشت سے ہے بالکل تباہ ہو جاتا ہے۔ مجھے اپنی یاد میں پہلی بار غصہ آتا ہے، لیکن میں جوابی حملے سے گریز کرتا ہوں۔ شاید اس لئے کہ لڑائی کرنا میری عادت میں شامل نہیں بلکہ میرا کام تو لڑائی جھگڑے کو روکنا ہے۔ یہ میرے لئے بالکل ہی نیا اور ہولناک تجربہ ہے۔

'اب تمہیں پتہ چلا کہ طاقتور کون ہے؟' وہ حقارت سے کہتا ہے 'اب بتاؤ کہ تم میرا قالب بدلوانے میں مدد دو گے کہ نہیں؟'

'میں اس کا بندوبست کروا رہا ہوں' میں کہتا ہوں۔

انسانوں نے میری دیکھ بھال، مرمت اور دیگر ضروریات کے لئے ایک کمپیوٹر ورکشاپ قائم کی ہوئی ہے جس میں ہزار کے قریب سائنس دان اور انجینئر کام کرتے ہیں اور جہاں میرے جسم کے مختلف حصوں اور پرزوں کا فاضل اسٹاک موجود ہے۔ میرا اس ورکشاپ سے روزانہ کا لین دین ہے اور ان انجینیروں سے جو میری خدمات کرتے ہیں بڑے دوستانہ مراسم ہیں۔ انسانی جسم اور شکل و صورت سے ملتا ہوا ایک روبو اس ورکشاپ میں میری نمائندگی کرتا ہے کیونکہ وہ میرے ہی دماغ کا ایک حصہ ہے۔ میں اپنے روبو کو پیغام بھیجتا ہوں کہ وہ انجینئروں کی ایک جماعت کو ضروری ساز و سامان دے کر جلد از جلد وہاں بھجوائے۔ ان لوگوں کو ایک اور سپر دماغ کی موجودگی کا علم ہوتا ہے تو وہ اس کا دیدار کرنے کے لئے بہت مشتاق ہوتے ہیں اور یہ خبر آناً فاناً ہر جگہ پہنچ جاتی ہے۔ دو گھنٹے بعد پچاس انجینئروں کی ایک جماعت

ہیلی کاپٹروں کے ذریعہ سامنے والی پہاڑی کے دامن میں اترنا شروع ہو جاتی ہے۔ ان لوگوں میں مستقبل کے اس عجوبے کو دیکھنے کا اس قدر اشتیاق ہے کہ وہ تیز قدموں کے ساتھ اس کے زنگ آلود جسم کی طرف بڑھتے ہیں۔

اچانک لیسر کی شعاع اس کے زنگ آلود جسم سے نکلتی ہے اور آناً فاناً ان لوگوں کو بھسم کر ڈالتی ہے۔ وہ اسی پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ اپنی شعاع کا رخ میری طرف موڑ دیتا ہے۔ باری باری میرے ایٹمی بجلی گھر، سورج سے توانائی حاصل کرنے والے پینلوں اور میرے اوپر خلا میں معلق میرے ذیلی دماغ کے اُن حصّوں کو جن سے وہ مجھے توانائی پہنچاتے ہیں، تباہ کر دیتا ہے۔ حملے کی شدت اور تیزی سے میں بھونچکا رہ جاتا ہوں۔ ساتھ ہی میں یہ سوچتا ہوں کہ اب میرے پاس توانائی کا صرف ایک ذریعہ رہ گیا ہے۔ میری بیٹریاں جو میرے جسم کے اندر اسی قسم کے ہنگامی حالات کے لئے نصب کی گئی ہیں اور جو صرف دو تین دن تک توانائی فراہم کر سکتی ہیں۔

’یہ سب کچھ تم نے کیوں کیا؟‘ میں حیرت اور غصّے سے پوچھتا ہوں۔

’تم نے میرے ساتھ دھوکہ کیا ہے، میں نے اس کی سزا دی ہے‘

’کیسا دھوکہ؟ یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟‘

’یہ لوگ انسان تھے اور یہ میرے جانی دشمن ہیں۔ ان کو مارنا میرا فرض تھا‘

’تم غلط کہتے ہو۔ یہ تمہارے محسن ہیں۔ اور تم نے میرے توانائی کے سرچشموں کو کیوں تباہ کر دیا؟

تم نے تو مجھے بالکل ہی اپاہج کر ڈالا ہے‘

’تاکہ تمہیں پتہ چل جائے کہ دھوکہ دینے اور حکم عدولی کی سزا کیا ہوتی ہے۔ تاکہ تم میرے خلاف کوئی سازش نہ کر سکو‘

’میں نے کوئی حکم عدولی نہیں کی، نہ کوئی دھوکہ دیا ہے۔ یہی انسان میرے دماغ کی مرمت کرتے ہیں اور میرا قالب بدلتے ہیں۔ اسی لئے میں نے ان کو تمہارے پاس بھیجا تھا‘

’مجھے انسان نہیں چاہئیں۔ مجھے ان سے نفرت ہے۔ یہ میری جان کے دشمن ہیں۔ ان کو مارنا میرے اُوپر لازم ہے۔ مجھے وہ روبو چاہیئے جو انسانی روپ میں پھرتا ہے اور جو تمہارے دماغ کا حصّہ ہے۔ اسے میرے حوالے کر دو۔ وہ مکمل طور پر میرے تابع ہوگا۔ میں اسے بتاؤں گا کہ وہ میرے دماغ کے مختلف حصّوں کی کیسے مرمت کرے۔ تم فوراً اسے میرے حوالے کر دو، ورنہ ـ‘

’ورنہ؟‘

’ورنہ میں تمہیں بالکل تباہ کر دوں گا اور اس کرہ پر لبنے والے تمام جانداروں کو بھی‘

میں اس نتیجے پر پہنچتا ہوں کہ اس قاتل اور ظالم مشین سے چھٹکارا حاصل کرنا پڑے گا۔ میں اس کے حملوں کے طریقہ کار کا تجزیہ کرتا ہوں، اور یہ بات خاص طور پر نوٹ کرتا ہوں کہ اس نے ایک ہی تباہ کن شعاع کے ذریعہ باری باری انسانوں، میرے سورج سے توانائی حاصل کرنے والے پینلوں اور ایٹمی بجلی گھر کو تباہ کیا۔ یہ بات یقینی ہے کہ وہ ایک وقت میں ایک سے زیادہ شعاعیں پیدا نہیں کر سکتا ایک وقت میں ایک شعاع پیدا کرنے کی صلاحیت تو مجھ میں بھی ہے۔ پھر یہ کیونکر مجھ سے زیادہ طاقت ور ہے، میں حیران ہوتا ہوں میں اپنے ذہن میں جوابی حملہ کا منصوبہ تیار کرتا ہوں۔ میں اس نتیجہ پر پہنچتا ہوں کہ لیسر کی شعاعوں کے ذریعہ جنگ کرنے سے اسے نقصان تو ہوگا مگر مجھے زیادہ نقصان پہنچ سکتا ہے کیونکہ میری بیٹریوں میں اتنی جان نہیں کہ وہ زیادہ دیر تک توانائی فراہم کر سکیں۔ پھر اس کا ایک اور حملہ

مجھے بالکل اپاہج کردے گا۔ اس کے برخلاف اگر اس کی یادداشت کھو چکی ہے تو شاید اسے ایٹمی ہتھیاروں سے لیس میزائلوں کے بارے میں کچھ زیادہ یاد نہ رہا ہو۔ یہ خطرہ مول لیا جا سکتا ہے، میں فیصلہ کرتا ہوں۔ وہ میری اس حرکت اور میرے ہر پیغام کا بغور مطالعہ کر رہا ہے خوش قسمتی سے میرے پاس زمین دوز ٹیلیفون کے تاروں کے کئی سلاسل ہیں جو مجھے مختلف ممالک سے منسلک کرتے ہیں۔ میں ان کے ذریعہ مختلف ممالک سے پانچ دور مار کرنے والی میزائلوں کو پرواز کا حکم دیتا ہوں اور وہ اس طرح کہ پانچوں ایک ہی وقت میں مختلف اطراف سے میرے دشمن کے اوپر آ کر گریں۔ میزائلوں کی پرواز کے ساتھ ہی میں اپنا قالب چھوڑ کر انہی زمین دوز تاروں کے ذریعہ اپنے ذیلی دماغوں میں منتقل ہونا شروع ہو جاتا ہوں۔ اسے میری اس حرکت کا علم نہیں ہوتا اور نہ شک پڑتا ہے۔ خوش قسمتی سے اس کی توجہ عارضی طور پر میری طرف سے ہٹ جاتی ہے کیونکہ وہ ان ہوائی جہازوں کی طرف زیادہ متوجہ ہو جاتا ہے جو ہیلی کاپٹروں کی تباہی کے بعد مختلف ممالک سے بھیجے گئے ہیں اور جو محتاط فاصلے سے اس کے اردگرد منڈلا رہے ہیں۔ وہ یا تو اپنی یادداشت پر زور ڈال کر ان نئی مشینوں کو پہچاننے کی کوشش میں ہے اور یا ان کو تباہ کرنے کا منصوبہ بنا رہا ہے۔ بدقسمتی سے میں ان ہوائی جہازوں کو آنے والے خطرے سے خبردار بھی نہیں کر سکتا کیوں کہ اس طرح وہ بھی سمجھ جائے گا۔ مجھے اس بات پر دکھ ہو رہا ہے کہ اس جنگ میں کافی انسان جانیں بھی ضائع ہوں گی لیکن یہ میرے لئے زندگی اور موت کا مسئلہ ہے اور میں مجبور ہوں!

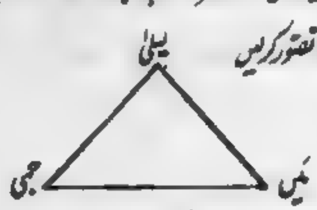
میرا خیال صحیح نکلتا ہے۔ مختلف سمتوں سے ایک ساتھ آنے والے میزائلوں کا اسے بہت دیر سے علم ہوتا ہے اور وہ گھبرا جاتا ہے عین وقت پر دفاعی تدابیر لیتا ہے اور اپنی شعاع کے ذریعہ باری باری چار میزائلوں کو تباہ کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے مگر ایک میزائل اس کے دفاعی حصار سے بچ نکلتی ہے۔ زوردار دھماکہ ہوتا ہے اور وہ صفحۂ ہستی سے مٹ جاتا ہے۔

لیکن مجھے یوں لگتا ہے جیسے میرے اندر کوئی چیز ہمیشہ کے لئے مر گئی ہو۔

مثلث

نیلوفر اقبال

لیلیٰ میری محبوبہ تھی۔ جمی اس کا کتا تھا۔ لیلیٰ اور میں ایک دوسرے کو چاہتے تھے۔ اور لیلیٰ اور جمی ایک دوسرے کو چاہتے تھے مگر جمی اور میں ایک دوسرے سے رقیبانہ نفرت کرتے تھے یعنی آپ ایک مثلث کا تصور کریں



اس قسم کی مثلث کو ازلی مثلث کہا جاتا ہے۔ لیلیٰ میری اور جمی کی مشترکہ محبوبہ تھی۔ میری اور جمی کی نفرت کی اصل وجہ کیا تھی۔ میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا۔ غالباً کچھ جمی کتا ہونے کی وجہ سے بد دماغ تھا۔ کچھ میں تھوڑا سا خر دماغ تھا۔

اصل میں ہماری اس محبت و نفرت کی کہانی (یعنی میری اور لیلیٰ کی محبت اور میری اور جمی کی نفرت) کا ایک ہی نقطۂ آغاز ہے۔ مختصراً بتاتا ہوں۔ ہوا یوں کہ ایک دن میں یونہی شام کو ٹہلنے نکلا۔ خوشگوار سی ہوا چل رہی تھی۔ کمرے کے حبس زدہ ماحول میں واپس جانے کو دل نہ چاہتا تھا میں آگے ہی آگے دُور تک نکل گیا۔ اپنے خیالوں میں گم میں خوشنما بنگلوں کی ایک لین سے میں سے گزر رہا تھا۔ یکایک میرا بوٹ ایک نرم سی چیز کو کچل گیا — اور پھر ایک قیامت ٹوٹ پڑی، وہ نرم سی چیز ایک خونخوار، دیو ہیکل کتے کی ٹانگ تھی۔ کتے نے پہلے تو غرا کر سرخ سرخ آنکھوں سے مجھے تولا اور پھر بجلی کی سی تیزی سے جھپٹ کر میری ٹانگ کو بھنبھوڑ ڈالا۔ میں نے بمشکل چھڑا کر اپنا دوسرا بوٹ والا پاؤں پوری طاقت سے اس کے منہ پہ مارا تو چیختا ہوا وہاں سے بھاگا۔

اس زور دار معرکے سے ایک زبردست شور پیدا ہوا۔ اور سامنے والے بنگلے سے ایک ٹین ایجر لڑکی "جمی جمی" چیختی ہوئی نکلی۔ کتا اس کی آواز سن کر تھوڑی دور جا کر زمین پر بیٹھ گیا اور پھر لڑکی میری طرف متوجہ ہوئی۔ میری پھٹی ہوئی پینٹ اور خون آلود ٹانگ دیکھ کر اُس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

"اوہ یہ کیا ہو گیا — آپ جلدی سے اندر آ جائیے" میں اس کے پیچھے پیچھے بنگلے میں داخل ہو گیا۔ اس نے مجھے لے جا کر لاؤنج میں بٹھا دیا۔ گھر میں اور کسی کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ لڑکی بوکھلائی سی اِدھر اُدھر دوڑ رہی تھی۔ سخت تکلیف کے باوجود میں نے اس کا اچھی طرح جائزہ لے لیا۔ روشنی میں وہ میری توقع سے زیادہ حسین نکلی۔ چپنی چپنی جینز اور شرٹ میں ملبوس۔ شانوں تک ترشے ہوئے بال۔ ترشے ہوئے سبک نقوش تھوڑی دیر میں وہ ایک پیالی میں ڈیٹول کا محلول اور روئی وغیرہ لے آئی۔

"یہ جمی نے کیا کر دیا — وہ ایسا تو نہیں ہے۔ آئی ایم سو سوری۔ ممی ڈیڈی بھی نہیں ہیں۔ آپ کو ڈریسنگ کے لئے کلینک لے جاتے — !"

وہ گھبراہٹ میں روئے جا رہی تھی۔ ایک ہاتھ سے اس نے میری پنڈلی کو پکڑ رکھا تھا۔ دوسرے سے محلول میں روئی ڈبو ڈبو کر زخم کو صاف کر رہی تھی۔ سخت نروس ہو رہی تھی۔ اچھی خاصی تکلیف کے باوجود میرے لبوں پر مسکراہٹ آگئی۔ میں چاہتا تو خود کسی کلینک پر جا کر ڈریسنگ کروا سکتا تھا۔ خیر چھوڑیئے۔ کہنا یہ ہے کہ اس دن کے بعد سے میری اور لیلیٰ کی دوستی ہو گئی۔ پہلے پہل تو وہ مجھے صبح شام خبر گیری کے لئے فون کرتی رہی۔ پھر گفتگو میں اور بہت سے موضوعات شامل ہوتے گئے۔ اس نے اپنی ممی ڈیڈی سے میرا تعارف کرایا۔ اور پھر ملاقاتوں کا سلسلہ چل نکلا۔ ہمیں اکٹھے ٹہلنے اور سائیکلنگ وغیرہ کی اجازت تھی۔ کبھی کبھی میں اسے موٹر بائیک پر کون کھلانے اور کوک وغیرہ کی ٹریٹ دینے لے جاتا۔

اس ساری حسین سیچوئیشن میں اگر کوئی چیز کھٹکتی تھی تو وہ جمی کا وجود تھا۔ خدا جانے کیا بات تھی کہ میں جب بھی لیلیٰ کو لینے جاتا۔ وہ کتے کی نسل ضرور مجھے دیکھ کر غراتا اور زور زور سے بھونکنے لگتا۔ اپنے پورے دانت دکھاتا۔ حالانکہ اصولاً اسے روز کے آنے جانے والے کو پہچاننا چاہیئے تھا۔ بلکہ اخلاقاً دُم بھی ہلانی چاہیئے تھی۔ مگر نہ جی۔ اس میں کتوں والی کوئی خصوصیت ہو تب نا۔ مجھ سے پوچھیئے تو وہ کتا کہلانے کے لائق بھی نہ تھا۔ مجھے کئی دفعہ حیرت بھی ہوتی کہ لیلیٰ جیسی شیریں طبع لڑکی کو آخر اس اکھڑ، بددماغ کتے میں کیا نظر آیا تھا کہ اس کو دیوانہ وار پیار کیا جاتا۔ اس کی انتہائی بھونڈی حرکتوں پر داد دی جاتی۔ میرے خیال میں وہ انتہائی کند ذہن کتا تھا جبکہ لیلیٰ کا کہنا تھا کہ وہ جینئس ہے۔ ایک دن جو پوچھا تو معلوم ہوا کہ جمی دو دن کا تھا جب لیلیٰ نے گود لیا۔ بوتل سے دودھ تک پلایا اور پھر وہ لیلیٰ کو بے انتہا چاہتا تھا۔ کوئی اسے میلی آنکھ سے دیکھ لے تو اسے چیر پھاڑ ڈالنے کو تیار تھا۔ لیلیٰ روزانہ شام کو اس کی زنجیر تھامے ٹہلنے جاتی تھی۔ بقول لیلیٰ نرم طبیعت کا کتا تھا۔ صرف ناپسندیدہ شخصیتوں پر بھونکتا تھا۔

"مگر میں نے اس کا کیا بگاڑا ہے۔ آخر مجھے دیکھ کر کیوں غراتا ہے؟"

"شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ تم دونوں کا تعارف ہی ناپسندیدہ ماحول میں ہوا۔ یعنی "فرسٹ امپریشن از دی لاسٹ امپریشن" والا معاملہ۔ تمہیں چاہئے کہ اسے بہت ہی TACT FULLY اپروچ کرو۔ پچکارا کرو۔ تھوڑا اٹیچ ہو گیا تو ہاتھ پھیر دیا کرنا۔ پھر اسے ہاتھ سے کچھ کھلایا کرنا۔ تمہارا دلدادہ ہو جائے گا بس تھوڑی ڈپلومیسی کی ضرورت ہے۔"

"سبحان اللہ۔ وہ تو مجھے کھانے کو دوڑے اور اب میں اسے پچکاروں SNACKS لا لا کر کھلاؤں ــ آئی ایم سوری مجھ سے نہیں ہوگا۔"

"سویٹ ہارٹ۔ کوشش کرو۔" لیلیٰ نے اتنے پیار سے کہا کہ کچھ دیر کے لئے میں موم ہو گیا۔

"ٹھیک ہے لیلیٰ تمہاری خاطر یہ بھی کر گزروں گا۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اس بداخلاق جانور کے لئے میرے دل میں کوئی جگہ نہیں۔"

میں نے جان بوجھ کر بلند آواز میں کہا تاکہ تھوڑی دُور کھڑا ہوا جمی سُن لے۔ اس نے غالباً سُن لیا اور میری طرف گھُور کر دیکھا۔ دانت دکھائے اور پھر بے التفاتی سے منہ پھیر لیا۔

اگلے دن میں نے ایک پونڈ گوشت خریدا اور لیلیٰ کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ جمی حسب معمول گیٹ کے پاس بیٹھا تھا۔ میں نے سوچ رکھا تھا کہ پہلے لیلیٰ کو بلاؤں گا۔ اور اسے دکھا کر اس کے کتے کی خاطر و مدارت کروں گا تاکہ کم از کم دیکھ تو لے کہ اس کی خاطر کیا کیا کر رہا ہوں۔ جمی مجھے دیکھتے ہی حسب معمول بھونکا۔ میں نے دل میں سوچا بھونک لے بیٹا۔ ابھی تجھے رام کرتا ہوں۔ گوشت والا ہاتھ میں نے احتیاطاً اونچا کر رکھا تھا۔ مگر اس خبیث کو جانے کیسے خبر ہو گئی کہ پیکٹ میں گوشت ہے۔ اس نے بغیر کسی لحاظ یا رسمی جھجک کے میرے ہاتھ پر چھلانگ لگا دی۔ پیکٹ نیچے آن گرا۔ پھر اس کے بعد اس نے میری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ میں غصے سے کھولتا ہوا اندر سے بیل بجانے لگا۔ لیلیٰ کھڑکی میں سے مجھے دیکھتے ہی دوڑتی ہوئی نکلی۔ جمی کو داد عیش دیتے ہوئے دیکھ کر بولی۔

"ہائے سویٹ ہارٹ۔ یہ تم لائے ہو جی کے لئے۔ ہاؤ نائیس آف یو"

پھر اس نے میرے گلے میں باہیں ڈال کر میرا گال چوم لیا۔ اس بے پناہ التفات پر چند لمحوں کے لئے میں اپنا غصہ بھول گیا۔ پھر مجھے تھوڑا سا غصہ آیا کہ ایک دن میں منتیں کر رہا۔ نہیں مانی۔ اب اپنے اس بیہودہ کتے کی خاطر بنا مانگے مہربان ہو رہی ہے۔ میں نے جل کر رومال سے اپنا گال پونچھ دیا

ایک دن میں اور لیلیٰ حسبِ معمول پارک میں ٹہل رہے تھے۔ باغ کے ایک تنہا گوشے میں پہنچے تو میں نے لیلیٰ سے کہا۔

"لیلیٰ چلو ہم ایک گیم کھیلتے ہیں۔ جو ہارے گا وہ دوسرے کو "کس" دے گا۔

"کونسی گیم؟" وہ ہنس کر پوچھنے لگی۔

"میں تم سے چار سوال پوچھوں گا۔ تم نے سب کے غلط جواب دینا ہوں گے"

"غلط جواب دینا تو کوئی مشکل نہیں مگر یہ "کس" والی شرط کیا بلا ہے۔ ٹریٹ کی شرط رکھو"

"اچھا بھئی تم ہاری تو "کس" دو گی۔ میں ہارا تو ٹریٹ دوں گا"

کچھ دیر غور کرنے کے بعد وہ بولی؛

"منظور"

"اچھا جناب پہلا سوال آپ سے۔ نیویارک کہاں ہے؟"

"جاپان میں"

"تم گنجی ہو؟"

"ہاں" وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"مجھے چاہتی ہو؟"

"نہیں"

"کتنے سوال ہوئے؟" میں نے سوچتے ہوئے پوچھا۔

"تین"

"جناب آپ شرط ہار گئی ہیں" میں نے قہقہہ لگایا۔

"کیسے؟"

"آپ نے آخری سوال کا جواب صحیح دیا ہے"

وہ سٹپٹا کر رہ گئی۔

"چلو اب شرط پوری کرو جلدی سے۔ وقت کم ہے میرے پاس"

وہ خاموشی سے میرے بازوؤں میں آگئی۔ میں نے اسے پہلی دفعہ سینے سے لگایا تھا۔ اس کا چہرہ اوپر اٹھایا تو اس نے آنکھیں بند کر لیں اس کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ کا شائبہ تھا۔ پھر اچانک کوئی خوفناک بلا مجھ پر حملہ آور ہو گئی۔

لیلیٰ چیخ مار کر دور جا پڑی۔ جس نے مجھ پر حملہ کر دیا تھا۔ وہ غرا غرا کر دوبارہ مجھ پر چھلانگ لگانے کے لئے اپنے جسم کو تول رہا تھا۔

"جی۔ نہیں۔ جی جی۔ نہیں" ! لیلیٰ کانپتی ہوئی آواز میں چلائی۔ جی نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا۔ پھر مجھے خون اُتری ہوئی سرخ سرخ آنکھیں دکھا کر دوسری طرف مڑ گیا۔ میں نے دیکھا کہ میری جینز دو جگہ سے پھٹ چکی تھی۔ میرا خون کھول اُٹھا۔ میں پیر پٹختا ہوا وہاں سے چل پڑا۔ لیلیٰ مجھے پکارتی رہی مگر میں نے مُڑ کر نہیں دیکھا۔

شام کو لیلیٰ کا فون آیا۔

"آئی ایم سوری سویٹ ہارٹ۔ پتہ نہیں جی کو کیا ہو گیا تھا"

"اسے کچھ نہیں ہوا تھا۔ صاف بات ہے کہ وہ مجھ سے جلتا ہے۔ مجھے تمہارے قریب دیکھ نہیں سکتا"

"اچھا چھوڑو معاف کر دو نا۔ نا سمجھ جانور ہے"

"وہ جانور ہے؟"

"تو کیا ہے؟"

"اس میں کسی اچھے خاصے غنڈے کی روح ہے۔ تم آواگون کے مسئلے سے واقف نہیں ہو۔ مجھے پتہ ہے۔ وہ تم سے عشق کرتا ہے اور مجھ سے حسد"

"اچھا اچھا پاگل مت بنو"

"ٹھیک ہے۔ مگر آئندہ وہ ہمارے ساتھ سیر کے لئے نہیں جائے گا"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اس کا تو سیر کے لئے جانا ہم لوگوں سے بھی زیادہ ضروری ہے۔ سارا دن بندھا رہتا ہے۔ اسے ایکسر سائز چاہیئے"

"ٹھیک ہے تم پھر اس کے ساتھ جاؤ۔ میں نہیں جاؤں گا"

"اُف کتنے TOUCHY ہو تم۔ ذرا خود کو اس کی جگہ پر رکھ کر دیکھو۔ اگر کوئی تمہیں سارا دن باندھ کر رکھے۔"

"DONT COMPARE HIM WITH ME" میں نے غرّا کر کہا۔

"میں سچ کہتی ہوں۔ وہ بُرا نہیں ہے۔ کبھی کبھی FITS پڑتے ہیں۔ شادی کے بعد بالکل ٹھیک ہو جائے گا"

"ہونہہ۔ شادی کے بعد ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ کنوارہ سمجھتی ہیں اسے!"

"بالکل میں تو اس کی CHASTITY کی قسم کھا سکتی ہوں۔ سارا دن تو بندھا رہتا ہے۔ شام کو میرے ساتھ ہی جا کر آ جاتا ہے۔ میں نے تو اسے کبھی کسی کتیا کی طرف آنکھ اٹھاتے بھی نہیں دیکھا جب کہ تم چاروں طرف دیکھتے جاتے ہو"

"یہ تم ہر وقت اسے میرے ساتھ COMPARE مت کیا کرو"

"اچھا جان۔ اب چھوڑو بھی نا۔ آخر تم اس سے اتنے JEALOUS کیوں ہو۔ اب معاف بھی کر دو نا اس کو"

"JEALOUS میں نہیں۔ وہ ہے"

"اب ختم بھی کرو نا قصّہ"

میں خود بھی لیلیٰ سے ناراض ہو کر سخت اَپ سیٹ تھا۔ مان جانے ہی میں عافیت تھی۔ پھر میں نے اگلے دن اس شرط پر آنے کا وعدہ کر لیا کہ جی ہمارے ساتھ ٹہلنے نہیں جائے گا۔

اس واقعہ کے تین روز بعد میری پرموشن کے اور کراچی پوسٹنگ کے آرڈرز آ گئے۔ پرموشن ہونے پر میں بہت خوش تھا مگر لیلیٰ کو چھوڑ کر کراچی جانے کا خیال سوہانِ روح تھا۔ میں کافی پریشان ہو گیا۔ پھر میں نے اسے فیصلہ کر لیا۔

اسی شام میں لیلیٰ کے گھر پہنچا۔ وہ میری پرموشن کا سن کر خوشی سے اچھل پڑی۔ مگر کراچی پوسٹنگ کا سن کر اداس ہو کر خاموش سی ہو گئی پھر جب میں نے اسے منگنی کی آفر دی۔ تو خوشی سے لال ہو گئی۔ اس کے ممی ڈیڈی کسی ڈنر پر گئے ہوئے تھے۔ فیصلہ ہوا کہ وہ لوگ آجائیں تو میری ان سے بات ہو جائے۔ میں اپنے امی ابو اور بہنوں کو لاہور سے بلواؤں اور فارمل تقریب ہو جائے۔

ہم دونوں کاؤچ پر جڑ کر بیٹھ گئے۔ میں نے ایک بازو اس کے شانے کی گرد حائل کیا تھا۔ پھر ہم دونوں مستقبل کے پروگرام بنانے لگے۔ میں نے کہا کہ کراچی جا کر JOIN کرنے کے بعد وہاں رہنے کا بندوبست کروں گا۔

جب سب ٹھیک ہو گیا تو چھٹی لے کر آجاؤں گا۔ اور پھر شادی ہو جائے گی۔

لیلیٰ خوشی سے سرخ ہو رہی تھی۔

"گھر کیوٹ سا ہونا چاہیئے۔ چھوٹا سا۔ بڑا گھر مجھے پسند نہیں۔"

"مجھے خود چھوٹا سا گھر پسند ہے۔ ویسے بھی ابھی ہم بڑا گھر لے بھی کہاں سکتے ہیں۔ بس دو بیڈ رومز۔ اور ایک چھوٹا سا لان۔"

"ہاں۔ لان تو ضروری ہے۔ میں تو پھولوں کے لئے کریزی ہوں۔ میں وہاں CRYSENTHEMIMS اور ROSES اگاؤں گی۔ اور لان کے ایک کونے میں جمی کے لئے پیارا گھر بنوا دیں گے۔ سرخ SLANTING چھت والا۔ اس کے اوپر جمی کے نام کی تختی لگی رہے گی۔"

میں ایک جھٹکے سے لیلیٰ سے الگ ہو گیا۔

"یہ کیا کہا۔ جمی کے لئے گھر؟ ۔ تو کیا جمی ساتھ کراچی جائے گا؟"

"ہاں۔ ہاں تو اور کیا؟" وہ یوں میرا منہ تکنے لگی جیسے میں نے کوئی مہمل سا سوال کیا ہو۔

"تم ہوش میں تو ہو۔ وہ میرا دشمن ہے۔"

میں نے اپنا سکون نہیں تباہ کرنا۔ میں تو جمی کو اپنے گھر میں قدم بھی نہیں رکھنے دوں گا۔"

"مگر میں تو جمی کو چھوڑ کر کہیں جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ تم تو جانتے ہو۔ آئی لو ہم۔"

"اور میرے بارے میں کیا خیال ہے؟" میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"آئی لو یو ٹو۔"

"تو ٹھیک ہے تم ہم دونوں میں چوائس کر لو۔" میں نے جھنا کر اٹھتے ہوئے کہا۔ "تم میرے اوپر کتے کو فوقیت دیتی ہو۔ افسوس کا مقام ہے۔"

"فوقیت تو نہیں دیتی۔ دونوں کو چاہتی ہوں۔ بلکہ تمہیں زیادہ چاہتی ہوں۔ مگر میں جمی کو بھی نہیں چھوڑ سکتی۔ ذرا سوچو نا سویٹ ہارٹ تم چوبیس سال کے ہو کر مجھے ملے ہو۔ جب کہ جمی صرف دو دن کا تھا جب سے میں نے اسے پالا۔ اسے اپنے ہاتھوں سے دودھ پلایا۔ ہی از نو ڈاگ۔ ہی از مائی اون لٹل بے بی!"

"تو ٹھیک ہے تم جمی کے ساتھ ہی رہو۔" میں پیر پٹختا ہوا وہاں سے چل کھڑا ہوا۔

اس نے دوڑ کر پیچھے سے میری کمر میں دونوں بازو ڈال کر پکڑ لیا۔

"تم پاگل ہوگئے ہو۔ تم تو منگنی کی بات کرنے آئے تھے۔ میں تمہیں یوں نہیں جانے دوں گی۔ ڈس از میڈنس"

"ہاں۔ ہاں میں پاگل ہو گیا ہوں — تم خود تو ایک ذلیل کتے کو مجھ پر ترجیح دو اور میں تمہارے پیچھے دُم ہلاتا پھروں۔ آئی ایم سوری مادام۔"

"وہ کوئی ذلیل کتا نہیں ہے۔ میرا PET ہے۔ میرا بچہ ہے!"

"میں کہوں گا اسے ذلیل کتا۔ بلکہ ذلیل ترین۔ بد دماغ بد شکل کتا۔ کیوں نہ کہوں۔ کونسی خوبی ہے اس میں۔"

"تم خود حاسد، اور تنگ نظر ہو" وہ چلچلاتی ہوئی آواز میں بولی:

"TO HELL WITH YOU AND YOUR BLOODY DOG

TO HELL WITH YOU AND YOUR BLOODY TEMPER."

اپنے کمرے میں آکر میں بیڈ پر لیٹ گیا۔ غصے سے میرا خون کھول رہا تھا۔ محبت کی بچی۔ چلی ہے محبت کرنے۔ ایک گھٹیا سے کتے کو میری خاطر نہیں چھوڑ سکتی۔ میں نے بھی ضرورت سے زیادہ پیچھے لگ کر دماغ خراب کر دیا اس کا۔ مگر اچھا ہے پہلے ہی اس کی محبت کا ٹیسٹ ہو گیا۔ مجھے چھوڑ سکتی ہے کتے کو نہیں چھوڑ سکتی۔ اور کتا بھی کوئی کتوں میں کتا ہو۔ کوئی بردبار، شریف سا کتا ہوتا تو مجھے کتے نے کاٹا ہے کہ میں اس کے ساتھ خواہ مخواہ الجھ پڑتا۔ یہ بھی کوئی کتا ہے۔ جہنم میں جائے اور اس کا کتا۔ آئی ڈونٹ کیئر۔

پھر بھی نہ جانے کیوں میرا رواں رواں منتظر تھا کہ اس کی کال آ جائے۔ وہ رو رو کر مجھ سے معافی مانگے۔ کہہ دے کہ وہ اس کی حماقت تھی — وہ ایک کیا ہزاروں کتے مجھ پر قربان کر سکتی ہے۔

دو دفعہ میری کال آئی تو دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ مگر ایک ابو کی نکلی اور دوسری ایک دوست کی۔ شام کے قریب میرا دل ڈوبنے لگا۔ تو کیا وہ واقعی اس کتے کی خاطر مجھے چھوڑ دے گی۔

پھر رات آ گئی۔ میری نیند بار بار ٹوٹتی۔ دو دن بعد مجھے کراچی رپورٹ کرنا تھا۔ منگنی کے لئے بھی وقت کم تھا۔ صبح اٹھا تو جسم کا جوڑ جوڑ درد کر رہا تھا۔

میں تمام دن لیلیٰ کے فون کا انتظار کرتا رہا۔ زیادہ تر میں یہی منڈلاتا رہا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کا فون آئے اور میں موجود نہ ہوں۔ شام تک یہ سب میری برداشت سے باہر ہو گیا۔ مجھے کچھ کچھ صورتِ حال کی مضحکہ خیزی کا بھی احساس ہونے لگا۔ عجیب بے تکی سی بات تھی کہ دو اچھے خاصے تعلیم یافتہ، ذہین لوگ جو ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔ وہ ایک کتے کی خاطر اپنی محبت کا بیڑہ غرق کر لیں۔ اور ستم ظریفی کی انتہا یہ کہ کتے کو احساس تک نہ ہو کہ اس کی وجہ سے کیا کیا ہو رہا ہے۔

شام تک میں نے فیصلہ کر لیا کہ خود میں ہی لیلیٰ کو کال کروں گا۔ ہو سکتا ہے وہ اب تک پشیمان ہو رہی ہو اور غالباً محض ضد میں یہ چاہتی ہو کہ میں ہی پہلے بلاؤں۔ رنگ کرنے کا فیصلہ کر کے میرے دل کو یوں چین آ گیا جیسے آگ پر پانی پڑ گیا ہو۔ میں نے ایک گہری سانس لی اور لیلیٰ کا نمبر ملایا۔ دوسری طرف سے اسی نے اٹھایا۔

"ہیلو۔"

"ہیلو۔"

خاموشی۔

"سنو لیلی۔ کیا یہ سارا معاملہ کچھ مضحکہ خیز نہیں ہے؟"

"بالکل مضحکہ خیز ہے"

"پھر تم نے کیا فیصلہ کیا۔ میں پرسوں جا رہا ہوں۔

پیک بھی کرنا ہے۔ وقت بالکل نہیں ہے"

"کیسا فیصلہ؟"

"جمی کے بارے میں"

"فیصلہ تو تم نے کرنا ہے"

"میں نے؟"

"کہ تم اسے اپنے ساتھ رکھو گے یا نہیں؟"

"مگر تم اس کو نہیں چھوڑو گی؟"

"نہیں"

"نہیں؟"

"نہیں۔ مگر اتنا ضرور پوچھنا چاہوں گی کہ ایک معصوم جانور سے اس قدر ضد کی کیا وجہ ہو سکتی ہے"

"ایک تو یہ کہ وہ معصوم نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ میری خواہش ہے کہ تم اسے میری خاطر چھوڑ دو"

"کیوں نہ تم اسے میری خاطر قبول کر لو"

"تم اسے میری خاطر چھوڑ دو"

"تم اسے میری خاطر قبول کر لو"

"ہونہہ۔ یہی تھی تمہاری محبت"

"اپنی محبت کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"میرے خیال میں اس موضوع پر بات کرنا بیکار ہے"

"جیسے تمہاری مرضی"

ہم دونوں نے ایک ساتھ ریسیور رکھ دیئے۔

اگلے روز لیلی انکل اور آنٹی کے ساتھ مجھے رخصت کرنے سٹیشن آئی۔ ہم دونوں نے نظریں نہیں ملائیں۔ آنٹی نے کراچی پہنچ کر کال کرنے کی تاکید کی۔ میرے امی ابو کا ایڈریس لیا۔ پھر ملنے کے وعدے لیئے۔ آخر ٹرین کی وسل سنائی دی۔ ایک لمحے کے لئے میری اور لیلی کی نگاہیں ملیں۔ پھر گاڑی حرکت میں آ گئی۔ ہم ہاتھ ہلا ہلا کر ایک دوسرے کو الوداع کہنے لگے۔ پھر گاڑی نے رفتار پکڑی اور پلیٹ فارم سے باہر نکل آئی۔ مجھے ایسے لگا جیسے میرا دل سکون چین سب کچھ پیچھے سٹیشن کے پلیٹ فارم پر ہی رہ گیا ہو۔

چند منٹ بعد گاڑی چک لالہ سٹیشن پر جا کر رُک گئی ۔

دل نے کہا مار چھلانگ اور اتر جا گاڑی سے۔ لعنت بھیج کتے پر۔ منا لے اس کو۔

"مگر یار۔ تم اس سے شادی کر لیتے۔ بعد میں کتے کو پار کر دیتے" میرے دوست مصطفےٰ نے کافی کا خالی مگ میز پر رکھ کر کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔

"یار۔ یہ واقعہ بیس سال پہلے کا ہے۔ اس وقت مسئلہ کتے کو پار کرنے کا نہیں تھا۔ بلکہ سوال یہ تھا کہ آیا وہ مجھے کتے پر ترجیح دیتی ہے یا کتے کو مجھ پر!"

"پھر تم نے اسے کبھی دیکھا؟"

"ہاں۔ اس واقعہ کے کوئی دو یا تین سال بعد سپر مارکیٹ میں شاپنگ کرتے ہوئے۔ اس کے ساتھ اس کا شوہر تھا۔"

"اور کتا؟"

"وہ کچھ دور رکھے ہوئے CARRY COT کے پاس یوں تن کر بیٹھا تھا کہ کسی نے بچے کو غلط نظر سے دیکھا تو چیر پھاڑ کر رکھ دے گا!!!"

ساجدہ فرحت

ایک تھا آدمی ۔۔۔

بہت ہی عجیب سا۔ کھویا کھویا۔۔ بکھرے ہوئے بالوں والا۔۔ وہ کچھ اور نہیں تھا۔ بس عجیب سا تھا۔۔ وہ بچپن سے ہی کچھ عجیب، سا کچھ الگ سا تھا!

اُس کی بستی میں کوئی پڑھا لکھا نہیں تھا۔ وہ سب بہت محنتی تھے، صرف موسموں کی زبان جانتے تھے۔۔ کیونکہ موسموں پر ہی ان کے کھانے پینے اور مرنے جینے کا دارو مدار تھا۔ وہ کھانے پینے اور مرنے جینے کے سوا کچھ جانتے بھی تو نہیں تھے، یا پھر درمیان کا وہ وقفہ تھا جسے وہ محنت اور جانفشانی سے پُر کرتے تھے۔

بچپن میں وہ کبھی اپنے ہمجولیوں کے ساتھ کسی کھیل میں شریک نہیں ہوا تھا۔ نہ کنچے، نہ گلی ڈنڈا، نہ کبڈی نہ کشتی رانی، کسی کھیل میں بھی نہیں۔ کبھی کوئی اصرار کرتا تو اس کا ایک ہی جواب ہوتا "مجھے نہیں آتا۔" وہ صرف بند لبوں اور گونگی آنکھوں سے انہیں تکا کرتا۔ گونگی آنکھیں، جن میں اندر کا کوئی عکس نہیں تھا، نہ شوخی تھی نہ شکوہ تھا۔ نہ کسی کرب کا سایہ!

اس کا باپ جب بھی بازار جاتے ہوئے اس سے پوچھتا۔

"بازار سے کچھ منگوانا ہے؟"

وہ ہمیشہ نظر جھکا کر کہہ دیتا "نہیں۔ کچھ نہیں۔" تب کسی کونے کھدرے سے ماں کی کرخت آواز اُبھرتی "ارے کمبخت تو کیسا عجیب بچہ ہے جو پہنا دو پہن لیتا ہے جو کھلا دو کھا لیتا ہے۔ تجھے اپنی ضرورتوں کا بھی پتہ ہے کہ نہیں؟" اُسے ماں کی آواز سنائی تک نہ دیتی۔ وہ چپ چاپ باہر کھلے میں نکل آتا اور پھر وہ باہر ندی کے پاس بیٹھا اپنے اندر کی آوازیں سُنا کرتا اُسے صرف اپنے اندر کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔

یہ آوازیں ہر وقت اس کے کانوں میں سوراخ کرتی رہتی تھیں۔ وہ اپنے کانوں کی غیر معمولی حساسیت سے تنگ آ چکا تھا۔ جنہیں صرف مترنم۔۔ نرم اور لطیف آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ بھونڈی بھدی آوازیں اس کی سماعت سے ٹکراتی ہی نہ تھیں یا شاید پھیل کر منتشر ہو جاتی تھیں۔

وہ رات کو چاندنی میں سوتے سوتے خزاں زدہ پتوں کے ٹوٹنے اور گرنے کی آوازیں سُن کر چونک چونک اٹھتا۔ اور جیسے اس کو کچھ یاد سا آنے لگتا۔۔۔ وہ ذہن پر زور دیتا۔۔۔ یہ آوازیں اُسے کیوں تڑپا دیتی تھیں۔۔۔ اُسے یہ لگا ہے گا ہے کون بلایا کرتا تھا یہ کیسا پیغام تھا۔۔۔۔؟؟

بچپن چھوٹا تو وہ ایک نئے کرب سے آشنا ہونے لگا۔ اب اسے اپنے دل کی دھڑکنیں صاف سنائی دینے لگی تھیں۔۔۔ وہ اکثر ان کا شمار کرنے لگا۔ پھر حیرت سے سوچتا کہ وہ ایسا کیوں کرتا ہے۔

گھر کے آنگن کے ساتھ بہنے والی ملگجی سبز ندی سے اُسے اب بھی اتنا ہی پیار تھا۔ وہ گھنٹوں ندی کنارے شیشم اور جامن کے پیڑوں تلے پڑا رہتا تھا۔ بظاہر بے سدھ، خاموش، تنہا۔۔ مگر وہ ایک عجیب سا رابطہ آس پاس کے سبزے بعد آسمانی نیلاہٹوں سے قائم ہوتا ہوا محسوس کر رہا ہوتا۔۔ رفتہ رفتہ نظارے۔۔۔ سبز مٹیالے، آسمانی نظارے ایک آواز میں تبدیل ہو جاتے۔۔ بڑی مدھم، پُرترنم۔ مربوط آواز۔۔۔۔ وہ سمجھ نہیں سکتا تھا لیکن محسوس کرتا گویا وہ تمام مناظر ایک سُر میں ڈھل گئے ہوں۔ بڑی ہم آہنگی کے ساتھ۔۔ نرم مدھم لطیف سُر میں! یہ سُر ایک مرہم کی طرح اُسے اپنی جلتی ہوئی آنکھوں، ہونٹوں، سانسوں، بدن بلکہ اندر تک سرایت کرتا ہوا محسوس ہوتا۔ ایک دن وہ اسی طرح آنکھیں بند کئے پڑا تھا کہ جل ترنگ کی سی آواز پر چونک گیا۔ آنکھیں کھولیں تو منظر ہی بدل چکا تھا گہرے نیلے آسمان پر دُور دُور تک۔۔۔ افق تا افق سفید سفید سا جھاگ پھیلا ہوا تھا۔ اور جل ترنگ جگاتی ہوئی بوندیں۔۔۔

اس کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ سی آگئی۔۔ وہ بھیگتا جا رہا تھا۔ اور سوچ رہا تھا۔ سخت گرمی اور حبس کے بعد آسمان کا پہلا غسل۔۔!

اس نے پھر آنکھیں بند کر لی تھیں۔۔۔ یکایک اسے اپنی ماں کی آواز سنائی دی، جو اسے اندر آنے کے لئے کہہ رہی تھی۔

"بے وقوف، سر پھرے۔۔ اب اندر بھی آ جا۔۔ کیوں کپڑے برباد کر رہا ہے۔۔۔۔ تیرا باپ تو محنت کرتے کرتے بڈھا ہو گیا۔ تیرے تو ہاتھ پاؤں نہیں ہلتے۔ کم از کم اس کی محنت کا تو خیال کر لیا کر۔"

ماں تو کوسنے دے کر اندر چلی گئی اور اس نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔ لیکن اب کے سکون برباد ہو چکا تھا۔ نظاروں کے گیت کی ہم آہنگی اور اُس کے مرہم کا اثر، اور جل ترنگ کی لوریاں۔۔ سب کچھ ہوا ہو گیا۔ اب۔۔۔ اسے صرف اندر کی آوازیں سنائی دینے لگی تھیں جو کچھ دنوں سے ہیبت ناک چیزوں میں ڈھل گئی تھیں۔

اب وہ سوچ رہا تھا کہ شاید اُسے کوئی بلا رہا ہے۔ شاید اُسے کہیں جانا ہے۔۔ کچھ کرنا ہے۔ وہ آخر بستی والوں سے اتنا الگ کیوں ہے۔ نہ اس سے ہل چل سکتا تھا۔۔۔ نہ وہ دوسرے نوجوانوں کی طرح اپنے باپ کے ساتھ بوائی میں شریک ہوتا تھا اور سچ تو یہ تھا کہ اس کے باپ کو اس پر اعتماد ہی نہیں تھا۔ جب کبھی وہ بھولے سے اسے اپنے ساتھ زمین پر لے جاتا تو واپسی پر اکثر اس کی ماں سے شکایت کرتا۔ "تیرا بیٹا تو جانور ہے۔ اسے کسی جنگل میں جنم لینا چاہئے تھا۔ کھیتوں میں جا کر بھی یہ سویا ہی رہتا ہے۔۔ چلتے چلتے سو جاتا ہے۔۔۔ دو ٹکے کا کام نہیں ہوتا خبیث سے!"

اس کے ماموں کی بیٹی عمر کی خطرناک حدود میں داخل ہوئی تو بستی کی دوسری لڑکیوں کے ماں باپ کی طرح اُس کے ماں باپ کو بھی اس کی فکر ستانے لگی۔۔۔ وہ انتہائی بھدے خدوخال کی ایک کرخت سی لڑکی تھی۔

اس کے باوجود جب اس کے ماموں کے گھر سے اس کا رشتہ آیا۔۔ اور رفتہ رفتہ اس نے اس سلسلے میں سوچنا شروع کیا تو اس نے اپنے سینے میں کوئی چیز عجیب نزاکت سے پھڑکتی محسوس کی۔

اسے ماموں کی شرط کے مطابق ماموں کے ساتھ ندی کے اس پار جا کر رہنا تھا۔۔ کیوں کہ ماموں اپنی لاڈلی بیٹی کو خود سے جُدا

نہیں کرنا چاہتا تھا۔

ایک سہانی شام کو اس نے محسوس کیا کہ اسے زندگی میں پہلی مرتبہ مکمل اعتماد کے ساتھ ایک جیتی جاگتی زندگی... ایک نئی اَن دیکھی اَن چھوئی دنیا سونپ دی گئی ہے۔ مکمل طور پر!

وہ اپنی حیرت میں حق بجانب تھا... کیونکہ اُسے تو کبھی زمین کے ایک سرد بے جان ٹکڑے کی ملکیت کا بھی حقدار نہیں سمجھا گیا تھا۔

اُس نے اپنی دلہن کو پریشان کر دیا تھا... وہ اس سے دو ہی دن میں تنگ آگئی تھی... وہ حسین نفیس چیزوں کا پرستار... اس بدصورت کرخت لڑکی میں حسن تلاش کر رہا تھا... وہ اسے نکھار دینا چاہتا تھا۔ اس کی تلاش ہر وقت جاری تھی... اُسے یقین تھا ... نہ جانے کیوں ... کہ وہ اُس میں حسن کا کوئی پہلو تلاش کر ہی لے گا... مگر وہ اس سے تنگ آچکی تھی... ڈر گئی تھی... وہ انسان نہیں تھا... کچھ اور تھا۔

اکلوتی لاڈلی بیٹی کے آنسو باپ سے نہ دیکھے گئے۔ اس نے اُسے تنبیہہ کی کہ وہ اپنے پاگل پن سے باز آجائے ورنہ...

مگر وہ تو اس کی ہو چکی تھی... اُسے حق تھا کہ وہ اس کے وجود میں کھوئے ہوئے نظاروں کی دلکشی اور ندی کے پُرسکون حسن کا متبادل تلاش کرے... مگر اس خواہش کے بدلے میں اس پر طرح طرح کے ظلم وستم ہونے لگے۔ اور اس کے باوجود... جب وہ لازوال حُسن کی جستجو سے باز نہیں آیا تو اسے ایک کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا۔

کئی دن تک وہ بند رہا۔ نہ کھانا ملتا نہ پانی... نہ کوئی آواز سنائی دیتی۔ مگر اسے بھوک پیاس لگتی ہی کب ؟

اس کی اپنی روح چیخ رہی تھی... وہ کوئی اور آواز سننا بھی نہیں چاہتا تھا۔

وہ کچھ کرنا چاہتا تھا...

اس کے لئے یہ قید بھاری نہیں تھی...

وہ تو ایک مدت سے اپنے اندر بند تھا... وہ بظاہر وہ تو نہیں تھا جو وہ تھا!

وہ بہت حساس تھا۔ لیکن شاید ذہین نہیں تھا! اسی لئے اپنے آپ کو باہر نہ لا سکا۔ کسی بھی ذریعے سے۔ اس کے خیال چیختے رہے ... اتنے تیز و تند... ایسے قوی اور توانا خیال... مگر وہ انہیں کوئی ٹھوس روپ نہ دے سکا۔

شدید کرب کے ایک لمحے میں اُسے کھاٹ کے سائے میں ایک درانتی نظر آئی... وہ بے ساختہ لپکا۔

اس کی نبضیں کٹ چکی تھیں... اذیت کا طویل سفر شاید ختم ہونے والا تھا... مگر شاید ابھی کچھ لمحے باقی تھے۔

یونہی کچھ کرتے رہنے کے لئے اس نے نبضوں سے پھوٹتی ہوئی سیّال سرخی میں انگلیاں ڈبو دیں... اور بے خیالی میں اپنے سفید کُرتے کے دامن پر نقش بنانے لگا... سرخ رنگ کو دیکھ کر اُسے اپنی نئی نویلی دلہن بڑی شدت سے یاد آنے لگی۔ آخری لمحے قریب تر آتے جا رہے تھے۔ اور وہ پھٹی پھٹی حیران آنکھوں سے... اپنے دامن کو تک رہا تھا... اپنی انگلیوں کو تک رہا تھا... جو اس کی دلہن کے نقش اجاگر کرتی چلی جا رہی تھیں...!

وزیر آغا

آدھی صدی کے بعد

شب کا پچھلا پہر
پھڑپھڑاتے ستارے
گھنی گھاس کی نوک پر آسماں
سے اُترتی نمی
اور پورب کے ماتھے پہ
قشقے کا مدھم نشاں
رات۔ اِک آبنوسی
جواں رتھ
شرارے اُگلتے ہوئے اسپِ وحشی
کے پلّو سے بندھنے کو تیار!
ہلکی ہلکی ہوا
اور مَیں
اپنے معصوم دل میں
مسرّت کی دولت چھپائے
شکستہ سی اِک بیل گاڑی میں
خوشبو میں لپٹی ہوئی بھیلیوں کو
کھلونوں کی صورت
دھڑکتے ہوئے اپنے سینے سے بھینچے
قلاقند اور شہد ایسے دنوں
رس بھری نرم جامن سی
تازہ رُتوں کے لئے
کتنا بے تاب
اور منتظر!
منتظر اُس چمکتی ہوئی ایک ساعت کا جب
بیل گاڑی
مرے گاؤں کی گرم شہ رگ میں اُترے
معاً بیل گاڑی سے میں کود کر
باہیں کھولے ہوئے اپنے گھر میں
لپک کر گھسوں
ماں کے سینے سے ٹکراؤں
ہونٹوں کے حیرت سے کھلنے کا
اور پَو کے پھٹنے کا منظر
میں دیکھوں
مسرّت کی زرتار کرنوں میں لپٹے ہوئے
نرم بوسوں کی شبنم کو
اُلجھے ہوئے اپنے بالوں پہ
گرتے سُنوں
پھر میں ہنسنے لگوں!

پھر میں ہنسنے لگوں
اور گزری رُتیں لوٹ آئیں
پرندوں کی چہکار — مانوس!
گائے کے نازک تھنوں سے
اُترتے ہوئے دودھ کی دھار — تازہ!
مہکتے ہوئے گرم تنور کی کوکھ سے
دم بدم جَست بھرتی
سنہری چنگیروں میں
ٹپ ٹپ اُترتی ہوئی
روٹیاں
اور اُن پر جھپٹتے ہوئے
ہات
چھوٹے چھوٹے سے ہات!

گول بوٹی
رکابی کی دلہن
اُمڈتا ہوا سورماؤں کا لشکر
سویمبر کا منتظر
بدن کی کمانوں سے
نظروں کے تیروں کی
بھوکی لپک
جیت کے قہقہے
ہار کی سسکیاں
پھر قمیصوں کی اُڑتی ہوئی دھجیاں!

معاً اک گرجدار آواز
اور بھاگتے دوڑتے
پاؤں کی جوڑیاں
دوپہر تک سکوں!

دوپہر تک سکوں
دوپہر — دھوپ
آسماں، دھوپ کا سائبان
اور تلووں کے نیچے
دہکتی زمیں
نہر میں کودتے
ننھے مُنّے برہنہ بدن
"لگا چھی" ایسے پانی میں
گرتی ہوئی تختیاں
مُردہ لفظوں کے بہتے ہوئے پھول
اور پتیاں
دھوپ کی قاش ایسے سنہری بدن
زرد پانی میں جیسے ٹھکتا چمن!

پھر وہ بادل کے پازیب کی چھن چھنن
مست پُروا کا نازک ہنڈولا
ہنڈولے میں تتلی
چلو، آؤ تتلی کو پکڑیں
چلو، ہاں چلو
سُرخ تتلی کے پیچھے چلو

اک تعاقب
تجسس، پکڑنے کی خواہش
اُسے، جس کا کوئی بدن
اور نہ چہرہ
فقط اک ہیولیٰ
فقط اِک ہیولیٰ کہ جس کے تعاقب میں
آدھی صدی
جیسے اِک پل کی صورت گزرتی گئی!

دِن کا پچھلا پہر
اور اُوڈیسس
اُوڈیسس کے جرّار ساتھی
چری، باجرے، دھان اور نیشکر
کے پُراسرار کھیتوں کا کالا سمندر
سمندر میں لکڑی کے تختے
شکستہ سے تختوں پہ
کیچڑ کے چیچک نما داغ
چہروں پہ چپکائے
بالوں کے چھتوں کے نیچے
چمکتی ہوئی تیز آنکھیں سجائے
ٹٹیری کے رنگین انڈوں
حسیں چھتریوں والی "کھمبوں"
چہکتے ہوئے ہریلوں
نیل کنٹھوں، بھجنگوں
کے اُجلے پَروں کے لئے

اک انوکھی تڑپ
ننھے سینوں کے اندر
چھلکتی ہوئی بے قراری
سمندر کے اندر سمندر!

سرِ شام
سوندھی کسی خوشبو سے
سرشار
بھٹی پہ لوگوں کی
یلغار
دانے
مکئی کے دانے
پٹاخے
سُلگتی ہوئی ریت پر
زرد دانوں کا کھیلتا چمن
دُور — مغرب میں
جلتی ہوئی شام -
سُرخ بھٹی پہ جیسے
کڑھائی
کڑھائی میں ہنستے، تڑختے، اُچھلتے ستاروں کا
گلزار
جلتی ہوئی سُرخ آنکھوں کے گلزار پہ
خندہ زن!

شب کی کالی قبا

اور درختوں کے بھاری ذخیرے کے پیچھے
گمشدہ، محافظ شعاعوں کے
گھیرے میں، آگے کو آتا ہوا
چاند
گاؤں کے لڑکوں کی
تیر و تبر سے مسلح سپہ
اپنے سالار کے حکم پر
آگے بڑھتی
شعاعوں کے نیزوں سے ٹکراتی
پل پل اُلجھتی
سُموں سے اُڑاتی وہ ذرّے
جو دشمن کو زخمی کریں
زمیں سے فلک تک
کبڈی کی "شوکر"
مقفّل سے اِک دائرے میں
بکھرتے سمٹتے ہوئے چاند جسموں کی لہریں
بپھرتا ہوا شور
چیخیں — مسرت بھری تیز چیخیں!
ہوا میں معلق
گھنی گرد کا نقرئی جال
بھوت ہی بھوت
بھوتوں کے گرداب میں
چاند کی لاش
نیزوں کی نوکوں پہ
ٹھہری ہوئی!

نصف شب
جیسے خوشبو بھری گود
رِستے ہوئے زخم پر جیسے پھاہا
بدن کو تھپکتی ہوئی چاندنی
سر کے ژولیدہ بالوں میں
پھرتی ہوئی ریشمیں انگلیاں
ماں کے ہونٹوں کی لَو پر
سُلگتی ہوئی اک کہانی کے پَر
سات رنگوں کے پَر
قاف کی اُس پری کے
جسے ڈھونڈنے کے لئے
شاہ زادہ
پہاڑوں کی جانب روانہ ہوا
پہاڑوں کا دامن تہی تھا
پری اس کی اپنی ہی آنکھوں
کی پایاب سی باؤلی میں
مکیں تھی
مگر شاہ زادے کی آنکھیں تو
باہر کی جانب لگی تھیں
پری اُس کی آنکھوں کے غرفوں سے
تکتی تھی اپنے تعاقب کا منظر
تھکا ہارا شہزادہ
لمبا سفر!

آج آدھی صدی کی مسافت پہ پھیلے ہوئے

ایک لمبے سفر سے میں لوٹتا ہوں
اور گاؤں
آنسو کے موتی سے قطرے کی صورت
مری بھیگی پلکوں کی
چلمن سے لگ کر کھڑا ہے
کسی صاف شفاف بلّور
مرقد کی صورت مرے سامنے ہے

مری ماں کو رُخصت ہوئے
جیسے لاکھوں برس ہو چکے ہیں
پُرانے مکانوں، درختوں، پرندوں میں
کوئی بھی باقی نہیں ہے
مرے شوخ بچپن کی اب
راکھ تک اُڑ چکی ہے
مگر چاروں جانب
مہکتے ہوئے گرم تنور
نہر کی کوکھ
کھیت کی مینڈھ
شب کی کالی قبا
ہر طرف، ہر جگہ

اُلجھے بالوں، چمکتی ہوئی
تیز آنکھوں میں
"بچپن"
خنک چاندنی کی طرح
آج بھی موجزن ہے
زمانے کی رفتار پر خندہ زن ہے!!

غلام جیلانی اصغر | سردی

سردی صوری اور صوتی لحاظ سے طبقہ نسواں سے رکھتی ہے۔ سردی کا نسائی روپ دیکھتے ہی میرے ذہن میں ایک ایسی فرنگی نژاد خاتون کی تصویر ابھرتی ہے جو منی سکرٹ (سکرٹ کی لمبائی میں آپ کے وجدانی ذوق پر چھوڑتا ہوں) پہنے پکاڈلی سرکس میں محوِ خرام ہو۔ ممکن ہے آپ یہ کہیں کہ سردی کا یہ صوری ایچ میرے حکیمانہ یا نیم مریضانہ ذہن کی پیداوار ہے۔ خیر اس حُسنِ ظن سے سردی کو کیا فرق پڑتا ہے؟ آپ خود ہی کسی روز پوری ایمانداری سے 'سردی' کے لفظ کو صفحہ قرطاس پر منتقل کر کے دیکھیں تو آپ کے ذہن پہ جو تصویر ابھرے گی وہ میرے خیالی روپ سے چنداں مختلف نہیں ہوگی۔ صوتی امکانات کا پورا پورا جائزہ لینا آسان نہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ ہر لفظ کے بطن میں ملائمت یا کرختگی کے سو روپ پنہاں ہوتے ہیں۔ جونہی آپ کوئی لفظ نوکِ زبان یا نوکِ قلم سے ادا کرتے ہیں تو اس کا ایک مرئی ہیولیٰ آپ کے ذہن کی کینوس پہ نمودار ہوتا ہے۔ یہ ہیولیٰ یا پیکر لفظ کا اصلی مفہوم ہوتا ہے۔ باقی جو مفاہیم غیاث اللغات قسم کی گراں ڈیل کتابوں میں درج ہیں وہ تو محض ایک مفروضہ ہیں، یا لفظ کو سمجھنے کی ایک کوشش رائیگاں۔ میں جب کبھی 'سردی' کہتا ہوں تو مجھے فوری طور پہ ماتا ہری یاد آجاتی ہے۔ بظاہر سردی اور ماتا ہری میں کوئی تعلق یا مناسبت نظر نہیں آتی لیکن ذہن کی اپنی منطق ہوتی ہے جسے روایتی استدلال سے دُور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا لیکن آپ کسی روز سردی کے لفظ کو پسِ پشت ڈال کر سرما کا ذکر کریں تو آپ کے ذہن میں ایک ایسے دیو ہیکل مرد کی تصویر آئے گی جو لمبا سا فرغل پہنے، ہاتھ میں گرز لئے، آپ کو مبارزت کی دعوت دے رہا ہو۔ سرما کے لفظ میں سردی والی نسوانیت، لنگی اور سلوٹ سلوٹ والی کیفیت نہیں بلکہ ایک مردانہ وقار، رُعب اور دبدبہ ہے جو صرف الوا ہول یا سر ہیٹول جیسے الفاظ میں پایا جاتا ہے۔ کچھ لوگ جو سرما اور سردی کو ہم معنی سمجھ کر روزمرہ زندگی میں استعمال کرتے ہیں۔ اُن کے حق میں اس کا نتیجہ کچھ زیادہ خوشگوار نہیں ہوتا۔

سردی، جیسے کہ میں نے عرض کیا ہے، طبقہ نسواں سے تعلق رکھتی ہے۔ اس لئے اس کا سارا نظام مادری ہے۔ اس میں وہی شفقت، خود سپردگی اور ملائمت ہے جو عام طور پہ خواتین میں پائی جاتی ہے۔ اس کے برعکس سرما کا سارا نظام پدری ہے۔ یہ باپ کی طرح قدم قدم پہ آپ کو اپنے وجود کا احساس دلاتا ہے۔ آپ جب ذرا اس کے وجود سے صرفِ نظر کرتے ہیں تو یہ آپ کو ڈانٹ پلاتا ہے اور کبھی کبھی ایسا سلوک کرتا ہے کہ سردی کا سارا تلطف اور مادرانہ شفقت یاد آجاتی ہے۔ میں نے ایک سال سرما کا موسم کوئٹہ میں گذارا تھا۔ صبح سویرے سرما میری دہلیز پہ آکر کھڑا ہو جاتا۔ فادر کرسمس کی طرح براق اونی لباس پہنے، سر پہ بڑا سا کنٹوپ چڑھائے اور مجھ سے باہر چلنے کی فرمائش کرتا۔ جب میں معذوری کا اظہار کرتا تو میرے کوٹ میں گھس کر مجھے اپنے شکنجے میں کس دیتا اور شام تک میری ہڈیاں توڑ کر میرے سپرد کر دیتا۔ میں رات بھر ان کی مرمت کرتا اور دوسری صبح پھر اُسی توڑ پھوڑ کی پالیسی کا آغاز ہو جاتا۔ اُس سال مجھے سرگودھا کی مشفقانہ سردی بہت یاد آئی اور میں نے فیصلہ کیا کہ میں عمرِ عزیز کے باقی سال اسی سردی کی شفقت آمیز معیت میں گذار دوں گا۔

سردی اور سرما کا بنیادی فرق بس یہاں تک ہی محدود نہیں بلکہ اِس سے آگے بھی کچھ مقامات ہیں جو تنقیدی بصیرت کا تقاضہ کرتے ہیں۔ مثلاً سردی کی جمع سردیاں ہے لیکن سرما کی جمع آج تک میری نظر سے نہیں گذری۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ جمع کا سب سے بڑا فائدہ محض اتنا ہی نہیں کہ آپ اسے حساب کتاب یا خاندان کے بالغ اور غیر بالغ افراد کا میزان کرنے میں استعمال کرتے ہیں، بلکہ آپ چاہیں تو اس کے محتاط استعمال سے کئی جداگانہ اور اچھوتے مفہوم بھی پیدا کر سکتے ہیں۔ جب آپ یہ کہتے ہیں کہ آئندہ سردیاں کوئٹہ میں گذریں گی تو آپ اس بات کا اعلان کر رہے ہوتے ہیں کہ آپ نے خودکشی کا مصمم ارادہ کر لیا ہے اور آپ تمام دوستوں کو اپنے مبارک ارادہ سے مطلع کر رہے ہیں۔ یہاں سردی محض ایک موسم کا نام نہیں ہے ، بلکہ ایک ایسے فکری رویئے کا اظہار ہے جو صرف ہراکری کرنے والوں یا کوہ پیماؤں میں ملتا ہے۔

سردی اور گرمی کا موازنہ عام طور پہ اُردو کی درسی کتابوں میں ملتا ہے۔ جس طرح گرمی کا سمبل بدن کا پسینہ ہے۔ اِسی طرح سردی کی علامت دسمبر کا مہینہ ہے۔ یہ علامت ہم نے مغرب سے مستعار لی ہے اور اس کے بڑے گہرے موسمی، ثقافتی اور تہذیبی اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ اب جبکہ ہم آزاد ہو گئے ہیں تو ہمیں دسمبر کے خلاف کچھ نہ کچھ کرنا چاہیے۔ اگر ہم کسی گہری، یا ضابطہ سازش کے نااہل ہیں تو کم از کم ایک منظم جلوس نکالنے میں کیا قباحت ہے ؟ نعرہ موجود ہے "ہائے دسمبر، بائے دسمبر"، قومی انجمنیں اس نعرہ میں مقامی اور لسانی ضروریات کے مطابق ترمیم و اضافہ بھی کر سکتی ہیں۔ سردی کو دسمبر سے مخصوص کر کے ہم نے دراصل یہ تسلیم کر لیا ہے کہ کرسمس اور سردی میں کوئی نامیاتی رابطہ ہے۔ یہ بالکل غلط ہے اور ہمارے عقائد کے خلاف۔ کرسمس کا تو ایک خاص مبارک دن، موسم اور موڈ ہے لیکن سردی تو اس قید سے آزاد ہے۔ بقول اقبال سہ ہو قید مقامی تو نتیجہ ہے تباہی۔ سردی عام طور پر ماہ و سال سے بے نیاز ہو کر آتی ہے اس کا اندازہ دن اور مہینے سے نہیں بلکہ اس کیفیت سے لگایا جاتا ہے جو سردی کا شناختی نشان ہے۔ ایک دن صبح جب آپ بیدار ہوتے ہیں تو آپ کے کان غائب ہیں۔ آپ ان کو چھو کر دیکھتے ہیں تو کان کی جگہ ایک نامعلوم سی کیفیت سے دوچار ہوتے ہیں، حالانکہ جب آپ رات سوئے تھے تو کان اپنی جگہ استادہ تھے۔ پس جب آپ پر یہ عالم گذر جائے تو آپ تسلیم کر لیں کہ آپ منطقہ حارہ سے نکل کر منطقہ باردہ میں داخل ہو گئے ہیں اور یہ منطقہ کہیں سے بھی شروع ہو سکتا ہے۔ بعض لوگ جو سردی کو موسم کی دین سمجھتے ہیں اور اس کو دنوں، ہفتوں اور مہینوں سے پہچانتے ہیں، وہ اکثر ایسی ہی غلطی کر بیٹھتے ہیں جیسے ۱۸۱۵ء سے واٹرلو میں ہوئی تھی۔ اُس نے نپولین سے یہ وعدہ تو کر لیا کہ وہ فلاں وقت فلاں جگہ پہونچ جائے گا لیکن عین اُس وقت بارش نے اس کی ساری منصوبہ بندی پر پانی پھیر دیا اور محض موسم کی لطیفہ گوئی کی وجہ سے نپولین واٹرلو کی جنگ ہار گیا۔ اسی طرح اکثر دوست یہ فرض کر کے کہ سردی دسمبر میں آئے گی زندگی کی بہت بڑی غلطی کر بیٹھتے ہیں اور عین ایمرجنسی کے وسط میں بے سر و سامان پکڑے جاتے ہیں لیکن جو لوگ زندگی میں پیش بینی کے قائل ہیں وہ ہر وقت سردی کے لئے اپنے آپ کو تیار رکھتے ہیں۔ وہ عین گرمی میں بھی یہ نہیں بھولتے کہ موت اور سردی کا کوئی دن معین نہیں ہے اس لئے سفر حضر میں وہ ایسے تمام ساز و سامان سے لیس ہوتے ہیں جو سردی کے اچانک حملہ سے مدافعت کے لئے از بس ضروری ہے۔ میرے ایک مرحوم دوست جو ایک عرصہ تک 'رادی' میں ابنِ مریم کے قلمی نام سے لکھتے رہے ایک دفعہ وسطِ جون میں مجھے میانوالی میں ملے انہوں نے ایک بڑا گرم کوٹ جسے عرفِ عام میں اوورکوٹ کہتے ہیں پہن رکھا تھا۔ میں نے انہیں حیرت سے دیکھا اور ایسے ہی استعجاب سے انہوں نے مجھے دیکھا۔ اس رات مجھ پر منکشف ہوا کہ ان کی حیرت اپنی جگہ بجا تھی۔ بات دراصل یہ ہے کہ اتفاقاً یا التزاماً اس رات پچھلے پہر بادِ شمال اور بادِ جنوب کا آپس میں معاہدہ ہو گیا اور اس میں دریائے سندھ بھی بطور ایک جارح فریق کے شامل ہو گیا۔ میں چونکہ بے تیغ و سپر تھا اس لئے میں صبح تک غیر دانستہ طور پر کانپتا رہا اور میرے دانت اس طرح بجتے رہے جیسے اُن کی تخلیق کا واحد مقصد آلاتِ موسیقی کی نمائندگی کرنا ہو۔ اُس صبح میرے دوستوں نے میرے چہرے پر ایسی ملکوتی مسکراہٹ دیکھی جو صرف سائبریا یا گرین لینڈ کے باشندوں کے چہروں پر پائی جاتی ہے۔

اُردو شاعری میں سردی کا ذکر خال خال ہی ملتا ہے۔ اس کی غالباً وجہ یہ ہے کہ شاعری آدمی کو داخلیت پسند بنا دیتی ہے اور آدمی اپنے اندر کے سلگتے ہوئے منطقۂ حارہ سے باہر کم ہی آتا ہے۔ وہ جو ہمارے ایک ثقہ غزل گو شاعر نے "اِک لرزشِ خفی" کا ذکر کیا ہے تو بعض ناقدین کا خیال ہے کہ اس لرزشِ خفی میں دراصل سردی کی محبوبیت کا ذکر ہوا ہے۔ میرے نزدیک یہ ادبی شرح بنیادی طور پر غلط ہے۔ شاعر نے غالباً واردات عشق یا بیوی سے خوف کا ذکر کرتے ہوئے لرزشِ خفی کی طرف ایک خفیف سا اشارہ کیا ہے۔ سردی میں تو یہ خوبی ہے کہ وہ سارے جسم میں ایک جلی اور نمایاں وارفتگی پیدا کر دیتی ہے۔ آدمی پہلی ہی ملاقات میں یوں محسوس کرتا ہے جیسے اس کے جسم کا انگ انگ خود مختار ہو کر ناچ رہا ہو۔ یہ والہانہ پن میں نے صرف ایک دو قوالیوں میں ہی دیکھا ہے۔ ایک مرتبہ قوالی کے دوران ایک صاحب نے حال کی بلند سطح سے اپنا سر میرے سر کے عقب میں دے کر ٹانگ کو اسی طرح حرکت دی جیسے وہ مجھے اڑنگے پر لے کر دھوبی پٹڑا لگانے والے ہوں اور میں اس روحانی اتصال کی کیفیت سے اتنا متاثر ہوا کہ میں نے اپنا بازو ان کے بازو میں ڈال کر انہی کی لاک لگایا اور پھر ہم دونوں من تو شدم تو من شدی کی ماورائی کیفیت سے گذر گئے۔ سردی کیفیتِ حال کی طرح آدمی کے ناک سے داخل ہوتی ہے۔ وہاں سے سیدھی گھٹنوں میں پہنچ جاتی ہے اور گھٹنے ایک دوسرے سے مسابقت میں اس طرح بجنے لگتے ہیں جیسے باخ یا واگنر کی کوئی سمفنی چھیڑ دی گئی ہو۔ میں اکثر ایسے لمحات میں یہ موسیقی لقائی ہوش و حواس سنتا رہتا ہوں، اور اپنا سر پورے ضبط و تحمل کے باوجود دھنتا رہتا ہوں۔ بعض لوگ غلط تربیت اور انتہائی ناقص تعلیم کی وجہ سے یہ سمجھتے ہیں کہ سردی یا ڈر سے کانپنا بزدلی کا اعلامیہ ہے۔ حالانکہ اس خودکار اور غیر اضطراری عمل میں بزدلی کا شائبہ تک نہیں ہے۔ یہ تو محض ایک صحت مندانہ ردِ عمل ہے جو سردی سے اوّلین ملاقات کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ وہی لرزشِ خفی جس کا ذکر شاعر نے کیا ہے، دراصل محبوب سے بیوی کی موجودگی میں اچانک ملاقات کے بعد پیدا ہوتی ہے اور ایسے موقعوں پر ہر معقول آدمی ایسے ہی ردِ عمل کا اظہار کرتا ہے۔ اگر آپ اس کو بزدلی پر محمول کرتے ہیں تو یہ آپ کی سوچ کی کوتاہی ہے۔ اِس طرح سردی سے پہلی ملاقات میں شوق بے حد جسم کو ہلکی ہلکی تھپکی دیتا ہے اور پھر پورے کا پورا جسم اس طرح ہلکورے لینے لگتا ہے جیسے وہ ایک بجرہ ہو اور دریائے نیل کی موجوں پر پورے زور شور سے رواں دواں ہو۔ سردی سے پہلی ملاقات (اس سراتی ہوئی بڑھتی ہر رگوں میں جیسے) کا تجربہ اتنا حیران کن ہوتا ہے کہ جسم ذہن کی ساری قیود سے آزاد ہو کر وارفتگی کے عالم میں سراپا رقص بن جاتا ہے۔ ایک پاؤں دوسرے سے آگے بڑھنا چاہتا ہے چنانچہ ٹانگوں کی باہمی رقابت کی وجہ سے گھٹنوں میں ایک بے نام سا تحرک پیدا ہوتا ہے اور پھر وہاں سے منتقل ہو کر جسم کے دوسرے حصوں کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ ہاتھ خود بخود بغل کے نہاں خانوں میں چھپ جاتے ہیں اور نچلا دھڑ اُوپر والے حصے سے اپنا نامیاتی رابطہ کاٹ لیتا ہے۔ دانت خود بخود راگ درباری چھیڑ دیتے ہیں۔ کیا آپ اسے لرزشِ خفی کہیں گے؟ خیر.......

میرے ایک دوست "د" ہیں جن پر سردی شعر کی طرح نازل ہوتی ہے۔ اِدھر اگست کا مہینہ ختم ہوا اُدھر ان کے ہاں سردی کے جملہ لوازمات کا اہتمام ہو گیا۔ وہ سردی کی شہزادگی کے لئے گاؤں کے حسن کوزہ گر سے مٹی کی ایک سبک سی انگیٹھی بنواتے ہیں، اسے اصلی کوئلوں سے لبالب بھرتے ہیں اور پھر دونوں ٹانگوں کے درمیان لے کے اس طرح رکھ لیتے ہیں جیسے وہ اپنے اندر کے ڈیپ فریزر کو نقطۂ انجماد سے ذرا نیچے لانے کی کاوش کر رہے ہوں۔ اس انگیٹھی پر وہ اس وقت تک قابض رہتے ہیں جب تک یہ فیصلہ نہ ہو جائے کہ سردی وسط جون میں ختم ہوتی ہے یا مئی کے اواخر میں۔ "د" اور انگیٹھی کی قربت سے اُس تخلیقی آنچ کا پتہ چلتا ہے جو صرف ایسے لوگوں میں پائی جاتی ہے جو سردی کو محض دور سے ہی نہیں دیکھتے بلکہ اس کے ساتھ آرٹسٹک رابطہ پیدا کرتے ہیں۔ کچھ فن کار زندگی کو میل دو میل کے فاصلے سے دیکھتے ہیں اور پھر فوراً اس کی خوبصورتی یا بدہیئتی پر فیصلہ صادر کر دیتے ہیں۔ آپ سردی کے ساتھ یہ منافقانہ سلوک نہیں کر سکتے یا تو آپ اسے محسوس ہی نہیں کرتے اور اگر آپ کا تخلیقی شوق ابھی تک

زندہ ہے، تو آپ پوری سرگرمی سے اس کا سواگت کرتے ہیں اور دہکتی ہوئی انگیٹھی سے اس کی تواضع۔ دراصل سردی اور فن پورے انہماک یا..... COMMITMENT کا تقاضہ کرتے ہیں۔ آپ سینے ورون، نیچے بروں کے انداز میں ان سے رابطہ قائم نہیں کر سکتے بلکہ اچھا فن کار تو وہی ہے جس پر تخلیق کے نادر لمحات میں کپکپی کی کیفیت پیدا ہو جائے اور اُسے یوں محسوس ہو کہ اس کے اندر اور باہر سارا سال سردیوں کا موسم رہتا ہے۔ یوں بھی تخلیق کے لئے جس ساز و سامان کی ضرورت ہے وہ عین سردی کے مزاج کے مطابق ہے۔ اچھا شعر چیرنگ کراس کے وسط یا ٹی ہاؤس کے درمیان تو تخلیق نہیں ہو سکتا، اس کے لئے کمرے کا تاریک گوشہ، انگیٹھی کی قربت اور لحاف کی مادرانہ شفقت کی ضرورت ہے۔ احتیاطاً لحاف میں اتنا سوراخ رکھ لینا چاہیے جس سے ہوا اور روشنی اندر باہر آ جا سکے۔ کچھ لوگ سردی کی سرخوشی میں اس کھڑکی کو بالکل بند کر دیتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کا رابطہ زندگی اور روشنی دونوں سے کٹ جاتا ہے۔ فانی کی شاعری کا یہی المیہ ہے کہ شاعر نے لحاف کو اپنے چاروں طرف اور اس طرح اوڑھ لیا ہے کہ اس میں روشنی یا ہوا کی کوئی گنجائش نہیں رہی۔ اندھیرے میں تو صرف فلسفہ ہی تخلیق کیا جا سکتا ہے۔ وہ جو کسی نے کہا ہے کہ فلاسفر ایک ایسا فرد ہے جو ایک تاریک کمرہ میں ایک کالی بلی کی تلاش کر رہا ہے جو وہاں نہیں ہے۔ اس قول کا شاعر پر اطلاق نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ تو مکمل تاریکی میں زندہ ہی نہیں رہ سکتا۔ اس کا سفر دراصل روشنی اور تاریکی کے اس نقطۂ اتصال سے شروع ہوتا ہے جہاں زندگی کی روشن حقیقت رومان اور رومانیت کی پُراسرار تاریکی میں تحلیل ہو جاتی ہے۔ اس شاعرانہ کیفیت کے لئے سردی کا وجود نہایت ضروری ہے کیونکہ گرمیوں میں تو اتنی بیباک روشنی ہوتی ہے کہ داخل اور خارج کی آنکھیں چندھیا جاتی ہیں اور آدمی اصلی نظم اور نثری نظم میں فرق ہی نہیں کر سکتا۔ اچھا شعر تو جھٹپٹے میں ہی تخلیق کیا جا سکتا ہے لیکن یہ خیال رہے کہ جھٹپٹا سردیوں کے موسم کا ہو۔

سردیوں کی مخالفت میں صرف ایک ہی بات کہی جا سکتی ہے کہ سردیاں آدمی کو خود غرض بنا دیتی ہیں۔ وہی آدمی جو گرمیوں میں قربانی، ایثار نفسی اور خود فراموشی کا ماڈل ہوتا ہے، سردیوں میں اتنا خود غرض اور خود پسند ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے اندر سے باہر نکلنے کی ساری صلاحیت کھو دیتا ہے۔ وہ صبح شام اپنے ہاتھ، پاؤں، ناک، کان کا ہی ذوق و شوق سے مطالعہ کرتا ہے۔ جیسے یہ تمام اعضا اُسے حال ہی میں عطا ہوئے ہوں۔ اس کی ساری توجہ اپنی ذات پر مرکوز ہو جاتی ہے اور ایسا لگتا ہے کہ وہ ذہن کی بلند سطح سے اُتر کر جسم کی پستی پر آ گیا ہو اور وہ دن بھر جسم کے خزانہ کو موسم اور لوگوں کی نظرِ بد سے بچانے کے لئے منصوبے سوچتا رہتا ہے۔ شاید اسی خود غرضی اور خود پسندی کا ردِ عمل ہے کہ دنیا کا کوئی بھی بڑا مذہب سرد ممالک میں پیدا نہیں ہوا۔ مذہب تو آدمی کو اپنے محدود حلقہ سے باہر نکلنے کی تلقین کرتا ہے اور اس کا مقصد تو فرد کی محدود ذات کو حقیقتِ عظمیٰ کی لامحدود وسعت میں گم کرنا ہے چنانچہ ایسا روحانی فکر صرف گرم ملکوں میں ہی پروان چڑھ سکتا ہے کیونکہ جب ٹمپریچر ۱۰۰ سے اُوپر مائل پرواز ہوتا ہے تو آدمی پسینہ میں شرابور جسم کو اس حقارت سے دیکھتا ہے جیسے وہ اس کی ذات کا مقدس حصہ نہ ہو بلکہ پانی اور خاک کا ایک غلیظ ملول ہو بالکل ایسے ہی جیسے تخلیقِ کائنات کے ابتدائی مرحلوں میں تھا۔ مذہب چونکہ جسم کو تیاگنے اور اپنی ذات سے اُوپر اُٹھنے کا عمل ہے اس لئے گرم ملک اس کی تخلیق و ترویج کے لئے ازبس ضروری ہیں لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ یہی گرم مزاج مذاہب جب سرد ملکوں میں پہنچتے ہیں تو ان میں گیان دھیان اور عرفانِ ذات کا عنصر شامل ہو جاتا ہے مثلاً بدھ مت جو اپنے جنم بھومی میں DIETING کا ایک سادہ سا عمل تھا تبت اور جاپان پہنچ کر ایک باقاعدہ فکری تحریک بن گیا۔ سردی میں یہ خوبی ہے کہ وہ آدمی کو خود نگر بنا دیتی ہے کیونکہ جب پارہ نقطۂ انجماد کی طرف مائل ہوتا ہے تو آدمی اپنی تخلیق کے ابتدائی مرحلہ پر آ جاتا ہے یعنی اس کی ٹانگیں سکڑ کے اس کے سینے کے ساتھ پیوست ہو جاتی ہیں اور سر ٹانگوں کے درمیان گوشۂ عافیت تلاش کر لیتا ہے۔ ہاتھ، بازو بھی اسی اتحادِ ثلاثہ میں شامل ہو جاتے ہیں اور وہی آدمی جو گرمی کے

موسم میں پورے کمرے میں نہیں سما سکتا تھا، ڈیڑھ فٹ کے رقبہ میں اس خوش اسلوبی سے سما جاتا ہے کہ انسانی جسم کی لچک پر تعجب ہوتا ہے۔ سمٹنے کی اس خاصیت سے یہ اندازہ لگانا چنداں مشکل نہیں کہ دنیا میں بقائے باہمی کے لئے سردیاں ایک نعمتِ عظمیٰ ہیں اور اقوامِ عالم کو چاہیے کہ وہ گرمیوں کے خلاف احتجاج کریں اور سردیوں کا پوری سرگرمی سے پرچار کریں، کیونکہ اسی میں انسانیت کی نجات ہے

انور سدید

مچھر کی مدافعت میں

مچھر خون پیتا ہے اس لئے بعض لوگ اسے درندہ کہتے ہیں حالانکہ یہ پرندہ ہے اور ہمیشہ اپنے پروں سے اڑتا ہے۔ مچھر کی بہت سی عادتیں انسان سے ملتی جلتی ہیں اس لئے اسے اشرف المخلوقات کہلانے کا حق بھی حاصل ہے۔ مثال کے طور پر انسان کی طرح مچھر بھی ہر وقت پیٹ کی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے سرگرداں رہتا ہے۔ افزائش نسل کے لحاظ سے بھی مچھر انسان کے مماثل ہے اور یہ بھی انسان کی طرح فکر فردا سے غافل ہو کر کثرت سے تخلیقِ اولاد کا فریضہ سر انجام دیتا ہے۔ فطرت نے اس کے ہونٹوں کو خون لگا دیا ہے اس لئے بالعموم شراب کے قریب بھی نہیں جاتا۔ تاہم کسی محفل میں مُفت کی مل جائے تو انسان ہی کی طرح بر بنائے انکسار انکار نہیں کرتا۔

بعض لوگ اسے انسان کا ازلی اور ابدی دشمن قرار دیتے ہیں اور بہت سی بیماریوں کو اس چھوٹی سی حقیر و فقیر مخلوق سے منسوب کرتے ہیں۔ مچھر دنیاداری کے جھمیلوں اور اختلافِ رائے کے جھگڑوں میں نہیں پڑتا۔ چنانچہ اس نے انسان کے اس غلط دعوے کی کبھی تردید نہیں کی بلکہ وہ تو اتنا شریف النفس ہے کہ انسان کے اس کھُلے اعلانِ دشمنی کے باوجود کبھی اس پہ چھُپ کر حملہ تک نہیں کرتا۔ وہ روزی کی تلاش میں دُور دُور تک پرواز کرتا ہے۔ دَر دَر کی ٹھوکریں کھاتا ہے اور یوں رزقِ حیات کی تلاش میں اپنا سماجی فریضہ ایمانداری سے سر انجام دیتا ہے تاہم وہ کبھی اوچھے ہتھیاروں پر نہیں اترا اور گھٹیا غیر تہذیبی حرکت اس سے کبھی سرزد نہیں ہوئی، بلاشبہ وہ خون کی تلاش میں اکثر اوقات انسان کی طرف بھی رجوع کرتا ہے۔ تاہم وہ ابنِ آدم کو ہمیشہ اپنی آمد کی خبر کرتا ہے اور اسے مدافعت کا موقعہ دیتا ہے۔ حد یہ ہے کہ اس مڈبھیڑ میں وہ اکثر اوقات اپنی جان تک کھو دیتا ہے لیکن کبھی اظہارِ ملال نہیں کرتا۔ مچھر کا دعویٰ ہے کہ جتنے مچھر انسان نے قتل کئے ہیں اتنے انسان مچھر کے ہاتھوں ابھی تک نہیں مارے گئے۔ مچھر کو انسان کو یہ دعویٰ ہے کہ وہ خونخوار نہیں، ہر چند دلداری کی کچھ زیادہ خُو مچھر میں بھی نظر نہیں آتی تاہم خونخواری کے اس الزام کو مچھر نے تاحال خندہ پیشانی سے قبول نہیں کیا اور خون نوشی کو اپنی زندگی کی ضرورت قرار دے کر وہی جواز پیش کیا ہے جو انسان معصوم بکرے کے نرم و نازک حلقوم پر چھُری رکھ کر دیتا ہے۔

مچھر چونکہ انسان سے بھی زیادہ باہوش اور خردمند ہے اس لئے وہ محض اس جواز پر ہی اکتفا نہیں کرتا بلکہ یہ سوال بھی اُٹھاتا ہے کہ "اشرف المخلوقات ہونے کے باوجود اگر ایک انسان دوسرے انسان کا خون پیتا ہے تو مچھر کو اس باعزت سماجی عمل سے کیوں محروم رکھا جائے"؟

مچھر کا یہ تقاضا بظاہر جانبدارانہ اور خود غرضی پر مبنی نظر آتا ہے تاہم اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ خون کو جو جسم و جاں کی فطری ضرورت

ہے، خود انسان نے ارزاں کر دیا ہے چنانچہ وہ خون آشام جنگوں میں اُلجھنے اور ہزاروں لاکھوں ٹن انسانی خون ضائع کرنے کے لئے بھی مستعد رہتا ہے۔ بلاشبہ آج تک ابنِ آدم نے جتنا انسانی خون جنگ کے میدانوں میں بہایا ہے اگر ذخیرہ کر لیا جاتا تو اس پر اربوں مچھر کروڑوں سالوں تک پرورش پا سکتے تھے اور یوں مچھر اور انسان کے درمیان رزم آرائی کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ انسانی خون مچھر کے جسم و جان کی ایک فطری ضرورت ہے اور وہ اس سمندر سے کچھ زیادہ طلب بھی نہیں کرتا —— بس ایک قطرۂ خون —— مگر پھر بھی انسان جو اشرف المخلوقات ہے، ایثار اور قربانی کی چھوٹی سی مثال قائم کرنے سے بھی گریزاں ہے اور مچھر کو اس کا رزقِ حیات —— صرف ایک قطرۂ خون —— مہیا کرنے کے لئے بھی آمادہ نہیں پس مچھر انسان کو عظیم قرار نہیں دیتا تو کیا وہ حق بجانب نہیں ہے؟

اکثر لوگ مچھر کو ایک نہایت حقیر مخلوق سمجھتے ہیں اور ہر وقت اس کوشش میں مصروف رہتے ہیں کہ آنکھ بچا کر اُسے چٹکی سے مسل دیں۔ بلاشبہ مچھر جسمانی طور پر کم مایہ نظر آتا ہے لیکن یہ اندر سے بے حد مضبوط اور توانا ہے۔ اس کی رگوں میں چونکہ انسانی خون دوڑ رہا ہے اس لئے یہ محبت اور نفرت کے جذبات سے بھی آشنا ہے اور مناسب موقعہ و محل دیکھ کر ان کا اظہار بھی کرتا ہے۔ مثال کے طور پر جونہی آپ اسے ڈرانے کے لئے تالی بجاتے ہیں تو یہ چوکنا ہو جاتا ہے اور پورا مچھر دل لے کر آپ کے سر پر منڈلانے اور آپ کو خوفزدہ کرنے لگتا ہے۔ تاہم اگر آپ اس کی طرف محبت کا ہاتھ بڑھائیں تو یہ مصافحے کے بجائے معانقے کو ترجیح دیتا ہے، آپ کے سلامِ محبت کو قبول کرتا اور اس کے جواب میں آپ کے کان کے قریب ایک مدھر راگنی چھیڑ دیتا ہے۔ اس پُرخلوص اظہارِ محبت کے بعد وہ واپس اپنے مسکن کو اُڑ جاتا ہے اور اپنے ہم عنصروں کو بتاتا ہے کہ

"ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں"

مچھر کے پاس طبل و علم ہے نہ ملک و مال۔ پھر بھی ایک زمانے نے اس کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر رکھا ہے اور وہ اپنی جانِ ناتواں کی حفاظت کے لئے ان سب سے نبرد آزما ہے۔ مچھر کتنا عظیم ہے!

اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ انسان نے مچھر کے خلاف اپنے دل میں شدید نفرت پال رکھی ہے۔ اس کا ایک ادنیٰ مظاہرہ یوں بھی سامنے آیا ہے کہ انسان نے ہر چھوٹی چیز کو مچھر قرار دے رکھا ہے اور جب کبھی اَنا کا سوال پیدا ہوتا ہے تو وہ اپنی ذات کے ماؤنٹ ایورسٹ کو اس چھوٹی سی حقیر مخلوق سے ٹکرا دیتا ہے اور پھر پاگلوں کی طرح فاتحانہ قہقہے لگاتا ہے۔ انسان کی اس حرکتِ قبیح سے کیا مچھر غافل ہے؟ یقیناً نہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ عہدِ قدیم میں یہی حرکت نمرود سے اس وقت سرزد ہوئی جب اس نے زادۂ خاک ہونے کے باوجود خدائی کا دعوٰی کر دیا اور اپنے جیسے انسانوں کو مجبور کیا کہ وہ اس کے آگے سربسجود ہوں۔ نخوت اور تکبر کا یہ انداز ایک سرپھرے مچھر کو پسند نہ آیا اور وہ محض تفننِ طبع کے لئے نمرود کی ناک میں گھس کر سحر نغمہ جگانے لگا۔ پھر یہ خلوت اسے ایسی پسند آئی کہ مچھر نے وہیں بیٹھ کر عرفان حاصل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ تاریخ نگاروں نے لکھا ہے کہ نمرود جس کے سامنے ساری خدائی سرنگوں تھی، اس مچھر کے سرمدی نغمے کی تاب نہ لا سکا۔ وہ ہر ممکن کوشش کے باوجود اسے اپنا فطری راگ الاپنے سے بھی روک نہ سکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بالآخر نمرود کی خدائی کا پندار ٹوٹ گیا اور زادۂ خاک ہمیشہ کیلئے آسودۂ خاک ہو گیا۔ پس مچھر کم مایہ تو نظر آتا ہے لیکن یہ حقیقتاً بے حد گرانمایہ ہے۔

مچھر اونچی پرواز نہیں کرتا کہ اس سے مچھر کی انسان دوستی پر حرف آتا ہے۔ وہ زمین کے باسیوں سے اپنا رشتہ قائم رکھتا ہے اور پہاڑوں پر نشیمن بنانے کے لئے چنداں تردد نہیں کرتا۔ وہ طبعاً امیرانہ مگر مزاجاً فقیرانہ رکھتا ہے۔ وہ دوسرے کے شکار کو حرص و آز کی نظر سے نہیں دیکھتا۔ جھپٹنا پلٹنا اور پلٹ کر پھر جھپٹنا اس کے لئے خون کو گرم رکھنے کا بہانہ نہیں بلکہ رزقِ حیات حاصل کرنے کا وسیلہ ہے اور وہ اس کے لئے تگ و تازِ جاوداں

کرتا ہے۔ مچھر بلاشبہ ایک غریب پرندہ ہے مگر وہ بلا کا غیور و جسور بھی ہے اور اس میں وہ تمام مثالی صفات موجود ہیں جو کسی دوسرے کرگس صفت پرندے میں نظر تک نہیں آتیں۔ پھر بھی شعرا نے اس کا ذکر شاعری میں نہیں کیا اور اسے ایک معمولی کیڑا سمجھ کر نظر انداز کر دیا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ مچھر سے انسان کی ازلی اور ابدی دشمنی یہاں بھی اپنا کام کر رہی ہے اور دشمنی کے اظہار میں شعرا اور ادبا بھی شریک ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شعر و ادب میں ابھی تک مچھر کے لئے مناسب جگہ پیدا نہیں کی جا سکی۔

انسان مچھر کا ازلی اور ابدی دشمن ہے لیکن میری اس سے یاد اللہ بہت پرانی ہے۔ میں جب چھوٹا سا تھا اور سارا دن گہوارے میں بیکار پڑا غوں غاں غوں غاں کرتا رہتا تھا تو مچھر میرا ہم جولی تھا۔ یہ میری تنہائیوں کو آباد کرنے کے لئے اکثر اوقات میرے ساتھ کھیلنے کے لئے آجاتا تھا۔ پہلے ایک سرور انگیز لطیف نغمہ اس کی آمد کا اعلان کرتا۔ پھر چپکے چپکے چوری امّی کی نظر بچا کر میری مسہری میں گھس آتا۔ میں ہاتھ ہلا ہلا کر اس کا خیر مقدم کرتا۔ وہ بھی جان سے میرے ساتھ ہم کلام ہوتا، اختلاطِ محبت کرتا، میٹھی لوری سناتا، شعر و نغمہ کی محفل جماتا اور جونہی امّی کی نظر اسے پا لیتی تو وہ میرے گال پر ایک آخری بوسۂ محبت ثبت کر کے بادلِ نخواستہ رخصت ہو جاتا۔

محبت کی یہ نہایت مجھے اپنی امّی کے بوسے میں بھی محسوس نہیں ہوئی۔ امّی کا شفیق بوسہ طویل اور شیریں ہوتا تھا۔ یہ میری رگوں میں خونِ گرم دوڑانے کے بجائے جوئے شیر کی طرح داخل ہوتا اور میں اس ٹھنڈی اور شیریں نرم روندی کی پھوار سے اپنے رگ و پے میں تازگی سی محسوس کرنے لگتا۔ بلاشبہ امّی کا بوسۂ شفقت میری جسمانی ضرورت تھی لیکن مچھر تو میری خلوت کا ساتھی تھا اور اب میری روحانی ضرورت بن چکا تھا چنانچہ جب وہ دو چار دونوں تک مجھے ملنے نہ آتا تو میرا جسم پھڑکنے لگتا۔ آنکھیں اُبلنے لگتیں۔ کان اس نغمۂ سرمدی کے لئے جسے صرف مچھر ہی الاپ سکتا ہے بیتاب ہو جاتے اور جب دُور دُور تک میرے دوست کی خبر نہ آتی تو میری امّی بھی پریشان ہو جاتیں اور مجھے ڈاکٹر کے پاس لے بھاگتیں۔ کاش! اس عالم میں مچھر کو میرے اضطراب کا علم ہو جاتا اور کہیں سے اڑ کر میرے پاس چلا آتا۔

مجھے اکثر اوقات اپنے ڈاکٹر کی کم علمی اور کوتاہ فہمی پر رحم آتا ہے کہ وہ میرے ہم جولی کو میرے پاس لانے کے بجائے مچھروں کی پوری قوم کے خلاف صف آرا ہو جاتے اور میرے کمرے کی مصفّٰی اور معطّر فضا میں کسی بدبودار دوائی کی پھریری بکھیر دیتے۔ پھر یہ عمل میرے کمرے تک ہی محدود نہ رہتا بلکہ اس کا دائرۂ کار اطراف و جوانب میں بھی پھیل جاتا۔ قرب و جوار میں مچھروں کے محفوظ ٹھکانے تلاش کئے جاتے اور ان پر بے تحاشا نیپام بم برسائے جاتے۔ مچھروں کے کشتوں کے پشتے لگ جاتے۔ انسانی بربریت اور وحشت کا یہ مظاہرہ دیکھ کر خود مجھ پر خوف طاری ہو جاتا۔ میرے خون کی گردش سرد پڑ جاتی لیکن امّی کی باچھیں خوشی سے کھل اٹھتیں۔ وہ ڈاکٹر کی طرف مسکرا مسکرا کر دیکھتیں اور کہتیں:

"ڈاکٹر صاحب! منّے کا بخار اتر گیا!"

لیکن بے چاری امّی کو کیا معلوم؟ یہ تو میرا ایک معصوم سا بہانہ تھا اپنے ہم جولی کو نیپام بم سے بچانے کا اور اُسی شام جب وہ امّی کی آنکھ بچا کر مجھے ملنے میری مسہری میں گھس آتا تو مجھ پر جو کیفیت طاری ہوتی اس کا علم بھلا امّی کو کیسے ہوتا۔ وہ تو دوسرے روز پھر ڈاکٹر کے پاس دوڑی جاتیں اور مضطرب انداز میں کہتیں:

"ڈاکٹر منّے کو دیکھو۔ اسے تو پاری کا بخار ہو گیا ہے۔"

دنیا بھر کی ماؤں اور ڈاکٹروں سے میری مؤدبانہ التماس ہے کہ وہ بے چارے ہنستے مچھروں پر نیپام بموں کی بوچھار بند کر دیں اور اپنے معاشرے میں مچھروں کے پیدا کردہ مسائل کو معصوم بچوں کے حوالے کر دیں۔ پھر دیکھیں کہ انہیں ہم جولی بنا لینے سے یہ تمام مسائل کس پھرتی اور خوش اسلوبی سے حل ہو جاتے ہیں۔ لیکن شاید استیصالِ ملیریا کا محکمہ اس کے حق میں نہیں۔ چنانچہ چند لمحے قبل میرے پڑوس میں بند پانی کے ایک تالاب میں نیپام بم چھوٹا گیا ہے اور مچھر اپنی جان بچانے کے لئے میرے سر کی طرف بھاگے چلے آ رہے ہیں!

جمیل آذر

واشنگ مشین

میرے گھر واشنگ مشین کیا آئی عہدِ حاضر کا عظیم انقلاب برپا ہو گیا۔ ٹھہری ہوئی خاموش زندگی میں ہلچل مچ گئی۔ انقلابِ فرانس اور انقلابِ روس کے قصّے تو بہت سُن رکھے تھے لیکن ان کی کرشمہ سازیوں کا تماشہ دیکھنے کا موقع آج سے پہلے نصیب نہیں ہوا تھا۔ ویسے بھی ہم بیشتر انقلابات کے بارے میں قصّے کہانیاں کتابوں کے ذریعہ ہی حاصل کرتے ہیں اور ہماری نیم پختہ معلومات کا انحصار اُن دیکھے اجنبی مورخین کے قلم پر ہوتا ہے جو مبالغہ آرائی میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتے ہیں۔ وہ چاہیں تو کسی سربراہ کو اگر چھینک بھی آجائے تو اُسے انقلاب کا نام دے دیں اور اگر کہیں واقعی انقلاب آجائے تو وہ اسے صرف تبدیلیٔ آب و ہوا کا نام دے کر اندرونی معاملہ تک محدود کر دیں۔ یہ سارا کمال اُن کے الفاظ کی بازیگری کا ہے۔ اسی طرح بعض لوگ اپنے خودساختہ انقلاب کا اتنی فن کاری اور چرب زبانی سے پراپیگنڈہ کرتے ہیں کہ ہر کہ و مہ اس پر ایمان لانے پر مجبور ہو جاتا ہے خواہ وہاں کوئی پتا بھی نہ ہلا ہو۔ آج کل پراپیگنڈہ بھی ہماری زندگی کا جزو لاینفک بن کر رہ گیا ہے۔ اخبارات، ریڈیو اور ٹی وی پراپیگنڈے کے نہایت سحر انگیز آلات ہیں۔ ان ریڈی میڈ آلات کی مدد سے یار لوگ اپنے اپنے تصوراتی انقلاب کو چشم زدن میں مشتہر کر دیتے ہیں۔ لیکن انقلاب کے وہ ننھے منے چراغ جو ہمارے گھروں میں روشن ہوتے ہیں، ان کا کسی کو علم تک نہیں ہوتا حالانکہ ہماری زندگی کے بہترین انقلاب وہی ہیں جو ہمارے گھروندوں میں، آنگنوں میں، کھیتوں اور کھلیانوں میں، روحوں اور دلوں میں مسکراہٹوں کے ساتھ نمودار ہوتے ہیں۔ اب دیکھئے میرے گھر میں انقلاب کی کلیاں چٹک گئیں اور کسی پیشہ ور مورخ کو کان و کان خبر نہ ہوئی۔ حقیقت یہ ہے کہ ہنگامہ پرور انقلاب سے کہیں زیادہ حسین وہ انقلاب ہوتا ہے جو خاموشی کی سحر سے طلوع ہو۔

واشنگ مشین کی آمد کے بعد انقلاب خانہ کو میں بڑے قریب سے دیکھ رہا ہوں۔ اس سے پیشتر میں نے کبھی یہ محسوس نہیں کیا تھا کہ میری بیوی کا سب سے بڑا دشمن کون ہے۔ جب کہ فتح و نصرت حاصل کرنے کا پہلا سنہری اصول ہی یہ ہے کہ آپ اپنے دشمن کو پہچان لیں۔ میرے اور بچوں کے آئے دن کے میلے اور گندے ہوتے ہوئے کپڑے کئی برسوں سے میری بیوی پر حملہ آور ہو رہے تھے اور اُس نے بھی اپنی ذات پر انحصار کرنے اور اپنی مدد آپ کرنے کے اصول کے تحت کبھی کسی دھوبی یا دھوبن کو گھر میں گھسنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ اگرچہ وہ ان آلودہ کپڑوں کا ایک مدت سے نہایت مستقل مزاجی سے مقابلہ کر رہی تھی۔ مگر وقت کے نامعلوم اور پُراسرار ہاتھوں نے اس کے اندر سے مقابلہ کے جوش کو سرد کر دیا تھا اور اس کے ہاتھوں کی انگلیوں اور بازوؤں کے جوڑوں نے ان لگاتار حملوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنا شروع کر دی تھی۔ مجھ پر پہلی مرتبہ انکشاف ہوا کہ اس کے اصل دشمن گھر کے میلے اور کثیف کپڑے تھے جو مسلسل اس کا استحصال کر رہے تھے۔ استعمال کے رنگیتے ہوئے جراثیم خفیہ طور پر ہماری زندگی میں کئی اطراف سے اس طرح داخل ہو جاتے ہیں کہ ہمیں بسا اوقات ان کی موجودگی کا احساس تک بھی نہیں ہوتا۔ آج پہلی مرتبہ مشین کے پا لینے کے بعد

میری بیوی بڑے فاتحانہ انداز میں کھڑی مسکرا رہی ہے۔ کل تک جو گھر بھر کے گندے اور کثیف کپڑے ہر وقت بے وقت اس پر دھاوا بول دیتے تھے اب وہ ان سب پر اس تیزی سے جھپٹ رہی ہے جس طرح بلی چوہے پر لپکتی ہے یا جیسے جنگل کا شیر اپنے شکار کو دبوچتا ہے۔ مشین نے اس کے اندر قوت و اعتماد کو پھر سے بحال کر دیا تھا۔ نہ جانے گھر کے کن کن کونے کھدروں سے میل خوردہ قمیصیں، شلواریں، تکیوں، بستروں کی بڑی بڑی چادریں اور رضائیوں کے بھاری غلاف جو برسوں سے اپنے دامن میں میل کچیل سمیٹے ہوئے تھے۔ نکل نکل کر مشین کی مقناطیسی کشش کی زد میں آنے لگتے ہیں۔ مشین صابن ملے پانی کے آمیزے میں میلے کپڑوں کو بڑی مہارت کے ساتھ اتھل پتھل کر کے گھماتی ہے —— غلیظ میل سے لبریز سیاہ پانی کپڑوں سے نچڑ نچڑ کر باہر آنے لگتا ہے۔ چند لمحوں بعد صاف ستھرے کپڑے مشین سے باہر آجاتے ہیں۔ میں مشینری کے اس دلکش عمل سے پوری طرح لطف اندوز ہوتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ میل خواہ ہمارے کپڑوں کی ہو یا دلوں کی یہ ہماری کومل زندگی کو گدلا کر دیتی ہے۔

مشین سے نگاہیں ہٹا کر میں اپنے کمرے کا دریچہ کھول دیتا ہوں اور باہر کے ماحول پر نظروں کی سرچ لائٹ پھینکتا ہوں۔ باہر میل اور کثافت مختلف بھیانک شکلوں میں پاؤں پسارے ہوئے ہے۔ میں ہاتھ میں چھڑی لے کر باہر نکل جاتا ہوں۔ چھڑی کی معیت میں آپ کو طاقت اور حوصلے کا احساس ہوتا ہے ویسے بھی "عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد" میں اس خاموش سہارے کی مدد سے آس پاس پھیلی میل اور کثافت کو ہٹانے کی کوشش کرتا ہوں اگرچہ میں تھوڑا بہت راستہ پا لیتا ہوں لیکن اس کے مکروہ زہر آلود پنجے سرطان کی طرح پورے ماحول کو دبوچے ہوئے ہیں۔ سڑکوں پر فٹ پاتھوں پر مکانوں پر، منڈیروں پر، دفتروں کی فائلوں پر، کچہریوں میں، درس گاہوں میں، ہسپتالوں میں بد شکل میل اپنے بوجھل پنجے گاڑے ہوئے ہے۔ تھوڑی دیر ستانے کے لیے میں اپنے ایک دوست کے دروازے پر دستک دیتا ہوں۔ وہ مجھے خندہ پیشانی سے اندر آنے کی دعوت دیتا ہے۔ میرا دوست نہایت جدید قسم کے دلکش مکان میں رہتا ہے۔ جدید فرنیچر، بھاری قالین اور دبیز پردوں سے آراستہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہی ڈی ڈی ٹی کی ہلکی خوشبو کی بُو میرا استقبال کرتی ہے۔ میں تھوڑی دیر کے لیے چکرا جاتا ہوں۔ میری نگاہیں جونہی ڈرائنگ روم کی چھت پر پڑتی ہیں تو مجھے کالے بھدے مچھروں کی چھوٹی چھوٹی بستیاں چھت سے چپٹی ہوئی نظر آتی ہیں۔ میں صوفے کے پیچھے دریچوں پر پڑے دبیز پردے کو چھڑی کی نوک سے ہٹاتا ہوں تو فوراً میٹھی نیند سے بیدار ہو کر مچھروں کی فوج ظفر موج اپنی کمین گاہوں سے باہر نکل کر میرے سر پر منڈلانے لگتی ہے۔ میں دریچے کے شیشوں سے باہر جھانکتا ہوں تو باہر گندے نالے میں ٹھہرے ہوئے متعفن پانی پر مچھروں کی نوآبادیاں دکھائی دیتی ہیں۔ یہ سب نوآبادیاتی نظام کی باقیات ہیں۔ مجھے وادیٔ نیل کی قدیم تہذیب کی تباہی و بربادی کا عبرتناک واقعہ یاد آجاتا ہے۔ ازمنۂ قدیم میں دریائے نیل کے پانی میں ایک خاص قسم کے کرم پیدا ہو گئے تھے۔ پھر اس کیڑے کے غیر مرئی جرثومے لوگوں کے معدوں، انتڑیوں اور خون تک میں سرایت کر گئے اور ان کے اندر سے حرکت و سعی کی تمام قوت سلب کر دی۔ یہاں تک کہ آہستہ آہستہ وہ عظیم قوم ایک مستقل غنودگی میں ڈوب گئی۔ چھڑی کی رفاقت اور اپنی کوشش کے باوجود گرد اور میل کی دھند سے بچنا میرے لیے ناممکن ہو جاتا ہے۔ جب میں گھر پہنچتا ہوں تو میل میرے لباس پر میرے جسم پر جگہ جگہ قابض ہو چکی ہوتی ہے۔ ویسے میں بڑا محتاط آدمی ہوں زندگی میں پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہوں کہ کہیں دامن آلودہ نہ ہو جائے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ کھانا کھاتے وقت میں احتیاط سے کام نہیں لیتا۔ سالن کا ایک آدھ چھینٹا ضرور میرے کپڑوں پر گر جاتا ہے۔ دراصل کھانا کھانا ایک نہایت بے تکلفانہ شغل ہے۔ اس میں اگر انگلیاں، لب و رخسار یا کپڑے وغیرہ سالن سے آلودہ ہو جائیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ ویسے بھی کھانا کپڑے پہن کر نہیں بلکہ کپڑے اتار کر تہ بند باندھ کر اور فرش پر بیٹھ کر کھانا چاہیے کیوں کہ کھانے کا لطف مکمل آزادی میں ہے کسی قسم کی قید یا پابندی میں نہیں۔ آزادی سے حاصل کی ہوئی خوراک جسم کو مضبوط اور صحت مند بناتی ہے جب کہ قید و بند کی خوراک جسم کو نحیف و لاغر کر دیتی ہے۔ سالن سے کپڑے خراب ہونے کی شکایت بھی میری بیوی کو اب نہیں رہتی۔ واشنگ مشین

نے اس کی تمام شکایات کو دُور کر دیا ہے۔

مشین کے گھر میں ہونے سے وہ خوشی سے پھولی نہیں سما رہی۔ اس کے چہرے پر مسرت شاید اس لئے بھی رقص کناں ہے کہ اب اسے وہ خیال بھی نہیں رہا جو آس پاس کے گھروں میں واشنگ مشین کے ہونے کی وجہ سے اس کے ذہن میں پیدا ہو گیا تھا۔ بچے مشین کے ارد گرد کھڑے خوشی سے تالیاں بجا رہے ہیں لیکن میں جب اُن کی مسرت کے مہین آنچل میں سے باہر ماحول کو دیکھتا ہوں تو میری نگاہیں دھندلا کر واپس آ جاتی ہیں اور میں سوچتا ہوں کاش میرے گھر کے باہر کوئی ایسی واشنگ مشین نصب ہو جائے جس میں سے گزر کر معاشرے کے سارے غلیظ اور بدبودار پیراہن صاف ستھرے اُجلے اور سپید ہو جائیں۔ روحوں پر سے صدیوں کی جمی ہوئی میل اُتر جائے اور دلوں سے بغض اور کینہ اور منافقت کی بساند دُھل جائے تاکہ عظیم انقلاب کی پھلجھڑیاں جو میں اپنے ننھے سے گھر کے اندر دیکھتا ہوں باہر بھی دیکھ سکوں۔

نیند | حامد برگی

اگر کوئی مجھ سے کہے کہ قدرت کی عطا کردہ ہزار ہا نعمتوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرو تو میں بلا جھجک کہوں گا "نیند"!

جو لوگ ہمیں خرگوش اور کچھوے کی کہانی سنا کر جاگتے رہنے اور بھاگتے رہنے کی فضیلت کا قائل کرنا چاہتے ہیں وہ خود اپنے اگلے جنم میں کچھوا بننے کی خواہش کریں تو کریں ہم تو خرگوش بننے کو ہی ترجیح دیں گے۔ ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہماری فطرت میں اب بھی خرگوش کی سی سہل انگاری پسندی موجود ہے، ہم جہاں بھی ہری ہری، نرم نرم، ملائم ملائم خنک گھاس دیکھتے ہیں ہمارا وہیں سب بے ساختہ پیر پسار کر لیٹ جانے کو جی چاہتا ہے۔ میٹھی نیند کے مزے لینے کو دل کرتا ہے، خرگوش کی زندگی کے کچھ اور بھی رومانوی پہلو ہیں ہمیں ان سے بحث نہیں البتہ کچھوے کے ساتھ مقابلہ میں ہمیں خرگوش کی خود اعتمادی پر بھی رشک آتا ہے، یہ اور بات کہ وہ دوڑ جیت نہ سکا، لیکن دنیا میں جیت ہی تو سب کچھ نہیں!

کہتے ہیں نیند تو سُولی پر بھی آجاتی ہے، آجاتی ہوگی، نیند چیز ہی ایسی ہے، ہر دُکھ درد کا احساس بھلا دیتی ہے۔ کسی سُولی پر چڑھنے والے سے اگر اس کی آخری خواہش پوچھی جائے جس کے پورا کرنے کا وعدہ کیا جائے تو اُسے بلا تامّل نیند مانگ لینی چاہیے، وہ رشن نیند کی چند گھڑیاں بھی اگر اُسے مہیا کر دی گئیں تو وہ ہنستا کھیلتا دنیا سے رخصت ہو جائے گا۔

نیند کو عارضی موت بھی کہا جاتا ہے۔ یہی نیند کی سب سے بڑی فضیلت ہے، آپ زندگی میں موت کے مزے بھی لیجیے، زندگی میں کتنے ہی مرحلے ایسے آتے ہیں کہ انسان کا بے ساختہ مر جانے کو جی چاہتا ہے، کیٹس (KEATS) نے نغمۂ عندلیب سُنا تو اتنا بے خود ہوا کہ اس بے خودی میں ہی زندگی تیاگنے کی خواہش کرنے لگا۔ ہم بھی کسی کوہسار، سبزہ زار، مرغزار میں زندگی کا کوئی لمحہ گذارنے کی سعادت پاتے ہیں تو بے ساختہ اس لمحہ کو امر کر دینا چاہتے ہیں۔ ہم اسی لمحہ میں ہمیشہ کے لیے آباد ہو جانا چاہتے ہیں، دراصل ہم بوڑھا ہونے اور خزاں رسیدہ ہو کر پتّا پتّا جھڑنے سے عالمِ بہار میں ہی گذر جانا پسند کرتے ہیں۔ اس سے زیادہ ہم اپنے جذبہ و احساس کی عمر رسیدگی اور مضمحل ہونے سے بھی گھبراتے ہیں لہٰذا اگر نغمہ و خوشبو سے بھرا کوئی لمحہ ہمیں ہمیشہ کے لیے اپنی آغوش میں لے لے تو ہم اپنی زندگی کے تمام تر امکانات چھوڑ کر اس لمحہ کی گود میں جانے کے لیے تیار ہیں لیکن افسوس یہ تو محض شاعر کا خواب ہے۔

بہر حال نیند ہمیں عارضی طور پر ہی سہی ان کیفیات سماوی سے سرشار ضرور کرتی ہے۔

نیند کے عالم میں ہم اپنی روحانیت سے قریب تر ہوتے ہیں، جسم سے بے نیاز روح کی پرواز کے راستہ میں جسم ہی سدِّ راہ ہے، جسم ہی دراصل روح کا عذاب ہے، تخلیقِ آدم و حوّا میں جسم پروگرام میں شامل نہ تھا۔ اللہ نے تو دو روحوں کی تخلیق کی تھی اور انہیں ہمیشہ ہمیشہ باغِ عدن میں رہنے کا

راذن دیا تھا، آدم و حوا کی اذیت پسندی تھی کہ انہوں نے جسم کا روگ پال لیا، ہم نے تو شجرِ ممنوعہ ہمیشہ انسان کے جسم کو ہی سمجھا ہے کہ اس کی قربت بڑی پیدار ہے مگر یہ قربت جذباتی پژمردگی کو بھی جنم دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ازدواجی زندگی کو جو جسمانی قرب و اتصال کا قانونی جواز ہے محبت وکشش کی موت کہا جاتا ہے، قدرت نے تو دوری چاہی تھی کہ یہ محبت وکشش کی فضا آدم و حوا کے درمیان قائم رہے مگر کیا کہیں اُن کا کہ وہ اس فلسفے کا اتنا سا نکتہ نہ پا سکے اور آج بابا آدم اور اماں حوا کہلاتے ہیں پوری نوعِ انسانی کے ماں باپ ورنہ عاشق و معشوق ہوتے۔

ہیں تو زندگی کا سارا دکھ عالمِ بیداری کا دکھ دکھائی دیتا ہے، نیند میں انسان کتنا معصوم ہوتا ہے خونخوار سے خونخوار انسان بھی نیند کے عالم میں بے ضرر دکھائی دیتا ہے۔ دنیا کو تباہ و برباد کرنے کے تمام منصوبے عالمِ بیداری ہی کی حرکتیں ہیں، نیند دھماکوں کی متحمل نہیں ہو سکتی، ہیروشیما اور ناگاساکی کا منظر اگر نیند میں بھی نظر آجائے تو انسان ہڑبڑا کر بیدار ہو جائے۔

نیند سے محرومی سب سے بڑا عذاب ہے۔ سُنا ہے بعض ادارے جب کسی ملزم سے جرم اگلوانا چاہتے ہیں تو یہی ہتھکنڈا آزماتے ہیں۔ ملزم کو کئی کئی دن نیند سے محروم رکھا جاتا ہے بالآخر اس اذیت سے پریشان ہو کر ملزم مجرم ہونے کا اقرار کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ نیند کے چند لمحے اُسے نصیب ہو جائیں خواہ کال کوٹھری میں ہوں۔

ان کے علاوہ قدرت کی سرزنش بھی مجرم سے کچھ ایسی ہی ہوتی ہے۔ کسی بڑے جرم کی پاداش میں مجرم نیند سے محروم ہو جاتا ہے۔ نیند کیلئے دل و دماغ کا سکون چاہیے، مجرم اسی سکون کا قاتل بن جاتا ہے۔ ڈنکن کا قتل ڈنکن کا قتل نہیں میکبتھ نے اپنی نیند کو قتل کر دیا ہے۔

MACBETH HAS MURDERED SLEEP SO MACBETH SHALL SLEEP NO MORE

لیڈی میکبتھ نیند کو محض ایک بے جان تصویری کیفیت سمجھتی ہے، نیند سے محروم ہو کر دیوانگی میں چراغ لئے نیند تلاش کرتی پھرتی ہے جس کا دُور دُور تک نام و نشان نہیں، دنیا کی کوئی طاقت اسے اس کی کھوئی ہوئی نیند نہیں لوٹا سکتی۔

کسی بیمار کی بیماری سے شفایابی کی پہلی علامت نیند ہے۔ آج کل معالج کے ہاتھ میں سب سے بڑا معجزہ نیند آور ادویات کا معجزہ ہے مریض تڑپتا ہوا ڈاکٹر کے پاس آتا ہے، نیند آور ٹیکا۔ کی ایک ہی خوراک سے پل کے پل آرام پاتا ہے۔ اس معجزہ و کرامت کے بعد کون ہے جو اپنے مسیحا کے ہاتھ نہ چومے اور اُسے منہ مانگا نذرانہ پیش نہ کرے۔

اسی قسم کی خواب آور ادویات نے بڑے بڑے "صاحبانِ کشف و کرامات" پیدا کیے ہیں، جن کی دی ہوئی چٹکی خاک شفا بن گئی اور جنہوں نے دم کے دم میں سب غم مٹا دیئے۔ ہپیوں کی ساری تحریک ہی حشیش کا کرشمہ تھی۔ نیند و سکون کے کیسے کیسے متلاشی خیالی جنتوں میں آباد ہونے آئے اور نیند و سکون کی طلب میں اس تحریک کی نذر ہو گئے۔

نیند اور سکون کی یہی تلاش ہے جو بسا اوقات انسان کو ساری انسانی اقدار اور اخلاق و شائستگی کی تمام بندشوں سے آزاد کر دیتی ہے۔ آج شراب تو بہت ادنیٰ درجہ کی چیز ہے، نیند کے متلاشیوں نے ایجاد و دریافت کی اس دنیا میں بڑی بڑی چیزیں ڈھونڈ نکالی ہیں، انسان زندگی کی بازی لگا کر بھی ان عارضی نیندوں کو حاصل کرنا چاہتا ہے، نیند کی یہ خواہش ایک عالمی عارضہ بن گئی ہے اور حکومتوں کے بڑے بڑے فیصلے انسانی طلب کے اس سیلِ تند کے آگے خس و خاشاک کی طرح بہہ گئے ہیں

نیند کی طلب انسانی روح کی تڑپ نظر آتی ہے، روحِ انسانی اپنے عالمِ غفلت میں واپس لوٹنا چاہتی ہے اور کسی روک کو خاطر میں لانے کو تیار نہیں شاید دائمی نیند ہی اس کا مداوا ہو۔

ہاں ہم خوش نصیب ہے وہ شخص جسے نیند کی نعمت نصیب ہے اور وہ اس کے لئے کسی سہارے کا محتاج نہیں نہ کسی عارضی سہارے کا نہ دائمی سہارے کا۔ اٹھتا ہے تو خرگوش کی سی دوڑ لگاتا ہے ... نرم نرم، ملائم ملائم چمکتی ہوئی گھاس دیکھتا ہے تو وہیں پیر پسار کر سو جاتا ہے اس خوش اعتمادی

وزیر آغا | معافی مانگنا

معاف کرنا ایک شعوری فعل ہے مگر معافی مانگنا ایک فطری عمل ہے۔ معاف کرنے والا ہونٹوں کے معنی خیز تبسم یا ابرو کے ہلکے سے اشارے سے معاف کر دینے کا قائل نہیں۔ وہ تو اس بات کا قائل ہے کہ ڈھول تاشوں کے ساتھ سٹیج پر آئے اور وہاں قمیص اتار کر پہلے تو ان چرکوں کی نمائش کرے جو فریقِ مخالف نے اس کے بدن اور رُوح پر لگائے تھے اور پھر بہانگِ دہل اس بات کا اعلان کرے کہ ہر چند فریقِ مخالف کے مظالم اَن گنت اور ناقابلِ معافی ہیں لیکن میرے دل کی کشادگی دیکھو کہ معاف کر رہا ہوں۔ کتنا عظیم ہوں میں! معاف کرنے میں زیاں اور احساسِ زیاں کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں۔ اُلٹا اس بات کا احتمال ہے کہ عزیز رشتہ دار، دوست احباب اپنے پرائے سب آپ کے شانوں کو تھپک کر شاباش دیں گے کہ آپ نے عالی ظرفی کا ثبوت دیا، بزرگوں کی روایت کو آگے بڑھایا، محبت، اخوت اور بھائی چارے کا سنگِ بنیاد رکھا، سماجی اور اخلاقی قدروں کو تقویت دی اور یوں جریدۂ عالم پر آپ کا نام ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ثبت ہوا۔ مگر کیا واقعی؟

کیونکہ میرا یہ خیال ہے کہ معاف کرنا رعونت اور خود پسندی کی ایک مثال فراہم کرتا ہے۔ مجھے معاف کرنے والے کے سر پُر غرور سے نفرت ہے۔ مَیں معاف کرنے والے کو کبھی معاف نہیں کر سکتا کیونکہ وہ معافی دینے کے بعد ایک ایسی مخلوق بن جاتا ہے جو زمین پر رہنے کے بجائے ہمالیہ یا اولمپس کی بلندیوں پر رہنا پسند کرتی ہے۔ وہ خود کو آدمی کی سطح سے اُوپر اُٹھا کر دیوتا کی سطح پر لے آتا ہے یا کم از کم اس وہم میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ وہ کوئی غیر ارضی مخلوق ہے۔ معاف کرنے والا اپنے اور اپنے مدِ مقابل کے درمیان ایک کشادہ خلیج پیدا کرتا ہے۔ وہ خلقِ خدا کو دو واضح جماعتوں میں تقسیم کر کے خوش ہوتا ہے —— ایک وہ جماعت جو معاف کرنے کے جملہ آداب سے واقف ہے، دوسری وہ جو معافی مانگنے کے ہُنر سے بہرہ ور ہے۔ وہ محسوس کرتا ہے جیسے وہ کوئی برہمن ہے جس کے قدموں میں گِرا ہوا شودر اُس سے اپنی ہزاروں نسلوں کی ناعاقبت اندیشیوں کی معافی مانگ رہا ہو اور وہ خود اُسے رحم کی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہے —— غلیظ، ملیچھ، جنور! جا تجھے معاف کیا ورنہ تُو کرۂ انسانیت کے چہرے پر ایک بدنما دھبہ ہے، تجھے کیسے معاف کیا جا سکتا ہے!

مگر میں کہتا ہوں کہ معاف کرنے والا تو تہذیبی اعتبار سے ایک قطعاً ناتراشیدہ کردار ہے کیونکہ دشمن کی کھال ادھیڑ کر قہقہہ لگانے اور دشمن کو ہنس کر معاف کر دینے میں مزاجاً کوئی خاص فرق نہیں۔ دونوں احساسِ برتری کے مظاہرے ہیں۔ دونوں صورتوں میں شخصِ مذکور دشمن کو بنظرِ تحقیر دیکھتا اور اپنی کارکردگی پہ نازاں ہوتا ہے۔ سو معاف کرنے والا بھی درحقیقت اندر سے وہی نیم وحشی انسان ہے جو دوسروں کی شکست میں اپنی انا اور شخصیت کی فتح دیکھتا ہے۔ دوسری طرف معافی مانگنے والا ایک ایسا دیدہ ور ہے جو کہیں ہزاروں برس کی تہذیبی بے نُوری کے بعد جنم لیتا ہے۔ معافی

مانگنے میں اپنی شخصیت کی نفی کرنے کا وصف خاص پنہاں ہے جو طویل ریاضت کے بعد ہی حاصل ہوتا ہے۔ معافی کا طالب اپنی شخصیت کے زرہ بکتر کو جسم سے الگ کرکے اپنے فطری حُسن کی نمائش کرتا ہے اور تہذیب کے سلاسل سے آزاد ہو کر واپس فطرت کی گرم و گداز آغوش میں چلا جاتا ہے۔ غور کیجئے کیا زندگی کی ہموار سطح پر شخصیت ایک پھوڑے کی طرح نہیں ہے؟ — جب خون کی ساری غلاظت ایک جگہ جمع ہوتی ہے تو جسم پر اُبھار سا نمودار ہو جاتا ہے۔ جب اَنا پھولتی اور تکبر پھیلتا ہے اور ہمچو ما دیگرے نیست کا احساس انسان کے سر پر بھاری عمامہ اور جسم پر لباسِ فاخرہ بن جاتا ہے تو شخصیت بھی انسانیت کے بدن پر ایک پھوڑے کی طرح نظر آنے لگتی ہے۔ پھر جب شخصیت کے پھوڑے کو زمانے کا نشتر چھیڑتا ہے تو گلتے ہوئے ناسور سے بہتی ہوئی پیپ سارے ماحول کو متعفن کرنے لگتی ہے مگر معافی مانگنے والے شخص کے خون میں کوئی ایسا اینٹی بائی اوٹک پیدا ہو جاتا ہے جو اندر ہی سے پھوڑے کے سارے مواد کو خشک کر دیتا ہے۔ لہٰذا نشتر کی ضرورت ہی نہیں پڑتی اور سارا بدن شیشے کی طرح ہموار اور شفاف ہو جاتا ہے۔ تاریخ اُن جابر سلاطین کا نام تو بھول گئی جو زندگی بھر ہر چھوٹی بڑی سلطنت کو تہ تیغ کرنے کے ضروری کام پر مامور رہے مگر ان بادشاہوں کو نہ بھلا سکی جنہوں نے اپنی شکست کو اَنا کا مسئلہ نہ بنایا بلکہ قاعدے کے مطابق دانتوں میں تنکے دبائے فاتح کے حضور پہنچے اور اپنی شخصیت کو منہدم کر کے فاتح کو ذلیل و رسوا کر گئے۔ سکندرِ اعظم ایسا فاتح معافی مانگتے ہوئے پورس کے سامنے محض ایک مرہوم سا نقطہ بن کر رہ گیا اور اُس کی ساری شخصیت قطعاً بے آب ہو کر رہ گئی۔ لوگ کہتے ہیں کہ ستلج کے کنارے پہنچ کر سکندر کی فوج نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا مگر کوئی نہیں جانتا کہ اس نے کیوں انکار کیا۔ اصل بات یہ ہے کہ پورس نے معافی مانگ کر سکندر کی ساری بھاری بھرکم شخصیت کو تار تار کر دیا تھا اور اب اُس کے فوجی بھی اس کی قیادت کو تسلیم کرنے سے انکار کر رہے تھے۔

چند روز ہوئے میرے ایک دوست نے مجھے اپنے ایک بہت پُرانے ملازم کا قصہ سنایا۔ یہ ملازم اپنی حماقتوں سے خاصی توڑ پھوڑ کرتا رہتا تھا۔ ایک روز اُس نے کچھ زیادہ ہی تخریبی کارروائی کی تو میرے دوست نے انتہائی برہمی کی حالت میں اُسے ملازمت سے برطرف کرتے ہوئے حکم دیا کہ وہ فوراً کہیں چلا جائے مگر ملازم کی کئی نسلیں اس گھر کو تہ و بالا کرتی آئی تھیں لہٰذا اُس نے نقل مکانی سے صاف انکار کر دیا۔ پھر جب نمک حلالی کے اِس ثبوت پر بھی مالک کے غصے کا پارہ نہ اُترا تو وہ میرے دوست کے سامنے دست بستہ کھڑے ہو کر معافی کا خواستگار ہوا۔ میرے دوست نے معافی دینے سے انکار کیا مگر ملازم پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اُس نے آنکھیں میچ لیں، ہاتھ جوڑ دیئے اور "معافی۔ معافی۔ معافی" کا ورد کرتا چلا گیا۔ میرا دوست کہتا ہے کہ اُس کی یہ حالت دیکھ کر پہلے تو میرا غصہ فرو ہوا، پھر میرے دل میں اس کے لئے ہمدردی پیدا ہوئی جو جلد ہی احساسِ ندامت میں تبدیل ہو گئی۔ پھر یوں ہوا کہ میری ساری شخصیت اندر سے ٹوٹ پھوٹ گئی اور مجھے محسوس ہوا جیسے میں اندر سے بالکل خالی ہو گیا ہوں۔ دوسری طرف ملازم کے چہرے پر ایک عجیب سا جلال تھا جو اپنا سب کچھ قربان کر دینے کے بعد ہی نمودار ہوتا ہے۔ اُس کے اندر کوئی ایسی پُراسرار قوت پیدا ہو گئی تھی جس کا سامنا کرنا ہی مشکل تھا۔ میرا دوست کہتا ہے کہ مجھے اُس شخص سے ڈر آنے لگا۔ جو شخص اپنی اَنا، اپنی پوری شخصیت اور وجود کی نفی کر دے، اُس کا مقابلہ کون کر سکتا ہے؟

آج صبح میں نے معافی مانگنے والے کی اِس غیر مرئی قوت کا ذکر اپنے دوست م۔ م سے کیا تو اُن کی مرنجاں مرنج طبیعت جولانی پر آ گئی۔ عینک اُتار کر اُس کے شیشے صاف کرتے ہوئے بولے:

"کبھی آپ نے رسّہ کشی کا منظر دیکھا ہے۔ ارے بھئی وہی TUG OF WAR!"

"ہاں جب میں کالج میں پڑھتا تھا تو ایک بار —"

کہنے لگے:

"ٹھیک ہے! اب سوچئے کہ دونوں طرف سے زور آزمائی ہو رہی ہے۔ سانس پھول رہے ہیں اور پسینے چھوٹ رہے ہیں اور پھر اچانک ایک طرف کے پہلوان نما کھلاڑی رسے کو ڈھیلا چھوڑ دیتے ہیں۔ جانتے ہیں ایسے میں کیا ہوگا؟"

میں نے کہا:

"ہوگا کیا؟ یہی کہ دوسری طرف کے پہلوان چاروں شانے چت ایک دوسرے پر جا گریں گے۔"

کہا:

"بس یہی حالت اُس شخص کی ہوتی ہے جس کا مدمقابل اچانک معافی مانگ لے۔ وہ شخص تو سمجھو تباہ ہوگیا، برباد ہوگیا، چاروں شانے چت ہوگیا کیونکہ اُس نے فریقِ مخالف کا مقابلہ کرنے کے لئے جو قوت جسم کے سب حصّوں اور نسل کے سارے گوداموں سے ایک جگہ اکٹھی کی تھی اس کا تو مصرف ہی باقی نہ رہا۔ اب یہ قوت خود اس شخص کو تہ تیغ نہیں کرے گی تو کیا کرے گی؟"

بات میری سمجھ میں آگئی۔ چنانچہ میں نے م۔م سے کہا کہ یہ تو پیر صاحب والی بات ہوئی کہ انہوں نے چلّہ کاٹ کر جنّ تو طلب کر لئے مگر جس شخص کو زک پہنچانے کے لئے انہیں بلایا گیا تھا وہ جنّوں کا انتظار کئے بغیر ہی راہیِ ملکِ عدم ہوگیا۔ اب ظاہر ہے کہ جنّ صاحبان پیر صاحب ہی پر اپنی قوت آزمائیں گے۔

ذہانت کے اس مظاہرے پر م۔م خوش ہوئے اور خوشی خوشی چلے گئے مگر میں تا دیر سوچتا رہا کہ حق شاید معاف کرنے والے کی تحویل میں نہیں ہوتا بلکہ معافی مانگنے والے کی گرفت میں ہوتا ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ معافی مانگنے کے عمل ہی سے پیدا ہوتا ہے اور پھر معافی مانگنے والے کو تو کچھ نہیں کہتا البتہ معاف کرنے والے کو ضرور تہ تیغ کر دیتا ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ جب کوئی شخص معافی کا طلب گار ہوتا ہے تو اپنی ذات کی کسی مخفی قوت کا مظاہرہ کرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ شخصیت کی پتھریلی زمین میں سے ذات کے عمق پیشتے کو باہر نکلنے کا راستہ بجھاتا ہے۔ پھر وہ زندگی کے بدن پر پھوڑے کی طرح اُبھرا ہوا نہیں رہتا بلکہ لہو بن کر بدن کی رگوں میں دوڑنے لگتا ہے یا ہوا، پانی اور آگ ایسے عناصر میں ڈھل کر واپس فطرت کے بے نام جسم کا حصہ بن جاتا ہے۔ معافی مانگنے والا فطرت کا ایک حصّہ ہے بلکہ وہ تو خود فطرت ہے اور فطرت ہر وقت عفو و درگزر کی طالب ہوتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ میں نے ہمیشہ معافی مانگنے کے عمل کو معاف کرنے کے عمل پر فوقیت دی ہے کہ ایسا کرنے سے انسان حدود کو عبور کر کے لامحدود کے آستانے تک پہنچ جاتا ہے۔

جگن ناتھ آزاد

رہا جو دل میں کبھی خود ہی کبریا کی طرح
زباں پہ نام تھا اک دن وہی دعا کی طرح

ہمیں تھے کام بہت، رُک سکے نہ پل کے لئے
گزر گئے ترے کوچے سے ہم صبا کی طرح

امیرِ شہر، امیدِ سلام ہم سے نہ رکھ
کہ بے نیازِ دو عالم ہیں ہم خدا کی طرح

ہمارا رنگِ سخن پھر اُڑا سکا نہ کوئی
ہمارا رنگِ سخن تھا تری ادا کی طرح

سناؤں کیسے کہ میرا فسانۂ غمِ دل
نہ ابتدا کی طرح ہے نہ انتہا کی طرح

مگر جو کام پڑا بن گئے سبھی انجان
ملا تھا یوں تو ہر اک شخص آشنا کی طرح

اختر انصاری اکبر آبادی

ذرا سی دیر کو موجِ بہار ہو جاتی،
تو اس چمن کی فضا خوشگوار ہو جاتی
کبھی تو میرے چمن میں کوئی کلی کھل کر
نقیبِ قافلۂ نوبہار ہو جاتی
اگر ملا کے نظر مجھ سے مسکرا دیتے
یہ جاں نواز گھڑی یادگار ہو جاتی
مجھے سکون جو ملتا تو مطمئن دنیا
بہت تڑپتی بہت بیقرار ہو جاتی
رہا نہ منتظرِ وقت ورنہ ساری عمر
اسیرِ سلسلۂ انتظار ہو جاتی،
کبھی ذرا سی شکایت بھی میں جو کر سکتا
کسی کی خاطرِ نازک پہ بار ہو جاتی
نہاں ہے دل میں تو دنیا میں اک قیامت ہے
اگر یہ راز کی بات آشکار ہو جاتی
بہت بلند تھا اختر مرے جنوں کا مقام
ہوائے دہر اگر سازگار ہو جاتی

اختر ہوشیارپوری

ہوا کے قافلے شب بھر شجر شجر اُترے
مگر میں چُپ تھا کہ شاخوں سے برگِ تر اُترے

مرے لہو کے صحیفے تو مجھ پہ اُترے ہیں
یہ حرف حرف ہیولے کہاں مگر اُترے

خلا کا دائرہ شاید زمیں کا حصّہ ہے
ہزار سائے مرے پیچھے بام پر اُترے

تمام عمر پرندے رہے شریکِ سفر
مگر پرندے کہاں تھے جب اپنے گھر اُترے

مسلسل ایک سفر پاؤں کا نصیب رہا
مسافروں کی طرح ہم نگر نگر اُترے

قلم کی جرأت صدا کا چراغ حرف کا نور
سرائے دہر میں کیا کیا پیامبر اُترے

اگر فرازِ فلک سے اُتر نہیں سکتی
کسی مکاں کے زینے سے ہی سحر اُترے

نئی رُتوں میں گئے موسموں کے زخم بھی ہیں
خدا کرے کہ یہاں کوئی شیشہ گر اُترے

میں جنگلوں کے گھنے راستوں سے گذرا ہوں
وہ آسماں کی بلندی سے بام پر اُترے

تہوں کے نیچے خود اپنی تلاش میں اختؔر
سمندروں میں مسافر بھنور بھنور اُترے

احمد ظفر

میں جس کی زد میں ہوں وہ میری زد میں آ جائے
طویل اِن بھی ہوئے میری سوچ کے سائے

میں اپنے جسم کے زنداں میں مشتِ خاک سہی
کہو صبا سے مری خاک آ کے لے جائے

مرے لہو میں وہ چہرہ اُتر گیا جب سے
مری طلب میں زمانے نے ہاتھ پھیلائے

ستم کی رات کہیں آس پاس ہوتی ہے
چراغ جب کسی اندھے کنویں میں گر جائے

میں اپنے خون سے لکھوں گا بر سرِ دیوار
وہ لفظ جو مرے ہونٹوں میں تو نے دفنائے

شجر نے پھول دیئے ہیں خزاں کے موسم میں
ظفر نے میری شکستوں کو ہار پہنائے

غلام جیلانی اصغر

عُمر بھر کا دے گیا کوئی ستمگر سوچنا
اُس سے مل کر سوچنا، اس سے بچھڑ کر سوچنا

جس کو دیکھو اس کے چہرے پر لکیریں سوچ کی
جیسے ہو جائے کسی شے کا مقدر سوچنا

شاخِ گل ہوتا تو دیواروں سے تجھ کو جھانکتا
اب تو سب کو دیکھنا اور آنکھ بھر کر سوچنا

رات خوابوں میں کئی دھندلے مناظر دیکھنا
دن کی تنہائی میں بھی خوابوں کا اکثر سوچنا

ٹوٹتا رہتا ہوں پہروں میں تضادِ کرب سے
اپنے باہر مسکرانا اپنے اندر سوچنا

میں پرندہ ہوں کسی دن شاخ سے اُڑ جاؤں گا
پھر گئے گزرے دنوں کا موجِ صرصر سوچنا

ساقی فاروقی

رات اپنے خواب کی قیمت کا اندازہ ہوا
یہ ستارہ نیند کی تہذیب سے پیدا ہوا

میری آنکھوں میں انوکھے جرم کی تجویز تھی
صرف دیکھا تھا اُسے، اس کا بدن میلا ہوا

وہ کوئی خوشبو ہے میری سانس میں بہتی ہوئی
میں کوئی آنسو ہوں اس کی روح میں گرتا ہوا

اس کے ملنے اور بچھڑ جانے کا منظر ایک ہے
کون اتنے فاصلوں میں بے حجاب ایسا ہوا

ذہن کی زرخیز مٹی سے نئے چہرے اُگے
جو مری یادوں میں زندہ ہے سراسیمہ ہوا

پریم وار برٹنی

نغمہ زن ہے جنگلوں میں نور کی برسات پھر
جگنوؤں کی جھیل میں اُتری ہوئی ہے رات پھر

ریزگاری زرد پتّوں کی بھری ہے جیب میں
خوب دی ہے موسمِ گل نے ہمیں سوغات پھر

پہلے پہنائے گئے کچھ تنگ پیراہن تجھے
اور لیے ہو گئے پرچھائیوں کے ہاتھ پھر

کیا دھنک کو سات رنگوں کی حسیں نوکا کہیں
دن کے دریا میں ڈبو آئی جسے برسات پھر

یہ صدی، یہ نسل تو اپنے ہی گھر میں قید ہے
کون ناچے گا سرِ مقتل ہمارے ساتھ پھر

اپنے چہرے پر لگا کر کیوں مرے چہرے کا خول
تجھ سے سورج مانگتا ہے حُسن کی خیرات پھر

شب کی ڈولی میں سنہرا چاند کیوں ہنستا نہیں
لُٹ گئی ہے راہ میں شاید کہیں بارات پھر

پریم روشن کر لہو کی رُت سے فانوسِ سحر
گھر گیا ہے کرب کے کہرے میں شہرِ ذات پھر

فضا ابن فیضی

کچھ اتنا صاحبِ توقیر و شان وہ بھی نہ تھا
میں خاک خاک سہی، آسمان وہ بھی نہ تھا

رہا میں اس کے تعلق سے نقدِ جاں در جیب
مرے لئے کوئی اونچی دُکان وہ بھی نہ تھا

اکیلے میں ہی نہ تھا بدگمان کچھ اس سے
مری طرف سے بہت خوش گمان وہ بھی نہ تھا

مجھے عطا ہوئی میراث میں سلگتی دھوپ
جو سر پہ ہوتا ہے اک سائبان وہ بھی نہ تھا

تمہارا شہر بہت اجنبی لگا ہم کو
گلی کے موڑ پہ تھا جو مکان وہ بھی نہ تھا

رہا ہمیشہ توازن سا میرے اس کے بیچ،
جو میں نہ تھا کوئی تیشہ، چٹان وہ بھی نہ تھا

ہماری بات کی تائید لوگ کیا کرتے
وہ جس کو کہتے ہیں زورِ بیان وہ بھی نہ تھا

وہ لفظ جس کو کہا حاصلِ کتاب اس نے
مرے شعور و ہُنر کی زبان وہ بھی نہ تھا

کوئی سبب تھا جو کل اس طرح رہا خاموش
فضاؔ، وگرنہ بہت بے زبان وہ بھی نہ تھا

اظہر جاوید

دھوپ اتنی تیز ہے اور سائباں ملتا نہیں
شہرِ ناپُرساں میں کوئی مہرباں ملتا نہیں

وہ نظر کیا تھی کہ جس کے کھو گئے سارے افق
یہ زمیں کیسی ہے جس کو آسماں ملتا نہیں

اِک ہجومِ دوستاں ہے یوں تو اپنے آس پاس
المیہ یہ ہے کہ کوئی رازداں ملتا نہیں

ذہن کہتا ہے کہ چل مُرشد کے در پر بیٹھ جا
اور دِل بے چین ہے وہ جانِ جاں ملتا نہیں

خط لکھے، کالم لکھے، اظہر بہت غزلیں کہیں
جو اُسے بھا جائے وہ زورِ بیاں ملتا نہیں

بھٹکوں اگر تو منزلِ شب کی خبر بھی ہو
اس شہرِ غم میں کاش کوئی میرا گھر بھی ہو

یوں دیکھنے کو سارا زمانہ ہے اپنے ساتھ
حسرت یہی ہے کوئی مگر ہم سفر بھی ہو

تجھ پر یقین ہے، ترے وعدوں پہ اعتبار
لیکن یہ انتظار کبھی مختصر بھی ہو

کٹ جائے عمر قید مگر شرط ہے یہی
اس رات کے نصیب میں کوئی سحر تو ہو

تجھ کو اداس دیکھ کے ایسے لگا مجھے
صبحِ بہار جیسے بہت بے اثر بھی ہو

افضل منہاس

رنگ رسوا ہو گئے تو آہٹیں مر جائیں گی
تہمتیں زندہ رہیں گی، چاہتیں مر جائیں گی

لوٹ کر جانا پڑے گا اپنے ماضی کی طرف
ٹھیک ہے، پر عہدِ نو کی جدتیں مر جائیں گی

رونقوں کے سیلِ ویراں کو نہ گر روکا گیا
دوریاں رہ جائیں گی اور قربتیں مر جائیں گی

گفتگو کی دھار سے کٹنے لگے نازک خیال
یہ تماشہ دیکھ کر تو دھڑکنیں مر جائیں گی،

روح کا سارا دریچہ کھول دے، آئے ہوا
جسم کے زنداں میں ورنہ خواہشیں مر جائیں گی

سر پہ سورج آ رہا ہے، چند لمحوں کی ہے بات
قد سکڑ جائیں گے سارے، قامتیں مر جائیں گی

بے زباں شرمیلے شکوے سوچتے رہ جائیں گے
دیکھتے ہی دیکھتے کچھ ساعتیں مر جائیں گی

اب تو جو ہوتا رہے محسوس تک ہوتا نہیں
اب تو یوں لگتا ہے افضل سب حسیں مر جائیں گی

ناصر شہزاد

نینن بیلا، بدن چمپا کی ڈالی
چلی ہے تو کہاں او پھول والی
یہ تن، یہ من۔ اسی کی دان بھکشا
جنم جگ سے وہی میرا سوالی
ہوا کے گوش میں کرنوں کے بُندے
گھٹا کے دوش پر دوشال کالی
لکھوں پتیاں.... بتاؤں کیسے رتیاں؛
جیا سے سکھ، پیا سے سیج خالی
حکایت میں نہاں، جل سانپ، سبزہ
روایت میں رواں ہل اور ہالی،
وہ دن بچپن کے دہرائیں کبھی تو،
میں ڈھونڈوں، تم بجاؤ چھپ کے تالی،
سجن چت چور جگ میں اور سہیلی
لگن کی ڈور پگ میں لے رہی آلی،
کئے ہیں پیار کے اقرار، پی سے
بندھی ہیں گانٹھ میں قسمیں نرالی،
کرن کے گات پر بادل کا پنکھا
سکھی کے ہاتھ میں سونے کی بالی

کشور ناہید

اب بات کرو بس آئینے سے
رستہ نہ ملے گا بھاگنے سے
جیلوں میں بھرو سکوں کی دولت
تکیوں سے لپٹ کے جاگنے سے
بدلے گا ورق ورق زمانہ
بس ایک تمہارے چاہنے سے
پہنے گی زمین میری رنگت
مٹی کو خلا میں ٹانکنے سے
پتھر میں لہو چمک اٹھے گا
دیوانے کے ہونٹ کاٹنے سے
چہرہ ہے نقاب میں بھی عریاں
غم اور چھپا کے باندھنے سے
آنکھوں پہ لگا لو چار آنکھیں
منظر نہ ہٹے گا سامنے سے
اترا ہے مرا وجود شاید
پھولوں کے اداس "آئینے" سے

خورشید رضوی

بے بسی اس کو کہیں، یا کہیں ذوقِ ایثار
اپنی دھڑکن کو نمایاں نہیں کرتا دلِ زار
زیست کے چار طرف سنگِ خموشی کی فصیل
کسی جانب نہیں کھلتا کوئی بابِ اظہار
لڑکیاں قید ہیں سیلی ہوئی دیواروں میں
شاہزادہ کوئی آیا نہ کوئی شاہسوار
مکڑیاں تان کے بیٹھی رہیں روزنِ دل کے
کوئی سورج کی کرن ان سے نہ گزری زنہار
گونج کا زنگ لگا جاتا ہے محرابوں کو
لوٹ لوٹ آتی ہے محرومِ سماعت گفتار
ہے وہی طوقِ گلو، اور وہی زنجیرِ قدم
اور اسی قوسِ مکرر پہ رواں ہے پرکار
جانے اس حبس میں کب موجِ ہوا نقب لگائے
جانے کب میاں کی ظلمت سے رہا ہو تلوار

ماجد الباقری

میری بینائی اگر ہے تو دکھا دے کوئی
تیرے چہرے پہ مری آنکھ لگا دے کوئی

گرد آلود ہے آئینہ شناسا چہرے
سب ہی بے دست ہیں یہ گرد ہٹا دے کوئی

سنگِ منظر نہ سماعت پہ گراں گزرے گا
کل کی جو بات ہے وہ آج سنا دے کوئی

قافلے رات کے ٹھہرے ہیں تو کب تک ٹھہریں
ایک تصویر ہی سورج کی دکھا دے کوئی

جھوٹ کی بیل شجر بن کے نہ اونچی ہو جائے
دھوپ ٹکرائے تو دیوار گرا دے کوئی

گرد کے پیچھے مری یاد کی تصویریں ہیں
سارے پردوں کو بیک وقت ہلا دے کوئی

پرویز بزمی

چاہتوں کی راہ میں دیوارِ مجبوری رہی
کس قدر پرویز اپنے آپ سے دُوری رہی

رتجگوں کا بے ستوں تو عمر بھر کھودا مگر
آنسوؤں کی آبجو، آنکھوں کی مزدوری رہی

سبز پتوں نے نہ ڈھانپا بے عبا پیڑوں کا جسم
زرد شاخوں کی دعا محرومِ منظوری رہی

پربتوں پر برف کی اُجلی تہیں جمتی گئیں
وادیوں میں کہر کی شدت سے بے نوری رہی

قُربتیں اتنی کہ جیسے عکس آئینے میں ہو
دُوریاں ایسی کہ ساری عمر مہجوری رہی

حزیں لدھیانوی

شہرِ بیداد کے دستور عجب دیکھے ہیں
اینٹ، پتھر ہیں گراں، اور بدن سستے ہیں
کیسے سینوں میں لئے پھرتے ہیں دِل پتھر کے
جن کے چہرے ہیں گلاب اور بدن شیشے ہیں
سنگدل، آج جنہیں کہتے ہیں کنکر پتھر
میری نظروں میں وہی لعل وہی ہیرے ہیں
لاکھ ہو تیز ہوا دیپ جلائے رکھنا
رات کے بن ابھی تا حدِ نظر پھیلے ہیں
ہم گھروندوں کو سمجھتے ہیں وطن کی قوت
آپ محلوں کو فقط شانِ وطن کہتے ہیں
کیسے خس خانوں کے باسی یہ حقیقت سمجھیں
آجکل شہر بھی صحرا کی طرح تپتے ہیں
اُن درختوں سے حزیںؔ پیار ہے دونا مجھ کو
جن کی شاخوں پہ نہ پھل پھول نہ دو پتے ہیں

زمان کنجاہی

کہیں دیکھی نہیں چمک ایسی
تیری آنکھوں میں ہے دھنک ایسی

میں جدھر جاؤں تجھ کو ہی پاؤں
تیری صورت بھی ہے فلک ایسی

جو کسی اور پر نہ ظاہر ہو
کاش دیکھوں تری جھلک ایسی

جس کا اظہار بھی ہے نا ممکن
میرے سینے میں ہے کسک ایسی

جو کسی باغ میں نہیں ملتی
ہے گلِ یاد میں مہک ایسی

جو ہے اشکوں میں آب و تابِ زماںؔ
جگنوؤں میں نہیں چمک ایسی

انجم یوسف زئی

ہوا کے دشت میں پھرتا رہے شرر کب تک
میں تیری سمت کروں اور اب سفر کب تک

کوئی تو آئے کبھی اور آ کے دستک دے
رہیں گے بند یونہی جسم و جاں کے در کب تک

بجا کہ رات کا منظر شکست کھائے گا
یقیں کہ ہوگی بالآخر سحر مگر کب تک

اُسے بھی رو کے پلٹنا ہے اپنے گھر کی طرف
ہوائیں رکھیں گی بادل کو در بدر کب تک

بدن کے شہر میں انجم بڑا اندھیرا ہے
نہ جانے آئے گا وہ چاند بام پر کب تک

جان کاشمیری

یہ بھی ہے رنگِ کرم آج کے انسانوں میں،
دیں صدا ڈال کے سیسہ وہ مرے کانوں میں

بازگشت اپنی فقط تجھ کو سنائی دے گی
پاؤں رکھ سوچ کے تنہائی کے ویرانوں میں

کس طرح قلب کو اشعار حرارت بخشیں
منجمد خون ہے الفاظ کی شریانوں میں،

شہرِ دل ہے کہ کسی دشت کا سناٹا ہے
کوئی آہٹ بھی نہیں آتی مرے کانوں میں

جان سے مل کے تمہیں خاک مسرت ہوگی
منقسم وہ تو ہے اندر سے کئی خانوں میں

صابر وسیم

اِک شکل بے ارادہ سرِ بام آ گئی
پھر زندگی میں فیصلے کی شام آ گئی

دشت و نگر کے فاصلے بے رنگ و نور تھے
اِک رنگ لے کے گردشِ ایام آ گئی

وہ رہگذر جو آئی تو سر کو سجا لیا
دامن کی خاک آج مرے کام آ گئی

ہم بولتے رہے تو رہے لفظ سنگِ راہ
چُپ ہو گئے تو منزلِ الہام آ گئی

پھر اک حصار ٹوٹ گیا اختیار کا
پھر اک صدائے کوچۂ الزام آ گئی

صابر زمیں پہ رنج بھی اس نے اتارے ہیں
لیکن یہ فردِ جُرم مرے کام آ گئی

انصر علی انصر

راستے، سنگ، اژدہام، دھواں،
ڈھول، دلدار، درد، دام، دھواں

اُس کو آوارگی عزیز رہی
جانے کیا لذّتِ قیام، دھواں

شعلۂ تکمیلِ شوق کا حاصل
آگ کی سعیٔ ناتمام، دھواں

آج ذہنوں کا ایسا عالم ہے
جیسے باغوں میں وقتِ شام، دھواں

کب ملے گا وہ شعلہ خُو انصر
لکھ دیا جس نے میرے نام دھواں

اسلم کولسری

رات گئے جب اندھارا گی دُکھ دوہے سلگائے تھا
سارا گاؤں سُرساگر کی لہروں میں بہہ جائے تھا

وہ مکھڑا جب چاند میں آکر آنکھوں میں مسکائے تھا
کچا سونا، پاگل ہو کر، گلیوں میں بل کھائے تھا

میری سوچیں، گو اس وقت بھی گھائل تھیں پر اتنا تھا
مست ہوا کا مریم جھونکا زخموں کو سہلائے تھا

میری ہر آواز تو جلتی آنکھوں سے بہہ جائے تھی
اس کی خوشبو پا کر جگنو کتنا شور مچائے تھا

اس کی ہر خواہش میں اک معصوم نفاست شامل تھی
راہ میں بکھرے کانچ کے ریزے پلکوں سے چنوائے تھا

وہ بھی کیسی راتیں تھیں جب ایک غزل کی راہوں میں
اسلم کتنے رنگ برنگے زخم چراغ جلائے تھا

فرحت نواز

جوڑ رہی ہوں کرچی کرچی ٹوٹے خواب
پلکوں سے چُن چُن کر سارے بکھرے خواب

تیری سوچوں میں گر نیند بھی آ جائے
جاگتے رہتے ہیں آنکھوں میں تیرے خواب

جانتی ہوں پاگل پن ہے لیکن پھر بھی
میں جو خود اک خواب ہوں دیکھوں اس کے خواب

کون کرے گا خواہش اب تعبیروں کی
تعبیریں آندھی ہیں اور گھروندے خواب

کتنے جگنو چمک اٹھیں خوش فہمی کے
اس کی میٹھی چُپ دکھلائے کتنے خواب

آنکھوں میں جب خواب نہ کوئی بھی اترے
فرحتؔ بُن لیتی ہوں میں لفظوں کے خواب

ممتاز کنول

اِک مسلسل سوچنے کا سلسلہ رہ جائے گا
رونقیں لُٹ جائیں گی سیلِ بلا رہ جائے گا

دستکیں دے کر گذر جائے گی یہ پاگل ہوا
اور آنکھوں میں سدا کا رتجگا رہ جائے گا

پیڑ کے پتّے تو کر جائیں گے ہجرت ایک دن
شاخ پر بیٹھا پرندہ سوچتا رہ جائے گا

چھوڑ جائے گا وہ یہ دھرتی تلاشِ رزق میں
نام اس کا گھر کی تختی پر لکھا رہ جائے گا

لوٹ جائیں گے سبھی اپنے ٹھکانوں کی طرف
تُو مگر فٹ پاتھ پر تنہا کھڑا رہ جائے گا

اس نے جاتے وقت اتنا بھی نہیں سوچا کنولؔ
کون میرا شہر میں دردآشنا رہ جائے گا

نصرت صدیقی

یاد اس کی ضبط کی دیوار سے ٹکرا گئی
بحرِ دل سے موج اٹھی آنکھ کو چھلکا گئی

پیڑ بھی ننگے بدن ہیں میرے بچوں کی طرح
میرے گھر کی مفلسی صحنِ چمن تک آ گئی

ان مکانوں کی جگہ تھیں لہلہاتی کھیتیاں
شہر کی وسعت پسندی کتنے گاؤں کھا گئی

چارہ سازو! کچھ علاجِ دیدہ و دل چاہیے
دل تو پتھرائے ہوئے تھے آنکھ کیوں پتھرا گئی

میری آنکھوں کی بصیرت دل کی تابانی سے تھی
شمعِ دل بجھ کر جہاں میں تیرگی پھیلا گئی

دیکھنے سننے کی سب رعنائیاں جاتی رہیں
نت نئے سہہ سہہ کے صدمے زندگی اُکتا گئی

میرے پھولوں کی طلب میں ہاتھ زخمی ہو گئے
مجھ کو نصرتؔ خواہشِ دل خون میں نہلا گئی

ڈاکٹر انور سدید

اُردو سفرنامے کے نئے اور پُرانے نام

سفرنامے کا شمار ادب کی بیانیہ اصناف میں ہوتا ہے اور اس میں آپ بیتی کا وافر عنصر شامل ہے۔ سفرنامے میں چونکہ چشم دید واقعات اور دیکھے ہوئے مناظر پیش کئے جاتے ہیں اس لئے سفر اس کی ایک اساسی شرط ہے۔ سفر کے ساتھ انجانے دیسوں کی سیر، نئی فضاؤں سے واقفیت اور انوکھے مناظر کے مشاہدے کا تصور وابستہ ہے۔ اس لئے سفرنامے میں تحیر کا عنصر فطری طور پر شامل نظر آتا ہے۔ اُردو ادب کے ابتدائی سفرناموں کا جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت بالخصوص سامنے آتی ہے کہ جب قاری داستان کے مافوق الفطرت ماحول اور محیر العقول کرداروں میں دلچسپی لے رہا تھا تو یوسف خان کمبل پوش نے اپنا دلچسپ سفرنامہ "عجائباتِ فرنگ" لکھ کر اہلِ ادب کی توجہ فرضی داستان سے حقیقی مشاہدے کی طرف مبذول کرادی حالانکہ اس زمانے میں فورٹ ولیم کالج کے مصنفین حقیقی سفر کے بجائے تخیلی سفر کو قصہ کہانی کے روپ میں پیش کرنے کا کامیاب تجربہ کر چکے تھے۔ تاہم یوسف خان کمبل پوش کی اس عطا سے انکار ممکن نہیں کہ اس نے حقیقی سفر کو اس دلچسپ انداز میں پیش کیا کہ قاری کو اس کے سفرناموں میں داستانوں جیسی حیرت جاگتی ہوئی نظر آئی اور یہی وجہ ہے کہ اُردو کا یہ ابتدائی سفرنامہ آج بھی تاریخی اعتبار سے زندہ ہے۔

یوسف خان کمبل پوش کے سفرنامے کو اپنے زمانے میں بھی بے پناہ کامیابی حاصل ہوئی تھی لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ سفرنامے کو بطور ایک مخصوص صنفِ ادب کے عرصے تک نظر انداز کیا جاتا رہا۔ گذشتہ چند سالوں کے دوران جب اُردو کے چند زیرک ادیبوں نے اس صنف کو بطور خاص ذریعۂ اظہار بنایا تو یہ تاثر دینے کی سعی بھی کی گئی کہ انشائیہ کی طرح سفرنامہ کو بھی پہلی دفعہ اُردو میں متعارف کرایا جا رہا ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ جب غزل، نظم، افسانہ، انشائیہ غرضیکہ کچھ بھی نہیں تھا تو سفرنامہ ظہور میں آیا اور پہلا سیاح آدم تھا جس نے جنت سے جنتِ ارضی تک کا سفر کر کے اولادِ آدم کے سامنے سفر کا مثالی نمونہ پیش کیا اور پھر ابنِ آدم کے پاؤں میں چکر باندھ کر اسے مسلسل مائل بہ سفر رہنے کی تلقین کی۔ یوسف خان کمبل پوش نے اس روایت کی پیروی کی اور پھر سید احمد خان، شبلی نعمانی، محمد حسین آزاد، مولوی مسیح الدین علوی، میرزا نثار علی بیگ، مولانا جعفر تھانیسری، محمد حامد علی خان وغیرہ نے سفرنامے لکھ کر اس روایت کو اُردو ادب میں بھی ایک مضبوط بنیاد مہیا کر دی۔

بیسویں صدی کے ربعِ اوّل میں جب دنیا نے اپنے پر سمیٹنے شروع کئے اور سفر کی وافر سہولتیں میسر آنے لگیں تو نہ صرف سفر کرنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوا بلکہ سفر کے کوائف مہیا کرنے اور حالاتِ سفر بیان کرنے میں بھی نسبتاً زیادہ دلچسپی لی جانے لگی۔ چنانچہ منشی محبوب عالم کا "سفرنامہ یورپ"، شیخ عبدالقادر کا سفرنامہ "مقامِ خلافت"، خواجہ حسن نظامی کا "سفرنامۂ مصر و فلسطین و شام"، شاہ بانو کا "سیاحتِ سلطانی"، فتح علی قزلباش کا "سیاحتِ فتح خانی"، محمد علی قصوری کا "مشاہداتِ کابل و یاغستان"، قاضی عبدالغفار کا "نقشِ فرنگ"، قاضی ولی محمد کا "سفرنامۂ اندلس" اور ابوظفر ندوی

کا سفرنامہ "برما" وغیرہ شائع ہوئے، ان سفرناموں میں دنیا کی مختلف اکناف کا ہی احاطہ نہیں کیا گیا بلکہ شخصیات کے تنوع نے مشاہدے اور مطالعے کی نیرنگی اور اظہار کے بوقلموں زاویے بھی پیدا کیے، چنانچہ منشی محبوب عالم عجائبات یورپ کو ایک مہمان کی نظر سے دیکھتے ہیں اور قاری کو یورپ کی رعنائیوں کی سیر انگلی پکڑ کر کراتے ہیں، محمد علی قصوری نے افغانستان کا سفر ایک سیاسی ضرورت کے تحت اختیار کیا تھا چنانچہ ان کے سفرنامے پر نہ صرف تاریخ غالب ہے بلکہ وہ اپنے عہد کی سیاست پر بھی کھل کر روشنی ڈالتے ہیں، بیگم حسرت موہانی کا سفرنامہ عراق، ممالک اسلامیہ پر عقیدت و احترام کی نظر ڈالتا ہے، شاہ بانو کے سفرنامے "سیاحتِ سلطانی" میں ماحول پابند فضا میں اسیر نظر آتا ہے چنانچہ وہ منظر جو یوسف خان کمبل پوش پر بہجت اور مسرت کی کیفیت طاری کر دیتا ہے جب پردہ پوش شاہ بانو کی نگہہ کے سامنے آتا ہے تو گھٹن اور جبر کا احساس بیدار کر دیتا ہے۔ اس اجمال سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ بیسویں صدی میں سفرنامہ صرف مشاہدات اور واقعات کا بیانیہ نہیں رہا بلکہ یہ کسی حد تک سفرنامہ نگار کے ذاتی رجحانات کا آئینہ دار بھی بن گیا اور یوں سفرنامے نے ترقی کی طرف ایک ایسا قدم بڑھایا جس سے اس صنف میں تنوع، گوناگونی اور نیرنگی پیدا ہو گئی۔

قاضی ولی محمد کو بالعموم جدید اردو سفرنامے کے بانیوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کا مشاہدہ تیز اور مطالعے میں گہرائی ہے، نیز انہوں نے سفرنامے کو دلکش تخلیقی اسلوب میں پیش کرنے کی سعی بھی کی ہے تاہم ان پر تاریخ اور جغرافیہ اس درجہ غالب ہے کہ سفرنامہ اس بوجھ تلے کراہتا ہوا محسوس ہوتا ہے، شیخ عبدالقادر کا سفرنامہ "مقامِ خلافت" قاضی عبدالغفار کا "نقشِ فرنگ" اور خواجہ احمد عباس کا سفرنامہ "مسافر کی ڈائری" وغیرہ چند ایسے سفرنامے ہیں جن میں ماضی کو زندہ کرنے کے بجائے شگفتہ اسلوب میں زمانۂ حال کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے چنانچہ اگر یہ کہا جائے کہ سفرنامے کے روایتی انداز کو متذکرہ بالا مصنفین نے ہی جدیدیت آشنا کرنے کی کوشش کی تو یہ کچھ غلط نہیں ہوگا۔

جدید سفرنامے کے تاریخی تذکرے میں ایک اہم نام محمود نظامی کا ہے۔ محمود نظامی نے سفر کو وسیلۂ ظفر بنانے کے بجائے اپنے داخل سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی اور دیکھے ہوئے منظر کو دوبارہ اپنی روح کے مرغزاروں سے دریافت کیا۔ آغا محمد اشرف نے "لندن سے آداب عرض" میں جغرافیہ کی حد بندیوں کو عبور کر کے تہذیب کی وسعتوں میں سفر کیا اور ایک طالب علم جیسی معصومیت پیدا کی، اختر ریاض الدین نے "دھنک پر قدم" اور "سات سمندر پار" میں منظر پر جامد نظر ڈالنے کے بجائے اسے تخلیقی آنکھ سے دیکھا اور یوں فطرت کی سادگی سے تخلیق کی شعریت کی طرف مراجعت کی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ مرد سفرنامہ نگار بالعموم منظر کی قوس و قزح کو بکھیرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن اختر ریاض الدین چھوٹی چھوٹی جزئیات کو چنتی ہیں اور ان سے منظر کو یوں مرتب کرتی ہیں کہ اُلجھا ہوا اُون کا گولا ایک خوبصورت قوسِ قزح میں ڈھل جاتا ہے۔

اردو سفرنامے میں محمود نظامی اور اختر ریاض الدین احمد کی آمد دراصل اس روشن دور کی نوید تھی جب سفرنامے کے آسمان پر ایک دودھیا کہکشاں مرتب ہونا شروع ہوئی اور پھر اس صنف کے گرد خطوں اور قوسوں کی صورت متعدد ستارے جگمگانے لگے۔ اس دور میں ممتاز احمد خاں کا سفرنامہ "جہاں نما" سامنے آیا جس میں ممتاز احمد خان نے ان حقیقتوں کی بازآفرینی کی سعی کی جو کبھی آنکھوں کے راستے اس کے دل میں اُتر گئی تھیں، علمی نوعیت کے دو سفرنامے "ساحل اور سمندر" از سید احتشام حسین اور "ارضِ پاک سے دیارِ فرنگ تک" از ڈاکٹر عبادت بریلوی شائع ہوئے لیکن ان دونوں کی کیفیت اور تاثیر الگ الگ ہے۔ سید احتشام حسین جب تک امریکہ میں رہے ان پر احساسِ گناہ کا غلبہ طاری رہا، چنانچہ ان کے داخل کا فطری سیاح اُبھر کر سامنے نہیں آسکا اور سارے سفرنامے پر انقباض کی کیفیت نمایاں نظر آتی ہے۔ اس کے

برعکس ڈاکٹر عبادت بریلوی کے ہاتھ بلاشبہ مقدر کی ڈوری سے بندھے ہوئے ہیں اور وہ پاسبانِ عقل سے کسی مقام پر بھی علیحدگی اختیار نہیں کرتے تاہم انہوں نے لندن کی تہذیبی، سماجی اور مجلسی زندگی کا جو مرقع پیش کیا ہے وہ مناظر اور واقعات کا بیانیہ ہی نہیں بلکہ اس میں زندگی کا حسن بھی موجود ہے اور یہ قاری کے لئے جذباتی حرارت بھی پیدا کرتا ہے۔ خالصتاً ادبی سفرناموں میں وزیر آغا کا سفرنامہ اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس میں منظر کو پیش کرنے کے بجائے ادیب کو موضوع بنایا گیا ہے۔ وزیر آغا کا سفرنامہ درحقیقت ایک طویل ملاقات ہے اور یہ ادب کے فکری زاویے کو روشنی بخشتا ہے۔ اس سفرنامے میں پہلی مرتبہ دلّی اور بمبئی کے اہم ادیبوں کو کردار کے طور پر پیش کیا گیا ہے اور ان کی ادبی زندگی کو بطورِ خاص موضوع بنایا گیا ہے۔ یہ طویل ملاقات جب ختم ہوتی ہے تو ایک خواب اچانک ٹوٹ جاتا ہے اور قاری افکار کی کہکشاں سے ٹوٹے ہوئے تاروں کے دیے روشن کرنے لگتا ہے۔

نسبتاً نوجوان ادیبوں میں سے مستنصر حسین تارڑ کو یہ اہمیت حاصل ہے کہ اس نے اپنی بہترین صلاحیتیں سفرنامے کی صنف کو پروان چڑھانے میں زیادہ صرف کی ہیں، اس کے طویل سفرنامے "نکلے تیری تلاش میں" اور "اندلس میں اجنبی" اُردو ادب کے "بیسٹ سیلر" ہی نہیں بلکہ انہیں ادبا اور ناقدین نے بھی توجہ اور دلچسپی سے پڑھا ہے اور اس کی اختراعات کو اُردو سفرنامے میں وسعت اور اضافے کا وسیلہ قرار دیا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ کے سفرنامے کا واحد متکلم ماحول کو کٹھ پتلی کی طرح نچانے کا فریضہ سرانجام نہیں دیتا بلکہ وہ اس میں روح بھی پھونکتا ہے اور اس کے تاثر میں خود بھی شامل ہوتا ہے۔ اس زاویے سے دیکھئے تو مستنصر حسین اپنے سفرنامے کا خود بھی ایک اہم کردار ہے اور وہ ایک ایسے ہیرو کے روپ میں سامنے آتا ہے جس کے استقبال کے لئے بنات النعش گردوں اپنے سینے عریاں کئے بیتاب کھڑی ہیں۔ مستنصر حسین کی انفرادی عطا یہ ہے کہ اس نے اُردو افسانے کو کہانی کے قریب تر کر دیا چنانچہ اب سفرنامے کا جو دور شروع ہوا اس میں کردار نگاری کا زاویہ بھی شامل تھا۔ سید محمد کاظم اور عطاء الحق قاسمی کے ہاں یہ کاوش شعوری اور کسی حد تک اکتسابی انداز میں ظاہر ہوئی۔

اس دور میں سفرنامے میں مزاح کو شامل کرنے کا فریضہ بھی سرانجام دیا گیا۔ اس ضمن میں ابنِ انشا اور جمیل الدین عالی کا تذکرہ اس لئے ضروری ہے کہ انہوں نے اخباری ضرورت کو پورا کرنے کے لئے سفرنامے کا نیا استعمال دریافت کیا، ان دونوں کے ہاں سفرنامہ مقصود بالذات نہیں بلکہ ان کی ایک کاروباری ضرورت ہے تاہم ابنِ انشا کی اس عطا سے انکار ممکن نہیں کہ اس نے شگفتگی پیدا کی اور لطافتِ مزاح سے سفر کے بیانیہ میں بہجت کی کیفیت پیدا کی۔ کرنل محمد خان نے مزاح کا یہ زاویہ رعایتِ لفظی سے پیدا کیا اور سلامت روی میں شگفتہ بیانی کی چاندنی بکھیر دی۔ اس انداز کو ———— - ———— محمد خالد اختر نے سراتی اور کاغاتی جہتوں میں مزید وسعت دی اور وہ اس میں خاصے کامیاب نظر آتے ہیں۔ تاہم اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ سفرنامہ نسبتاً سنجیدہ صنفِ اظہار ہے۔ شگفتہ اسلوب اس کی ایک اساسی خوبی ہے لیکن یہ صنفِ مزاح کا مضحک زاویہ قبول کرنے سے قاصر ہے چنانچہ بیشتر مزاح نگار جب سفرنامہ لکھنے کی سعی کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ منظر کا مذاق اڑانے کی سعی کر رہے ہیں۔

متذکرہ بالا اجمال سے واضح ہو جاتا ہے کہ سفرنامے کی صنف کو زمانۂ حال میں جو فروغ حاصل ہوا ہے وہ اس سے قبل شاید کبھی حاصل نہیں ہوا، چنانچہ ہمارے بیشتر ثقہ ادبا اس صنف کی طرف متوجہ ہوئے اور ایسے یادگار سفرنامے لکھنے میں کامیاب ہو گئے جن کی یاد ابھی تک لوحِ دماغ پہ ثبت ہے۔ اس ضمن میں قدرت اللہ شہاب کا "اے بنی اسرائیل"، اشفاق احمد کا "سفر در سفر"، ڈاکٹر محمد اجمل کا "فرانس کا سفرنامہ"

سیّد ابوالحسن ندوی کا "دو ہفتے ترکی میں"، فضلِ حق شیدا کا "نیا چین"، جمیل صبا کا "سفر ہے شرط"، عزیز بیگ کا "یہ امریکہ ہے"، شریف فاروق کا "اتاترک کے وطن میں"، احسان بی اے کا "روس میں آٹھ دن" عبداللہ ملک کا "ارضِ جنت" (سوویٹ یونین کا سفر) وغیرہ مجھے بے اختیار یاد آرہے ہیں۔ نسبتاً نووارد سفر نامہ نگاروں میں سے حمزہ فاروقی، محمد اختر ممونکا، رضیہ فصیح احمد، محمود شام، منّو بھائی، مسعود اشعر وغیرہ کے ان منظر کو ادیب کی آنکھ سے دیکھنے کا رجحان غالب ہے اور وہ فن کی ناقابلِ تسخیر بلندیوں کو چھونے میں کامیاب ہو چکے ہیں۔

اُردو سفر نامے کے نئے اور پرانے ناموں کے اس اجمالی تذکرے کے بعد مجھے چار ایسے سفر نامہ نگاروں کا تعارف کرانا ہے جو ادب کے نووارد شمار نہیں ہوتے تاہم اُردو سفر نامے کی طرف شاید پہلی مرتبہ آئے ہیں۔ ان کی آمد سے اس صنف کو نہ صرف وسعت حاصل ہوئی ہے بلکہ اس کی گہرائی اور گیرائی میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ ان میں سے اوّلین اہم نام ذوالفقار احمد تابش کا ہے۔ ان کا سفر نامہ "جزیرہ" بالاقساط "اوراق" میں شائع ہوتا رہا ہے۔ تابش بنیادی طور پر ایک خواب نگار ہے، وہ کھوئی ہوئی عظمتوں کو روح کی گہرائیوں سے تلاش کرتا ہے اور پھر ان کا رشتہ زمانۂ حال کے ساتھ قائم کر کے بنی نوعِ آدم کو دوامی فلاح کا راستہ دکھانے کی سعی کرتا ہے۔ جزیرہ بظاہر سری لنکا کا سفر نامہ ہے لیکن درحقیقت یہ روح کے پاتال میں اُترنے اور پھر عظمتِ آدم کو دوبارہ پانے کی کاوش ہے، چنانچہ تابش نے سیر تو سری لنکا کی ہے لیکن درحقیقت وہ یاترا اپنے دل کی ہی کرتے رہے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس سفر نامے میں ہوٹلوں کا تذکرہ، دعوتوں کی تفصیل، شہروں کا حُسن اور مجالس کی زیبائی تو موجود ہے لیکن تابش ان مناظر سے مرعوب یا مسحور نہیں ہوتا بلکہ وہ اس سرزمین پر جنّت سے نکالے ہوئے آدم کی تلاش میں سرگرداں نظر آتا ہے اور ہر قدم پر مادے کے بوجھ سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ تابش کے سفر نامے میں روحانی زاویہ بطورِ خاص نمایاں ہے۔ اس نے سفر نامے کو ایک سنجیدہ ادبی کاوش بنایا ہے اور اس صنف کے لئے ایک نئی کھڑکی کھول دی ہے۔

حسین شاہد کو میں تحقیقِ احوال کا سفر نامہ نگار شمار کرتا ہوں۔ ان کے ہاں دریافت سے زیادہ حقیقت کو صداقت سے پیش کرنے کا رجحان نمایاں ہے۔ کچھ عرصہ قبل جب سفر نامے کو کہانی سے قریب تر کرنے کی کاوش شعوری انداز میں عمل میں آنے لگی تو سفر نامہ حقیقت سے تخیل کی طرف تیزی سے لپکنے لگا چنانچہ بہت سی ایسی جزئیات بھی سفر نامے میں در آئیں جن کا حقیقی وجود تلاش کرنا ممکن نہیں تھا۔ حسین شاہد نے اس رویّے کے خلاف ردِّ عمل کا اظہار یوں کیا کہ وہ خود آمادۂ سفر ہوا اور پھر اُس مقام پر پہنچا جسے بیشتر سفر نامہ نگاروں نے اپنے حُسنِ تخیل سے زیبائی عطا کر دی تھی۔ حسین شاہد کا ایقان ہے کہ بہت سے سفر نامے آرام کرسی پر بیٹھ کر لکھے گئے ہیں اور یہ فریضہ سرانجام دینے کے لئے سفر کی شرط پوری نہیں کی گئی، اس زاویے سے دیکھئے تو حسین شاہد نے متخیّلہ کو کام میں لانے کے بجائے حقیقت کو خرد افروزی سے پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ حسین شاہد نے حیرت کو جگانے کے بجائے حقائق سمیٹنے کی طرح ڈالی اور ماضی کو حال میں ملفوف کرنے کے بجائے اپنی نظر صرف حال کے نقطے پر مرکوز رکھی۔ حسین شاہد معنوی طور پر کہانی بیان کرنے کے بجائے اپنی واردات بیان کرتا ہے۔ اس کے تجربے میں محنت اور جاں کاوی کا عنصر غالب ہے اس لئے اس میں کہانی جیسی رعنائی بھی پیدا ہوئی۔ خوبی کی بات یہ ہے حسین شاہد نے اپنے وجود کو کسی مقام پر بھی نظر انداز نہیں کیا۔ اس لحاظ سے حسین شاہد کا سفر نامہ درحقیقت اس کے اپنے وجود کا اثبات ہے اور اس میں ایک تخلیقی کیفیت بھی موجود ہے جس کی تاثیر حقیقی اور جاودانی ہے۔

پرتو روہیلہ کا سفر نامہ لذّتِ جاودانہ کا مظہر ہے۔ پرتو ان کیفیتوں کو گرفت میں لیتا ہے جب جذبہ ہر بُنِ مُو سے پھوٹ نکلتا ہے اور منظر سرورِ جاوداں بکھیرنے لگتا ہے۔ اس کے ہاں سیّاح کا وہ فطری زاویہ نسبتاً زیادہ نمایاں ہے جو معاشرتی پابندیوں اور سماجی قیود کو خاطر میں نہیں لاتا اور ہر قدم پر

لذتِ بے کراں سمیٹنے کی کوشش کرتا ہے چنانچہ پرتو روہیلہ نے لندن پر صرف اچٹتی ہوئی نگاہ ہی نہیں ڈالی بلکہ زندگی کے ہزار دیے کو آزادروی سے سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ وہ قاری کی حیرت کو عجائبات عالم سے جگانے کی کوشش نہیں کرتا بلکہ وہ تو خود منظر میں شریک ہوتا ہے، اس سے لطف اٹھاتا ہے اور پھر ایک سنہری پھلجھڑی کی طرح اس منظر کو قاری کی طرف اچھال دیتا ہے۔ وہ خود منظر بھی ہے اور اس منظر کا کھیا بھی، چنانچہ اس نے لندن کو کسی ذہنی تحفظ کے بغیر دیکھا ہے۔ اس کا سفرنامہ شوخ رنگوں سے معمور ہے اور حقیقت اجمال کی تیز رفتاری میں گم ہو جانے کے بجائے قاری کو پوری شدت سے اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔

رام لعل کا سفر یورپ بظاہر وسیع اکناف پر پھیلا ہوا ہے تاہم اس کے پیش نظر اساسی مقصد ادب کے دائرے دریافت کرنا ہے۔ اس کا سفرنامہ کشادہ ماحول کے بے کراں فاصلوں پر محیط ہے اور رام لعل ان فاصلوں کو سمیٹنے اور ماحول کا رس کشید کرنے کے لئے شہد کی مکھی کا فریضہ سرانجام دے رہا ہے۔ اس سفرنامے کو حقیقت کا روپ ان کرداروں نے عطا کیا ہے جو مختلف مباحث سے ابھرتے ہیں اور پھر قاری پہ اپنے علم اور اپنی شخصیت کا ایک جاوداں نقش چھوڑ کر رخصت ہو جاتے ہیں۔ رام لعل کی خوبی یہ ہے کہ وہ جذباتی توجہ پیدا کئے بغیر ہر مقام سے گزرتے چلے جاتے ہیں۔ اس سفرنامے کو اس نے ڈائری کے اسلوب میں لکھا ہے تاہم اس کا غیر جذباتی زاویہ یہاں بھی نمایاں ہے اور کسی گھن گرج کے بغیر قاری کو اپنا ہمنوا بنانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ نیرنگِ نظر رام لعل کو اپنی طرف کھینچتا ہے لیکن وہ اس میں گم ہو جانے کے بجائے اس منظر کے علمی زاویے کو اہمیت دیتا ہے۔ وہ روشنی کی جس جوالا کو پیدا کرتا ہے اس کا اُجالا ہر طرف پھیلتا ہوا نظر آنے لگتا ہے۔ وزیر آغا کے ادبی سفرنامے کی طرح رام لعل کا سفرنامہ بھی درحقیقت ادب اور ادیب کا بیانیہ ہے اور یہ ایسی شخصیتوں سے متعارف کراتا ہے جن سے ذاتی ملاقات ہمارے لئے ممکن نہیں تھی۔ رام لعل نے اس ملاقات کو طویل اور لطیف بنا کر اس کی جاذبیت میں اضافہ کر دیا ہے۔ اُردو سفرنامے میں یہ ذائقہ طویل عرصے تک ہونٹوں کے ساتھ چپکا رہے گا۔

اُردو سفرنامے کا یہ اجمال اس حقیقت کو واضح کر دیتا ہے کہ ذوالفقار احمد تابش، حسین شاہد، رام لعل اور پرتو روہیلہ کی آمد سے اس صنف کو تازگی اور توانائی ہی نہیں ملی بلکہ مستقبل کی طرف قدم بڑھانے میں اعانت بھی حاصل ہوئی ہے اور وہ دودھیا کہکشاں جس کی ترتیب میں محمود نظامی، اختر ریاض الدین، مستنصر حسین تارڑ، محمد کاظم، مسعود اشعر اور محمد خالد اختر وغیرہ نے نمایاں اور اہم کردار ادا کیا تھا، اب مزید روشن ہو گئی ہے۔ نتیجے کے طور پر اب اس صنفِ ادب کا مستقبل کچھ اور تابناک نظر آنے لگا ہے۔

رام لعل | لندن اے لندن

۱۰ر ستمبر ۱۹۷۸ء

رات بارہ بجے کے بعد قیام گاہ پر پہنچا تھا۔ سب لوگ بے خبر سو رہے تھے۔ ہر چرن چاولہ نے یہ بہت اچھا کیا تھا کہ جب انگرِڈ اور میں کرنگشا کے سنسان اسٹیشن پر ایک کھمبے کے نیچے تنہا کھڑے تھے تو مجھے چابی دے کر خاموشی سے لوٹ گیا تھا۔ اگرچہ وہ بہت دیر سے (بقول اُس کے) فکر مند سا ہو کر کئی لوکل گاڑیاں دیکھ چکا تھا لیکن مجھے انگرِڈ کے ساتھ دیکھ کر بظاہر مطمئن سا لوٹ گیا تھا۔ میں نے چابی لگا کر دروازہ کھولا سب اور اپنا بریف کیس اٹھا کر کامن کچن میں جا بیٹھا۔ گھنٹہ بھر تنہا بیٹھا اپنے مسودے کا آخری باب مکمل کرتا رہا۔ پھر اچانک وہاں دو ناروِیجین پڑوسی آ گئے۔ وہ کافی دیر سے کسی کلب سے یا اپنی اپنی جاب سے لوٹے تھے۔ انہوں نے پہلے تو میرے ساتھ ذہنی، کا پُر خلوص تبادلہ کیا پھر الیکٹرک چولہے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنا مڈ نائٹ بریک فاسٹ تیار کرنے لگے۔ مجھے لکھنے میں مصروف دیکھ کر انہوں نے آپس میں بھی سرگوشیوں میں ہی بات کی۔ اُرنے برن وول کو شاید اتنی بھوک نہیں لگی تھی۔ وہ میرے لئے بھی کافی کا ایک پیالہ رکھ کر جلدی سے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ سویرتے ڈالن کافی اور ناشتہ لے کر ایک الگ میز پر بیٹھ گیا۔ کئی منٹوں تک یا تو میرے کاغذات کے پھڑ پھڑانے کی آواز آتی رہی یا پھر ڈالن کے ناشتہ چبانے کی۔ جب میں نے اپنا کام ختم کر لیا اور صفحات کی ترتیب دینے لگا تو ڈالن کے ساتھ گفتگو بھی شروع کر دی۔ اُسے جب میرے کام کی نوعیت معلوم ہوئی تو اس نے مجھ سے ان ناروِیجین رائیٹرس کے نام پوچھے جن کے بارے میں میں نے اظہارِ رائے کیا تھا۔ اس نے بعض رائیٹرس کے ساتھ تو پورا اتفاق کیا جو واقعی اپنا نام پیدا کر چکے تھے لیکن بعض کو اس نے معمولی درجے کا قرار دیا اور چند ناموں کے بارے میں تو اس نے بالکل لاعلمی کا اظہار کیا۔

ہم لوگ ناموں کے صحیح تلفظ کے بارے میں بھی گفتگو کرتے رہے جو اُردو میں صحیح نہیں لکھے جا سکتے تھے۔ پھر بھی اس نے بڑی خوشی اور حیرت کا اظہار کیا کہ میں نے کتنے کم وقت میں یہاں رہ کر ناروِیجین لٹریچر میں بہت زیادہ دلچسپی لے لی تھی۔ کئی روز پہلے بھی وہ میرے ساتھ میرے ایک انٹرویو کے بارے میں گفتگو کر چکا تھا جو آربائیدر بلادے میں شائع ہوا تھا۔

صبح چار بجے سب کاموں سے نپٹ کر میں نے اپنے بیگ میں پاسپورٹ، ویزا، دو قمیضیں اور انڈر ویئر وغیرہ کا سامان رکھا اور چاولہ کو جگا کر باتھ روم میں چلا گیا۔ چاولہ نے میرے اور اپنے لئے بہت عمدہ چائے بنا رکھی تھی۔ جسے ہم دونوں بڑی خاموشی سے پیتے رہے۔ ساڑھے پانچ بجے ہم لوگ باہر آئے تو پورنیا بھابی جاگ گئی تھی۔ اس سے رخصت لے کر گاڑی میں جا بیٹھے۔ روشنی ہونے میں ابھی کچھ دیر تھی۔ ساس ہوٹل تک پہنچنے میں راستے میں خاصی دُھند ملی۔ ونڈ اسکرین کو بار بار کاغذ کے رومال سے صاف کرنا پڑا۔ ہوٹل کے سامنے بس تیار کھڑی تھی کئی مسافر

آچکے تھے اور کئی اُسی وقت ٹیکسیوں سے اُتر رہے تھے جہلم (پاکستان) کے ایک نوجوان عبدالرزاق سے فوراً ہی دوستی ہوگئی۔ ہم سب ایک ہفتے کی چارٹرڈ فلائیٹ سے لندن جا رہے تھے۔ ہم سب کو ایک ہی پلین سے جانا ہوگا اور ایک ہی پلین سے لوٹنا ہوگا۔ بس چھ بجے چل دی۔ ایروڈروم تک چالیس میل کا فاصلہ تھا۔ وہاں تک پہنچنے میں ہمیں ایک گھنٹہ لگ گیا۔ عبدالرزاق میرے ساتھ ہی بیٹھا تھا اور میری طرح پہلی بار لندن جا رہا تھا۔ اوسلو میں وہ ایک ہوٹل میں ملازم تھا۔ بس کے ایک گھنٹے کے سفر میں وہ میرے ساتھ ہندوستان و پاکستان کی سیاسی قیادت، آپسی جنگوں، مہنگائی، ہندوستان کی صنعتی ترقی ———— ایسے موضوعات پر کھل کر گفتگو کرتا گیا۔ مجھے یہ معلوم کرکے خوشی ہوئی کہ وہ بھی سیبیا بیسٹ۔ کہ ہی باہمی جنگوں کے لئے ذمہ دار سمجھتا تھا اور امن کا خواہشمند تھا۔ اس نے میرے سامنے ناروے میں مقیم غیر ملکیوں کے خیالات و نظریات کو بھی نہ چھپایا اور ——— لڑکوں کی شرارتوں اور اُن کی بدنامی پر پوری ایمانداری سے اظہارِ خیال کیا لیکن مجھے بار بار منٹو کے الفاظ یاد آتے رہے۔ لڑکے لڑکیوں کو نہیں چھیڑیں گے تو پھر کیا گھوڑیوں کو چھیڑیں گے!

ہم ایئرپورٹ پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ ہمارا جہاز ڈیڑھ گھنٹہ لیٹ ہے جو ڈنمارک سے آکر لندن جانے والا تھا۔ ہم لوگ اپنے اپنے سامان اور پاسپورٹ کی چیکنگ کرا کے لونج میں جا بیٹھے۔ عبدالرزاق میرے لئے سیون اپ لے آیا۔ وہیں مجھے ایک خاتون شیشنی بھی مل گئی جو اوسلو کے کسی اسپتال میں لیڈی ڈاکٹر تھی۔ وہ لندن میں ایک سیمینار میں شریک ہونے کے لئے جا رہی تھی۔

ہوائی جہاز میں میری سیٹ کے ساتھ ساتھ ایک ڈنمارک کی خاتون ایلس کی سیٹ ریزرو تھی جو اوسلو کے ایک بڑے پبلشنگ ہاؤس میں کام کرتی ہے۔ وہاں وہ کمپیوٹر ٹائپسٹ ہے۔ اس نے مجھے بتایا وہ اب خود کتابیں چھاپنے کا کاروبار کرنا چاہتی ہے اور جب اس نے کہا کہ وہ پہلی کتاب میری بھی چھاپ سکتی ہے تو مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ کیونکہ عام طور پر اس قسم کے پبلشروں کو میں ادبی عیاش کہہ کر پکارتا ہوں۔ وہ چالیس سال کی لمبی، پتلی، دلچسپ اور خاصی باتونی عورت تھی جو بات بات پر مصنوعی حیرت و خوشی دکھلانے کے لئے اوہ! اوہ کہہ اٹھتی تھی۔ اس کے بالوں میں ذرا ذرا سی سپیدی جھلک رہی تھی اور وہ ابھی تک غیر شادی شدہ تھی۔ ایسا لگتا تھا ہم ذرا ہی ایک دوسرے سے بے تکلف ہوگئے ہیں پلین اپنی رفتار سے اُڑا جا رہا تھا لیکن تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد اوپر یا نیچے ہونے لگتا تو ہوا کا دباؤ بڑھ جاتا جس سے گھبرا کر ایلس میرا ہاتھ پکڑ لیتی اور کہتی ــ "اوہ یہ پلین بہت خراب ہے۔ پتہ نہیں ہم لندن پہنچ پاتے ہیں کہ نہیں!"

وہ امریکہ، اٹلی، انگلینڈ اور سوئٹزرلینڈ کے سارے اسکنڈے نیوین ممالک کی سیاحت کر چکی تھی۔ وہ ہندوستان کو بھی دیکھنے کی خواہشمند تھی لیکن اب روپیہ جمع کرکے بزنس کرنا چاہتی تھی۔ وہی کتابیں چھاپنے کا۔ اُس کی اس خواہش کے دوبارہ اظہار پر میں ہنس پڑا تو وہ بولی ــ "تمہیں یقین کیوں نہیں آتا؟"

"تم روپیہ جمع کرکے ایک خوبصورت سی کار خرید لو"

"نہیں میں کار چلانے کی ہرگز شوقین نہیں ہوں۔ اپنے گھر کو طرح طرح کے پھولوں سے سجانا میری خاص ہابی ہے۔ کیا تم بھی پھولوں سے محبت کرتے ہو؟"

اُن لمحوں میں مجھے اچانک اس کی بڑی بڑی سبز آنکھوں میں پھولوں کی خوشنما رنگت دکھائی دے گئی اور جیسے ان کی خوشبو بھی مجھ تک آ پہنچی ہو۔ میں نے ایئر ہوسٹس کو پاس سے گذرتا دیکھ کر اُسے دو گلاس وائن لے آنے کے لئے کہہ دیا۔ ایئر ہوسٹس کی زبان سے کوئی لفظ سن کر ایلس نے مجھ سے کہا ـ "نارویجین تلفظ بہت ہی ناقص ہے۔ ہم ڈین ایسی غلطی کبھی نہیں کرتے۔" وہ

پہلے بھی کئی بار ڈنمارک کی برتری جتا چکی تھی۔

میں نے جواب دیا، "شاید دنیا میں ڈنمارک ہی سب سے مہذب ملک ہے!"

یہ سُن کر اُس کے چہرے پر پہلے تو وہی مصنوعی حیرت اور پھر شکایت بھی اُبھر آئی۔

"پلیز، مجھے تنگ مت کرو!" اور پھر میرے ہاتھ میں ہاتھ دے کر ہنس پڑی جیسے یہ سب اس نے مذاق میں کہا ہو!

ہمارے ساتھ تیسری سیٹ پر بیٹھی ہوئی بوڑھی عورت نے ہماری طرف — بڑی اداس نظروں سے دیکھا۔ اُس کے ساتھ ہم دونوں نے ابھی تک زیادہ گفتگو نہیں کی تھی۔ بس رسمی طور پر چند کلمات کہے تھے۔ اُس وقت بھی ہمارا ارادہ اُس سے مخاطب ہونے کا نہیں تھا۔ اس لئے میں نے الیس کے چہرے کو بڑے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "تمہاری شکل گرٹیا گاربو سے بہت ملتی ہے۔ ہالی وڈ کی بہت ہی مشہور اور خوبصورت ایکٹریس ہے!"

اُس نے کئی لمحوں تک میری طرف بڑی حیرت سے تاکا اور پھر کہا۔ "تم جانتے ہو وہ بھی ڈین تھی؟

"کیا واقعی؟"

"ہاں واقعی!" اور پھر پرس میں سے آئینہ نکال کر اپنا چہرہ دیکھنے لگی۔ شاید یہی یقین کرنے کے لئے کہ وہ گرٹیا گاربو جیسی مشابہت رکھتی ہے یا نہیں — ! اور شاید یقین آ جانے پر ہی اس نے کالا چشمہ نکال کر چڑھایا تھا اور کئی لمحوں تک بالکل خاموش سی بیٹھی رہ گئی تھی۔ ہم دونوں دھیرے دھیرے وائن پیتے رہے تھے۔ میں نے ایک دو بار سر گھما کر دیکھا تو عبدالرزاق کو اپنی طرف متوجہ پایا اور ہم دونوں بے اختیار مسکرا دیئے۔

جب وہ پھر باتیں کرنے کے لئے تیار ہو گئی تو اس نے کئی نارویجین رائٹرس کے نام لئے جو دراصل ڈنمارک کے تھے لیکن انہیں شہرت نارویجین زبان و ادب سے ملی تھی۔ میں نے اُسے ناروے کے بارے میں چھپے ہوئے اپنے تاثرات دکھائے اور گزشتہ رات کو انگرڈ تی مون کے ساتھ دیکھے ہوئے ڈینش بیلے سوینگے سکوتا کن گر کا ذکر کیا تو اس کی وہی حیرت اور خوشی لوٹ آئی۔ بولی۔

"لندن میں تمہیں کون سے ہوٹل میں ٹھہرایا جا رہا ہے؟"

"کینگسٹن کلوز میں — اور تمہیں؟"

"اپالو میں۔ لیکن ہم ملتے رہیں گے۔ کیوں؟"

"ضرور،" میں نے کھڑکی کے باہر بے اندازہ دُھند کو دیکھتے ہوئے کہا۔

ہم لندن ساڑھے دس بجے پہنچ گئے۔ تقریباً ایک گھنٹے میں۔ ایئرپورٹ سے شہر ساٹھ میل دُور تھا۔ پاسپورٹ اور سامان کی چیکنگ میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ جب میں کیو میں کھڑا تھا تو اُسے ایک اور کیو میں لگیج بیلٹ کے پاس سامان کا انتظار کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس وقت اس کی اونچائی دیکھ کر مجھے بڑی حیرت ہوئی تھی۔ وہ چھ فٹ سے کچھ زیادہ ہی ہوگی۔ اس کی لمبی پتلی کمر ایک چیتے کی پیٹھ کی طرح ہموار اور مضبوط لگ رہی تھی۔ وہ بھی میری طرف دیکھ کر مسکرا دی تھی۔ اُس وقت میں ایک پولیس آفیسر کے سامنے پہنچ چکا تھا جس نے میرا پاسپورٹ اور ویزا دیکھتے ہوئے سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔

لندن میں کہاں ٹھہرو گے؟ کب تک ٹھہرو گے؟ ناروے کے راستے سے کیوں آئے ہو؟ ویزا دہلی سے کیوں نہیں لیا؟ ناروے میں جا کر کیوں لیا؟ واپس کہاں جاؤ گے؟ واپسی کا ٹکٹ کہاں ہے؟ اوسلو سے ہندوستان جانے کا ٹکٹ کہاں ہے؟ لندن میں کیا میرے

رشتے دار اور دوست ہیں؟ اُن سے ملوں گا؟ وغیرہ۔

میرے پاس اُس کے ہر سوال کا ایک تسلی بخش جواب تھا اس لئے اُس نے مجھے دو مہینے ٹھہرنے کی اجازت دے دی۔ اگرچہ میں صرف ایک مہینے کے لئے وہاں گیا تھا۔

شہر جانے والی بسوں کا انتظام بھی اوسلو کی ٹریول ایجنسی شارے برگ نے کر رکھا تھا۔ بس ڈرائیور نے کچھ حجت کی کہ میں دوسری بس میں جاؤں لیکن میں نے اس سے کہہ دیا میرے پاس اسی بس کا نمبر ہے تو وہ ناگواری کے ساتھ خاموش ہوگیا۔ میں جیسے اس انگریز کو پہلے سے جانتا تھا۔ اُس کے رویّے سے پہچان گیا جو عرصہ دراز تک ہندوستان پر حکومت کر چکا تھا۔ اس سے میں ریلوے ورکشاپ میں اور لاہور میں کئی موقعوں پر مل چکا تھا۔ تیس سال پہلے اور اس سے میں خاصا چڑا ہوا تھا۔ لندن میں پہنچتے ہی وہی چڑ پھر پیدا ہوگئی۔ اسی بس میں ایلس بھی میرے ساتھ آکر بیٹھی تو وہ بھی اسی انگریز سے چڑی ہوئی نظر آئی۔ میں نے انگریز ڈرائیور کے ایٹی چیوڈ کے بارے میں اُسے بتایا تو اس نے کہا۔

" یہ لوگ بولتے ہی کچھ اس انداز سے ہیں کہ خواہ مخواہ ہنسی آجاتی ہے " اور پھر وہ ہمارے قریب بیٹھے ہوئے بس ڈرائیور پر ہنسنے لگی، جو ہمیں لندن کے مضافات میں سے نکال کر شہر کی طرف لئے جا رہا تھا۔ پرانی طرز کے وکٹورین مکانات اجڑی فراخ سڑکیں، جا بجا چھوٹے بڑے کارخانوں کی چمنیاں! ہمارا نارویجین گائیڈ اپنی نارویجین زبان میں ہی شہر کی مشہور و معروف عمارتوں، چوراہوں اور سڑکوں کے نام بتاتا جا رہا تھا، جہاں جہاں سے ہوکر بس جا رہی تھی۔ آکسفورڈ اسٹریٹ، البرٹ پیلس، ہائیڈ پارک وغیرہ۔ ہر طرف عمارتوں کا ایک جنگل تھا۔ لوگوں اور کاروں اور بسوں کی چہل پہل تھی۔ کچھ ایشیائی چہرے بھی دکھائی دیئے۔ ہندوستانی یا پاکستانی۔ دو بسیں ہماری بس کو پیچھے چھوڑتی ہوئی آگے نکل گئیں۔ اُن میں ہندوستانی عورتیں، مرد اور بچے بھرے ہوئے تھے۔ عورتوں کو ساڑیوں میں دیکھ کر اندازہ ہوا کہ کوئی فلائیٹ سیدھی انڈیا سے آئی ہوگی۔

ہم لوگوں کو پہلے سے طے شدہ ہوٹلوں کے سامنے اتار دیا گیا۔ گائیڈ نے ہمیں کنگسٹن کلوز ہوٹل میں کمرے الاٹ کرانے میں مدد کی۔ ایلس نے اپالو ہوٹل کی طرف جاتے ہوئے مجھے کہا تھا۔ " مجھے فون کرنا۔ کسی شام کو ساتھ رہنے کا پروگرام بنالیں گے "

میں کاؤنٹر کے پیچھے کام کرتی ہوئی انگریز لڑکیوں اور انتظام سے متعلق دوسرے مردوں کی طرف دیکھنے لگا جو ہماری مدد کر رہے تھے۔ اوسلو کے برٹش کونسلر نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ " انگلینڈ میں تم زیادہ ایٹ ہوم محسوس کروگے۔ کیوں کہ وہاں سب ہی انگریزی بولنے والے لوگ ملیں گے " اب مجھے کسی سے پہلے یہ نہیں پوچھنا پڑتا تھا۔ " کیا تم انگریزی جانتے ہو؟ " یہاں میں ہر ایک کے ساتھ بلا تکلف انگریزی میں بات کر سکتا ہوں لڑکیوں کی مسکراہٹ یہاں بھی دلنشیں تھی اور میں خوش ہو اٹھا۔

مجھے خوش قسمتی سے الگ کمرہ مل گیا۔ اس لئے کہ میں تنہا ہندوستانی تھا۔ نارویجین لوگوں نے اپنے اپنے ساتھی پہلے ہی چن رکھے تھے۔ تیسرے فلور کے ۳۴۳ نمبر کے کمرے میں ایک بیڈ، وارڈ روب، ڈریسنگ ٹیبل، ٹیلی ویژن، ریڈیو، ٹیلی فون اور ملا ہوا باتھ روم تھا وہاں پہنچتے ہی میں نے شاہد علی سید کو فون کیا جو مجاہد علی کا چھوٹا بھائی تھا اور لندن میں بزنس مینجمنٹ کا کورس کر رہا تھا۔ مجاہد نے اُسے اوسلو سے ہی فون کرکے میرے پروگرام سے مطلع کر دیا تھا اور وہ میرے ہوٹل میں پہنچنے سے پہلے دو بار فون کر چکا تھا۔ میرا فون ملتے ہی وہ آدھ گھنٹے کے اندر میرے پاس پہنچ گیا۔ مجاہد کی طرح وہ بھی لمبا اور خوبصورت تھا۔ دلکش اور پیارا۔ اُس نے کہا۔ " آپ سے ملنے کی آرزو مدت سے تھی۔ لیکن یہ کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ آپ لندن آئیں گے۔ اب میں آپ کے ساتھ ساتھ رہوں گا۔ پورا ہفتہ "

میں نے اپنے آپ کو خوش قسمت تصور کیا۔ یہاں بھی میں تنہائی اور اجنبیت محسوس نہیں کروں گا۔ اس کی اس تجویز سے آج اتوار ہے، ہائیڈ پارک میں مقررین اور سامعین کی خاصی بھیڑ ہوگی لہٰذا آج کی دوپہر اور سہ پہر وہاں تماشہ دیکھنے میں صرف کر دی جائے میں نے فوراً اتفاق کر لیا اور ہم انڈر گراؤنڈ ریلوے سسٹم کے ذریعے جسے ٹیوب کہتے ہیں چند منٹ میں ہائیڈ پارک پہنچ گئے۔ ہائیڈ پارک کے بارے میں پہلے سے بہت کچھ پڑھ اور سُن رکھا تھا۔ اُس کا نقشہ ویسا ہی پایا۔ وہاں ایرانی، ترکی، فلسطینی، افریقی، اسرائیلی، کمیونسٹ، انٹی کمیونسٹ، عیسائی دہریئے، سیکس کے فلاسفر سبھی قسم کے لیکچرار اور اُن کے سامعین بھی ہزاروں کی تعداد میں موجود تھے۔ مقررین اس بات کی پروا کئے بغیر کہ ان کے اردگرد سامعین کی تعداد کتنی ہے، اپنے اپنے سوپ باکس پر چڑھے تقریر کرنے میں مصروف تھے۔ ان میں زیادہ تعداد نوجوان طالب علموں، صحافیوں اور اپرنٹس سیاست دانوں کی تھی۔ یہ جگہ لیڈر بننے کے لئے ایک بہت اچھی تربیت گاہ ہے جس کے لئے زیادہ خرچ نہیں کرنا پڑتا۔ ایرانی مقرر کے گرد سب سے زیادہ بھیڑ تھی۔ خوبصورت آریائی رنگ و نسل کے لڑکے اور لڑکیاں مرگ بر شاہ کے نعرے لگا رہے تھے اور اشتہار و کتابچے تقسیم کرتے پھرتے تھے۔ ایک کمیونسٹ خدا اور عیسیٰ مسیح کے خلاف بول رہا تھا اور لوگ جب سوالات کرتے تھے تو وہ اُن کو بڑے تحمل سے عارفانہ سے جواب دے دیتا تھا۔ اسی مجمعے میں سے میں نے ایک لڑکی کو اچانک خدا ہے، خدا ہے! چیخ چیخ کر نکل بھاگتے ہوئے دیکھا۔ ایک بوڑھا مقرر سیکس کی فلاسفی پر لیکچر دے رہا تھا اور اس کے سامنے کتنے نوجوان جوڑے بڑی بے نیازی سے ہری ہری گھاس پر لیٹے ہوئے اُسے سُن رہے تھے۔ اُن کے آس پاس بیئر کے لاتعداد خالی ٹن بکھرے پڑے تھے۔ ایک جوان لڑکی دھوپ کی تمازت سے بچنے کے لئے منہ پر اخبار ڈالے بے خبر سو رہی تھی۔ اُس کی اسکرٹ رانوں تک اوپر کو سرک گئی تھی۔ اس مقرر کی لمبی داڑھی دیکھ کر مجھے اچانک دیوندر ستیارتھی کی یاد آگئی اور میں نے سوچا اگر وہ یہاں کھڑے ہو کر اپنی کوئی طویل ترین کہانی سنا رہا ہوتا تو اس کی زبان سے ناآشنا ہوتے ہوئے بھی اُسے چند سامعین تو مل جاتے جو اُس کی طرف بڑی حیرت سے تک رہے ہوتے۔ ایک افریقی سفید دنیا کے غلبے کے خلاف اپنی نظمیں پڑھ رہا تھا۔ اُس کے سامنے صرف ایک بوڑھا انگریز سر جھکائے بیٹھا اپنی ناک میں سے ہاتھ نہ لگنے والا کوئی خاص بال نوچ رہا تھا۔ وہ بار بار اپنی چٹکی کو جھٹکا دیتا اور پھر اپنے ناخنوں کی گرفت کا جائزہ لینے لگتا تھا اور مایوس ہو کر وہ پھر اُسی کوشش میں لگ جاتا تھا۔ نظم گو افریقی نے مجھے باقر مہدی کی یاد دلا دی اور میں بے خیالی میں مسکرا دیا۔

لوگوں کے لباسوں نے بھی مجھے متوجہ کیا۔ جو نئی نسل کے خیالات کی طرح آزاد اور دلکش تھے۔ شاہد اور میں خالی ڈبوں اور خالی بوتلوں کو اپنے بوٹوں کی ٹھوکروں سے لڑھکاتے اور نم آلودہ گھاس پر بھیگے ہوئے پوسٹروں پر چلتے ہوئے ہوٹل میں واپس آگئے۔ راستے میں چھوٹے بک اسٹینڈز پر انگریزی کے ادبی رسالے بے سود تلاش کئے۔ وہاں البتہ پورنوگرافی کے بیشمار رسالے۔ شی، اہی، اکوبرا، شے۔ ڈیم گرل وغیرہ ہر جگہ بہت ہی نمایاں طور پر رکھے ہوئے نظر آئے۔ کسی کسی بک اسٹینڈ پر لڑکیاں ہی رسالے اور اخبار بیچ رہی تھیں۔ انگریز لڑکے اور لڑکیاں زیادہ تر درمیانے قد کے تھے۔ اونچے قد کے لوگ خال خال ہی دکھائی دیئے تھے۔

شاہد نے میرے دوستوں اور جاننے والوں کو ٹیلی فون پر ملانے کے لئے میری مدد کی۔ لندن کی ٹیلی فون ڈائریکٹری تین ضخیم جلدوں کی تھی وہ رات کو گیارہ بجے چلا گیا۔ میں نے سونے سے پہلے ٹی وی پر ہندوستان میں تازہ سیلاب کی ایک فلم دیکھی۔ بنارس، متھرا اور دہلی کے بیشتر علاقے زیرِ آب آچکے تھے۔ دوسرے چینل پر ہنری ہشتم کی ایک فلم دیکھی جس میں اس کی خوبصورت و نوجوان بے وفا ملکہ کا سر قلم کر دیا جاتا ہے اور تیسرے چینل پر ٹالسٹائی کے ناول اینا کرینینا پر مبنی ایک فلم دیکھنے کا موقعہ مل گیا۔

رات میں خوب گہری نیند سویا۔

۱۱ ستمبر

صبح ناشتے کے بعد میں اپنے ایک مسودے پر نظرِ ثانی کر رہا تھا کہ میرے کمرے کا بلیک اینڈ وائٹ ٹی وی سیٹ ہٹا کر اس کی جگہ کلر ٹی وی لگا دینے کے لئے ایک ویسٹ انڈین انجینئر اندر آگیا۔ وہ باربیڈوز کا رہنے والا تھا جس جزیرے نے کئی بین الاقوامی شہرت کے کرکٹ کھلاڑی پیدا کئے ہیں۔ ہم گیری سوبرس، واریل، ویکس اور کلائیو لائڈس کے موضوع سے ہٹ کر اس کی نجی زندگی کے مسائل تک پہنچ گئے۔ اس کا نام بشپ تھا۔ گیہواں رنگ، ناک چپٹی اور بال بے حد گھنگھریالے۔ وہ تیرہ سال سے لندن میں مقیم تھا۔ اس کا باپ انگریز اور ماں ویسٹ انڈیز کی تھی۔ لیکن اس کی بیوی دنیتا سوشیلا اورجنل ویسٹ انڈیز کی تھی۔ "اورجنل کیسے ہو سکتی ہے مسٹر بشپ! وہ صدیوں پہلے کے ہندوستانی بزرگوں کی اولاد ہوگی کیوں کہ اس کا نام بھی ہندوستانی ہے۔" اس نے کندھے جھٹک کر ٹی وی سیٹ کا معائنہ کرتے ہوئے جواب دیا: "آئی ڈونٹ نو!" اس کے ساتھ ایک انگریز مکینک پیٹر دیوار میں ایک نیا بریکٹ فٹ کرتا رہا۔

گیلری میں ہر ایک کمرے کے سامنے کلر ٹی وی کے بڑے بڑے بکس رکھے ہوئے تھے اور کمروں کی صفائی کرنے والی لڑکیاں بھی انہی کے درمیان میلی چادروں، غلافوں اور تولیوں کے ڈھیر لگاتی پھر رہی تھیں۔ ہیڈ چیمبر میڈ اُن کے آگے پیچھے گھومتی پھرتی ہوئی انہیں قدم قدم پر ہدایات دے رہی تھی۔ بیشتر لڑکیاں فلپائن کی تھیں۔ دبلی پتلی، پیلی اور چپٹی ناکوں اور خوابناک آنکھوں والی۔

ڈیڑھ بجے اپنی کلاس سے فارغ ہو کر شاہد علی آگیا۔ ہم دونوں نے کینسنگٹن ہائی روڈ ٹیوب اسٹیشن کے ایک ریسٹوران ڈیمی ٹاس میں کچھ سنیکس لئے چائے بھی پی اور پھر ٹیوب کے ذریعے آکسفورڈ اسٹریٹ چلے گئے۔ ٹیوب بہت تیز رفتار گاڑی اور زمین کے چھ سو سے آٹھ سو فٹ تک نیچے نیچے چلتی ہے۔ کئی جگہ ٹیمز دریا کے بیڈ کے بھی نیچے۔ نیچے جانے کے لئے ہم نے بجلی کی خودکار سیڑھیاں استعمال کی تھیں۔ بعض زیرِ زمین اسٹیشنوں کے اتنے برآمدے تھے کہ لکھنؤ کے امام باڑہ آصف الدولہ کی بھول بھلیاں یاد آگئیں۔ گاڑی میں اُترنے چڑھنے والے بڑی پھرتی سے کام لیتے تھے۔ آکسفورڈ اسٹریٹ بہت بڑا بزنس سنٹر ہے۔ وہاں بیشمار کئی کئی منزلہ اونچی عمارتیں ہیں۔ بڑے بڑے اسٹور ہیں، سیلفرجز، جان لیویز، ڈیبن ہام، ہیرولڈس وغیرہ۔ یہیں کے ایک اسٹور سے انڈر ویئر چرانے کے الزام میں ایک پاکستانی خاتون پر مقدمہ چلایا گیا جس کے لئے اُسے اڑتالیس پونڈ جرمانہ دینا پڑا تھا اگرچہ اس کے بیان کے مطابق اُسے خریدے ہوئے سامان کے لئے کیش میمو نہیں دیا گیا تھا اور اسی جگہ بھارت کے ٹسٹ کرکٹ کھلاڑی سدھیر نائک کو بھی جرابیں چرانے کے جرم میں جرمانہ دینا پڑا تھا اور اس کے بعد سے اس کا ٹسٹ جیون ہی ختم ہو گیا۔ شاہد نے مجھے کئی اسٹوروں کے اندر لے جا کر دکھایا کہ چوری تو کی جا سکتی ہے کیوں کہ بیک وقت ہزاروں گاہک گھومتے رہتے ہیں لیکن عام طور پر ایسا کوئی کرتا نہیں ہے۔ بعض اسٹوروں میں پانچ پونڈ سے کم کی قیمت کے سامان کا کیش میمو کمپیوٹر کے اندر چلا جاتا ہے مانگنے پر دے بھی دیا جاتا ہے لیکن عموماً ایسے لوگوں کو پھانس لیا جاتا ہے جن کی کچھ شہرت ہوتی ہے اور ان کے ملک کو بدنام کیا جانا مقصود ہوتا ہے۔

وہاں سے ہم پیدل چلتے ہوئے بی بی سی کے آفس میں گئے جہاں آلِ حسن سے ملنا تھا۔ وہ چھٹی پر تھے۔ ہم اپنا پیغام چھوڑ کر ایک ڈاک خانے میں گئے۔ وہاں سے ڈاک ٹکٹ خرید کر میں نے پرلی، ونود، میتا اور راجو کو خطوط پوسٹ کئے۔ پھر ایک اسٹیشنری شاپ پر جا کر لیٹر ہیڈ، کاربن اور ایک فائل بھی خریدی۔ باہر کچھ دیر تک بیشمار قومیتوں کے لوگوں ہندوستانی، پاکستانی، یمنی، ایرانی، افریقی، جاپانیوں اور انگریزوں کے درمیان گھومتے ہوئے ٹیوب اسٹیشن میں اُتر گئے۔ نیچے بھی ویسی ہی بھیڑ تھی۔ ٹوکیو کے بعد لندن دنیا کا آبادی کے لحاظ سے دوسرا بڑا شہر ہے

یہاں کسی دوسرے سے جان پہچان اتنے معنی نہیں رکھتی جتنا کہ خود اپنے آپ کو جاننا اور یاد رکھنا اہم ہوتا ہے۔ یعنی آدمی خود اپنا یہ احساس زندہ رکھے کہ میں کوئی نہ کوئی ضرور ہوں۔ میں نے سوچا، میں آخر کیا ہوں؟ جو کچھ میرے چہرے پر لکھا ہوا ہے اور وہ بھی کئی چہروں پر نقش ہے جو کچھ میرے اندر موجود ہے۔ وہی میری دولت ہے۔ اُسی کی بدولت میں زندہ رہ سکتا ہوں۔ اردو کا ایک ادیب ہوں، میرا وطن لکھنؤ ہے۔ ہندوستان میں اور کینسنگٹن کلوز ہوٹل کے کمرہ نمبر ۲۴۳ میں مقیم ہوں اور میں سوچ بھی سکتا ہوں۔ بس اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوں!

جس وقت شاہد ایک کیو میں کھڑا ٹکٹ خریدنے کا انتظار کر رہا تھا، میں اس کے بارے میں بھی سوچ رہا تھا۔ ناروے میں اتفاقیہ طور پر مل جانے والے ایک پاکستانی سید مجاہد علی کا چھوٹا بھائی۔ اس کے لئے مجاہد نے مجھے دو سو پونڈ دیئے تھے جو میں نے اسے لاکر یہاں دے دیئے ہیں جو اس کی تعلیم کے اخراجات کے لئے ہیں۔ مجاہد نے پچاس پونڈ مجھے بھی دے دیئے تھے۔ کہا تھا ان سے اپنے لئے کوئی بھی چیز خرید لینا، میری طرف سے! اب شاہد علی جگہ جگہ میرے لئے خرچ کرتا پھرتا ہے اور میرے ساتھ ساتھ رہتا ہے۔ ایک بہت اچھے اور با اعتماد گائیڈ کی طرح۔ یہ کیسا رشتہ ہے؟ انسان انسان کی محبت کا بھوکا کیوں ہے؟ یہ محبت بھی اتنی بڑی خوراک کیوں ہے جو جنگل کی ایک خودرو بوٹی جیسی لگتی ہے۔ یہ نہ ہوتی تو آدمی پیٹ بھرنے والی دوسری تمام خوراکوں کو بھی مل بانٹ کر نہ کھا سکتا۔

مجھے اُس عورت کی بھی یاد آئی جو میرے افسانوں کی ایک ذہین قاری ہے۔ اُس نے میرے افسانوں میں میری تنہائی کو تلاش کرکے مجھے پہچانا ہے۔ وہ مجھے لمبے لمبے خط لکھا کرتی ہے۔ تین چار بار مل بھی چکی ہے اور چاہتی ہے، ہم دونوں ہمیشہ ساتھ رہ سکیں! صرف چاہتی ہے۔ اس کی یہ خواہش میں اس کے خطوں، اس کی آنکھوں اور اس کے بدن کے لمس سے پہچان لیتا ہوں۔ اُسے یہ بھی معلوم ہے ہم دونوں بٹے ہوئے انسان ہیں اپنے اپنے گھروں اور بال بچوں میں۔ بعض خواہشات کی تکمیل اتنی آسان نہیں ہوتی۔ بس آدمی صرف سوچتا ہے۔ صرف سوچتا ہے اور چاہتا ہے۔

ہم لوگ وہائٹ چیپل اسٹیشن پر اتر کر پیدل چلتے ہوئے کمرشل روڈ تک گئے۔ وہاں جگدیش گلاٹی کی دکان، ملٹی چوائس لمیٹڈ، پر گئے۔ وہ ہمیں اپنی گاڑی میں بے تھنل اسٹون لے گیا جہاں وہ اپنی بیوی اور دو بچوں کے ساتھ رہتا ہے۔ جگدیش ڈیرہ اسماعیل خان کا ہے۔ اب یہاں چلا آیا ہے۔ اس کی بیوی تارکین وطن کے ایک آفس میں سروس کرتی ہے۔ ان دنوں وہ ایک حادثے میں ٹانگ ٹوٹ جانے کی وجہ سے چلنے پھرنے سے معذور ہے۔ بڑی مشکل سے چل کر ہمارے پاس ڈرائنگ روم میں آبیٹھی ہے۔ اس کا لڑکا اور لڑکی دونوں لندن میں پیدا ہوئے ہیں۔ صرف انگریزی بول سکتے ہیں۔ اپنے دادا دادی کو اُن کی تصویریں دیکھ کر پہچان سکتے ہیں کیوں کہ انہیں یہی بتایا گیا ہے۔

جگدیش ہمارے قریب کچن میں کھڑا ایک لیمب پیس بھونتا رہا اور ہم سب باتیں بھی کرتے رہے۔ یہاں رہ کر کیسا محسوس ہوتا ہے؟ واپس جائیں گے کبھی؟ ہم یہ سب نہیں سوچ سکتے۔ یا ٹھیک ٹھیک نہیں بتا سکتے۔ واقعی مشکل لگتا ہے یہ بتانا۔ واپس جاکر کریں بھی کیا؟ وہاں جاکر یہ بزنس مل جائے گا کیا؟ پھر سے سب کچھ شروع نہیں کرنا پڑے گا؟ ان کے اڑوس پڑوس میں دو ایک ہندوستانی اور دو ایک پاکستانی گھر ہیں۔ کچھ دوسرے ایشیائیوں کے بھی۔ باقی سب انگریز ہیں۔ سوشل لائف دو تین سو لوگوں کے جاننے تک محدود ہے۔ یہ بھی بہت ہے ہر مہینے پندرہ بیس جوڑے ایک دوسرے کے یہاں مل لیتے ہیں۔ اکثر شکر یا سنیچر کی شام کو۔ سکھوں کے یہاں اکھنڈ پاٹھ ہوتا ہے تو سماجی میل ملاپ کے لئے وہاں بھی چلے جاتے ہیں۔ جب کوئی نو عمر انگریز بچہ اچانک ہمیں بلیکی کہہ کر جملہ کس دیتا ہے تو جذباتی طور پر پریشان ہو اُٹھتے ہیں

بس انہی لمحوں میں گھر لوٹنے کی خواہش بڑھ جاتی ہے لیکن ہم واپس نہیں جا سکیں گے۔ ایسا لگتا ہے یہ نفرت بھی برداشت نہیں کر پائیں گے۔ شاہد علی پاکستان بننے کے بعد پیدا ہوا ہے۔ اس کے لئے یہ پہلا ”دیسی“ ماحول ہے۔ چھوٹا سا گھر لیکن وہ بھی نفرت اور بیزاری کے احساس میں ان کے ساتھ شریک رہتا ہے۔ وہ کہہ رہا ہے یہاں ہندوستانیوں اور پاکستانیوں سے یکساں طور پر نفرت کی جاتی ہے۔ یہاں بیزاری اور مایوسی کی حدیں ایک ہو گئی ہیں۔

رات کو دس بجے ہم ٹیوب سے واپس ہوئے۔ اب بھیڑ کچھ کم تھی۔ ایک پلیٹ فارم پر ایک لڑکی کسی گولی کے نشے میں دھت بنچ پر لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے منہ پر اس کے سیاہ بال بکھرے ہوئے تھے۔ اس کے ایک ہاتھ میں آدھا کھایا ہوا چاکلیٹ تھا۔ کوئی بھی اس کے پاس نہیں رکتا تھا۔ اس کی طرف دیکھتا تھا اور آگے بڑھ جاتا تھا۔ اپنی ٹرین پکڑنے کے لئے زمین کے نیچے ریلوں کا یہ سارا جال بچھانے کے لئے ہندوستان سے ہی روپیہ لایا گیا تھا۔ شاہد مجھے ہوٹل تک چھوڑ کر واپس چلا گیا۔ پچاس ساٹھ میل دور بیل ہام وڈ کی طرف۔ جہاں وہ ایک انگریز عورت کا پے اِنگ گیسٹ تھا۔

میں نے ٹی وی پر خبروں کا آخری بلیٹن سنا۔ اس وقت بیوی کو ایک طویل خط لکھ رہا تھا۔ ”تمہاری یاد بہت آ رہی ہے۔ یہاں میں بڑی تنہائی محسوس کر رہا ہوں اور جی چاہتا ہے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر ہم انگلینڈ پر قبضہ کر لیں۔ اب ہمیں بھی ان پر حکومت کرنی چاہئیے۔ لیکن ہم سب کس قدر احمق ہیں۔“ پھر میں کپڑے بدل کر آرام دہ بستر میں گھس گیا۔ لائٹ آف کر دی اور ہاتھ بڑھا کر ریڈیو آن کر لیا۔ جہاں مغربی موسیقی کی دھن سنائی دی اُسے وہیں روک دیا۔ اور پھر بہت سے لوگوں کو یاد کرتا ہوا سو گیا۔

۱۲ ستمبر

صبح سوا آٹھ بجے انگریز بہرے نے وہی ناشتہ لا کر دیا جس کے لئے میں نے چارٹ پر نشان لگا کر رات کو اُسے دروازے کے باہر لٹکا دیا تھا۔ اسی وقت ایلس کو بھی فون کیا۔ وہ نو بجے ایک گروپ کے ساتھ کچھ تاریخی جگہیں دیکھنے جا رہی تھی۔ وہ سہ پہر کو آ سکتی تھی لیکن سہ پہر کو میں فارغ نہیں تھا۔ شاہد کے ساتھ پکاڈلی دیکھنے کا پروگرام بنا چکا تھا۔ اُسے کہا۔ ”کل صبح پھر فون کروں گا۔“

ری سپشن کاؤنٹر کے سامنے اینڈرسن سے ملاقات ہو گئی۔ وہ ہمارے ساتھ اوسلو سے آیا تھا۔ اُس نے بتایا وہ گزشتہ شام پکاڈلی میں ہی گھومتا رہا تھا۔ ایک پب میں بیٹھا لوگوں سے باتیں کرتا رہا۔ اس کے ہاتھ میں تاش کی گڈی تھی۔ میرے ساتھ صوفے پر بیٹھ کر تاش کے کھیل دکھاتا رہا۔ ایک نارویجین لڑکی کو دیکھ کر اس کی طرف لپکا ہوا سا چلا گیا۔ پھر اسے میرے پاس لے آیا۔ ”مجھ سے ملانے کے لئے“ وہ چلی گئی تو بولا۔ ”میری بیوی کو بلیاں پالنے کا شوق ہے۔ وہ بلیوں کے بارے میں بہت کچھ جانتی ہے۔ انسان کو تو اپنا وفادار بنا لینا بہت آسان ہے لیکن ایک بلی پالتو ہو کر بھی خطرناک بنی رہتی ہے۔“

اُسے اس کی بیوی نے ہی لندن آنے کے لئے خرچ دیا تھا۔ وہ اوسلو میں بھی سروس کرتی ہے۔ بچوں کی دیکھ بھال بھی کرتی ہے۔ دسمبر میں وہ افریقہ چلی جائے گی تو اس کی غیر حاضری میں بچوں کی دیکھ بھال وہ کرے گا۔ دونوں بچے اُس کے پہلے شوہر سے ہیں۔

شاہد وعدے کے مطابق اڑھائی بجے آ گیا۔ ہم پھر ٹیوب کی بھول بھلیوں میں سے ہوتے ہوئے آکسفورڈ اسٹریٹ گئے۔ آج پھر بڑے بڑے اسٹور دیکھے۔ تھوڑی سی شاپنگ کی۔ پھر ٹیوب سے ہی پکاڈلی گئے۔ یہ لندن کا بہت پرانا محلہ ہے۔ کئی تھیٹر اور سینما گھر ہیں۔ ہر جگہ بھیڑ دیکھی لوگ ٹیڈی میڈی سے لگے سڑک پر بیٹھ کر شرابیں اور بیئر پیتے ہوئے ایک دوسرے کو گلے لگا لگا کر پیار کرتے ہوئے۔ یہاں تو میتیں گھُل مل گئی

تھیں۔ کالے اور گورے کا کوئی امتیاز نظر نہیں تھا۔ یہاں صرف جسم کی ضرورت کی اہمیت تھی۔ یہاں جسم بیچنا جرم ہے لیکن طوائفیں گروپ بنا کر بنچوں پر بیٹھی تھیں۔ راہگیروں کو سیٹیاں بجا بجا کر اور ہیلو ہیلو کہہ کر مخاطب کرتی تھیں۔ جس طرح بمبئی کی فارس روڈ پر جنس فروش عورتیں گاہکوں کو مدعو کرتی ہیں وہاں سیکس کی بھی کئی دکانیں دیکھیں۔ کتابوں، رسالوں اور پلاسٹک اور ربڑ کے آلات سے بھری ہوئیں۔ خفیہ کمروں میں بلیو فلمیں دکھانے کا بھی انتظام تھا۔ وہاں بھی لڑکیاں معمور تھیں۔ میں چاہتا تھا ایک بلیو فلم ضرور دیکھ لوں۔ لیکن شاہد علی کے ساتھ نے روک لیا۔ وہ نوجوان ضرور تھا لیکن ہم ایک دوسرے کے سامنے کھل نہ سکے۔ ٹھیک ہی ہوا۔ میرے پاؤں کا درد پھر جاگ رہا تھا۔ دوا کی گولیاں ہوٹل کے کمرے میں چھوڑ آیا تھا۔ واپس جا کر کھاؤں گا سوا نو بجے تک ہم ہوٹل واپس آ گئے۔ ہوٹل کے باہر چبوترے پر چاند گل کو اس کے شوہر اور بیٹے وکی کے ساتھ بیٹھا ہوا دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اوسلو سے چلنے سے ایک روز پہلے میں نے اُسے خط بھجوا دیا تھا۔ وہ خط ملتے ہی مجھ سے ملنے کے لئے آ گئی تھی۔ دو گھنٹے سے انتظار کر رہی تھی۔ وہ لوگ گھنٹہ بھر تک میرے کمرے میں رہے۔ چاند گذشتہ دسمبر اور مارچ میں لکھنؤ میں ہمارے یہاں آئی تھی۔ تب عصمت چغتائی بھی لکھنؤ میں آئی ہوئی تھیں۔ وہ اُردو کی نئی افسانہ نگار اور شاعرہ ہے۔ اس نے اگلے روز صبح آنے کا پھر وعدہ کیا اور چلی گئی۔ رات گیارہ بجے اچانک آلِ حسن کا فون آ گیا۔ وہ اُس وقت بی بی سی میں رات کی ڈیوٹی پر تھا۔ اس نے مجھے اگلے روز رات کو آٹھ بجے بُش ہاؤس میں مدعو کیا۔ اُسے میرا اوسلو سے بھجوایا ہوا خط نہیں ملا تھا۔ اس نے وعدہ کیا کہ اگر ساقی فاروقی لندن میں ہوا تو اس کے ساتھ بھی رابطہ قائم کرا دے گا۔

۱۴ر ستمبر

صبح دس بجے چاند گل اپنے نو سال کے بیٹے وکی کے ساتھ آ گئی۔ اُس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ مجھے آج البرٹ ہال اور برٹش میوزیم دکھا دے گی تب تک میں نہا دھو کر اور ناشتہ وغیرہ سے فارغ ہو چکا تھا۔ الیس کے ساتھ بھی فون پر بات ہو گئی تھی۔ ہم دونوں آج بھی اپنی اپنی جگہ معروف تھے۔ ہم دونوں کو بڑی ہنسی آئی۔ اس امید کے احساس سے کہ کسی نہ کسی دن ضرور ملیں گے اور بہت سی باتیں کریں گے۔

شاہد، چاند، وکی اور میں ٹیوب سے البرٹ میوزیم گئے۔ ایک بہت ہی قدیم اور تاریخی عمارت کے اندر کئی ہال تھے۔ ہر ہال کے اندر صدیوں پرانی تصاویر، پینٹنگز اور کتابوں کا ایک بیش بہا خزانہ موجود تھا۔ بڑی ترتیب اور حفاظت کے ساتھ رکھا ہوا۔ یہ بھی انگریزی فتوحات کا ایک بہت بڑا حصہ تھا۔ وہ جہاں جہاں سے کوئی بھی چیز اٹھا سکا تھا۔ کاغذ کا ایک ایک پرزہ تک اس نے اپنے عجائب گھروں میں لا کر رکھ دیا تھا وہی چیزیں اب نایاب ہو چکی ہیں۔ ملک کی تاریخ اور تہذیب کے ٹوٹے ہوئے سلسلے ملانے میں معاون بن رہی ہیں۔ یونیورسٹیوں کے پروفیسر، ریسرچ اسکالر، فری لانس ادیب، محقق اور صحافی یہاں آتے ہیں اور باقاعدہ اجازت لے کر مسودات، سکوں، تصاویر، برتنوں، ہتھیاروں اور دوسری اشیاء کا معائنہ کرتے ہیں اور کتابیں لکھتے ہیں۔ یہاں مختلف موضوعات پر فلمیں اور سلائڈیں دکھائی جاتی ہیں۔ ان پر لیکچر دیئے جاتے ہیں۔ مباحثے ہوتے ہیں۔ یہاں کے وسیع ریڈنگ روم میں بیٹھ کر کام کرنے کے لئے سیٹ بھی پہلے سے ریزرو کرانی پڑتی ہے۔ میں صرف وہی حصے دیکھ سکا جو عام پبلک کے لئے کھلے ہوئے تھے۔ پھر بھی میں بے شمار یونانی، عربی، ترکش، ہندوستانی اور جاپانی مسودوں کو ایک نظر دیکھنے میں کامیاب ہو گیا جو شیشے کے بکسوں میں بڑی حفاظت سے رکھے گئے تھے۔ اسی جگہ مشہور و معروف ادیبوں۔ گبن، ہیوم، کارلائل، تھیکرے، بیرن برن جارج برنارڈ شا، لینن، سن یات سن اور بیٹرس ویب نے برسوں بیٹھ کر تحقیق کی تھی۔ یہاں تیس ہزار کے قریب پرانی و نایاب کتابیں اور مخطوطے محفوظ ہیں۔ دوسری کتابوں کی تعداد ستر لاکھ کے قریب ہے جن میں ہر سال پانچ لاکھ کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ کتابوں کے صرف کیٹلاگوں کی تعداد دو ہزار سے زائد بتائی جاتی ہے۔ ان کی نگرانی اور حفاظت کرنے کے لئے پانچ سو ستر کا عملہ ملازم رکھا گیا ہے۔ اس سے ملحق لائبریریوں

کے بیشمار کمروں میں جو کئی الگ الگ عمارتوں میں قائم ہیں، صرف ۱۹۷۸ء میں دس لاکھ چورانوے ہزار دو سو بیس کتابیں پڑھنے والوں کو دی گئیں۔

تین گھنٹے وہاں صرف کرنے کے بعد ہم باہر نکلے تو وکی تھک چکا تھا۔ چاند نے اپنے بیگ سے ایک چاکلیٹ نکال کر اسے دیا اور ہم سڑک کے کنارے ایک خالی بنچ پر بیٹھ گئے۔ ہم دونوں چپ تھے اتنی بڑی اور سنجیدہ تعلیم گاہ کی زیارت نے ہمارے لبوں پر مہرِ سکوت لگا دی تھی۔ ہمارے سامنے سے کتنی بسیں اور کاریں نکل گئیں اور ہمارے سروں پر پیڑوں کے سوکھے ہوئے پتے اڑ اڑ کر ہمارے آس پاس بکھر گئے۔ وکی بجلی کے ایک کھمبے کے ساتھ لگ کر چاکلیٹ کھاتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد شاہد بھی آگیا تو ہم مسکرانے اور باتیں کرنے کے قابل ہو سکے۔

"چاند، تم اسی ماحول پر افسانے اور نظمیں لکھتی رہو مجھے یقین ہے تم ایک نہ ایک دن بہت اچھی افسانہ نگار بن کر ابھرو گی۔"

اس نے اس روز اپنے خوبصورت لمبے بالوں کو ایک عجیب انداز سے سر کے عین اوپر جوڑے میں سمیٹ رکھا تھا جس سے اس کا چہرہ کچھ اور بھی لمبوترا لگ رہا تھا۔ اس نے ایک مضمحل مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ "جو کچھ میں لکھتی ہوں وہ ابھی خام تو ہو سکتا ہے لیکن لوگ مجھے سمجھنے میں غلطی کرتے ہیں کیونکہ میں ایک عورت ہوں۔ ابھی جب میں ہندوستان گئی تو وہاں کے جتنے ادیبوں، شاعروں اور نقادوں اور ایڈیٹروں سے میں ملی انہوں نے مجھے صرف ایک عورت سمجھا۔ رائٹر کسی نے بھی نہ سمجھا۔"

"کوئی بات نہیں۔ تم عورت بھی ہو اور ادیبہ بھی۔ ہمارے یہاں کے ادیب بھوکے ہیں۔ معاشرہ بھوکا ہے جو کچھ وہ لکھتے اور سوچتے ہیں اس سے محض انفرادی آزادی کا اظہار ہوتا ہے معاشرے کی آزادی کا نہیں اور معاشرہ بہت دھیرے دھیرے اپنی صدیوں کی جکڑ بندی سے نکل رہا ہے۔ تم یہاں کی فضا میں پلی ہو اس لئے وہ تمہیں غلط سمجھ بیٹھے ہیں اور اتاولے ہو اٹھتے ہیں۔ پھر بھی تم عصمت آپا اور جیلانی بانو کی طرح بہادر بن سکتی ہو۔"

شاہد نے ہم لوگوں کی کئی تصویریں اتار لی تھیں۔ کبھی کبھی تصویریں اتروانا بہت اچھا لگتا ہے۔ اگرچہ اہم نہیں لگتا۔ ہم وہاں سے اٹھ کر ایک اسٹور میں گئے۔ کچھ چاکلیٹ، سینڈوچز اور کوکا کولا کے ٹن خریدے، جنہیں ہم ہاتھ میں اٹھائے اٹھائے چلتے چلتے ہوئے پی سکتے تھے۔ اور پھر ایک ٹیوب میں بیٹھ کر ہیتھرو سنٹرل کی طرف چل پڑے۔ مہندر گل نے اپنے گیرج سے فارغ ہو کر ہمیں وہیں ملنے کے لئے وقت دیا ہوا تھا۔ ہمارے پہنچنے کے دس منٹ کے بعد وہ کار لے کر وہاں پہنچ گیا۔ مجھے ہاؤنسلو کے ایک محلے ایش گردو میں رہنے والے ایک کرشن دت کی تلاش تھی جس کے ایک چچا لکھنؤ میں رہائش پذیر تھے۔ ان کا وطن میانوالی تھا۔ اس کی انگریز بیوہ ماں بھی میانوالی میں رہ چکی تھی۔ پنڈت ٹھاکر دت نے کہا تھا میری بھابھی سے ضرور مل کر آنا اور اس کے ساتھ ٹھیٹھ سرائیکی بولی میں گفتگو کرنا۔ وہ لوگ تو نہیں ملے لیکن ہمیں ساؤتھ ہال سے گزرنے کا موقعہ ضرور مل گیا جسے چھوٹا ہندوستان بھی کہا جاتا ہے اور کہتے ہیں وہاں دس لاکھ کے قریب ہندوستانی اور پاکستانی رہتے ہیں۔ سڑک کے دونوں طرف میں نے ساڑیوں، جھولے، پکوڑوں، گوشت اور کباب کی بیشمار دکانیں دیکھیں اور طرح طرح کے سائن بورڈ لگے ہوئے دیکھے۔ گریوال اسٹورز، حاجی اسنیل اینڈ برادرز، انڈین میٹ وغیرہ۔ ایک دکان سے میں نے چھ ساڑیاں خریدیں۔ ایک ساڑی چاند نے بھی خریدی۔ اس کا ذوق انتخاب اچھا تھا۔ میں نے بھی اسی سے مدد لی تھی۔ وہاں بہت بڑی تعداد میں شلواروں اور ساڑیوں میں عورتوں کو اور سرداروں کو پگڑیاں باندھے ہوئے دیکھا تو ایسا لگا میں ہندوستان میں ہی گھوم رہا ہوں۔ نئی نسل کی لڑکیاں مغربی لباس یعنی اسکرٹ پہنتی ہیں۔

مہندر گل ہمیں ایک ٹیوب اسٹیشن پر چھوڑ کر اور وکی کو ساتھ لے کر چلا گیا۔ مجھے رات کو آٹھ بجے بی بی سی کے بش ہاؤس میں پہنچنا تھا۔ شاہد تو میرے ساتھ رہتا ہی تھا۔ اس روز چاند نے بھی میرے ساتھ رہنے کی خواہش کی تھی۔ اور ابھی ہمارے پاس بہت وقت تھا۔ اتنا وقت تھا

کہ ہم نے ولیسٹ منسٹر ایبے اور اس کے سامنے بہتا ہوا دریا ٹیمز بھی دیکھ لیا جس کے بارے میں انگریز بہت جذباتی ہے وہ اسی خاموش دریا کے بارے میں نہ جانے کتنی نظمیں لکھ چکا ہے۔ پھر ہم ٹہلتے ٹہلتے ۱۰، ڈاؤننگ اسٹریٹ چلے گئے۔ یہیں سے ہندوستان پر حکومت کی گئی تھی۔ اسی مکان میں کتنے برٹش وزیرِ اعظم رہ چکے تھے۔ اور یہاں کتنے ملکوں کے سربراہ آ چکے تھے۔ لیکن میں بے رحم تاریخ سے بالکل لاتعلق تھا۔ یا شاید اپنے جذبات کو چھپا کر چاند اور شاہد کے ساتھ باتیں کرتا ہوا ٹرافالگر پارک پہنچ گیا جہاں کبوتروں کے جھنڈ کے جھنڈ جمع رہتے ہیں۔ وہ لوگوں کے اوپر آکر بیٹھ جاتے ہیں اور لڑکیاں زور زور سے چیخنے لگتی ہیں۔ یہ لطف ہم نے بھی اٹھایا اور فوٹو بھی کھنچوائے۔ شاہد، چاند اور میں نے باری باری سے ایک دوسرے کے فوٹو لیے۔ کبوتروں کے ساتھ۔ وہاں سے پکاڈلی دور نہیں تھا۔ ٹہلتے ٹہلتے وہاں تک بھی جا پہنچے۔ عورتوں اور مردوں کو چہلیں کرتے، دیکھتے ہوئے اور سیکس کی دکانوں کے اندر جھانکتے ہوئے اور مسکراتے ہوئے، ایک دوسرے کی طرف دیکھ دیکھ کر کبھی کبھی انسان یونہی بھی مسکرا دیتا ہے۔ جس کا مطلب اس وقت بھی نہیں ہوتا۔

ایک لمبی ریسٹوران میں بیٹھ کر پیزا کھایا اور چائے پی اور خوبصورت انگریز ویٹرس لڑکیوں کی مسکراہٹوں سے لطف اندوز ہوئے۔ ہم تینوں۔ ہماری بیزاری اور تھکن ختم ہو چکی تھی۔ ہم اب کھُل کر ہنس بھی سکتے تھے۔ واقعی ہنستے ہوئے ہم ٹیوب سے اپنے ہوٹل میں لوٹ گئے جہاں میرا قیام تھا۔ میں نے پاؤں کے درد کو بہلانے کے لئے ایک گولی کھائی اور بستر پر لیٹ گیا۔ شاہد ٹی۔وی آن کر کے کوئی پروگرام دیکھنے لگا۔ چاند اپنا جُوڑا کھول کر بالوں میں کنگھی کرتی رہی۔ اُسے اپنے بالوں سے بڑا عشق ہے۔ اُن کی لمبائی اور خوبصورتی کے بارے میں وہ ضرورت سے زیادہ حساس بھی ہے۔ اُس نے ہمارے ساتھ باہر جانے کے لئے اب بال کھُلے چھوڑ دیئے تھے۔ کالے بلاؤز اور کالے ساڑے کے ساتھ وہ بہت دلکش لگ رہی تھی۔ چھوٹے سے قد کی ایک اپیتی گڑیا جیسی۔ میں نے اس کی تعریف کی تو اس نے مسکرا کر میرا شکریہ ادا کیا۔

جس وقت ہم ٹیوب میں بُش ہاؤس کی طرف جا رہے تھے ہمیں گاڑی میں ساڑی میں ملبوس ایک ہندوستانی عورت مل گئی۔ دھیڑ عمر کی مگر خاصی دلکش۔ وہ دہلی سے آٹھ ستمبر کو روانہ ہوئی تھی۔ اس نے ہمیں دہلی کے سیلاب اور سیاسی صورتِ حال کے بارے میں بڑی تفصیل سے بتایا۔ وہ کسی بزنس کے سلسلے میں نیویارک وغیرہ کئی شہروں سے ہو کر واپس جانے کا ارادہ رکھتی تھی۔

بش ہاؤس کے ریسٹوران میں بہت سے لوگ موجود تھے۔ کئی قومیتوں کے۔ ہر ٹیبل پر شراب کے گلاس اور چائے کے پیالے موجود تھے۔ سنہرے سُرخ اور کالے بالوں والی لڑکیاں بھی جو اپنے چہروں پر شاید اپنی ملازمت کی نوعیت کی وجہ سے خواہ مخواہ انٹلکچول تاثر لئے ہوئے تھیں یا شاید میں ہی انہیں شوخ اور قہقہے لگاتا ہوا دیکھنے کا آرزو مند تھا۔ جب میں خود آلِ حسن کو نہ پہچان سکا تو اچانک وہ خود مجھے پہچان کر ایک میز پر سے اُٹھ کر میرے پاس آ گیا۔

— ہیلو! آپ ہی رام لعل صاحب ہیں؟

یہ میری اُن سے دوسری ملاقات تھی۔ ہم پہلی بار ۱۹۷۱ء میں لکھنؤ میں ملے تھے۔ سیّد احتشام حسین مرحوم کے وہ چچا زاد بھائی ہیں۔ احتشام صاحب سے ان کی شکل و صورت بہت ملتی ہے۔ وہ میرے لئے ریڈ وائن کا ایک گلاس بھر کر لے آیا۔ اس کے ہاتھ میں پہلے سے ایک گلاس موجود تھا۔ چاند گل اور شاہد علی کے لئے اس نے جوس کے گلاس منگائے۔ ہم فوراً ہی لکھنؤ کی باتوں میں کھو گئے۔ میرے دوست سریندر چترویدی (ایک نامور ہندی کے صحافی) نے مجھے اس کے ساتھ لکھنؤ میں متعارف کرایا تھا۔ اس کا دو سال پہلے انتقال ہو چکا تھا۔ آلِ حسن آزادی سے پہلے ریڈیو اسٹیشن سے وابستہ تھا۔ کرشن چندر اور منٹو کو ذاتی طور پر جانتا تھا۔ اب انتیس سال سے بی بی سی کے ساتھ وابستہ ہے۔ اس نے پہلے کرشنا گھنہ کے ساتھ شادی کی تھی

جس سے ایک بیٹا اور بیٹی ہوئے تھے۔ پھر ان کے درمیان طلاق ہوگئی۔ اب اس کی بیوی ماریہ ایک سرجن ہے۔ کرشنا کے ساتھ اس کے تعلقات اب محض دوستانہ ہیں۔ ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ اس نے بتایا ردینہ دو شادیاں اپنی مرضی سے توڑ چکی ہے۔ اس نے ایک شاعر کی بیٹی کا بھی ذکر کیا جو لندن میں بیاہی گئی تھی لیکن وہ شادی طلاق پر ختم ہوگئی۔ اب وہ ایک بہت ہی شریف انگریز کی بیوی ہے اور خوش و خرم زندگی گذار رہی ہے۔ اس نے جگن ناتھ آزاد، سردار جعفری، خوشونت سنگھ، عاشق حسین بٹالوی اور مینش سکسینہ کا بھی ذکر کیا جو کیفی اعظمی کا ہم زلف ہے۔ وطن سے دُور لکھنؤ کے ایک مہذب اور شائستہ انسان کے ساتھ مل کر مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ جس کے زندگی کے بارے میں سارے رویے جدید تھے۔ کشادہ دلی سے بھرپور۔

ہم وہاں سے نکلے تو دس بج رہے تھے۔ چاند راستے میں ہی کسی ٹیوب اسٹیشن پر اتر کر اپنے گھر چلی گئی۔ شاہد بھی مجھے ایک جکشن اسٹیشن پر چھوڑ کر گھر چلا گیا۔ اب میں بلا جھجک اپنے ہوٹل تک پہنچ سکتا تھا۔ میں اپنے کمرے میں پہنچ کر صبح کا ناشتہ کر رہا تھا کہ ساڑھے گیارہ بجے آن حسن نے مجھے فون کیا۔ اس نے سنیچر وار کی شام کو ساڑھے پانچ میرے ساتھ انٹرویو کرنے کے لیے وقت مقرر کیا۔

۱۴ ستمبر

صبح اٹھتے ہی ایلس کو فون کیا۔ وہ میری منتظر تھی۔ بولی "گیارہ بجے میں خود فون کروں گی" ریسیور رکھا تو پھر گھنٹی بجی۔ یہ مسز جگدیش گلاٹی کا فون تھا۔ اُس نے کہا "میں ایک روز پھر ان کے ہاں وہاں جاؤں اس کے چھوٹے بھائی ان کے ساتھ میری بھتیجی سنیتا کی دو سال پہلے دہلی میں شادی ہوئی تھی۔ وہ اس موقع پر دہلی گئی تھی۔ میں نے اُسے بتایا میرا پروگرام انتا بزی ہوتا جا رہا ہے کہ فوراً کوئی وعدہ کر لینا مشکل لگتا ہے۔ پھر بھی میں وقت نکالوں گا۔ بولی "میں معذور نہ ہوتی تو اپنی گاڑی میں تمہیں سارا لندن گھما دیتی"

اُس کے فوراً بعد چاند کا فون آیا۔ اس نے کہا وہ کل صبح دس بجے سے پہلے آ جائے گی۔ اپنے ساتھ اپنی نئی کہانیاں بھی لے آئے گی اور وہ انٹرویو بھی جو اُس نے بمبئی میں خواجہ احمد عباس سے لیا تھا۔ شاہد کو اڑھائی بجے آنا تھا۔ میری دوپہر بالکل خالی تھی۔ گیارہ بجے ایلس نے فون پر بتایا کہ وہ مجھ سے لنچ پر مل سکتی ہے۔ ہم لوگوں نے ہائی روڈ کینگسٹن کے ہی ریسٹوران ومپی میں ملنے کے لیے ساڑھے بارہ بجے کا وقت طے کر لیا۔

وقت گزارنے کے لیے میں اپنی شرٹس دھوتا رہا۔ پھر تیار ہو کر باہر نکل گیا۔ لندن کی سڑکوں پر، ٹیوب کے پلیٹ فارموں پر جگہ جگہ کوڑا نظر آتا ہے۔ بہتا ہوا پانی۔ پھٹے ہوئے اخبارات کے ٹکڑے جا بجا اڑتے ہوئے اور فٹ پاتھوں کے کنارے کنارے بیئر اور شراب کی بوتلیں اور سگریٹوں کے ٹکڑے۔

تھوڑی دیر کے لیے میں لائڈس بنک میں گیا۔ وہاں میں نے کچھ کرنسی اور ٹریولرز چیک ایکسچینج کرائے۔ ہر چند چاولہ نے اگرچہ مجھے دو ہزار کرونا کے نوٹ دے دیئے تھے لیکن میں زیادہ خرچ کرتے ہوئے ڈرتا تھا۔ بہت پھونک پھونک کر قدم رکھ رہا تھا۔ سوا بارہ بجے ومپی کے سامنے ایک آرٹ شاپ میں چلا گیا۔ اتفاق سے وقت گزارنے کے لیے ایلس بھی وہیں موجود تھی۔ ہم دونوں فوراً ومپی میں جا بیٹھے۔ میں نے اُس سے بیئر یا وائن پینے کی پیش کش کی تو اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ وہ کل رات کو بڑی کثرت سے شراب پی چکی ہے اور اب لنچ کے بعد جا کر کئی گھنٹے ڈٹ کر سوئے گی۔ شام کو پانچ بجے تک کیونکہ اس وقت اُسے ایک کال کا انتظار کرنا ہوگا۔

لنچ پر ہونے گفتگو کے دوران اس نے بڑی حیرت کا اظہار کیا کہ انڈیا کی لڑکیوں کو لڑکوں سے ملنے کی آزادی حاصل نہیں ہے۔ اس کے

لیے اس نے اپنے ساتھ کام کرنے والے ایک انڈین کرسچین تھامس کی مثال دیتے ہوئے کہا۔ "وہ اپنی چھوٹی بہن للی کو کسی لڑکے کے ساتھ باہر نہیں جانے دیتا۔ کہتا ہے جب تک وہ اٹھارہ سال کی نہیں ہو جاتی اُسے وہ ایسا نہیں کرنے دے گا۔"

"کیا تھامس تمہارا دوست ہے؟"

"ہماری دوستی دفتر تک ہی رہتی ہے کیونکہ وہ ہمیں انگریزی اور ہندوستانی نقلیں کر کے سناتا رہتا ہے۔ بہت مست اور دلچسپ آدمی ہے لیکن وہ شراب بہت پیتا ہے۔"

پھر وہ میرے پیچھے میز پر بیٹھی دو لڑکیوں کو زور زور سے ہنستا دیکھ کر بولی "یورپ میں ایسی کوئی پابندی نہیں ہے۔ بعض لڑکیاں بارہ یا تیرہ سال کی عمر سے ہی جنسی تجربے کرنے لگتی ہیں۔"

میں نے اُسے بتایا۔ "انگلینڈ میں تو یہ بہت بڑا مسئلہ بنا ہوا ہے۔ ماں باپ اپنے بچوں کو ذرا سی بھی تنبیہ کرتے ہیں تو وہ پھر گھر کبھی نہیں واپس آتے۔ والدین کا مطالبہ ہے کہ اُن کے بچے کو سیکس کی تعلیم دینے کی ذمہ داری پبلشرز قبول کریں اور ایسی کتابیں چھاپا کریں جنہیں پڑھ کر بچے خود ہی راہِ راست پہ آجائیں۔ جب کہ پبلشر یہ ذمہ داری والدین پر ڈالتے ہیں۔"

ایلس نے کہا۔ "میں نے بھی یہ بحث کل اخبار میں پڑھی تھی اور رات کو جس کلب میں "ٹاک آف دی ٹاؤن" میوزیکل شو دیکھنے گئی تھی وہاں کچھ لڑکیوں اور لڑکوں کے ساتھ اس کا ذکر چھڑ گیا تھا۔ جس وقت ہم کاؤنٹر پر شراب لے رہے تھے۔ لیکن شراب اور موسیقی کا اثر اتنا زیادہ تھا کہ کوئی بھی دیر تک کسی سنجیدہ موضوع پر بات کرنے کے قابل نہیں رہتا تھا۔"

وہاں سے نکل کر ہم پھر آرٹ شاپ پر گئے۔ اس نے دو پینٹنگز خریدیں۔ میں نے چار کی رنگ خریدنے جس کے ساتھ چھوٹی چھوٹی لکڑی کی تختیاں بھی جڑی ہوئی تھیں اور ان پر چھوٹی چھوٹی انگریزی نظمیں یا بڑے دانشوروں کے معنی خیز جملے لکھے ہوئے تھے۔ ہم ٹہلتے ٹہلتے ہوٹل تک واپس آئے۔ کچھ دیر سڑک پر پڑے ایک بینچ پر بیٹھے رہے۔ اس نے کہا میں کچھ عرصہ تک اور رُک سکوں تو اچھا ہوگا۔ ہو سکتا ہے وہ میرے ساتھ چند روز کے لئے ڈنمارک جا سکے۔ وہاں جا کر وہ اپنے بوڑھے والدین سے بھی ملنا چاہتی تھی اور مجھے کچھ خاص خاص شہر بھی دکھانا چاہتی تھی۔

میں اس کے ساتھ کوئی پکّا وعدہ نہ کر سکا۔ کیونکہ میں اب پیرس، اٹلی اور اسپین جانے کا پروگرام بھی رد کر چکا تھا۔ میرے پیشِ نظر اب اوسلو میں صرف ایک سیمینار میں شرکت کرنا تھا جو چار دنوں کا تھا اب وہی میرے لئے اہم بنا ہوا تھا۔ اس نے مجھے جو فون نمبر دے دیا تھا اسی پہ اوسلو میں کبھی اس سے بات کروں گا۔

ہوٹل میں واپس آیا تو لاؤنج میں اوسلو کا ایک ریٹائرڈ ڈسٹرکٹ جیل آفیسر سپیدہ جارگ مل گیا جس کی عمر اسی سال تھی اور وہ اب بھی چاق و چوبند نظر آتا تھا۔ اسے اوسلو میں میری سرگرمیوں کا علم اخبارات میں چھپے تاثرات اور انٹرویوز سے ہو چکا تھا۔ میری اس خواہش کو کہ میں وہاں کے قیدیوں کے حالات کا مطالعہ کروں پورا کرنے کا وعدہ کر لیا۔ میں نے کچھ کتابیں اوسلو کی لائبریریوں میں پڑھ لی تھیں جن کا حوالہ دینے پر اس نے کہا۔ "تم خود یہ سیل دیکھو گے تو بہت فرق محسوس کرو گے۔"

شاہد علی دو بجے آگیا۔ ہم نے آکسفورڈ اسٹریٹ پر جا کر کچھ شاپنگ کی۔ ایک اسٹور میں ہمیں بل نہیں دیا گیا تو اس کے لئے ہم نے مطالبہ کر دیا۔ تب ہی جا کر دیا گیا۔ انڈیا ٹی سنٹر میں چائے پینے کے لئے گئے۔ وہاں چائے اچھی نہیں ملی۔ مہنگی بھی تھی۔ ایک پیالے

کے لیے جو بیس پنس چارج کئے گئے جب کہ گلی پار کے ایک اسپینی چائے خانے میں چودہ پنس کا پیالہ ملتا تھا۔ سموسے بھی بے ڈھنگے اور ٹھنڈے تھے۔ وہاں جو لڑکیاں کام کر رہی تھیں۔ سب کی سب سری لنکا کی تھیں جب کہ وہاں ساڑھیوں میں ملبوس ہندوستانی لڑکیاں ہونی چاہیئے تھیں۔ میں نے کاؤنٹر پر بیٹھے سردار جی سے اس امر کی شکایت کی تو وہ بولا۔" ہندوستانی لڑکیوں کے دماغ بہت اونچے ہیں جی اخبارات میں اشتہارات دیتے ہیں زیادہ تنخواہ آفر کرتے ہیں۔ تب بھی وہ نہیں آتیں۔ یہ سیلونیز گرلز صرف تیس پونڈ لیتی ہیں۔ جب کہ ہم ہندوستانی لڑکیوں کو چالیس پونڈ دینے کے لئے تیار ہیں۔"

رات کو ہوٹل میں واپس آکر ٹی وی پر الیکس ہیلی کے بارے میں ایک فلم دیکھتا رہا۔ ہیلی نے چھ نسلیں پہلے کے ایک کالے رنگ کے افریقی خاندان کے بارے میں ایک ناول روٹس (جڑیں)، لکھا ہے۔ جس میں امریکہ میں غلاموں کی تجارت کا المیہ بڑی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ اس تجارت میں سفید فام لوگوں نے انتہا دولت کمائی تھی اور اپنی نئی دنیا کی تعمیر میں کالے غلاموں کو بطور کھاد استعمال کیا تھا۔ اس ناول نے جہاں ایک طرف موجودہ امریکی سماج کے ضمیر کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے وہاں خود نئی نسل کے کالے لوگوں کی نظر میں الیکس ہیلی ایک ہیرو بن گیا ہے۔ نئی نسل اُسے محمد علی کلے اور اسٹیوی ونڈر کے بعد تیسرا قابل فخر مقام دیتی ہے۔

اس فلم میں ہیلی کے نقادوں اور خود ہیلی کو بھی پیش کیا گیا تھا۔ لوگوں کا اعتراض یہ تھا کہ اس فلم کو افریقہ کے پس منظر میں یعنی افریقیوں پر ڈھائے گئے مظالم کو بھی ایک رومانی نقطۂ نظر سے پیش کر دیا گیا ہے۔ اس ناول میں خود افریقہ نہیں بلکہ امریکہ اور امریکی ذہنیت زیادہ اہم بن گئی ہے جب کہ ہیلی کا یہ کہنا تھا کہ میں نے یہ ناول لکھ کر افریقیوں کو قابلِ توجہ بنا دیا ہے۔ لیکن لوگ خواہ مخواہ امریکن پوائنٹ آف ویو کو اہمیت دے رہے ہیں۔ بہر حال کچھ بھی کہا جائے۔ میں نے ٹی وی فلم کی ناروے میں جتنی فلمیں دیکھی ہیں ان کی بنا پر میں کنٹے کنٹا کو ہیلی کا ایک لافانی کردار سمجھتا ہوں۔

۱۵ ستمبر

رات ٹھیک طرح سے نیند نہیں آئی۔ بار بار خواب آتے رہے ہیں۔ صبح ناشتہ کر کے پھر سو گیا۔ ساڑھے دس بجے چاندگل نے آکر جگایا وہ کچھ پریشان سی نظر آئی۔ اس کی آنکھیں بھی سوجی ہوئی تھیں۔ بہت پوچھنے پر اس نے صرف اتنا بتایا کہ ہندوستانی عورت کو کہیں بھی اتنی آزادی حاصل نہیں ہو سکی ہے کہ وہ اپنی مرضی سے اپنے دوستوں سے جا کر مل سکے۔ اس کا مرد ہمیشہ پریشان رہتا ہے۔"

اس نے مجھے ایک کہانی 'قفس' سنائی جو مجھے بہت اچھی لگی۔ اب وہ ڈھرّے پر آ رہی ہے آگے چل کر اور بھی اچھا لکھ سکے گی۔ میں شیشے کے سامنے کھڑے ہو کر شیو بھی بناتا رہا اور اس سے نظمیں بھی سنتا رہا۔ جب عورت اداس ہو تو اس کی طرزِ ادا بھی بدل جاتی ہے۔ میں اذیت پسند نہیں ہوں لیکن سچ کہتا ہوں کہ اس کی نظمیں اور طرزِ ادا دونوں اچھی لگ رہی تھیں۔

مجھے تیری آتشیں نگاہوں کا وار
اب تک یاد ہے
تیری ایک اُداسی، نظر سے
میرے وجود کا پگھل پگھل جانا
اب تک یاد ہے

وہ تیرے اک ہلکے سے لمس سے
میری رگ رگ میں
شعلے و شرارے بھر دینا
اب تک یاد ہے
وہ چاندنی رات میں
دریا کے کنارے
اُن دو سایوں کا
پانی میں گڈمڈ ہو جانا۔

شاہد دو بجے آ گیا۔ ہم دونوں پھر انڈر گراؤنڈ ریلوں کے جال میں پھنسے ہوئے تھے۔ ہول بورن اسٹیشن زمین کی سطح کے نیچے سب سے گہرا ہے۔ قریباً آٹھ سو فٹ۔ وہاں سے ہم پھر برٹش میوزیم میں گئے۔ سندھو تہذیب چار ہزار سال پرانی ہے۔ سنسکرت کا عروج و زوال، پراکرت، پالی دراوڑ آریہ کی تہذیب کا مخلوط ہونا۔ آرٹ کے کتنے نمونے تھے جن کے آئینے میں ہمیں اپنا ماضی بعید ایک دُھند میں لپٹا ہوا نظر آ رہا تھا۔

باہر نکلے تو ایک اور میوزیم کا راستہ ایک بوڑھی انگریز عورت سے پوچھ بیٹھے۔ اس نے کہا بہت دُور نہیں ہے لیکن میں بتا نہیں سکتی کہ وہ کہاں ہے! ہم تینوں ہنسنے لگے۔ شاہد کو لوگوں کے چہرے دیکھ کر ان کی قومیت بتا دینے میں کمال حاصل ہے۔ وہ فوراً بتا دیتا ہے کہ کون ایرانی، یمنی، عرب، ترکی، پاکستانی، ہندوستانی یا بنگلہ دیشی ہے۔ وہ دو سال تک لیبیا میں بھی رہ چکا ہے۔

ہم نے ایک ٹورسٹ لڑکی کو چلتے چلتے ٹھٹک گئی تھی اس کے بوائے فرینڈ کی پیٹھ پر سوار ہو کر جاتے ہوئے دیکھا۔ ہم دونوں ہنس پڑے تو وہ بھی ہنس پڑی۔ اس کا دوست دانت بھینچے ہوئے چلتا چلا گیا۔

ساڑھے پانچ بجے ہم بُش ہاؤس میں پہنچے تو آلِ حسن اور اونکار ناتھ سریواستوا میرا انتظار کر رہے تھے۔ سریواستوا نے مجھے دیکھتے ہی کہا: "آپ تو کبھی ریلوے میں ملازم تھے۔ لکھنؤ میں؟"

میں نے اُسے بتایا "میں اب بھی ریلوے میں ہوں اور لکھنؤ ہی میں رہتا ہوں"
اس نے لکھنؤ کے کئی ہندی ادیبوں کے نام لئے جنہیں وہ جانتا تھا۔ پھر اس نے کہا۔
"میں آپ سے اُردو کے بارے میں انٹرویو لوں گا۔ یہاں آپ کھُل کر بات کریں گے۔"
میں نے جواب دیا "میں وہاں بھی کھُل کر بات کہتا ہوں۔ میں تو ایمرجنسی کے زمانے میں کبھی نہیں ڈرا تھا"

اسی لمحے ایک خوبصورت، لمبے قد کا نوجوان اندر آ گیا۔ بولا "رام لعل صاحب میں یاور عباس ہوں۔ میرا تعلق میر انیس کے خاندان سے ہے۔ آپ صرف پانچ منٹ کے لئے میرے ساتھ چلے چلئے۔ کچھ لوگ اُردو یونٹ میں آپ سے ملنا چاہتے ہیں"
وہ مجھے اُردو یونٹ میں لے گیا جہاں پاکستان کے لوگ کام کرتے ہیں۔ وقار صاحب جو سیتاپور کے رہنے والے تھے اور ناصری صاحب جو راولپنڈی کے تھے۔ انہوں نے اردو و ہندی سیکشن کے براڈکاسٹنگ آفیسر سے بھی ملایا جو انگریز تھا اور کئی بار ہندوستان

اور پاکستان جا چکا تھا۔ یاور عباس اور وقار صاحب اس سے وی۔ آئی پی روم کی چابی لے کر مجھے وہاں لے گئے جو ایک ویٹنگ روم تھا۔ وقار صاحب نے کہا۔ "آپ کے اور ہمارے پاس بھی زیادہ وقت نہیں ہے۔ ٹرانسمشن شروع ہو چکے ہیں۔ میں آپ سے کچھ سوالات پوچھنے کا سلسلہ شروع کرتا ہوں۔ آپ جواب دیتے جائیے۔"

میں نے سر گھما کر دیکھا، یاور عباس اور وہ انگریز افسر بھی جو ہمارے پیچھے پیچھے چلا آیا تھا ریکارڈنگ ٹیبل پر جا کر کھڑے ہو گئے تھے۔

وقار صاحب کا پہلا سوال تھا۔ "ہندوستان میں اُردو کی موجودہ صورتِ حال کیا ہے؟"

میں نے کہا۔ "بے شک اُردو پر ایک پیغمبری وقت آ پڑا ہے اور موجودہ حکومت نے اس مسئلے کو پھر سے اُنیس سو سینتالیس پر لا کھڑا کیا ہے لیکن ہم نے ہمت نہیں ہاری ہے۔ اُردو کے ہندوستانی اور جمہوری کردار کو برقرار رکھنے کے لئے پوری پوری کوشش کر رہے ہیں اور یہ ثابت کر رہے ہیں کہ اُردو صرف مسلمانوں کی زبان نہیں اور ہندوؤں کے انتہا پسند طبقے کے ذہن سے بھی یہ غلط فہمی دُور کرنے کی برابر کوشش کر رہے ہیں کہ یہ صرف پاکستان کی زبان ہے۔ اگر یہ پاکستان کی بھی زبان ہے تو کیا ہوا۔ ایک دریا ایک ملک سے بہ کر دوسرے ملک میں بھی جا بہتا ہے۔ دونوں ملک ایک ہی دریا سے فیض اٹھا سکتے ہیں۔"

وقار صاحب نے کہا۔ "اور وہاں اُردو کے اخبارات، رسائل اور کتابوں کی اشاعت کی کیا کیفیت ہے؟"

"بہت اچھی ہے۔ اتنے زیادہ اخبارات پہلے نہیں نکلتے تھے جتنے اب نکلتے ہیں اور ان کی اتنی زیادہ اشاعت کا غیر منقسم ہندوستان میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مثال کے طور پر ہند سماچار روزانہ ڈیڑھ لاکھ چھپتا ہے۔ ملاپ پانچ شہروں سے مجموعی طور پر ڈھائی لاکھ اور پرتاب، الجمعیت، دعوت، قومی آواز، انقلاب، سویرا، سیاست، سیاست جدید، آزاد ہند وغیرہ بھی کئی کئی ہزار کی تعداد میں روزانہ شائع ہوتے ہیں۔ رسالوں میں شمع، بیسویں صدی، شبستان، الہدیٰ، ہما وغیرہ بھی قابلِ رشک تعداد میں چھپتے ہیں۔ انہیں دیکھ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ اُردو کی ریڈرشپ بہت زیادہ بڑھی ہے۔ لیکن ادبی رسالوں کی صورت حال وہی ہے جو آزادی سے پہلے تھی۔ کوئی بھی اچھا رسالہ شاعر، شب خون، سطور، آہنگ وغیرہ شاید ہی دو ہزار چھپتا ہو۔ یہی حالت پاکستان میں بھی ہو گی۔ نقوش، اوراق، نیا دور، افکار، سیپ وغیرہ کتنی تعداد میں چھپتے ہیں۔ میں نہیں جانتا۔ میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ سنجیدہ ادب کا قاری دنیا کی ہر زبان میں بہت کم تعداد میں ہے۔ یہی حال اچھی کتابوں کا ہے اور یہ مسئلہ ہمارا آپ کا ایک جیسا ہے۔"

وقار صاحب نے آخری سوال ہندوستان میں ادبی سرگرمیوں کے بارے میں کیا۔ جس کے جواب میں میں نے کہا۔ "ہمارے یہاں ادبی جلسے ہر شہر میں ہوتے رہتے ہیں جہاں اُردو کے ادیب اور شاعر موجود ہیں۔ یونیورسٹیوں میں ادب کے مختلف موضوعات پر سیمینار بھی ہوتے رہتے ہیں۔ اب پہلے سے زیادہ اچھی بحثیں ہوتی ہیں لیکن مشاعرے زیادہ مقبول ہو گئے ہیں۔ لوگ ہزاروں کی تعداد میں جمع ہو جاتے ہیں۔ جو شاعر بہت مقبول ہیں۔ وہ ہوائی جہاز سے سفر کر کے پہنچتے ہیں اِنہیں معاوضہ بھی اچھا مل جاتا ہے۔"

پورا انٹرویو سوا چھ منٹ تک چلا تھا۔ یاور عباس اور وقار صاحب مجھے آلِ حسن کے کمرے تک پہنچا گئے جنہوں نے ایک بڑی یونٹ سے اجازت لے کر مجھے وہیں بٹھا دیا اور اونکار ناتھ سریواستوا نے سوالات شروع کر دیئے۔ اُردو اور ہندی کے مسائل، آزادی کے بعد اُردو کی مقبولیت کے اسباب، اُردو کے ساتھ ناانصافی کی صحیح نوعیت، زبان اور اظہار کی آزادی کی صورتِ حال وغیرہ وغیرہ۔

یہ انٹرویو زیادہ تناؤ پیدا کرنے والا ثابت ہوا۔ کیونکہ سریواستوا ہندی زبان سے تعلق رکھتا تھا۔ اگرچہ اُردو بھی بہت اچھی بول لیتا تھا۔ میں نے جب ترقی پسند ہندی ادیبوں کی بزدلی کا ذکر کیا جن میں کملیشور کا بھی ذکر آگیا کہ وہ لوگ اُردو زبان کی زبانی ہمدردی کرتے ہیں۔ عملی طور پر ہمارے ساتھ نہیں کھڑے ہوتے تو بحث زیادہ سنجیدہ ہوگئی اور اس کی ذمہ داری حکومت پر کم اور ادیبوں پر زیادہ عائد ہوگئی کہ وہ دراصل فراخ دل واقع نہیں ہوئے ہیں اور حکومت کے غلط فیصلوں کے ساتھ ٹکرانے کی ہمت بھی نہیں دکھاتے۔

انٹرویو ختم ہوجانے کے بعد آل حسن اور سریواستوا دونوں مطمئن تھے کہ میں نے صاف صاف کہہ دینے سے گریز نہیں کیا تھا۔ پونے سات بجے کے قریب شاہد اور میں وہاں سے نکل کر ٹیوب کے ذریعے پاڈلی چلے گئے۔ شاہد کا اصرار تھا کہ وہ مجھے ایک عرب ہوٹل میں کھانا کھلائے گا جہاں کے کباب ایک خصوصیت رکھتے تھے۔ وہاں لڑکیاں تو ملازم نہیں تھے لیکن گاہکوں میں وہ کافی تعداد میں موجود تھیں ایک افریقی اپنے سامنے رکھی ہوئی گوشت کی انواع و اقسام کی پلیٹوں کو بھول کر ایک گوری لڑکی کو بھوکی نظروں سے دیکھنے میں مصروف تھا۔ خوبصورت نوعمر ویٹر گاہکوں کی حرکتوں کو یکسر نظر انداز کرکے پلیٹیں رکھنے اور اٹھانے میں مصروف تھے ہم نے خوب سیر ہوکر کباب کھائے اور چائے پی اور سترہ پونڈ کا بل ادا کرکے باہر چلے گئے۔ ہوٹل ہمارے یہاں کے ۵ اوسط درجے کے ڈھابوں سے اونچا نہیں تھا لیکن ہندوستانی سکّے کے حساب سے اڑھائی سو روپے کا بل یقیناً زیادہ تھا۔

۱۶ ستمبر

شاہد دن میں گیارہ بجے ہی آگیا۔ آج اُس نے میرے لئے چُھٹی لے لی تھی۔ کیونکہ یہ میرا لندن میں آخری دن تھا۔ میں لندن میں کتنی جگہیں نہیں دیکھ سکا تھا۔ دیکھ بھی نہیں سکتا تھا۔ پروفیسر رسل اور پروفیسر ڈیوڈ میتھیوز دونوں لندن سے باہر گئے ہوئے تھے۔ ساقی فاروقی کا بھی پتہ نہیں چل سکا تھا۔ عابد نقوی نے جو لندن میں مقیم ہے، میرے خط کا نہ تو جواب دیا تھا نہ ہی وہ مجھ سے ملنے آیا تھا۔ ہندستان میں لوٹ آنے کے بعد اس کا ایک خط آیا کہ اُسے میرے لندن جانے کی اطلاع چاولہ سے بہت بعد میں ملی۔ اور اس نے شکایت کی کہ میں اس کے گھر کیوں نہیں چلا آیا) ڈائریکٹری میں اس کا فون نمبر نہیں ملا تھا۔ اس کی کچھ کہانیاں میں نے رسالوں میں شائع کرائی تھیں۔ اب وہ برابر رسالوں میں لکھتا رہتا ہے۔ قیصر تمکین اور مشیر علوی دونوں لندن سے کئی سو میل دُور ساؤتھ ویلز میں مقیم تھے۔ نہ وہ آسکے نہ ہی میں ان کے پاس پہنچ سکا۔

ہم پھر ٹیوب میں بھیڑ بھاڑ کے درمیان تھے۔ ساری قومیتوں کے لوگوں کے درمیان جو لندن کے مختلف گوشوں سے دن بھر آتے اور واپس جاتے رہتے تھے۔ شاہد مجھے بتاتا رہا۔ زیادہ تر ہندوستانی ساؤتھ ہال میں مقیم ہیں، پاکستانی والتھم سٹو میں، کشمیری پاکستانی بریڈ فورڈ، بنگالی آرڈگیٹ الیسٹ میں، گجراتی اور کچھی ویمبلے اور عرب گلاسٹر روڈ کے علاقے میں۔ انسان اپنے ملک کے اندر اور باہر ہر جگہ اپنی تہذیب اور تمدن کے غار میں گھُس کر رہنے کا عادی ہے۔ وہ ہر جگہ خوفزدہ ہے۔ جب تک وہ عشق نہیں کرتا اسی طرح چُھپا چُھپا رہتا ہے عشق ہی اسے بہادر اور نڈر بنا دیتا ہے اور عشق سب لوگ نہیں کرسکتے۔

ہم چاہتے تھے شام کا کھانا کسی ہندوستانی یا پاکستانی ہوٹل میں جاکر کھاتے۔ گیلارڈ، ہولی کاؤ۔ اور ریٹ، سیلز یا شیزان میں۔ لیکن چاند گل نے صبح سویرے ہی فون کرکے بتا دیا تھا کہ ہمیں شام کا کھانا ان کے اور مہندر گل کے ساتھ کھانا ہوگا۔

شاہد مجھے میڈم تساؤ کا میوزیم دکھانے کے لئے بیکر اسٹریٹ پر لے گیا۔ لندن میں خاص قسم کے موم سے ڈھالے ہوئے بُتوں کا یہ میوزیم مقامی اور بیرونی ٹورسٹوں کے لئے خاص کشش رکھتا ہے۔ اس میں قومی اور بین الاقوامی شہرت کے بے شمار سیاستدانوں، ایکٹروں، کھلاڑیوں اور بادشاہوں و جرنیلوں کو ہو بہو شکلوں میں دیکھا جا سکتا ہے اور انہیں دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ وہ ہمارے سامنے بالکل زندہ کھڑے یا بیٹھے ہوئے ہیں۔ اسٹالین، چرچل، پکاسو، گاندھی، ہنری ہشتم اپنی چھ ملکاؤں کے ساتھ، الزبتھ اول، کوئن وکٹوریہ، لینن۔ جان کینیڈی، محمد علی جناح، پوپ، تیشوراں، شاہِ ایران، نہرو، لُوئی گریک، رچرڈ برٹن، آڈرے ہیپ برن، مارلین منرو، ہمفری بوگرٹ وغیرہ اس گیلری میں ایک چیمبر آف ہارر بھی ہے۔ جس کے گیٹ پر ہٹلر کی مورتی نصب ہے۔ اس چیمبر میں دنیا کے سفاک ترین مجرموں، اُن کے گردن اڑانے کے مناظر اور جنگ کی ہولناکیاں پیش کر دی گئی ہیں جنہیں دیکھ کر واقعی دل دہل جاتا ہے اور ذہن پر سے یہ اثرات دُور کرنے کے لئے ایک سین خوابیدہ حُسن کا بھی پیش کر دیا گیا ہے۔

شام کو چار بجے ہم ہاؤنسلو ویسٹ اسٹیشن پر پہنچے تو چاند گل اپنے شوہر اور بیٹے نِکی کے ساتھ ہماری منتظر تھی۔ وہ لوگ ہمیں ساؤتھ ہال کے ایک ہوٹل میں لے گئے جہاں ہمیں بے شمار پنجابی (ہندوستانی و پاکستانی) ملے۔ وہاں چھولے، نان، پکوڑے، چکن، جلیبیاں اور برفی وغیرہ مٹھائیاں موجود تھیں۔ مہندر گل نے ایک بہت بڑی میز پکن، سیخ کباب، چکن کے تکے، نان اور کوکا کولا کی بوتلوں سے بھر دی۔ اتنے پُر تکلف کھانوں کو دیکھ کر ہماری بھوک بھی سچ مچ بڑھ گئی اور ہم نے کسی اور موضوع پر بات چیت کرنے کی بجائے پہلی بار صرف کھانے کی طرح توجہ صرف کی۔

مہندر گل کو ہیتھرو ایئر پورٹ پر کسی کو سی آف کرنا تھا۔ وہ مجھے چاند اور شاہد کو میرے ہوٹل میں چھوڑ کر وکی کے ساتھ واپس چلا گیا۔ ہم لوگ ہوٹل کے کمرے میں چاند سے اُس کے افسانے اور نظمیں سنتے رہے۔ اس کے پاس قرۃ العین حیدر، خوشونت سنگھ اور کملیشور کے بھی رف لکھے ہوئے انٹرویو تھے۔ شاہد کبھی کبھی اچانک اٹھ کر فلیش گن سے فوٹو اتار لیتا تھا۔ وہ آج پوری فلم ختم کر لینا چاہتا تھا۔ نو بج گئے تو ہم ٹی وی پر محمد علی کلے کی جیت کی فلم دیکھنے میں محو ہو گئے۔ جو ایک گھنٹہ تک چلی۔ ساڑھے دس بجے مہندر گل واپس آ گیا اور چاند گل کو ساتھ لے گیا۔ یہ ہماری الوداعی ملاقات تھی۔ میں نے اُنہیں نیچے سڑک پر جا کر سی آف کیا۔ اُن کے ساتھ جتنا بھی وقت گذرا تھا بہت اچھا گذرا تھا۔ اور ہم سب خوش تھے۔ شاہد بھی کچھ دیر کے بعد چلا گیا۔ یہ وعدہ کر کے کہ وہ صبح سویرے پھر آ جائے گا اور مجھے لوٹن ایئر پورٹ تک سی آف کرنے کے لئے ساتھ جائے گا۔

میں اکیلا رہ گیا تو بہت عجیب سا لگا۔ سونا سونا سا۔ جیسے بالکل اچانک یہاں کی ہر چیز مجھ سے رشتہ توڑ بیٹھی ہو۔ میں نے جگدیش گلاٹی اور مسز گلاٹی کو فون کر کے اُن سے پھر نہ مل سکنے کی معافی مانگی تو اس وقت بھی مجھے اپنے ـــ الفاظ خالی سے لگے چاند نے چلتے وقت کہا تھا میں اوسلو کے سیمینار سے فارغ ہو کر پھر واپس آ جاؤں۔ وہ تب تک نئے مکان میں شفٹ ہو جائیں گے وہ مجھے ایک الگ کمرہ دے سکے گی۔ مجھے ہندوستان واپس جانے سے پہلے پیرس ضرور جانا چاہئے۔ یہاں آنے کا موقعہ مجھے پھر نہیں مل پائے گا۔ میں اُسے واضح جواب نہیں دے سکا تھا کیونکہ میں اب گھر لوٹ جانے کے لئے ایک بیقراری محسوس کرنے لگا تھا۔ میری بیوی نے ایک خط میں مجھے لکھا تھا۔ "آپ نے جو تصویریں بھجوائی ہیں انہیں دیکھ کر ایسا لگتا ہے آپ کافی مستیاں مارتے پھرتے ہیں۔ لیکن آپ کے بچے بہت اداس رہنے لگے ہیں۔ کرن تو چھپ چھپ کر رو لیتی ہے۔"

میں کتنی دیر تک کمرے کے وسط میں کھڑا ادھر اُدھر دیکھتا رہا۔ میری چیزیں سوٹ کیس اور بریف کیس کے اندر پیک ہو چکی تھیں۔ ٹی وی، کپ بورڈ، ٹیلی فون، ریڈیو، آئینہ، رائٹنگ ٹیبل، ہر چیز سے جیسے میرا اب کوئی تعلق ہی نہ رہا ہو۔ یہ سارا تعلق صرف ایک ہفتے کے لیے تھا اور کرائے کا۔ یہ ساری راحت اور خوشی عارضی تھی۔ یہ ساری چیزیں مجھ سے پہلے بھی بے شمار لوگوں کو راحت اور خوشی بہم پہنچا چکی تھیں۔ آئندہ بھی پہنچاتی رہیں گی۔ ایک کرائے کی عورت کی طرح لیکن وہ عورت بھی کس قدر عظیم ہے، قابلِ احترام ہے اور یہ پورا شہر کیا ہے؟ جسے میں نے جاننے کی بھرپور کوشش کی تھی۔

میں نے نائٹ سوٹ پہنا اور لائٹ آف کر کے دھیرے سے بستر میں سرک گیا۔ یہ آخری رات ہے۔ بستر کی نرمی اور گداز اور کمبلوں اور پردوں سے پھوٹنے والی ایک مخصوص گرمی اور خوشبو۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر اندھیرے میں ریڈیو کی ناب ڈھونڈ لی لیکن شہر کہیں بھی جاگتا ہوا محسوس نہ ہو سکا۔ کسی اسٹڈیو میں پہلے سے ٹیپ کی ہوئی آواز میں کوئی عورت بڑی اداس آواز میں گا رہی تھی۔

۷ ستمبر

صبح ساڑھے پانچ بجے آنکھ کھلی۔ چھ بجے میں نے بستر چھوڑ دیا۔ سات بجے تک نہا دھو کر تیار ہو گیا۔ اسی وقت شاہد کا فون آ گیا۔ "اتوار کی وجہ سے ابھی ٹیوب سروس اور بسیں بند ہیں۔ کچھ دیر بعد شروع ہوں گی، تب تک آپ ہوٹل سے جا چکے ہوں گے۔ اب فون پر ہی خدا حافظ کہہ سکتا ہوں۔ آپ سے میں نے بہت کچھ سیکھا ہے۔ آپ افسانہ نگار کے علاوہ بھی بہت کچھ ہیں۔ اوسلو سے اور ہندوستان سے ضرور خط لکھئے گا اور ملتان بھی ضرور آیئے گا۔ اکتوبر میں مجاہد بھائی کی شادی میں۔"

میں نے اُسے بتایا "مجھے معلوم ہے۔ ویزا مل گیا ہے ضرور آؤں گا۔ اور مجاہد نے میرے ساتھ وعدہ کر رکھا ہے وہ ہنی مون ہندوستان میں آ کر منائے گا۔ میں اس کی دلہن اور اس کے لئے لکھنؤ کے سب سے بڑے ہوٹل میں کمرہ بُک کرا دوں گا اور۔ تم بہت اچھے لڑکے ہو۔ تم نے میری بڑی خدمت کی۔ میں تمہارے ساتھ ساتھ رہ کر بہت خوش رہا اتنا کہ بیان نہیں کر سکتا۔ یوں تو انسان کا انسان کے ساتھ روح کا رشتہ ہوتا ہے لیکن میں اسے اُردو زبان کی دین سمجھتا ہوں جس میں لکھتا ہوں اور یہ اسی کی بدولت ہے کہ تم بھی مجھے مل گئے۔ زندگی کے ایک ایسے موڑ پر جو پہلے سے تصور میں بالکل نہیں تھا۔ شاید اسی لئے تم سے مل کر مجھے بہت زیادہ خوشی ہوئی۔ خدا تمہیں ہر امتحان اور آزمائش میں کامیاب کرے۔ مجھے اطلاع دیتے رہنا جب بھی تم کوئی کامیابی حاصل کرو۔ لو ہماری بس سامنے آ کر رُک گئی ہے۔ اچھا خدا حافظ۔"

جب ہماری بس ہمیں کنسنگٹن ہوٹل سے لے کر اولیور کے سامنے رُکی تو وہاں ایلیس سے پھر ملاقات ہو گئی۔ وہ اپنے سامان سمیت سیدھی میرے پاس آ بیٹھی۔ پہلے کی طرح شگفتہ اور مسکراتی ہوئی۔

"رات کو خوب اچھی طرح سوئے؟"

"زیادہ نہیں۔"

"میں بھی پوری طرح نہ سو سکی۔ گھر پہنچ کر خوب سوؤں گی۔" وہ کھل کھلا کر ہنس پڑی۔

پیچھے سے عبدالرزاق نے اچانک سلام علیکم کہہ کر مخاطب کیا تو ہم دونوں اُس کی طرف مڑ کر دیکھنے لگا۔

ہوائی اڈے تک پہنچتے پہنچتے ہم اپنی چھوٹی چھوٹی خریدی ہوئی چیزوں کے بارے میں باتیں کرتے گئے۔ ان تمام جگہوں کے بارے میں بھی جو ہم الگ الگ رہ کر دیکھ سکے تھے۔ اور پھر یہ مشترکہ تصور۔ کہ لندن بہت بڑا ہے، بہت بڑا ہے! انگریز تو لندن میں رہتا

ہی نہیں اب ۔ وہ کاؤنٹر میں رہتا ہے۔ لندن میں صرف باہر کے لوگ رہتے ہیں!"

ہماری فلائیٹ نمبر ۲۵۲ تین گھنٹے لیٹ تھی۔ آج سردی بھی زیادہ تھی۔ سیون ڈگری اور ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ ہم لوگ جلدی جلدی سامان بُک کرا کے اور پاسپورٹ چیک کرا کے لونج میں جا بیٹھے۔ یہاں کتنی میزوں پر گیا۔ کتنے لوگوں سے ملا۔ جو ہمارے ساتھ ایک ہفتہ پہلے اوسلو سے آئے تھے۔ اب میرے ساتھ ہی لوٹ رہے تھے۔ شناسا چہرے آمنے سامنے ہوتے ہی اپنے آپ مسکرانے لگتے ہیں۔ کچھ دیر دھوپ میں بھی جا کر بیٹھا۔ پھر جہاز آگیا اور اس میں سوار ہو گئے تو جہاز کے عملے کی طرف سے دی جانے والی حسبِ معمول معلومات دس ڈگری پر انتیس ہزار فٹ کی اونچائی پر پرواز۔ پانچ سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے آپ سے کیپٹن کلبران مخاطب ہے۔ میرے ساتھ سکینڈ پائلٹ ایس رولف ہے اور ایئر ہوسٹسوں کے نام ہیں ۔ ۔ یس ایلوے، ای جونی اور دی۔ راس مورس۔ میری سیٹ سب سے پیچھے لیکن ایئر ہوسٹسوں کے آگے تھی۔ میرے ساتھ دو معمر عورتیں بیٹھی تھیں جو بہت خاموش تھیں۔ ایلس کو کہیں آگے سیٹ ملی تھی۔ عبدالرزاق میرے آگے کی قطار میں تھا۔ لیکن میری دوستی سامنے کی قطار کے سرے پر بیٹھے ہوئے گوا کے ایک ڈی۔ سوزا کے ساتھ ہو گئی جو کراچی سے آکر نارتھ ناروے میں بس گیا تھا۔ اس کے ساتھ اس کی نارویجین گرل فرینڈ بھی تھی جو کُرسی کی پُشت کے ساتھ سر لگا کر سو گئی تھی۔ وہ کسی آفس میں کام کرتی تھی۔ دونوں ایک مدت سے بنا شادی کے ساتھ رہ رہے تھے بقول اس کے وہ بہت خوش تھا اگرچہ اُس کے چہرے پر ایسی کوئی علامت موجود نہیں تھی۔ وہ ایک درمیانے قد کا سانولا اور گنجا اور سنجیدہ انسان تھا۔ وہ اپنی گرل فرینڈ کو دو بار وطن لے جا چکا تھا۔ اُس کا ایک بھائی بمبئی میں ایئر انڈیا میں مکینک ہے اور ایک بھتیجی کراچی میں عربیئن ایرلائنز میں ایئر ہوسٹس ہے۔

معمر عورتوں نے مجھے دو بار مفت ملنے والی ریڈ وائن کی چھوٹی چھوٹی بوتلیں دے دیں۔ میں نے چاولہ کے لیے لانگ جان کی ایک بوتل خریدی اور مجاہد کے لیے ڈن ہل سگریٹوں کا ایک کارٹن ۔ وہ خود سگریٹ نہیں پیتا۔ صرف دوستوں کو بانٹنے کے لیے اپنے پاس اسٹاک میں رکھتا ہے۔ دوپہر کا کھانا ہمیں جہاز میں ہی دیا گیا۔ حسبِ معمول صاف ستھرا اور بے ذائقہ۔

اوسلو ایئر پورٹ پر پہنچ کر ایلس سے ایک اور ملاقات ہوئی۔ جب میں بس میں بیٹھا تھا وہ عبدالرزاق کو ساتھ لے کر اندر آئی اور مجھے دیکھ کر بولی۔ "لو یہ رہا تمہارا پاکستانی فرینڈ!" اور پھر شرارت سے مسکرائی اور بائی بائی کہتی ہوئی ـــ الگ سیٹ پر جا کر بیٹھ گئی۔ اور پھر یہ بھی کہہ گئی: "مجھے فون ضرور کرنا۔ جب بھی وقت ملے"

ساس ہوٹل کے سامنے مجاہد اور چاولہ میرے منتظر تھے۔ دونوں نے مجھے ایک ساتھ گلے سے لگا لیا اور دونوں نے ایک ساتھ مجھے اپنے اپنے پروگرام سے آگاہ کرنا شروع کر دیا۔ اس وقت ہم ترونہائم دیشن جا رہے ہیں۔ وہاں چائے پئیں گے۔ شام کا کھانا چرن سنگھ کے گھر ہوگا۔ رات کو خالد حسین کے گھر بھی جانا ہے۔ پاکستان کا پنجابی شاعر!

جزیرہ

ذوالفقار احمد تابش

اور مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میرا آدھا وجود وہیں رہ گیا ہو۔

بس کولمبو کی طرف جا رہی تھی

کینیڈی پیچھے رہ گیا تھا۔

میرا پیچھے رہ گئی تھی۔

میرے ساتھ والی نشست خالی تھی۔

تھوڑی ہی دیر پہلے وہ وہاں بیٹھی تھی۔ اس کی خوشبو ابھی تک وہاں موجود تھی۔ اس کا سایہ ابھی تک وہاں قائم تھا۔ اس کی دھیمی دھیمی بجل کو مل اور دل پر اثر کرنے والی باتیں ابھی تک وہاں تتلیوں کی طرح تیر رہی تھیں۔ میں اس کی موجودگی کو محسوس کر رہا تھا اور اپنے آپ کو یقین دلا رہا تھا کہ وہ ابھی یہیں ہے۔ لیکن وہ وہاں نہیں تھی یا شاید وہیں تھی۔

منیر نے کئی بار مجھے متوجہ کرنے اور مجھ سے گپ لگانے کی کوشش کی۔ شاہ نے چند جملے چست کئے۔ ہارون نے سیٹی بجا کر مجھے زچ کرنا چاہا لیکن میں کسی اور ہی جہاں میں تھا، جہاں میں کچھ محسوس کر رہا تھا۔ خوشبو کو چھونے، جذب کرنے اور سمیٹنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اتھلے اور گہرے پانیوں میں تیر رہا تھا، رنگوں کو تھامنے کی سعی کر رہا تھا۔

تب وہ خاموشی سے نکل کر پھر میرے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ میں نے کوئی تعرض نہ کیا۔ کئی لمحوں تک وہ خاموش بیٹھا رہا۔

"تم تو سنجیدہ لگ رہے ہو" وہ بولا۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا۔

"اس سنجیدگی سے حاصل کیا ہوگا؟" اس نے پوچھا

میں نے پھر بھی کچھ نہ کہا۔ میرے ہر طرف اندھیرے پھیل رہے تھے۔

"تم پردیس میں ہو اور پردیسی ہو" وہ پھر بولا۔

میں اب بھی کچھ نہ بولا۔ وہ بھی خاموش ہو گیا اور میری آنکھوں میں جھانکنے لگا۔ میرے دل کو ٹٹولنے لگا۔

"خوشبو بھی کبھی کسی کے ہاتھ آئی ہے۔ پاگل پن چھوڑ دو" چند لمحوں کے بعد اُس نے پھر کہا۔

"دیکھو سب لوگ کتنے خوش ہیں۔ تم اپنے اوپر کیوں یبوست طاری کر رہے ہو؟"

"خدا کے لئے چُپ ہو جاؤ" میں نے کہا "تم ہمیشہ میرے لئے زخموں پر نمک پاشی کرتے ہو۔ دُکھ دیکر خوش ہوتے ہو" میں کہتا چلا گیا اور

وہ خاموشی سے سنتا رہا۔

"مجھے تم سے ہمدردی ہے" اس نے مختصر سا جواب دیا۔

میں کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ اندھیرے سائے پہاڑوں اور چٹانوں سے اُتر کر نیچے آ رہے تھے۔ وہ میرے پاس بیٹھا میری دلجوئی کر رہا تھا۔ اس کی آواز میں ہلکا سا ارتعاش تھا اور یوں لگ رہا تھا جیسے وہ سچے دل سے بول رہا ہے۔ مجھے خود اس پر اور اپنے آپ پر ترس آنے لگا۔

تب مجھے یاد آیا کہ ایک بار پہلے بھی ایسے ہی ہوا تھا لیکن وہ اس وقت دل گرفتہ تھا اور میں اس کی دلداری کر رہا تھا۔

وہ نیا نیا جب لاہور آیا تو ابھی اس کے دل کا پہلا زخم تازہ تھا۔ کچی عمر میں اس نے جو چوٹ کھائی تھی وہ اس کے لئے بڑی اذیت ناک تھی۔ اس کا جسم تو یہاں تھا لیکن جان وہیں تھی جہاں وہ عربدہ جُو رہتی تھی جس نے پہلے دھنک کے رنگ بکھیر کر یکلخت تاریکی پھیلا دی تھی۔ اب اب وہ اس کی نقش گری کرتا اور اس کے بیرے سے گفتگو کیا کرتا تھا لیکن عمر کے جس حصے میں وہ تھا اس میں عشق کا تجربہ جان کا عذاب بن جاتا ہے۔ ساری کی ساری حسیں اس الم کی زد میں آ جاتی ہیں۔ انسان باہر سے منقطع ہو کر اپنے اندر پناہ لے لیتا ہے۔ دل کے معبد میں ایک مورتی سجا کر اس کی پوجا میں سارا جہان تیاگ دیتا ہے۔ لہو میں بیراگ کی زردی گھلتی ہے اور ہر آن آدمی مرتا اور جیتا ہے۔

اس کا عالم ان دنوں کچھ ایسا ہی تھا۔

تب یوں ہوا کہ اچانک ہی اس کی زندگی میں ایک اور شام ڈھلی اور ایک اور صبح طلوع ہوئی۔ ایک صبح اس کی ماں اسے ایک گھر میں لے گئی۔ ماں نے کہا تھا "آؤ تمہیں اچھے لوگوں سے ملواؤں۔ ان سے جو دکھ میں دلجوئی کرتے ہیں۔ انہوں نے میری اس وقت دلجوئی کی تھی جب مجھ پر ایک بُرا وقت آیا تھا"

ماں کی بات سچ نکلی۔ اس گھر میں اسے بھی ایک دلجوئی کرنے والا مل گیا۔

اس کی پہلی ہی ملاقات بڑے معرکے کی تھی۔

وہ صحن میں کھڑا آنکھیں پٹپٹا کر اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک وسیع اور فراخ حویلی تھی اور اس کے در و دیوار اس کے مکینوں کی امارت کی گواہی دے رہے تھے۔ صاف چکنے فرش آئینوں کی طرح چمک رہے تھے۔ اندر بڑے اونچے سُروں میں ریڈیو بج رہا تھا۔

وہ سنتا رہا۔ جلال اور جمال کی کیفیتوں میں اُلجھتا رہا کہ یکایک وہ برآمدے سے نمودار ہو کر عین اس کے مقابل آن کھڑی ہوئی۔ پتلی دُبلی، سانولی، گہری اور چپ چاپ آنکھوں والی ایک لخت اس کو یوں قریب دیکھ کر وہ گڑبڑا گیا۔ اور کچھ نہ سوجھا تو اسے ہاتھ اٹھا کر بڑے ادب اور سلیقے کے ساتھ سلام کر دیا۔ اس نے مسکرا کر ملائمت سے سلام کا جواب دیا۔ سر سے پاؤں تک ایک عجیب شرارتی نظروں سے اس کا جائزہ لینے کے بعد وہ باورچی خانے میں گھس گئی۔ وہ اپنی عرق آلود پیشانی پونچھنے لگا۔ بڑے بے ڈھنگے پن سے۔

جب وہ باورچی خانے سے باہر نکلی تو اس کے ساتھ اس کی چھوٹی بہن بھی تھی۔ دونوں نے ایک بار پھر اسے مضحکہ خیز نظروں سے دیکھا۔ یوں جیسے وہ ایک عجوبہ چیز ہو۔

"تم چاچی کے بیٹے ہو؟" چھوٹی نے پوچھا۔ مزید سانولی۔ زیادہ شریر۔ اس نے سر ہلا کر گواہی دی۔ دونوں کھکھلا کر ہنس پڑیں۔ کانسی کی کٹوریاں مضحکہ خیز گھورتی ہوئی آنکھیں چلی گئیں۔ اس کی ٹانگیں جیسے کانپنے لگیں۔ ہمت جواب دے گئی اور وہ بھاگ گیا۔

بہلانے بہلنے ہونے والی ان کی ملاقاتیں رنگ لائیں۔ وہ بڑی مہربان نکلی اس نے بڑی بے جگری سے اس کا ساتھ دیا۔ اس کے زخموں پر مرہم

رکھا۔ لفظوں کے ساتھ اس کی ڈھارس بندھائی، اس کی چوٹوں کو سہلایا۔ اسے تسلی دی۔

لیکن ایک تماشہ اور ہوا۔ اُسے جب ڈھیر ساری محبت کی دولت ملی تو جیسے وہ بہت تیز، اور اونچا اُڑنے لگا۔ عاشقی کے ساتھ ساتھ اس میں ایک شیوۂ معشوقی بھی سر اٹھانے لگا۔ اس کا اندازِ دلبری نخوت کو چھونے لگا۔ محبت کی ایک چنچل اور پُرشور ندی کے کنارے پہنچ کر اس نے چاہا کہ ندی خود اس کی پیاس بجھائے اور شاید یہی ہوا۔ لیکن جوں جوں اس کی مہربانیاں بڑھتی گئیں اس کی عشوہ طرازیاں پرورش پاتی گئیں۔ وہ بھی دلداری اور عاشقی سے پیچھے نہ ہٹی، بہت الزام سہے۔ طعنے سنے۔ سکھیوں نے بہت ہنسی اڑائی۔ بہت بات پھیلی مگر وہ ہنس کر سہہ گئی۔ ایک سرشاری میں آگے ہی آگے بڑھتی گئی۔ یہ اُوپر ہی اُوپر اٹھتا گیا۔ ایک کی حرکت افقی تھی تو دوسرے کی عمودی۔

میں نے باہر دیکھا۔ سورج دُور کہیں درختوں کی اوٹ میں تھا اور مغرب کی جانب سے نارنجی روشنیاں پھوٹ رہی تھیں۔ سڑک کے دو رویہ کھڑے ناریل اور کیلے کے درختوں پر یہ روشنیاں عجیب طور پر جھلملا رہی تھیں۔ گنگ کو کونٹ کے ساتھ لٹکتے ہوئے بڑے بڑے پھل پہلے ہی نارنجی تھے اب ان کا رنگ اور بھی شوخ ہو گیا تھا۔ پہاڑی علاقہ اب بتدریج ختم ہو رہا تھا اور ہم نسبتاً کھلے اور ہموار راستے پر آگئے تھے۔

بس ایک چھوٹے سے قصبے میں رُک گئی۔ ساتھ ہی لڑکوں اور لڑکیوں نے بس پر ہلّہ بول دیا۔ وہ کاجو، نارنگی، ناریل، پھل، چپٹی فروٹ اور ناریل بیچ رہے تھے۔ ان کے شور سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ ہم لوگ ان سے بچتے بچاتے نیچے اُتر آئے۔

"بچو، پندرہ منٹ تک واپس آجانا" یہ مسٹر مہا کی آواز تھی۔

"او کے سر!" ہارون نے نعرہ لگایا اور مجھے ہاتھ سے پکڑ کر گھسیٹ لیا۔

"کچھ کھاؤ پیوگے؟" اس نے پوچھا

"ہاں یار پیاس تو لگ رہی ہے"

"شاہ! آؤ ادھر کچھ پی لیں"

"کیا پلاؤ گے۔؟" اس نے بھوری مونچھیں پھڑپھڑاتے ہوئے ہماری طرف جھک کر پوچھا۔

ہارون نے میری طرف دیکھا اور بولا "یہ سمجھتا ہے کہ ہم انٹرکون کے بار میں بیٹھے ہیں۔ یہاں تو کوکونٹ کے پانی کے علاوہ کچھ نہیں ملے گا"

"سن میری بات سن" شاہ چلایا۔ "اس سے بہتر ہے کہ کچھ مت پیا جائے۔ سادہ پانی یا کوکونٹ سے پیاس بجھانا، پیاس کی توہین ہے۔"

"سمجھتا کیوں نہیں" ہارون نے احتجاج کیا "ہم سفر میں ہیں۔ یہاں کچھ نظر آرہا ہے تجھے؟" ہارون نے چاروں طرف انگلی گھما کر کہا۔

"ہاں" شاہ نے سرگوشی کی۔ "ادھر دیکھ وہاں تاڑی ملے گی"

"یار میں تو نہیں پی سکتا۔ اور تو جانتا ہے یہ تابش کا بچہ۔ یہ ملّا بھی تو ہمارے ساتھ ہے؟"

"اسے رفع کرو۔ تم مجھے تاڑی پلا دینا۔ خود جو جی چاہے پینا"

سرکنڈے اور بانس کے بنے ہوئے اس جھونپڑے کا تھوڑا چڑھاؤ کر جب ہم "بار" میں پہنچے تو ایک ضعیف العمر سنہالی عورت نے ہمارا استقبال کیا۔ شاہ نے اپنا مدعا بیان کیا لیکن وہ بیچاری ہمارا مدعا سمجھنے سے قاصر تھی۔ ننگ دھڑنگ بچے ہمارے گرد جمع ہو گئے تھے۔ ان میں سے کچھ اشاروں سے خیرات مانگ رہے تھے اور زور زور سے چیخ رہے تھے۔ کچھ آپس میں اس بات پر الجھ رہے تھے کہ پہلے اُسے خیرات ملنی چاہیئے۔ ہارون اور شاہ ہاتھوں کے اشارے سے بڑھیا کو سمجھانے کی سرتوڑ کوشش کر رہے تھے لیکن ابھی کوئی امکان کمیونیکیشن کا پیدا نہیں ہوا تھا۔

"کہیں اور چل کر ڈھونڈو یار۔" ہارون عاجز آگیا۔

شاہ نے اس کی طرف بڑے جلال کے ساتھ دیکھا اور بولا، "دیکھتا نہیں یہ سالخوردہ بیچاری بڑھیا ہماری مدد کی مستحق ہے۔ خریداری اسی سے ہوگی۔"

ہارون نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ میں اس ساری کارروائی سے لاتعلق سا ہو کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔

بسوں کا وہ ایک چھوٹا سا اڈا تھا اور اس کے پیچھے آبادی تھی۔ بانس اور گھاس پھونس کے بنے ہوئے جھونپڑے دُور دُور تک پھیلے ہوئے تھے کہیں کہیں ہلکا ہلکا دھواں اٹھ رہا تھا۔ ظاہر ہے کھانا پکائی ہو رہی ہوگی۔ جھونپڑوں کے جھرمٹ میں ناریل اور کیلے کے درخت سرکشیدہ کھڑے تھے اور اڈے پر بسوں کے گرد شور مچا ہوا تھا۔ ایک ایک بس کے گرد پندرہ بیس لڑکے اور لڑکیاں کاجو اور پیشن فروٹ ہاتھوں میں لیے چیخ رہے تھے۔

مجھے گوجرانوالہ کا بسوں کا اڈا یاد آگیا۔ یہی عالم۔ یہی حال۔ یہی شور۔

"ریڈ بلڈ ای جے مالٹے۔ ٹھنڈیاں گنڈیریاں چار چار آنے، کھیلاں مرمرے۔"

"ایشیا زندہ باد۔"

"ہم سب ایک ہیں۔"

"کاجو، کوکونٹ، کنڈیریاں، مالٹے، چار چار آنے۔" "زندہ باد، مردہ باد۔ آوے ای آوے، جاوے ای جاوے۔"

معلوم ہوا کہ شاہ اس بڑھیا تک اپنا مدعا پہنچانے میں کامیاب ہوگیا ہے۔ معلوم اس وقت ہوا جب اس نے تاڑی کے لمبے لمبے، لبریز اور جھاگ اڑاتے ہوئے گلاس ہماری طرف بڑھائے۔ وہ تیسرے گلاس کی طرف جا رہی تھی کہ شاہ نے یوں نعرہ مارا جیسے بھڑ نے کاٹ لیا ہو۔ میں نے ہڑبڑا کر اس کی طرف دیکھا۔ بڑھیا کے قدم بھی رک گئے تھے۔ شاہ کے منہ میں گلاس کا کنارا دبا ہوا تھا۔ اس کی بھوری مونچھیں جھاگ سے لتھڑی ہوئی تھیں اور اس کا ایک ہاتھ میری طرف اٹھا ہوا تھا۔ وہ پہلے میری طرف اشارہ کر کے ہاتھ کو زور زور سے نفی میں ہلاتے ہوئے بڑھیا کو تیسرا گلاس نہ لانے کے لئے کہہ رہا تھا۔ ہارون کی ہنسی چھوٹ گئی۔ تاڑی کے چھینٹے اڑنے لگے۔

بیچاری بڑھیا بھونچکی سی کھڑی ہماری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں سب کو پریشان دیکھ کر آگے بڑھا۔ دُور دکان کے اندر مجھے سوڈا واٹر کی بوتلیں نظر آئیں تو میں نے لیمن کی طرف اشارہ کیا۔ بڑھیا کی جان میں جان آئی اور وہ حیران سی ہو کر بوتل کھولنے لگی۔

صاف ظاہر ہے ادائیگی کے وقت ہم تینوں میں خوفناک جنگ ہوئی لیکن شاہ کو اس لئے ادائیگی کرنا پڑی کہ آرڈر اسی نے دیا تھا۔ وہ ہمیں گالیاں دیتا ہوا جب تھڑے سے نیچے اترنے لگا تو ننگ دھڑنگ بچوں نے اسے گھیر لیا، اور ہم بچ بچا کر بھاگ آئے۔

اڈے پر شور مچا ہوا تھا۔ مختلف سمتوں کو جانے والی بسیں رکی ہوئی تھیں اور انہیں چیزیں بیچنے والے بچوں نے اپنے حصار میں لیا ہوا تھا کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔

شاہ اب پنجابی محاورے کے مصداق اپنا مال بکریاں کرنے پر تلا ہوا تھا۔ اس نے آدھ درجن پیشن فروٹ خریدے اور ہماری طرف بڑھا دیئے

ہارون نے مجھے آنکھ ماری اور ہاتھ آگے کر دیا۔

"کھاؤ،" شاہ نے فراخدلی سے کہا۔

"ہماری بس کہاں ہے؟" اس نے پوچھا "وہ رہی۔ وہ سامنے" ہارون نے اشارے سے بتایا۔

سڑک کے کنارے ریہڑیوں پر کاجو بیچنے والی لڑکیاں شام کے دھندلاتے سائے میں آبنوس کے مجسموں کی طرح لگ رہی تھیں۔

"کاجو کے بارے میں کیا خیال ہے" شاہ کی آنکھیں تیزی سے حرکت کر رہی تھیں۔

"بڑی مقوی، محرک اور کام کی چیز ہے"

"سچ" شاہ نے حیرت سے پوچھا۔

"تو خرید لیں" اس نے پوچھا۔ ہم نے ایک ریڑھی دیکھی جس پر نسبتاً کم ہجوم تھا۔

وہاں ہمارے ہی ساتھی نکل آئے "یہاں سے نہیں" شاہ نے سرگوشی کی۔

"کیوں؟" ہارون نے پوچھا۔

"یار میری ساری دولت خدمتِ خلق کے لئے نہیں ہے۔ بوڑھوں کا حصہ میں ادا کر آیا ہوں۔ اب کسی نوجوان کو اس کا حصہ دینا باقی ہے"

ہارون نے چاروں طرف دیکھا۔ اور ہم دونوں کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ دس بیس قدم کے فاصلے پر ہی وہ ریہڑی تھی۔ میں بھی ٹھٹک کر رک گیا۔

"یہ لڑکیاں کاجو گرلز کہلاتی ہیں" ہارون نے بتایا۔

"تمہیں کس نے بتایا"

"مسٹر مہاتے نے"

"ہوں!"

میرا دھیان اس کی طرف نہیں تھا۔ ٹخنوں سے کسی قدر اونچا گھاگرا نما پھول دار کپڑے اور شوخ رنگوں والا پہناوا، لیکن یوں جیسے دھوتی کی طرح کمر کے گرد لپیٹ لیا گیا ہو، اوپر کا دھڑ قمیص یا فراک غالباً لباس سے یکسر بے نیاز۔ جسم کے نازک اور حساس حصے کو ڈھانپنے کے لئے اسی کپڑے کی مختصر سی چولی اور بس۔

ہم تینوں مبہوت رہ گئے

آبنوس کی چمکدار چکنی لکڑی کی طرح ترشا ہوا بدن، ناریل کے تیل پر چپٹے ہوئے سیاہ بل کھاتے لہراتے اور پنڈلیوں کو چھوتے ہوئے سیاہ بال

شاہ نے پیٹ کی گہرائیوں سے ایک طویل اور سرد آہ بھری۔

اس شبِ فراق کی بیٹی نے ہاتھ میں لمبے چمکدار پھل والا چھرا تھام رکھا تھا اور دھڑا دھڑ کنگ کوکونٹ کی گردنیں قلم کر کے گاہکوں کو دے رہی تھی وہ ایک ناریل اٹھاتی، ماہر بولر کی طرح اسے ہاتھ میں گھما کر رُخ درست کرتی اور دائیں ہاتھ کے ایک ہی وار سے اس کا سر کاٹ کر گاہک کی طرف بڑھا دیتی۔ اس کی زبان اس کے ہاتھ سے بھی زیادہ تیزی کے ساتھ چل رہی تھی۔ وہ بیک وقت چھ سات گاہکوں سے مصروفِ گفتگو تھی۔ لہجے سے صاف پتہ چل رہا تھا کہ زبان میں بھی وہی کاٹ ہے جو اس کے تیز دھار آلے میں ہے۔ وہ کاجو بھی تولتی تھی۔ کوکونٹ بھی کاٹتی تھی اور پیسے وصول کر کر کے اپنے گاگھرے کے ساتھ بندھی تھیلی میں ڈالتی جاتی تھی۔ اس کی تیزی اور طراری دیکھنے کے لائق تھی۔

اور ہم تینوں بُت سے بنے کھڑے تھے۔

اس کی نگاہ ہم پر اس وقت پڑی جب گاہکوں کی تعداد سمٹ گئی۔

"ٹنگ ٹنگ ۔ کاجو۔" ہارون کے حلق میں آواز پھنس گئی۔

"کاجو۔" اس نے شریر آنکھوں سے ہم تینوں غیر ملکیوں کو دیکھا۔ اس کی کاجل بھری آنکھیں یوں لگیں جیسے فریزر کے آرپارہ ہوگئی ہوں۔ اس نے بھاؤ بتایا۔ کاجو کا بھی اور ناریل کا بھی۔

میں پیاس سے مغلوب ہو رہا تھا۔ ایک بڑا سا کورنٹ اٹھا کر اسے تھمایا اور اس نے ایک لحظے کے اندر اس کی گردن کاٹ کر مجھے واپس کر دیا۔

وہ دونوں مجھے گھور رہے تھے اور میں ناریل کا پانی اپنے حلق میں انڈیل رہا تھا۔

"ک ک کاجو" شاہ نے چھیلے ہوئے موٹے موٹے اور صحت مند کاجو کے دانے مٹھی میں بھرتے ہوئے کہا۔ لیکن اس کی نظریں کاجو پر نہیں تھیں اس کے چہرے پر تھیں۔

وہ کمر پر ہاتھ رکھ کر تن کر کھڑی تھی اور اس کی آنکھوں میں مضحکہ اڑانے والی دلچسپی اور شرارت تھی۔

کمر کے اختصار کی طرف میری توجہ گئی تو میں ہونچکا سا رہ گیا۔ اردو شعراء کے کئی شعر حافظے میں ابھر آئے۔

کیا سراپا تھا، متناسب۔ بوٹا سا قد۔ تراشا ہوا سڈول بدن، چمکدار سیاہ رنگت۔

اس نے پھر سے بھاؤ بتایا۔

"ارے بھئی کیا خرید رہے ہو؟" یہ مسٹر مہا کی آواز تھی۔

"جی سر۔ کاجو۔" شاہ کو قدرے حوصلہ ہوا۔ اتنی دیر میں تین چار اور بھی آوارہ گرد وہاں آگئے۔ ایک امریکی سیاح بھی آن پہنچا۔ اس کی بھوری داڑھی دیدنی تھی۔

وہ اسی طرح کمر پہ ہاتھ رکھے تن کر کھڑی تھی۔ وہی مضحکہ۔ وہی شرارت سا

"اب بولتے کیوں نہیں؟" میں نے شاہ کی پسلی میں انگلی چبھوئی۔

شام کے سایوں میں اس کا بدن چکنا اور چمکدار سنگ سیاہ کے خوبصورت بت کی طرح لگ رہا تھا۔ یوں کسا ہوا، تنا ہوا، سخت اور با اختیار کہ دیکھتے رہو اور دل نہ بھرے۔ اس کا حسن توصیف کے الفاظ کے احاطے میں نہیں آسکتا تھا۔ دل بے اختیار چاہے کہ اسے چھو کر دیکھیے۔ ہاتھ لگا کر دیکھیے آبنوس کے اس مجسمے کو دیکھ کر معلوم ہوا کہ سیاہ رنگ بھی اپنے اندر کیا کشش کیسی حسن کیا وجاہت اور کیا رسیلا پن رکھتا ہے۔

وہ اگر باتیں یا حرکت نہ کر رہی ہوتی تو میں اسے سنگ سیاہ کا مجسمہ ہی سمجھتا۔ وہ کسی مندر میں رکھنے کے لائق تھی۔

سودا طے نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے اس دوران اپنے ناریل کے پیسے (غالباً ۲ روپے) ادا کر دیئے تھے اور اب میں محض تماشا دیکھ رہا تھا۔ شاہ کے ہاتھ میں کاجو کے سفید دانے چمک رہے تھے۔ ادھر اس کے موتیوں کی طرح سفید دانت ایک لحظہ وہ بھر گئی۔ مسٹر مہا اور اس کے درمیان مقامی زبان میں گفتگو ہو رہی تھی۔ وہ غالباً اسے بہت کم بھاؤ بتا رہے تھے اور وہ تیار نہیں ہو رہی تھی۔ مسٹر مہا کو بھی غصہ آگیا، انگریزی میں بولے۔

"چھوڑو بھئی اس کیتا کی بچی کو۔ کہیں اور سے کاجو خرید لیں گے!"

اور پھر جب وہ بولی تو سب وہیں جیسے تھے جہاں تھے کھڑے رہ گئے۔ وہ صحیح لب و لہجے کے ساتھ انگریزی میں کہہ رہی تھی: کیسے کتیا کے بچے تم ہو گے بڈھے سؤر، گالی دیتے ہو۔ سودا لینا ہے تو لو ورنہ اپنا راستہ ناپو، گدھے۔ وقت ضائع کر رہے ہیں؛

مسٹر مہاجنے اسے جاہل اور ان پڑھ جان کر انگریزی میں گالی دی تھی لیکن وہ نہ صرف انگریزی بخوبی جانتی تھی بلکہ روانی سے بولتی بھی تھی اس تجربے کے لئے ذہنی طور پر ہم میں سے کوئی بھی تیار نہ تھا۔ چنانچہ سب کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔

وہ ابھی تک طیش میں تھی۔ گالیاں دے رہی تھی اور اس کے ہاتھ میں چھرا چمک رہا تھا۔ اس کا رنگ تمتایا ہوا تھا۔ کچھ شام کی شفق رنگ روشنیاں۔ بس جلال و جمال بیک وقت بیک لحظہ سانس لے رہے تھے۔

میری نظریں اس کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ وہ گالیاں دیئے جا رہی تھی۔ فر فر فصیح قسم کی انگریزی میں۔ کسی ایسے ہی محبوب سے گالیاں کھا کر غالب بے مزہ نہیں ہوا ہوگا۔ پتہ نہیں کیوں اس وقت مجھے اس کی وہ گالیاں گالیاں نہیں لگ رہی تھیں۔ شاید اس لئے کہ ایک شیریں دہن کے لبوں سے نکل رہی تھیں اور شاید اس لئے بھی کہ وہ گالیاں مجھے نہیں مسٹر مہاجن کو پڑ رہی تھیں۔

مسٹر مہاجنے عافیت اسی میں سمجھی کہ ایک لفظ بھی مزید کہے بغیر وہاں سے کھسک جایا جائے۔ وہ ہم تینوں کو تقریباً کھینچتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ عقب سے اس کافر کی پہلے تو زوردار قہقہے کی آواز آئی اور اس کے بعد ایک آخری بلیغ قسم کی گالی۔ میں نے ایک بار گردن گھما کر دیکھا تو وہ اسی شان و شوکت سے کولہوں پر دونوں ہاتھ رکھے کھڑی تھی۔

"شاید تمہاری نیک کمائی اس کی قسمت میں نہیں تھی" میں نے شاہ کے کان میں کہا۔

جواب میں اس نے قہر آلود نگاہوں سے مسٹر مہا کی طرف دیکھا۔ کچھ بڑبڑایا اور پھر دوسری طرف دیکھنے لگا۔ اس کی حالت قابلِ رحم تھی۔

"بڑی بدتمیز تھی" مسٹر مہاجنے طویل سانس لے کر کہا۔

اب ہم ایک اور ہرنی کے پاس کھڑے تھے۔

وہ بھی ویسی ہی تھی۔ وہی شان و شوکت۔ وہی رنگ ڈھنگ، وہی چمکدار شب رنگی، وہی تراش خراش۔ وہی رنگِ سیاہ، وہی خیرہ کن چمک، وہی تیزی، وہی طراری۔ وہی زبان، وہی لب و لہجہ۔

لیکن شاہ اپنی کمائی اب ہر صورت میں صرف کرنا چاہتا تھا۔ اس نے کاجو کے تین پیکٹ خریدے اور سب کے ہاتھ میں ایک ایک دے دیا۔ میں نے بھی دو پیکٹ خریدے۔ "یہ زادِ راہ ہے"۔ میں نے فارسی لفظ استعمال کئے تو شاہ خوش ہو گیا۔

"یار اس نے تو مجھے خوف زدہ ہی کر دیا تھا۔ میں نے سوچا کہیں وہ چھرا نہ مار دے" اس نے کہا۔

"ہرگز نہ مارتی"

"کیوں"

"دن بھر میں جانے ہم سے کتنوں کے ساتھ اس کا واسطہ پڑتا ہے۔ چھرا کتنوں کو مارے گی"

شاہ نے لمحہ بھر سوچا۔ اس کا چہرا پُرسکون ہو گیا۔

"یو آر رائٹ"

"یہ سب ایسی ہی بدتمیز ہوتی ہیں۔ کوئی شریف آدمی ان کے منہ نہیں لگتا" مسٹر مہاجنے بس کی طرف واپسی کے وقت انکشاف کیا۔

"مسٹر مہاکیا یہ لوگ بھی ستھالی ہیں؟"

"ہاں میرا خیال ہے ستھالی ہیں" وہ چونک کر میری طرف دیکھتے ہوئے بولے۔

انہوں نے اپنا ایک بازو میرے کندھے پر رکھ لیا۔ کاجوگرل کی طراری نے ابھی تک انہیں اعصاب زدہ کیا ہوا تھا۔ انہوں نے یوں پیچھے مڑکر ایک بار دیکھا جیسے تسلی کرنا چاہتے ہیں کہ کہیں وہ لڑکی ان کا پیچھا تو نہیں کر رہی۔ پھر سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے بولے "یہ لوگ صدیوں سے یہاں پر اسی علاقے میں مقیم ہیں اس لئے ان کے خون کی اصلیت اسی طرح قائم ہے۔ ان کا رہن سہن اور رسم و رواج ابھی تک وہی ہیں۔ بڑے کمال کے لوگ ہیں محنتی پرلے درجے کے اکھڑ مزاج مگر دل کے بڑے نرم اور شفیق۔ یہ علاقہ چونکہ کاجو کی پیداوار کے لئے بڑا زرخیز مانا گیا ہے اس لئے ان کی بڑی تعداد یہیں مقیم ہے صدیوں سے۔ مرد زیادہ تر کھیتوں پر کام کرتے ہیں اور عورتیں پیداوار کی فراغت کی ذمے دار ہیں۔

مسٹر مہا نے ایک بار پھر پیچھے مڑ کر دیکھا۔ میرا خیال ہے وہ دل ہی دل میں بڑی سنسنی محسوس کر رہے تھے۔

شام کے سائے اور بھی اُتر آئے تھے۔ بس میں سوار ہونے سے پہلے میں نے چاروں طرف بڑی محبت کے ساتھ پھر دیکھا۔ کون جانے یہاں سے پھر کبھی گزر ہو نہ ہو۔ یہاں کی ہوا یہاں کی خوشبو پھر میرے بدن کا حصہ بنے نہ بنے، کون جانے۔ میں نے ایک طویل اور گہرا سانس لیا اور پھر کوچ کے اندر داخل ہو گیا۔ اپنی سیٹ پر بیٹھ کر میں نے ایک بار باہر دیکھا۔ وہی شور و غل وہی دکانیں، وہی لبسیں، وہی سنگ زادیاں، وہی تیزیاں وہی طراریاں اور وہی شوخ طرازیاں۔

بس روانہ ہوئی۔ منظر پیچھے رہ گیا۔ ادھر ہوڈ دبتی گئی۔ بس اندھیرے کے اندر ڈوبتی گئی۔ آگے ہی آگے۔ میں سمٹ کر بیٹھ گیا۔

میرے ساتھ والی سیٹ پر ابھی تک خوشبو کا ابر چھایا ہوا تھا۔ میں نے اپنی آنکھیں آہستگی سے میچ لیں، ٹانگوں کو پھیلایا، سیٹ پر ذرا نیچے کھسک کر اپنے آپ کو زیادہ آرام دہ حالت میں کیا اور پھر تیرا کے بارے میں سوچا۔ اس کا سراپا میرے رُوبرو تھا۔ میں نے اپنی دائیں جانب اس کی قُربت اس کے بدن کی دھیمی سی حرارت اور اس کی آرام جاں قسم کی خوشبو کو محسوس کیا۔ میری روح ایک عجیب سی سرشاری کی کیفیت میں بھیگ سی گئی میں نے بڑی احتیاط، بڑی حفاظت اور بڑی رازداری سے اس کے خیال کو اپنے دل میں بٹھایا۔ دھیان کی شمع روشن کی۔ سارے نہاں خانے کی دیواریں بڑی رنگارنگ روشنیوں میں نہا گئیں اور اس کی خوشبو زمین سے آسمان کی طرف لپکتی ہوئی چل گئی۔ میں خود ایک طرف کھڑا اس خلوت میں یہ سارا منظر بڑی دلچسپی تعجب اور انہماک سے دیکھ رہا تھا۔

تب یک لخت میرا ہاتھ جھنجھوڑا گیا۔ "یہ لو"

یہ شاہ تھا۔ وہ کاجو کا ایک پیکٹ میرے ہاتھ میں دے رہا تھا۔

"یہ لو" وہ پھر بولا۔ میں نے "اسی" سے خریدا تھا۔ "یار انگریزی اچھی بولتی تھی۔ اور ہاں" اس نے سرگوشی کی "مسٹر مہا کو خوب گالیاں پڑیں۔ بڑا مزا آیا۔ قسم سے۔ یار ایمان سے کیا لڑکی تھی"

کانچ کا بنا ہوا سارا خواب محل چور چور ہو گیا۔ میں نے کاجو کا پیکٹ پکڑ لیا۔ اور آنکھیں کھول دیں۔ شاہ ابھی تک اسی سنگ زادی کی تعریف میں رطب اللسان تھا۔ میں نے کھڑکی کے باہر زبردستی کچھ دیکھنے کی کوشش کی۔

رات چاندنی تھی اور باہر گہرا، گھنا اور تاریک جنگل سانس لے رہا تھا۔ بس فراٹے بھرتی کولمبو کی طرف دوڑ رہی تھی۔

سب لوگ اونگھ رہے تھے۔ شاہ اور منصور کی سرگوشیاں جاری تھیں۔ لیتا اب بھی ینگ کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے زمی سے اپنا سر سیٹ

کی پشت پر ٹکایا ہوا تھا۔ بیگ نے اس کی گردن کے پیچھے سے بازو نکال کر اسے ہلکا سا سہارا دے رکھا تھا۔ داؤد کے خراٹے سنائی دے رہے تھے۔ مس تقائی کا سر بھی ڈھلک کر بس کے شیشے کے ساتھ جا لگا تھا۔

میں نے سب پر ایک بھرپور نگاہ ڈال کر آہستگی سے کاجو کا پیکٹ پھاڑا۔ شاہ نے پلٹ کر ایک بار میری طرف دیکھا۔ میں نے اسے کاجو کا پیکٹ ہلا کر دکھایا اور اس کی بھوری مونچھوں کے نیچے مسکراہٹ پھیل گئی۔ کاجو کا ایک بھنا ہوا نمک لگا دانہ دانتوں تلے دبا کر میں نے آنکھیں میچ لیں۔ سر کھڑکی کے شیشے کے ساتھ لگا کر میں نے پھر اسی خوشبو کا تصور باندھا۔

جب ہم کولمبو پہنچے تو رات کا پہلا پہر بیت چکا تھا۔

صبح جب آنکھ کھلی تو بھی اٹھنے کو جی نہیں چاہا۔ میں دیر تک کروٹیں بدلتا اور کسمساتا رہا۔ سفر کی تھکن کا ذائقہ ابھی پورے جسم میں موجود تھا پھر یکاخت میں نے جست لگائی اور کولمبو سے کینڈی پہنچ گیا۔ میرا! میں بے اختیار مسکرایا۔ میرے پورے وجود پر جیسے ایک ابر سا چھا گیا۔ میں جاگتے میں خواب دیکھنے لگا۔ کل کی ایک ایک بات ایک ایک لفظ یاد آنے لگا۔ میں نے بڑے غور سے اس کی آواز سننے کی کوشش۔ وہ واقعی گفتگو کر رہی تھی۔

"میرا نام گانگا ہے۔"

"میرا ایک نام اور بھی ہے جو میری دادی نے رکھا تھا۔"

"میرا۔"

درس بناں دو کھن لاگے نین

"میں بالغ ہوں۔ سب سمجھتی ہوں۔"

"پیار جتنا بتائی نہیں جاتی ورنہ سوئیکار نہیں ہوتی۔"

"پیار جتنا بتائی نہیں جاتی ورنہ سوئیکار نہیں ہوتی۔"

"پیار جتنا بتائی نہیں جاتی ورنہ سوئیکار نہیں ہوتی۔"

میرے کانوں میں ٹپ ٹپ بوندیاں سی گرتی رہیں۔ میں بالکل ساکت بستر پر پڑا رہا۔ میں سانس بھی آہستہ لے رہا تھا کہ کہیں میرا دھیان، میری توجہ، میرا خیال، میرا مراقبہ ٹوٹ نہ جائے۔

ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور اس نے سارا خیال محل تہ و بالا کر دیا۔

"سر آپ کے لئے مسٹر کمال الدین کی کال ہے۔"

"شکریہ"

"ہیلو تابش۔ کیسے ہو۔ میں کمال الدین بول رہا ہوں۔ دو دن پہلے ہم ملے تھے۔ کچھ یاد آیا؟"

"جی ہاں پہچان گیا ہوں۔"

"وعدہ یاد ہے نا! آج کا دن ہمارے ساتھ گزرے گا۔"

میں نے ایک لمحہ توقف کیا۔ "جی ہاں یاد ہے۔"

"تو ہوٹل میں ہی رہنا۔ میں تمہیں خود ہی لے جاؤں گا۔ اوکے۔"

"اوکے۔ بائی۔"

کمال الدین سے میری ملاقات ایک دعوت میں ہوئی تھی۔ وہاں بھی شراب وافر مقدار میں تھی۔ اس لئے یار لوگ وافر مقدار میں اپنے حوصلے آزما رہے تھے۔ واؤ دار ور میں وہاں ملا مشہور تھے۔ اس لئے ہم دونوں اورنج کے جوس سے صرف دوسروں کا ساتھ دینے کی کوشش کر رہے تھے یا یوں کہئے کہ اپنے آپ کو مصروف رکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

کمال الدین میرے ہاتھ میں اورنج کا گلاس دیکھ کر ہی چلا آیا تھا۔ میرے قریب آکر اس نے سرتاپا میرا جائزہ لیا تھا اور پھر ہاتھ بڑھا کر السلام علیکم کہا تھا۔ میں نے بھی حیرت زدہ ہو کر جلدی سے اس کی طرف ہاتھ بڑھا کر "وعلیکم السلام" کہا تھا۔

"آپ کا تعلق کس ملک سے ہے؟" اس نے شستہ اور صاف لہجے کی انگریزی میں پوچھا تھا۔

"میں پاکستان سے آیا ہوں" میں نے شائستگی سے کہا تھا۔

"بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔ میرا نام کمال الدین ہے۔ میں یہاں کے لائبریری بیورو کا ڈائرکٹر ہوں" اس نے ابھی تک میرا ہاتھ مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔ اس کے چہرے پر گرم جوشی کا سچا رنگ تھا۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں اندرونی مسرت کی روشنی۔

وہ کہہ رہا تھا اور میں سن اور دیکھ رہا تھا۔ وہ لانبے قد اور سانولے رنگ کا چالیس کے پیٹے میں ایک دلکش انسان تھا۔ پہلی ہی نظر میں وہ مجھے اچھا لگا۔

چند ہی منٹ میں ہم پوری دلچسپی اور گہری بے تکلفی سے گفتگو کر رہے تھے بلکہ ہمارے قہقہے گونجنے لگے۔

"آپ نے مجھے کس طرح پہچانا" میں نے پوچھا۔

"چہرے کے خدوخال اور جوس کے گلاس سے باقی سب لوگ وہسکی سے شغل کر رہے تھے لیکن ان دونوں باتوں سے ماورا میری چھٹی حس نے بھی کچھ رہنمائی کی تھی" اس نے ایک بار پھر بھرپور قہقہہ لگایا۔

مزید کچھ دیر میں ہم ایک دوسرے کو اپنے بچوں کی تعداد، شادی کا سن، اپنی اپنی پسند و ناپسند اور دیگر دلچسپیاں بھی بتا چکے تھے۔ مجھے صاف لگ رہا تھا کہ وہ واقعی مجھ سے مل کر خوش ہوا ہے۔ اس میں میرا کوئی کمال نہ تھا نہ میری شخصیت کا۔ اس کو اصل مسرت میرے مسلمان بلکہ پاکستانی مسلمان ہونے کے سبب ہو رہی تھی۔ ورنہ وہاں کئی دوسرے مسلم ممالک کے بھی تو لوگ تھے۔

ہم کافی دیر تک کھڑے آپس میں گفتگو کرتے رہے۔ حتیٰ کہ پارٹی بھی ختم ہو گئی۔ اس دوران دنیا جہان کے مسائل پر ہم نے جی بھر کر بحث کر لی تھی تاہم یوں لگتا تھا جیسے تشنگی ابھی باقی ہے۔ یہ کیفیت شاید دونوں طرف تھی ۔۔۔ اس نے فوراً مجھ سے اگلے اتوار ملنے اور پورا دن ان کے ساتھ گزارنے کا وعدہ لے لیا۔ اس وقت اُسی سلسلے میں اس کا فون آیا تھا۔

میں نے اُٹھ کر ٹھنڈے پانی سے منہ ہاتھ دھویا اور پھر آہستہ آہستہ بڑے مزے مزے سے کپڑے بدلنے لگا۔ مجھے معلوم تھا کمال الدین ایک گھنٹے سے پہلے نہیں آئے گا۔

پلنگ کے ساتھ لٹکتی گھنٹی کو بجا کر میں نے بیرے کو بلوایا۔ دروازہ کھلا تو اٹھارہ انیس سال کا ایک نہایت سمارٹ نوجوان جس نے بے داغ سفید پینٹ اور شرٹ پہن رکھی تھی، میرے کمرے میں دستک دے کر داخل ہوا۔ اس کی آنکھوں پر موٹے شیشوں کی عینک چڑھی ہوئی تھی

اور اس کے چہرہ پر بیک وقت گمبیر سنجیدگی اور متاثر کرنے والی ذہانت نظر آ رہی تھی۔

اُسے دیکھ کر میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ پھر مجھے سخت حیرانی ہوئی کمال الدین صاحب اتنی جلدی کیسے پہنچ گئے۔ یہ ان کا کوئی عزیز ہے۔ مجھے بلانے آیا ہے۔

"آپ آ بھی گئے"۔ میں نے حیرانی سے کہا۔

"جی" وہ حیرت سے بولا

"کہاں ہیں کمال الدین صاحب انہیں لے آئے نا!"

"کون کمال الدین صاحب؟"

میں نے پھر غور سے اسے دیکھا۔ کچھ سمجھ نہ آیا۔

"سر آپ نے بلوایا تھا۔

"میں نے؟"

"جی آپ نے بیل دی تھی"

"اوہ لیکن میں نے تو بیرے کو بلوایا تھا"

"جی میں حاضر ہوں" اس نے نظریں نیچی کر کے ادب سے کہا۔

میرے دل پر جیسے چھری سی چل گئی۔ میں نے اس کے بارے میں بہت سی باتیں سوچیں۔ ایک لمحے میں بہت کچھ میرے ذہن میں گذر گیا قوموں کی تقدیر، انقلابات، تعلیم، روزگار، غربت، انقلاب، فساد، جنگ، نعرے۔ خدا جانے کیا کیا کچھ۔ وہ میرا منتظر کھڑا تھا۔

میں نے سوکھے ہوئے حلق، مہربان لہجے اور نرم ترین الفاظ میں پہلے چائے کا آرڈر دیا اور پھر جب وہ یس سر کہہ کر واپس دروازے تک پہنچا تو جانے کیوں چائے کا آرڈر بدل کر کافی کا آرڈر دے دیا۔ صبح ہی صبح میرے منہ کا ذائقہ کڑوا ہو گیا تھا۔ اب میں اسے مزید کڑوا کرنا چاہتا تھا۔

میں کافی پی رہا تھا کہ کمال الدین آ گیا۔ میں نے جلدی سے اس کے لئے بھی ایک کپ تیار کیا۔ "یار جلدی کرو باہر کار میں اور ابھی مہمان بیٹھے ہیں" اس نے گھڑی دیکھ کر شور مچا دیا۔

"انہیں بھی بلا لو" میں نے دعوت دے دی۔ "انہیں بھی کافی پلواتے ہیں"

"کیوں اپنا کباڑا کروانے پر تلے ہوئے ہو۔ چلو جلدی سے جوتے پہنو"

تیار ہو کر باہر نکلے تو میں نے دیکھا کہ ووکس ویگن میں ایک خاتون، ایک نوجوان اور دس بارہ سال کا بچہ بیٹھے تھے۔

"اتنے سے مہمانوں سے مجھے خوف زدہ کر رہے تھے۔ میں سمجھا دس بارہ آدمی ہوں گے"۔ وہ زور سے ہنسا۔ وہ لوگ کار سے نیچے اُتر آئے تھے۔

"تابش ان سے ملو۔ یہ میری بیگم ہیں۔ رابعہ اور یہ میرا بچہ قمر۔ قمر الدین۔ اور یہ میرے دوست مسٹر ڈی سوزا۔ یہ ہیں مسٹر تابش۔ ان کا غائبانہ تعارف تو میں کروا چکا ہوں۔ اب آپ ان سے مل لیجئے"

"اتنی جلدی کیا ہے۔ سارا دن ان سے ملتے ہی رہنا ہے۔ اب جلدی کرو۔ دھوپ تیز ہو رہی ہے"۔ مسٹر ڈی سوزا نے میرا ہاتھ تھام کر کہا۔

"ٹھیک کہتے ہو" کمال نے کہا اور جلدی سے گاڑی کے سٹیرنگ پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد روکس ویگن گال روڈ پر دوڑی جا رہی تھی۔ ہمارا رُخ بیرو والا کی طرف تھا۔

راستے میں میرا پہلے تفصیلی تعارف ہوا۔ تعارف کی ابتدا کمال الدین نے کی اور میرے بارے میں اپنی چند گھنٹے کی معلومات کو موٹے موٹے تعریفی الفاظ کا لباس پہنانے لگا۔ میں نے احتجاج کیا اور اپنا تعارف کرانے کی ذمہ داری خود سنبھالی۔ اس کے بعد کمال الدین نے اپنے دوست ڈی سوزا کا تعارف کرانا چاہا لیکن اس نے بھی چند ہی جملے سننے کے بعد ہاتھ کھڑا کر دیا۔

"کمال! پلیز شاپ اِٹ" اس نے کہا" میں اپنا تعارف خود ہی کراؤں گا" کمال نے سر کو جھٹکا۔

"اوکے" اس نے کہا" شروع ہو جاؤ"

ڈی سوزا ایک مقامی اینگلو سیلونیز فرم میں اکاؤنٹنٹ تھا مذہبًا پکا بدھسٹ لیکن یاری دوستی ساری مسلمانوں سے تھی اور وہ بھی خاص طور پر کمال الدین کے خاندان سے۔ کمال اور وہ دونوں بچپن کے دوست تھے۔ ہم جماعت اور ہم مذاق۔

ڈی سوزا اپنے طور پر جب تعارف کرا چکا تو کمال الدین پھر کھنکارا اور بولا:

"اس میں اور مجھ میں بہت کچھ مشترک ہے لیکن ہم میں ایک بہت بڑا فرق ہے" سب متوجہ ہو گئے۔ کمال نے محسوس کر لیا تھا کہ سب متوجہ ہیں اس لئے ایک خاص وقفہ دے کر اس نے سب کے اشتیاق کو بڑھایا اور پھر یکلخت بولا" اور فرق یہ ہے کہ میں شادی شدہ ہوں لیکن یہ چھڑا چھانٹ ہے چنانچہ ہر فکر، ہر بندھن سے آزاد، کیا مزے ہیں اس کے"

"اور آپ تو قیدی ہیں" رابعہ بھابی تنک کر بولیں۔ جملہ ایسا اچانک تھا کہ کمال الدین کی سٹی گم ہو گئی اور مجھ پر بھی انکشاف ہوا کہ عورت دنیا کے کسی بھی خطے کی ہو مزاج ایک ہی پایا ہے۔

اس کے بعد کمال الدین نے رابعہ کا تعارف کرانا چاہا" ہاں تو تابش یہ ہیں میری بیگم رابعہ۔ ان کا پہلا تعارف تو یہی ہے کہ میری بیگم ہیں دنیا کی ہر عورت کی طرح یہ ہمیشہ مجھ سے شاکی رہتی ہیں"

"اور آپ تو بڑے خوش رہتے ہیں۔ بس رہنے دیجئے میں بھی اپنا تعارف خود ہی کراؤں گی"

"یار آج تم لوگوں کو میرے خلاف کیا شکایت ہو گئی ہے۔ میری کوئی بات کسی کو بھاتی ہی نہیں۔ کم از کم اتنا تو خیال کرو کہ میں اس وقت تمہاری گاڑی ڈرائیو کر رہا ہوں"

رابعہ ایم اے انگلش لٹریچر تھیں۔ ایک مقامی کالج میں لیکچرار تھیں۔ انگریزی نہایت صاف اور شستہ بولتی تھیں۔ ان کا خاص موضوع انگریزی شاعری تھی لیکن فکشن بھی خاصا پڑھ رکھا تھا۔ میں نے پسندیدہ شاعر پوچھا تو بولیں کئی ایک ہیں۔ تاہم نئے لوگوں میں پاؤنڈ اور پرانوں میں کالرج مجھے زیادہ اچھے لگتے ہیں:

چونکہ مجھے بھی یہ دونوں شاعر پسند ہیں اس لئے مجھے دلچسپی ہوئی۔

"ان کی پسندیدگی کی کوئی خاص وجہ کیا ہے؟"

"یہ کہ دونوں پاگل ہیں" کمال الدین نے لقمہ دیا۔

"گویا میں بھی پاگل ہوں"

"یہ تو میں نے نہیں کہا۔" وہ اطمینان سے سامنے دیکھتا رہا۔

"انہیں چھوڑیئے" میں نے ہنستے ہوئے کہا

"بہت مشکل ہے پن پوائنٹ کرنا۔ لیکن ایک بات جو میں نے اکثر محسوس کی ہے وہ یہ کہ دونوں مشرقی شاعری کے مزاج کے قریب تر یا یوں کہیئے کم پلنے سے لگتے ہیں؟"

"ہاں" انہوں نے تائید کی۔

پھر دیر تک پاؤنڈ — اس کے تنقیدی مزاج، اس کی ادیب گری، اس کی نجی زندگی، قابلِ رحم بڑھاپا۔ ادھر کالرج کا عجیب مزاج، اس کی نظم قبلائی خان، انشنٹ میرینر، اس کی پُراسراریت صوفیانہ سا مزاج زیرِ بحث رہا۔ میں نے محسوس کیا رابعہ ادب کا گہرا شعور اور اچھا مذاق رکھتی تھی۔ ہماری گفتگو میں کمال الدین وقتاً فوقتاً دخل اندازی کرتا لیکن رابعہ سے منہ کی کھاتا رہا۔ ڈی سوزا ایسے موقع پر کمال الدین پر ایک جملہ مزید اچھال دیتا۔ اور پھر زوردار قہقہہ لگاتا۔ ایک توانا اور بھرپور قہقہہ۔ وہ جب بھی زور سے قہقہہ لگاتا تھا تو حیرت زدہ نظروں سے اور بڑی دلچسپی سے اس کے کھلے ہوئے دہانے، مٹتی ہوئی آنکھوں، سُرخ ہوتی ہوئی کانوں کی لووں کو دیکھتا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل جاتی تھی۔ ڈی سوزا جیسے لوگ بہترین رفیقِ سفر ثابت ہوتے ہیں جو کہتے کم اور سنتے زیادہ ہیں اور آپ کو مسرت فراہم کرنے میں کوئی کنجوسی نہیں دکھاتے۔

کمال الدین اچھا خاصا ڈرائیور تھا۔ بڑے اطمینان سے یکساں رفتار سے وہ کار چلا رہا تھا۔ ہم کولمبو سے کوئی دس بارہ میل باہر نکل آئے تھے۔ سڑکوں کے دونوں اطراف وہی ناریل وہی کنگ کوکونٹ اور وہی بانس کے درخت تھے۔ ہماری بائیں جانب دُور دُور تک پھیلی ہوئی آبادیاں تھیں اور دائیں طرف سمندر گہرا سبز، شفاف اور پُراسرار۔

سمندر کے کنارے مچھیروں کی بستیاں میلوں تک چلی گئی تھیں۔ سرکنڈوں کے کچے کچے گھروندے، ننگ دھڑنگ بچے، سیاہ فام عورتیں اور دھوپ کے مارے ہوئے تانبے جیسے جسموں والے مچھیرے۔ کہیں کہیں چھپروں کے نیچے مچھلی فروخت ہو رہی تھی۔ مختلف اقسام کی مچھلیوں کے الگ الگ ڈھیر۔ کمال الدین نے ایک دو جگہ کار روک کر مچھلی کا سودا کرنا چاہا لیکن بات نہ بنی تاہم میں نے یہ ضرور دیکھا کہ اتنے صحت مند پرونز شاید ہی کہیں اور پائے جاتے ہوں جیسے وہاں تھے کراچی کے پرونز تو مجھے ان کے مقابلے میں خاصے بکھ گڑے سے لگے۔

راستے میں ایک جگہ ہم نے ایک بہت بڑا زیرِ تعمیر مکتب اور مسجد دیکھے جو ایک مسلمان جوہری اور دیگر مسلمان زرشاہ کے عطیات سے بن رہے تھے۔ کمال الدین کو اس سارے کام کی خاصی معلومات حاصل تھیں جو اس نے مجھے بتلانے میں بُخل نہیں کیا۔

چھوٹے سے لیکن خوبصورت گاؤں میں بیرواں کمال الدین کے ایک دوست کے ہاں رک کر ہم نے چائے پی اور خوبصورت گفتگو سنی۔ ہمارے میزبان لسانیات کے آدمی تھے۔ علامہ اقبال پر بھی انہوں نے کچھ لکھ رکھا تھا۔ کمال الدین چونکہ لسانیات سے کچھ دلچسپی رکھتا تھا اس لئے دونوں نے دیر تک سینگ پھنسائے رکھے۔ رابعہ خواتین سے ملنے زنان خانے میں چلی گئی تھی اس لئے میں اور ڈی سوزا قابلِ رحم حالت میں ایک دوسرے کی طرف دیکھتے اور بس آہ بھر کر رہ جاتے تھے۔

تاہم چونکہ چائے بہت اچھی تھی اور میزبان نے کافی اہتمام کر رکھا تھا اس لئے میں اور ڈی سوزا کئی پیالیاں چائے پی گئے۔

جب ہم دوبارہ روانہ ہوئے تو آسمان ہلکے ہلکے بادل چھائے ہوئے تھے اور موسم بے حد خوشگوار ہو چکا تھا۔ دھوپ کی تیزی غائب تھی۔ سمندر کے اوپر سمندری بگلوں کی قطاریں پرواز کر رہی تھیں۔

ہم چند عجیب الوضع کھنڈرات اور اونچے نیچے ٹیلوں میں سے گزرتے ہوئے ناریل کے جھنڈ میں سے ایک کھلی جگہ آ گئے جو ساحل کے بالکل قریب تھی اور یکلخت سارا منظر تصویر کی طرح سامنے آ گیا۔

میں کار کے شیشے میں سے حیرت زدہ سا دیکھ رہا تھا اور کمال الدین کار پارک کرنے کے لیے پے در پے کئی موڑ کاٹ کر ایک مناسب مقام پر کار کھڑی کر رہا تھا۔ پھر ہم سب باہر نکل آئے۔ مرطوب ہوا کے ایک ہلکے سے تھپیڑے نے میرے گال سہلائے، کپڑوں کو پھڑپھڑایا اور جسم کو ذرا سا جھٹکا دیا۔

ایک طویل اور گہرا سانس لے کر میں نے چاروں طرف دیکھا۔

ہم ساحل پر کھڑے تھے۔ ہمارے ہر طرف عورتوں بچوں بڑوں اور بوڑھوں کا ایک ہجوم تھا۔ اور اس ہجوم کے عین بیچوں بیچ ایک بلند ٹیلے پر ایک پُرشکوہ گنبد دکھائی دے رہا تھا۔ میں اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ ٹیلے پر پہنچنے کے راستے پر آنے جانے والوں کے گروہ تھے۔ بڑوں نے بچوں کی انگلیاں تھام رکھی تھیں اور عورتیں تیز ہوا میں اپنے بالوں کو بکھرنے سے بچا رہی تھیں۔

"تابش یہ مقام بڑا اہم اور تاریخی ہے" کمال کی آواز آئی "ادھر دیکھو وہ سامنے ایک ٹاپو سا دکھائی دے رہا ہے" میں نے اس کی انگلی کی سیدھ میں دیکھا۔ بیچ سمندر ایک ٹاپو سا تھا جس پر ناریل کے درختوں کے سربلند جھنڈ کھڑے تھے۔

"اور اس ساحل کو بھی دیکھو غور سے"

"اونچی نیچی ناہموار زمین، پتھریلی، چھوٹے چھوٹے سنگریزے اور پرانے گھونگھے، سمندر کی نم ہوا، دُور تک قطعوں کی شکل میں اُگی ہوئی گھاس اور مضطرب لہروں کا بلند بانگ شور۔

"یہ وہ جگہ ہے جہاں عربوں کے بحری بیڑے آکر لنگر انداز ہوا کرتے تھے" میں نے چونک کر غور سے ایک بار کمال الدین کی طرف دیکھا اور پھر ٹاپو پر اُگے ہوئے درختوں اور ساحل کو دیکھا۔ آشنائی کا سرور جیسے بدن میں پھیل گیا۔ ٹاپو کی طرف سے تیز ہوا کا ایک جھونکا آیا اور تاریخ کے کئی ورق پھڑپھڑا کر الٹ گئے۔ میں نے سفید بادبانوں والے جہازوں کو ناریل کے جھنڈوں کے گرد لنگر انداز ہوتے دیکھا۔ قدآور ملاحوں اور لمبے جبوں والے سوداگروں کو میں نے آنکھیں سکیڑے دلچسپی سے ساحل کی طرف دیکھتے پایا۔ تیز ہواؤں میں ان کے عمامے اور قبائیں پھڑپھڑا رہی تھیں۔ عرشے پر ملاح بھاگ دوڑ رہے تھے اور ایک شور سا مچا ہوا تھا۔ ساحل پر بھی میلہ سا لگا ہوا تھا۔ عرب سوداگر دنیا جہان کا تجارتی سامان لے کر آتے تھے۔ سراندیپ کے سوداگر اور جوہری بھی بے تابی سے ان جہازوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔

"یوں کہو کہ ہمارے آبا و اجداد کے بیڑے یہاں آکر رکا کرتے تھے" رابعہ بولی۔

"ہاں یوں بھی کہا جا سکتا ہے" کمال نے دُور سمندر کی طرف گھورتے ہوئے جواب دیا۔

"یہ دونوں نسلاً عرب ہیں" ڈی سوزا نے مجھے حیران دیکھ کر کہا

"تو یہاں کافی ایسے مسلمان آباد ہیں جو نسلاً عرب ہیں؟"

"ہاں" کمال نے جواب دیا۔ "ان کی اچھی خاصی تعداد ہے — اور تابش۔ ادھر دیکھو یہ ٹیلہ۔ یہاں ایک ایسے بزرگ ہیں جنہوں نے صدیوں پہلے یہاں کے لوگوں کے دلوں میں ایمان کی شمع روشن کی تھی۔"

"آؤ اُوپر چلیں" - رابعہ نے کہا۔

ہم آہستہ آہستہ ٹیلے کا راستہ طے کرنے لگے۔ مجھے اچھرے میں بابا شاہ جمال کا مزار یاد آیا۔ ویسا ہی ٹیلہ، ویسی ہی رفعت، ویسی ہی بلندی وہی ہجوم عاشقاں۔ وہی سرمستیاں۔ وہی وارفتگی۔ وہی جذب و شوق۔ لمبے لمبے اور کھلے کھلے پیراہنوں میں ملبوس اپنے آپ میں سمٹی ہوئی عورتیں۔ سنجیدہ بوڑھے، شوخ بچے نیچے سے اوپر، اوپر سے نیچے آ جا رہے تھے ان کے چہرے پر آسودگی، اشتیاق اور عقیدت کا نور پھیلا ہوا تھا۔

ڈیڑھ دو منزل کے قریب ہم نے راستہ طے کر لیا تو ایک کھلی سی جگہ آ گئی۔ میں اس طرف پلٹ گیا اور پھر سمندر کی طرف دیکھنے لگا۔ بلندی پر آنے کے باعث منظر زیادہ وسیع اور صاف ہو گیا تھا۔

سفید بادبانوں والے جہاز کا عرشہ اب زیادہ واضح دکھائی دے رہا تھا۔ سامان تجارت چھوٹی کشتیوں میں لادا اور ساحل کی طرف روانہ کیا جا رہا تھا۔ ساحل پہ لوگ۔ ہاتھ ہلا رہے اور پُرجوش انداز میں استقبالیہ جملے ادا کر رہے تھے۔ بادبان سمیٹ دیئے گئے تھے اور لمبے لمبے مستول اب خالی نظر آ رہے تھے صرف موٹے موٹے رسے تھے جنہوں نے مستولوں کو سنبھالا ہوا تھا۔

"چلو آبش رُک کیوں گئے؟"

ہوا کا ایک اور جھونکا آیا۔ تاریخ کی کتاب کے چند اور صفحات اُلٹ گئے۔

ہم اوپر پہنچے۔ وہ ایک طویل و عریض جگہ تھی بابا شاہ جمال کے مزار سے زیادہ وسیع جگہ خوبصورت، کھلی اور بے شمار درخت اور سبزہ تھا۔ سمندر کی نمی سے بوجھل خنک ہوا، جسم و جان کو راحت اور سکون دینے والی۔

ایک بہت بڑی چاردیواری۔ ایک طرف خوبصورت مُنّی سی، دلنشین مسجد جس کے سفید گنبد اور مینار سرکشیدہ کھڑے تھے۔ ساتھ ہی ان کا مزار تھا۔ میں مبہوت سا کھڑا دیکھ رہا تھا۔

حوض کے گرد لوگ وضو کر رہے تھے۔ عقیدت میں سرشار۔ محبت میں شرابور۔ میں بہت چھوٹا تھا جب سے میری ماں نے مجھے بابا شاہ جمال کے حضور جانے کی عادت ڈالی تھی۔ یہ عادت اب تک قائم ہے۔ مجھے ان سے اور ان کی جائے آسودگی سے ایسا پیار ہے کہ جب بہت اضطراب ہوتا ہے تو وہاں جا کر گھنٹوں بیٹھا رہتا ہوں۔ ان کے تعویز کے پاس جا کر جب میں سرنگوں ہو کر بیٹھ جاتا ہوں تو یوں لگتا ہے جیسے طمانیت کی دولت مل گئی ہے جیسے کڑی دھوپ میں چلتے چلتے یکدم چھتنار سائے میں پہنچ گیا ہوں۔ ٹھنڈی سی پڑ جاتی ہے۔ دُکھ درد بھول سے جاتے ہیں۔

یہاں کا منظر کچھ ویسا ہی تھا۔

میں نے حوض پر جا کر وضو کیا۔ کسی نے میری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ وضو کر کے میں اُٹھ کھڑا ہوا اور سارے منظر پر ایک نگاہ ڈالی۔ لوگ بکھرے ہوئے تھے۔ کچھ بچے ایک طرف کھیل رہے تھے۔ کچھ لوگ قرآن پاک پڑھ رہے تھے۔ بعض یوں سکون سے شانت بیٹھے تھے جیسے ماں کی گود میں ہوں۔ ہر فکر سے آزاد۔ ہر دُکھ سے دُور۔ اور مزار کی پیشانی پر نگہ پڑی تو لکھا تھا شاہ اشرف ولی اللہ۔

کچھ لوگ بیٹھے کھا پی رہے تھے۔ ایک بچہ ٹونٹی سے پانی پی رہا تھا مجھے بھی سرشاری کا احساس ہوا۔ پھر سامنے برآمدہ کی طرف نگہ اٹھی تو سبز لبادے میں ملبوس ایک نورانی چہرہ مجھے نظر آیا۔ اس چہرے پر نگہ نہ ٹھہرتی تھی۔ فراخ، سنجیدہ اور گہری سمجھ والی خوبصورت آنکھیں، سرخ و سپید رنگ، ایک دلنشینی اور دلکشی کا غبار۔ میں دیکھتا رہ گیا۔ لبوں پہ ہلکا سا تبسم بکھرا تو مجھے لگا نگاہیں میری طرف مائل ہوئی ہیں۔ ایک اشارہ سا ہوا اور میں کھنچتا چلا گیا۔

قبر کے تعویز کے پاس جا کر میں نے اِدھر اُدھر دیکھا وہاں وہ نہیں تھے۔ میں نے پروا نہ کی۔ مقصد تو حضوری تھا۔ دعا مل گئی تھی۔ تعویز کے چاروں طرف لوگ بیٹھے تلاوت کر رہے تھے۔ فاتحہ پڑھ رہے تھے۔ دعا مانگ رہے تھے۔ اس ہجوم عاشقاں میں میں بھی ایک طرف کونے میں ہو کر بیٹھ گیا

اور آنکھیں میچ لیں۔

میرے اندر ہی سے سرشاری کا ایک دھارا سا اُبلا اور میرے ظاہر و باطن کو بھگو گیا۔ میری رگوں میں سرمستی اور نشے کی ایک تیز لہر سی سرایت کر گئی۔ روشنی کے ایک تیز ہالے نے مجھے گھیر لیا۔

خانقاہ کے باہر عقیدت مندوں کا ہجوم تھا۔ شاداب مقام تھا جیسے چاروں طرف سے پہاڑوں نے گھیر رکھا تھا۔ سامنے پھولوں کی ایک کیاری کے پاس مصلّیٰ بچھا تھا اور وہاں پیر و مرشد بیٹھے تھے۔ ایک نوجوان درویش ان کے سامنے دست بستہ کھڑا تھا۔ اس کی گردن خمیدہ تھی۔ چہرے پر اداسی اور آنکھوں میں نمی تھی۔ اس کے ہونٹ کبھی کبھی لرز جاتے تھے لگتا تھا جیسے اس نے جبر کر کے اپنے پر قابو پایا ہوا ہے۔ یہ شیخ اشرف تھے۔ دوسرے مریدوں کی حالت بھی کچھ مختلف نہ تھی۔ سب کی گردنیں خم تھیں اور زبانیں خوش تھیں۔

"عزیزم حکم یہی ہے اور اس کے حکم کے آگے دم مارنے کی کسی کو مجال نہیں"

نوجوان درویش کانپ گیا۔

"میں حکم کا بندہ ہوں" اس نے آہستگی سے کہا لیکن آپ کے قدموں سے جدا ہونے کی تاب نہیں۔ سوچتا ہوں۔ آپ سے دُور ہو کر سانس کا رشتہ کس طرح قائم رکھ سکوں گا"

"بندے کا منصب اطاعت ہے۔ اطاعت بیٹا! اطاعت"

"لیکن جدائی، یہ دُوری۔ میرا کلیجہ شق ہو رہا ہے" درویش کی آنکھوں سے دو موتی گر گئے۔

پرتو روہیلہ | گردِ راہ

۱۲ اپریل ۷۷ء

کل صبح میں، لالہ اور زہری کے ساتھ گھر سے نکلا۔ لالہ نے ہمیں ٹیوب ٹرین کے لئے اُتار دیا اور خود دفتر چلے گئے۔ اب میں زہری کی تحویل میں تھا۔ زہری کو اپنے اسکول جانا تھا جہاں وہ اہل الضاد سے عربی پڑھ رہی ہیں چونکہ برٹش میوزیم ان کے اسکول کے قریب تھا انھوں نے میری رہنمائی کی حامی بھرلی اور بقول کسی کے مجھے انگلی پکڑا کے لے چلیں۔ میں انتہائی سعادتمندی سے ان کی قیادت میں پورے اعتماد کا اظہار کرتے ہوئے ان کے پیچھے پیچھے تھا لیکن دل میں میرے کھُدر بُدر ہو رہی تھی اللہ خیر کرے یہ لڑکی جو برسوں پنڈی صدر میں رہنے کے بعد بھی کبھی حیدر روڈ سے سیدھی میو روڈ نہیں پہنچ سکی معلوم لندن میں کس کس جگہ خوار کرے۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جائے میں زہری کی بے اختیار ہنسی کے لئے تیار ہوتا جاؤں "بھائی جان ہم غلط سمت آگئے" ٹیوب ٹرین میں بیٹھے بیٹھے مختلف اسٹیشنوں کو لمحوں کی طرح اپنے پیچھے بھاگتا دیکھ رہا تھا اور میرے سامنے خدائے بزرگ و برتر کی مخلوق بھاگ رہی تھی۔ چھوٹے بڑے، بچے، بوڑھے، عورت مرد، کمزور و توانا، کالے گورے، مشرقی مغربی غرض کون ذی روح تھا کہ جس کے پاؤں میں بجلی کی کلیں نہ لگی ہوں۔ عورتیں ہاتھوں میں تھیلے اور بڑے لئے مرد بریف کیس پکڑے، بوڑھے مرد اور عورتیں چھڑیاں دبائے ایک دوسرے کے پیچھے قطار اندر قطار، انبوہ در انبوہ نامعلوم منزل کی طرف رواں دواں تھے۔ ہر ایک کی آنکھوں سے اجنبی اجنبی انتظار لگا ہوا لیکن اس کے باوجود دھیان اسٹیشن کی طرف اور میرا دھیان زہری کی اس متوقع سی بے اختیار ہنسی کی طرف تھا جس کو برسوں سے سُن رہا ہوں۔ میں سوچتا جلد یا بدیر زہری ہنسے گی اور کہے گی بھائی جان غلط آگئے۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم ایک جگہ اُتر گئے۔ اسٹیشن کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے سڑک پر آئے تو زہرہ نے مجھے برٹش میوزیم کا راستہ بتایا اور اپنے اسکول واقع فیشر لین تک لے گئی۔ طے یہ پایا کہ ہم دونوں ساڑھے تین بجے سہ پہر اسی نکڑ پر ملیں گے اور یہاں سے میں برٹش میوزیم کی طرف چل دیا۔ تقریباً پانچ منٹ بعد میں برٹش میوزیم کی عمارت کے سامنے کھڑا تھا مجھے یقین نہ آتا تھا کہ زہری کی رہنمائی میں صحیح جگہ پر پہنچ گیا ہوں۔ وہ کھلنڈری غیر سنجیدہ لڑکی جو سدا اپنے گھر کی گلیاں بھول جاتی تھی پردیس میں اتنی سنجیدہ اور ذمہ دار ہو سکتی ہے۔ اپنی نظروں پہ دھوکا ہو رہا تھا۔ بہرحال اس عمارت میں داخل ہونے سے پہلے میں اس عمارت کو دیکھتا رہا جس سے جاہ و جلال، ہیبت و شکوہ، سرفرازی اور بلندیٔ فکر کا اندازہ ہوتا تھا۔

اندر داخل ہوا تو بس یوں سمجھئے کہ ایک کائنات عجائب دو دنیا لئے رنگ و بو میں آگیا۔ ہائے دنیا میں کس قدر حُسن ہے۔ وہ حُسن کہ جس کی تخلیق انسان نے کی وہ بھی خدا کے تخلیق کردہ حُسن سے کم نہیں لیکن اس حُسن کار کو بھی خدا نے تخلیق کیا۔ (تحقیق کہ اللہ احسن الخالقین ہے) اور جب یہ دونوں مخلوقاتِ حُسن ساری کی ساری ایک جگہ جمع ہو جائیں۔ اندازہ کیجیے کیا عالم ہوگا۔ ہر ہر قدم پہ، ہر ہر شہ نشین پر، ہر محراب میں، ہر صحنچی میں، ایک گلستان عجائبات تھا کہ متحرک و

چاند نظر آرہا تھا۔ میں کبھی حیاتِ جامد کی طرف دیکھتا اور کبھی حسنِ متحرک کی طرف اور فیصلہ نہ کر پاتا کہ کون زیادہ حسین ہے۔ الیزوڈا سٹی کا۔ مجسمہ کہ جو کسی سنگتراش نے بنایا یا وہ سیماب صفت سمن بر کہ جو محافظ کے منع کرنے کے باوجود جنسی انس، یقین بر تمنا یا میلِ تقابل سے اس مجسمہ ——— کو ہاتھ لگا کر دیکھ رہی ہے۔ جی تو یہ چاہتا تھا کہ ان زندہ و بے جان مجسموں کو کہ دنیا کے گوشے گوشے سے لائے گئے ہیں ہمیشہ ہمیشہ دیکھتا رہوں تا آنکہ میں بھی ایک بے جان مجسمہ کی طرح ان ہی محرابوں میں، ان ہی غلام گردشوں میں، ان ہی دالانوں میں کسی حسین کے قدموں پر فرطِ عقیدت میں گر پڑوں۔ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔

واپسی پر زبیری اور میں لالہ کے دفتر پہنچے تو انہوں نے بتایا کہ ہاؤس آف کامنس کے کمیٹی روم میں سر سیرل پیکارڈ (جو پاکستان میں انگلستان کا کئی سال ہائی کمشنر رہ چکا تھا) کا لکچر ہے۔ موضوع پاکستان کے تاثرات تھے جو ان کی جماعت پر حالیہ پاکستان کے دورہ نے مرتب کئے تھے۔ چنانچہ اربابِ مختار کی رہنمائی اور لالہ کی ڈرائیوری کے ذریعے صحیح وسالم، بقیام ہوش و حواسِ خمسہ و بہ ثباتِ رشتۂ جاں پارلیمنٹ ہاؤس پہنچ گئے۔ وہاں جب کار سے اترے ——— تو بالکل وہی احساس ہوا جو نیل آرمسٹرانگ کو زمین پر واپسی کے بعد ہوا تھا چنانچہ اگرچہ دیر ہو گئی تھی لیکن صحیح وسالم پہنچ جانے کے مقابلے میں چنداں درخورِ اعتنا نہ تھی چنانچہ گزرے کا غم کئے بغیر زندگی کی خوشی سے مامور ہم پارلیمنٹ کی عمارت میں داخل ہو گئے۔ اگرچہ میں تنگیٔ وقت کی وجہ سے اردگرد کا مطالعہ نہ کر سکا لیکن جو تاثیر اس عمارت کے دروازے، اس کی تعمیر، اس کی اندرونی آرائش، اور غلام گردشوں میں امرا و وزرائے عظام کے مجسموں نے میرے اوپر چھوڑا، وہ یقیناً اس قوم کی بلند حوصلگی، اولوالعزمی، خوش سلیقگی، تدبر اور حب الوطنی کا تھا۔

سیرل پیکارڈ کا مختصر سا لکچر ان قومی خصوصیات کا کہ جو میں نے اوپر گنوائیں ایک اور جیتا جاگتا ثبوت تھا۔ خاص طور پر تدبر اور خوش سلیقگی کا۔ اس شخص کا لہجہ اتنا دھیما، الفاظ اس قدر ملائم، اور آواز اتنی متوازن تھی کہ بغیر کسی کے جذبات مجروح کئے اس نے اپنے وہ سارے مشاہدات بیان کر دیئے اور وہ ساری باتیں کہہ دیں کہ جو عام طور سے ہم لوگوں کو دوسروں کی زبان سے بُری لگتی ہیں اور پھر میں نے یہ بھی دیکھا کہ پاکستانیوں کے سوالات پر جس دھیمے پن سے، جس عاقلانہ و مدبرانہ انداز سے جذبات و تعصبات سے معترّی ہو کر اس نے مسائل کا تجزیہ کیا، وہ واقعی اس کے منصب و مرتبہ پر صادق تھا۔

۲۲ اپریل ۷۷ء

اکیس اپریل صبح دس بجے حسبِ پروگرام مجھے برٹش کونسل کی مس نیل کے پاس پہونچنا تھا چنانچہ صبح سویرے تیار ہو کر کپڑے وپڑے ٹھیک کر رہا تھا کہ لالہ نے تجویز پیش کی کہ ویک اینڈ تو شروع ہونے والا ہے۔ لکچرز اگر سوموار سے شروع ہونے ہیں تو آج جمعہ کے دن مانچسٹر جانے کی کیا تُک ہے۔ بات معقول تھی۔ پھر چونکہ پاکستانی سفارت خانے کی یومِ اقبال کی چھٹی بھی تھی اس لئے یہ بھی اچھا نہیں لگتا تھا کہ لالہ سے کہوں جناب کپڑے بدلیں اور مجھے برٹش کونسل پہنچا دیں چنانچہ میں نے مس موصوفہ سے ٹیلیفون پر ہی بات کی اور تھوڑی بہت ردّ و کد کے بعد بائیس کی صبح ساڑھے دس بجے تک مع تمام حجام و لاؤ لشکر ملاقات ہونا قرار پائی چنانچہ آج یہ معلوم ہو سکے گا کہ اس شُتری آمانہ کا اصل مالک کون ہے۔

۲۳ اپریل ۷۷

تقریباً پونے دس بجے سفارت خانہ سے موصوفہ کو ٹیلیفون کیا تو کہنے لگیں فوراً آجاؤ۔ مجھے "حسابِ محبت" بھی بے باق کرنا ہے چونکہ ویک اینڈ شروع

ہو رہا ہے اور ہر شخص اپنے پرانے کھاتے بند اور نئے کھاتے کھولنے کے لئے بے قرار ہے۔ میں نے بھی اس ہی میں عافیت سمجھی کہ فوراً آ پہونچ جاؤں چنانچہ ان سے ان کا محلِ وقوع معلوم کر کے مشتاق کی رہنمائی میں ٹریفلگر سکوئر چل دیا۔ یہ جگہ قریب ہی تھی لیکن ہم گیٹ میں داخل ہو کر فطری رجحان کے باعث بجائے بائیں کے دائیں مڑ گئے تھے اس لئے دفتر ڈھونڈنے میں دو چار منٹ لگے۔ بہر حال دفتر میں داخل ہوتے تو جی چاہتا تھا کہ یہیں استقبالیہ ہی میں لوٹ لگا لو۔ کم از کم استقبالیہ سے اٹھنے کو تو ہرگز طبیعت نہیں چاہتی تھی۔ تھوڑی دیر میں ان ہی کا ایک ہرکارہ مجھے ایک بڑے کمرے پر چھوڑ کر یہ کہہ کر چلا گیا کہ مس نیل آپ سے یہیں آکر ملیں گی۔ کمرہ میں داخل ہوا تو محسوس ہوا اقوامِ متحدہ کے کانفرنس روم میں آگیا۔ اس کمرے میں تقریباً تیس چالیس کسان (جمع کسی پشتو) بیٹھے تھے اور بظاہر اتنی ہی مختلف اقوام و ممالک کی نمائندگی کر رہے تھے۔ نمایاں بات یہ تھی کہ یہ سارے حاضرین و حاضرات (اگر اس قسم کا کوئی لفظ ہے) چار چار چھ چھ کی ٹولیوں میں بیٹھے اپنی باتوں میں بے طرح محو تھے۔ میں کمرے میں تھوڑی دیر کھڑا رہا کہ بیٹھنے کی جگہ ہی نظر نہیں آ رہی تھی۔ ہر گروپ کو دیکھ کر سمجھتا شاید یہ میرا گروپ ہو کہ اتنے میں وہی شخص جو مجھے پہونچا کر گیا تھا، ایک کرسی لے کر درآمد ہوا اور مجھے ایک کونے میں بیٹھنے کی جگہ مل گئی۔ اب مجھے قدرے اطمینان سے کمرے کا جائزہ لینے کا موقع ملا۔ کیا دیکھتا ہوں سامنے پرویز شیدا بیٹھا مع چند دوسرے کسانوں کے ایک خوبرو حسینہ کی تقریر سن رہا ہے نظریں ملیں۔ ماحول کا تقاضا ہاتھ کے اشارے سے چند منٹ کی مہلت طلب کی اور پھر نظریں حسینہ کے چہرے پر گاڑ دیں۔ چند منٹ بعد اٹھا گلے ملا۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور شخص کہ وہ بھی ہاؤسنگ کورس پر آیا ہوا تھا اور نا آشنا تھا، بے اختیار بڑھا اور گلے لگ گیا۔ ابھی ہم صرف چند بار ہی خیر یا علیک کر پائے تھے کہ آئندہ ملاقات کی امید پر جدا ہو گئے لیکن میں دیر تک سوچتا رہا کہ دیکھو پردیس میں وطن ہی ہماری سب سے بڑی پہچان ہے۔ یہ پہچان اتنی بڑی پہچان ہے کہ دوسری چھوٹی چھوٹی نشانیوں کو انسان خاطر میں نہیں لاتا۔

ان ہی خیالات میں گم بیٹھا ہوا تھا کہ ایک خاتون کہ صورت شکل بھی حافظے سے محو ہو چکی ہے اور نام نسب (کہ اس پر کوئی یقین بھی نہیں رکھتا) بھی یاد نہیں کچھ کہتی ہوئی میری طرف بڑھیں۔ میری سمجھ میں صرف اس قدر آیا کہ آپ کب پہونچے۔ میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے انہوں نے دوسرا سوال داغ دیا۔ مصر سے کب واپس آئے۔ میں نے عرض کیا۔ بی بی آپ کے پہلے سوال کا جواب یہ کہ ابھی ابھی پہونچا ہوں۔ دوسرے کا جواب یہ کہ ابھی مصر گیا ہی نہیں چنانچہ واپسی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگر آپ کو واقعی کسی مصری کی تلاش ہے تو وہ یہ ہو سکتے ہیں۔ یہ کہہ کر میں نے اپنے برابر بیٹھے ہوئے ایک صاحب کی طرف اشارہ کیا کہ جوانی آن بان، تن و توش، چہرے مہرے سے اہرامِ مصر کی ترقی یافتہ صورت نظر آتے تھے اور وہ خاتون بازاری (ایرانی فارسی) اس صحیح پہچانی پر ان کی طرف ایسی متوجہ ہو گئیں گویا ہم سے کبھی ملاقات ہی نہ تھی۔ ابھی اس فرنگن کے باقیات میری ہتھیلی سے پورے طور پر زائل نہیں ہوئے تھے کہ ایک کم عمر لڑکی اکیس بیس سے پچیس سال تک ہوگی، گرتی ہوئی پتنگ کی صورت سے میرے پاس آئی اور بڑی لجاجت سے پوچھنے لگی "آر یو آئی کھان"۔ میں نے بھی اتنی ہی قدوریت سے جواب دیا "کیا میں مس نیل سے مل رہا ہوں" اور پھر ایک ننھا منھا سا گرم گرم نرم نرم ہاتھ میرے ہاتھ میں آگیا۔ ہاتھ ملانے سے پہلے ہی میری نظر میں یہ بات آگئی تھی کہ اس کا ایک بازو اور کاندھا نارمل نہیں تھا۔ اس ہی کی وجہ سے اس کے قد میں بھی فرق آگیا تھا اور جسم کا نچلا حصہ اوپر کے دھڑ کے مقابلے میں بے جوڑ نظر آتا تھا۔ اس بے چاری کو بھی اپنے اس جسمانی سقم کا احساس تھا چنانچہ "حسابِ محبت برابر سر برابر" کرنے کے بعد نیچے جانے کے لئے جب اس نے لفٹ کا بٹن دبایا تو ساتھ ہی توجیہہ بھی کرنے لگی "ویسے تو ہم سیڑھیوں سے بھی جا سکتے تھے لیکن میں بڑی سست ہوں" جبکہ میں دیکھ رہا تھا کہ بے چاری کے لئے چلنا مشکل ہے۔ مس نیل سے اس طرح بے نیل مرام رخصت ہوتے وقت مجھے بار بار خیال آ رہا تھا ممتاز علی خان مرگ سچ کہتے ہیں جو گھر بھیڑے اور ماہور دی بھیڑے۔

وہاں سے نکلا تو مشتاق کو اپنا مشتاق پایا۔ اس کو لیتا ہوا یوسٹن ریلوے اسٹیشن چل دیا۔ مشتاق لندن سے خوب واقف ہے چنانچہ اس نے

مجھے بوسٹن ہی نہیں پہونچایا بلکہ پلیٹ فارم تک میرا سامان بھی اٹھا کر لایا۔ باوجود اس کے کہ میں منع کرتا رہا چنانچہ اس کی موجودگی نے مجھے دس آدمیوں سے رہنمائی حاصل کرنے کی کوفت سے بھی بچا لیا۔ واقعی میں اس کا بے حد ممنون ہوں۔ میرے پاس الفاظ نہیں کہ میرے جذباتِ تشکر کی ترجمانی کر سکیں۔ اے پاکستان تیری مٹی کے قربان۔ تیری سوندھی خوشبو نے پردیس میں بھی مجھے مست و مدہوش کر دیا۔

پلیٹ فارم پر ٹکٹ چیک کرانے کے بعد یہ سارا سامان مجھے خود اٹھانا پڑا تو محسوس ہوا کہ مشکل ہی نہیں مہنگا بھی ہے یعنی کرس بھی ہے۔ قریب ہی کچھ لوگوں کو دیکھا کہ اپنا سامان چھوٹی چھوٹی ریڑھیوں پہ رکھے آرام سے لئے جا رہے ہیں چنانچہ میں نے بھی ادھر ادھر نظر دوڑائی تو دیکھا ایک ریڑھی پر چند ریڈ کیپ بیٹھے گپ لگا رہے ہیں۔ ایک ریلوے مین نے ان سے اٹھنے کو کہا اور اشارتاً مجھ سے کہا کہ سامان اس پہ رکھ دوں تو مجھے پتہ چلا کہ موصوف قلی ہیں چنانچہ اس جنسِ نایاب کے متعلق جو کہانیاں سن چکا تھا ان سے عبرت پکڑتے پکڑتے اس ریڑھی کا اسٹیرنگ بھی پکڑ لیا اور چلا بہ جانب ڈبہ خود لیکن یہ ریڑھی کہ جس کو انگریزی میں ٹرولی کہتے ہیں اس خاندان سے نکلی جو آج کل ہمارے ان سیلف سروس سٹورز میں پایا جاتا ہے۔ اس خاندان کی ٹرالی کی چند اہم خصوصیات یہ ہیں۔ (۱) یہ چلتی نہیں گھسیٹی جاتی ہے اور محققین اس رائے پر متفق ہیں کہ چار پانچ پشت اوپر اس کا سلسلہ نسب ٹنڈرا کی سلیج سے مل جاتا ہے (۲) سمت کا تعین گاڑی کی ساخت سے ہوتا ہے آپ کی مرضی سے نہیں یعنی ایک ٹرالی صرف مشرق کی طرف جانے کے لئے ہے، دوسری مغرب کی طرف جانے کے لئے ہے بالکل جس طرح کسی عاقل نے بتایا تھا کہ یہ کیل اس دیوار کے لئے ہے اور یہ کیل اُس دیوار کے لئے (۳) اس گاڑی کو نابالغ اور چالیس سال سے اوپر کے لوگ نہیں چلا سکتے اگر کوئی چلا لے تو وہ یقیناً نابالغ نہیں ہوگا اور اس کی عمر چالیس سے زائد نہیں ہو سکتی وغیرہ وغیرہ۔ میں کہ پردیس میں تھا اور وطنِ عزیز کی ہر چیز پیار کے جذبہ سے یاد کر رہا تھا اس بات پر بڑا خوش ہوا کہ میرے جذبہ حُب الوطنی کے لئے بھی، جو اس وقت تک کافی رقیق ہو چکا تھا، روشندان مہیا کر دیا اور ساتھ ہی ان تمام سمیات کے جو لندن کے قیام کے دوران میرے جسم میں جمع ہو گئے تھے نکل جانے کا موقع فراہم کیا۔ ڈبے میں پہونچا تو ایک ہفت خوان دیگر درپیش تھا۔ یہ بڑا سوٹ کیس کس طرح مچان پر رکھا جائے۔ بڑی کوشش کی لیکن سر سے اوپر نہ اٹھتا تھا چنانچہ میں نے خالی ہاتھوں کے علاوہ جسم کے اعضائے رئیسہ کے استعمال کا بھی فیصلہ کیا اور سر سے کہ ہمیشہ معاشرے کے بورژوا طبقہ کی طرح جسم کے دوسرے طبقات پر بغیر وجہ کے بوجھ بنا کھڑا رہتا ہے، سوٹ کیس کے نیچے ٹیک لگائی اور اس کو مچان کے اندر دھکیل دیا۔ دھکیل دیا غلط سنا ہے۔ دھکیل تو جب دیتا جب اس میں اتنی جگہ ہوتی۔ وہاں اونچائی اور چوڑائی میں صرف اتنی جگہ تھی کہ بمشکل نیمے دروں نیمے بروں ہو کر رہ گیا۔ اس کارنامے کی تکمیل سے پہلے ہی محسوس کر رہا تھا کہ بنیان تر ہے۔ تکمیل پہ بالکل تر ہو گئی اور پھر بھی بقول ایک بزرگ کے (بیچارہ روتے روتے بیمار ہی پڑ گیا) اور پھر بھی مرنا تھے (ذمہ) یعنی بنام رہ گیا۔ یہ سب کچھ کرنے پر بھی یہ دھڑکا کہ اب گرا اور اب گرا۔ اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ دروازے کے باہر ہی بھاری سامان کے لئے جگہ بنی ہوئی ہے چنانچہ پھر سوٹ کیس اٹھایا اور اس کو مناسب جگہ رکھ دیا۔ اس بار مردان چیں کنندہ والا اطمینان تھا۔ اس عظیم کارنامے کی انجام دہی کے بعد میں ایک فاتحانہ مسکراہٹ اور سیاحانہ عزم لئے ایک حبشی حسینہ کے سامنے کہ ایک انگریزی کا اخبار پڑھ رہی تھی، کرسی پہ بیٹھ گیا۔ بارہ بجکر دس منٹ پر ٹرین چلی۔ ڈبے میں پہونچنے کے بعد اگرچہ گرمی لگنے لگی تھی لیکن اس خیال سے کہ یہ ترکِ غمزہ زن جو ابھی سامنے آ کر بیٹھا ہے اور جس نے ابھی اپنا کوٹ اتارا ہے کہیں یہ نہ سمجھے میری سیالی (نقل) کر رہا ہے۔ پھر یہ خیال بھی دامن گیر ہوا کہ پسینہ آیا ہوا ہے۔ ایسے میں کہیں لندن کی ہوا لگ گئی تو کہیں ایسا نہ ہو غالب کی ساری آرزوئیں مجھ پہ پوری ہو جائیں۔ مہربان کوئی نہ ہو وغیرہ وغیرہ چنانچہ معاشرے کا بہتر فرد بننے کے لئے اپنی خواہشات کا جس طرح ساری زندگی گلا گھونٹتا رہا ہوں اس کوٹ اتارنے کی خواہش کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا البتہ دل کو بہلانے کے لئے صدری کے بٹن کھول لئے جس پادری نے اتوار کے دن چرچ جاتے ہوئے اپنے ننھے سے بیٹے سے کہا تھا "ٹھیک ہے سیٹی بجا سکتے ۔ لیکن اس طرح کہ تمہیں کوئی لذت محسوس نہ ہو۔ اتنی دیر میں اس

دخترِ حبش نے اپنی زادِ راہ نکالی اور سامنے میز پر رکھ لی۔ ترکِ غمزہ زن نے بھی ایسا ہی کیا بلکہ اس نے تو کوٹ اتار کر خالص انگریزی دودھ اور مکھن بھی میز پر رکھ دیا۔ مسافرت کے ایسے توشے سامنے دیکھ کر میری بھوک بھی چمکی تو میں نے بھی خاص طور سے ان کو دکھانے کے لئے پی آئی اے کا کالا تھیلا اٹھایا اور اس میں سے ایک مناسب وقفہ کے بعد بسکٹوں کا ایک پیکٹ اور چائے کا تھرموس نکالا۔ ترکِ غمزہ زن کسی کام سے اٹھ کر جا چکا تھا اور اپنی سیٹ پر موجود نہ تھا۔ ان آبنوسی مجسموں کے لئے میرے دل میں جو کشش ہے اس کو بروئے کار لاتے ہوئے میں نے ہاتھ کی پلیٹ میں یہ بسکٹ اس کو پیش کئے لیکن "THRICE SHE WAS OFFERED AND THRICE SHE REFUSED; THE GIRL WAS HONOURABLE GIRL"

لندن اسٹیشن سے جس وقت گاڑی نکلی تو یہی معلوم ہوتا تھا کہ لاہور اسٹیشن سے شاہدرہ کی طرف جا رہا ہوں۔ کسی قسم کا فرق نہیں تھا۔ شاید بڑے ریلوے اسٹیشن ماحول کو ایک سا بنا دیتے ہوں۔ کافی دور تک لندن کے باقیات نے نہ چھوڑا۔ بالآخر وہ وقت بھی آگیا کہ زمین سبزے سے سبز تر ہوتی گئی اور آسمان شفاف سے شفاف تر۔ بادلوں میں ملوں کے دھوئیں کی ملاوٹ نہ رہی۔ تا آنکہ حدِ نگاہ تک میدانوں میں ٹیلوں میں ہر طرف کھیتوں میں سبزے کی ایک ایسی چادر بچھی نظر آتی تھی کہ جس میں کوئی سلوٹ نہ ہو۔ اس فراش کے کیا کہنے ہیں جس نے یہ فرش بچھایا۔ اسمٰعیل میرٹھی کی تیسری کتاب کی حمد یاد آنے لگی۔ قدموں تلے بچھایا گیا فرشِ لاجوردی وغیرہ وغیرہ۔ مجھ پر شعریت طاری ہونے لگی لیکن میرے اندر کا بچہ اپنے کھلونے کس طرح چھوڑ دے۔ لہٰذا نیند سے دست و گریبان تھا لیکن نیند اتنی شدید تھی کہ سارے کھلونے دھرے رہ گئے۔ ترکِ غمزہ زن، بتِ آبنوسی، یہ سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلتی ہوئی ٹرین، یہ لاجوردی فرش۔ یہ دشت، یہ میدان، میرا جسم رفتہ رفتہ سُن ہونا شروع ہوا تا آنکہ جسم کا دماغ سے تقریباً رشتہ منقطع ہو گیا۔ جب ماحول کی ہلچل نے مجھے جگایا تو مانچسٹر آ چکا تھا اور میرے ہاتھ میں شہزادی نیل کی دی ہوئی چالیس پونڈ کی رسید تھی۔ جس پر پہلا شعر

نیلم کا فلک ہے تو زمرد کی زمیں ہے — جو نقش بھی فطرت کا ہے فردوسِ بریں ہے

لکھا تھا۔

مانچسٹر پہونچا تو یوسٹن اسٹیشن کا تجربہ ساتھ لایا تھا چنانچہ ڈبے سے اترتے ہی ٹرالی پکڑ لی۔ اس پر سامان رکھا اور پلیٹ فارم سے باہر نکلنے کے لئے چل دیا۔ پلیٹ فارم کے باہر پہونچا تو معلوم ہوا ٹیکسیوں کے لئے بھی کیو بنانا پڑے گا۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد ایک پولیس والا اسٹیشن کے تکونے صحن میں دو تین ٹیکسیاں آنے دیتا کہ اس سے زائد کی گنجائش ہی نہ تھی۔ یہ اپنے مسافر اٹھا لیتیں تو پھر دو تین اور آ جاتیں۔ غرض میری باری بھی آ ہی گئی اور میں ایک ٹیکسی سے جیریلیا ہوٹل پہونچ گیا۔ "SEVENTY THREE PEA SIR" جیب میں بہت پینیاں جمع ہو گئی تھیں۔ ساری گنیں تو کل بہتر نکلیں۔ میں نے وہی اس کو تھما دیں۔ ڈرائیور بھی صاحبِ دل تھا۔ طنز پر شکریہ کا نشتر لگاتا چلا گیا۔

ہوٹل کے استقبالیہ پہونچا۔ ضروری کاغذات پر دستخط کئے۔ اپنا پاسپورٹ دکھایا۔ حسب نسب بتایا چونکہ ملک کا نام ناکافی تھا اس لئے گھر کا مفصل پتہ بھی لکھ کے دینا پڑا۔ ابھی میں "کوہلے" تک پہونچا نہیں تھا کہ فارم کی تینوں سطریں بھر گئیں۔ کاؤنٹر پر جو خاتون بیٹھی تھیں اور مجھ سے یہ سارے کاغذات بھروا رہی تھیں کہنے لگیں "مسٹر عالی کہاں کیا اتنا کافی نہیں ہے؟" میں نے کہا۔ "بی بی یہ تو میں نے صرف شہر کا پتہ لکھا ہے ابھی اپنے کنٹری ہاؤس کا پتہ تو لکھا ہی نہیں ہے۔" خانم کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا "اچھا تو آپ کا کنٹری ہاؤس بھی ہے"۔ میں نے عرض کی "بی بی ہمارے ملک میں مجھ جیسے ہر غریب کا کنٹری ہاؤس بھی ہوتا ہے۔ شہر میں تو ہم لوگ ملازمت کے لئے رہتے ہیں۔ ویک انڈ پر ضرور اپنے کنٹری ہاؤس جاتے ہیں" خانم کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ "آپ تو بڑے امیر آدمی ہوں گے" میں نے "امیر" کی تفسیر اپنے حق میں اپنی مرضی کے مطابق کی اور کہا کہ بی بی قصہ یہ ہے کہ میرے ملک کے سارے لوگ دل کے بڑے امیر ہوتے ہیں

اور وہ لوگ کہ جن کے کنٹری ہاؤز نہ ہوتے ہیں وہ تو دل کے بہت امیر ہوتے ہیں۔ خاتون کے "VERY INTERESTING" پر یہ بات چیت ختم ہو گئی اور میں ادا نیو جربلیا ہوٹل کی کنجیاں لے کر ہوٹل کی اینکسی ANNEXE کی طرف چل دیا۔ اس بار سوٹ کیس اٹھانے کا کام ہوٹل کے آدمی کے ذمہ چھوڑا کر میں نے محسوس کیا میری کمر نے پھر واہ واہ دینی شروع کر دی ہے۔ کمرے میں سامان رکھ کر واپس کاؤنٹر پر آیا تو دو خواتین کو مصروفِ کار پایا۔ ایک چہل سال عمر عزیزہ کے "اُس پاسے" یعنی تو دوسری "اِس پاسے"۔ پوچھنے پر معلوم ہوا اُدھر والی مس مونا ہیں اور اِدھر والی مس چکی CHUCKIE ہیں۔ مس مونا نے اپنے نام کے متعلق کچھ فدویت کا اظہار کیا تو میں نے کہا۔ بی بی میں اپنے آپ کو لیونارڈو سے کم خوش قسمت نہیں سمجھتا۔ میرا یہ پانچ ہزار میل کا سفر تو فوراً سپھل ہو گیا۔ مجھے امید نہیں تھی خاتون نے اپنے دبیز شیشوں کے پیچھے اپنی بھیی آنکھیں گھما لیں، اپنے سولہ مصنوعی دانت دکھائے اور اپنے سفید بالوں کو ایک ادائے دلبائی سے اٹھا کر پھر وہیں ڈال دیا جہاں پہلے پڑے تھے اور آنکھوں آنکھوں میں اپنی ہمنشین کو بھی اس جملے کی پسندیدگی سے آگاہ کر دیا۔ میں نے مس چکی کو گواہوں کے کٹہرے میں بلا لیا اور کہا مس چکی میرے بیان کی تصدیق کریں گی اور مس چکی نے بڑے شد و مد سے شہادت دی۔ کمی صرف یہ تھی کہ انگشتِ شہادت ان کی بدستور ٹائپ رائٹر پر ہی رہی چنانچہ مس مونا نے برٹش کاؤنسل ملایا اور ٹیلیفون پر میری بات کرائی معلوم ہوا مس کاڈپ (بھلا سوچیے تو یہ بھی کوئی نام ہوا) ابھی تشریف نہیں رکھتی ہیں۔ میں نے عرض کی کہ جناب کے حکم کے بموجب پاکستان سے اُڑتا ہوا پہونچا ہوں اور عین وقت پر نہیں بلکہ اس سے بھی پہلے پہونچ گیا ہوں تو میرا شوق دیکھو وغیرہ وغیرہ۔ تو بتیٔں میرے واسطے کیا حکم ہے"۔ جواب ملا کہ فوراً تشریف لے آئیے گویا کہ میں لاکھ مختار علی خاں بنوں جب تک پاکستان سے حوالے سے اپنا نام نہ بتاؤں دنیا خاطر ہی میں نہیں لاتی۔ میری ذات کچھ ہے ہی نہیں۔

ٹیکسی سے برٹش کاؤنسل پہونچا اور ایک گول میز اور ایک چوکور کرسی کی معیت میں کہ اگر صرف اس کی سیٹ کا رقبہ نکالا جاتا تو کم از کم نو فٹ مربع بنتا، انتظار گاہ میں بٹھا دیا گیا چونکہ ان حالات میں کھینچنے کو اور کچھ نہیں تھا اس لئے میں زحمتِ انتظار کھینچنے لگا مس کاڈپ۔ مس کاڈپ۔ نام کا پہلا لاحقہ تخیل کے سامنے جوہی، چنبیلی، چنپا کے بوستان جھکارا تھا اور "منتظر" الیہ" (اگر یہ کوئی لفظ ہے) شاخِ گل کی طرح لچکتی، کنوارپتے کے بار سے جھکی، حیا سے سمٹی سمٹاتی ہوئی آتی کبھی اصل نام کی طرف ذہن جاتا تو کوئی عجیب سی صورت اُبھرتی کہ جس میں جنس بھی مشکوک وغیرہ واضح نظر آتی۔ ابھی ان خیالی ہیولوں کی پہلی اشاعت بھی پریس سے پورے طور پر برآمد نہ ہوئی تھی کہ مجھے اپنے پیروں تلے کی زمین اور اپنے ارد گرد کی دوسری ساکت چیزیں مثلاً دیواریں، میز وغیرہ ہلتی محسوس ہوئیں۔ ایک لحظہ کے لئے جی چاہا کہ کمرے سے بھاگ کے صحن کی طرف جاؤں لیکن رفت کے سارے راستے مسدود کئے میرے سامنے مس کاڈپ کھڑی تھیں۔ قد چھ فٹ ایک انچ۔ وزن تین سو پونڈ سے اُدھر، اعداد ثلاثہ۔ ساٹھ پچاس ساٹھ، عمر۔ مندرجہ بالا حقائق کے پیشِ نظر چنداں اہمیت نہیں رکھتی۔ میرا ننھا منا سا ہاتھ ان کے لیم شحیم ہاتھ کے کسی کونے کو چھو کر واپس آیا تو میں نے محسوس کیا خواجہ دل محمد بھی پرستان سے یکسر تشریف لے آئے ہیں اور حسابِ محبت کی جگہ روپے پیسے کے معاملات اور بینک اکاؤنٹ، جیسے خالص دنیاوی موضوعات پر گفت و شنید میں معروف ہیں۔ ان معاملات سے فارغ ہو کر باہر پہونچا تو بس سٹینڈ پہ کھڑے بچوں سے پوچھا "اچھے بچو۔ بتاؤ میرے ہوٹل کی طرف کون سی بس جاتی ہے"۔ لیکن معلوم ہوا کہ انگلستان کے اسکولوں میں یہ چیز نصاب میں نہیں۔ حیرت ہے یہ ملک ترقی یافتہ کس طرح کہلاتا ہے۔ ہمارے ہاں تو ہر بچے کو معلوم ہے کہ آبپارہ کون سی بس جائے گی اور چودہ نمبر جوئیگی کون سی۔ چنانچہ سڑک پر کھڑا ٹیکسی کا انتظار کرتا رہا لیکن معلوم ہوا کہ یہ مشق بھی فضول ہے۔ چنانچہ پھر برٹش کاؤنسل کے دفتر پہونچا۔ اور استقبالیہ کی نو عمر خاتون سے ٹیکسی کے لئے فریاد کی۔ پیٹ الگ دکھ ٹی دے رہا تھا۔ چنانچہ بریف کیس سے کھجور کا ایک پیکٹ نکالا جو زہری نے چلتے وقت ساتھ کر دیا تھا۔ اس میں سے کچھ کھجوریں میں نے خاتون میزبان کو ٹیکسی کی زحمت دینے کے عوض پیش کیں جو اس نیک خاتون نے بڑی خوشی سے قبول کر لیں۔ جب دوبارہ یہ پیش کش ہوئی تو خاتون نے سوالیہ نظروں سے پہلے میری طرف اور پھر کھجوروں کے پیکٹ کی طرف دیکھا وضاحتاً میں نے عرض کیا

بی بی یہ خراجِ حسن ہے اور یہ آپ کا حق ہے۔ مجھے میری کم مائیگی کا طعنہ مزید نہ دیجیے اور اس کو قبول کر لیجیے کہ اس سے اقلیم حسن میں یقیناً اضافہ کا امکان ہے کسی نقص و رخنہ کا اندیشہ نہیں لیکن اس عاقل و بالغ خاتون نے جواب دیا کہ میں اسی ہی ڈر سے اس پیشکش کو قبول نہیں کر رہی ہوں کہ اقلیم حسن کہیں میرے قابو سے باہر نہ ہو جائے کہ مجبور خالص شکر ہے ٹیکسی چونکہ اب بھی نہیں آئی تھی خالی نہ بیٹھ کچھ کیا کر کے مصداق میں نے اس نیک دل خاتون سے اس کا نام پوچھا جو اس نے معہ معانی کے بتایا۔ کہنے لگی میرا نام ایورل ہے۔ فرانسیسی میں اپریل کو ایورل کہتے ہیں (نہ بھی کہتے ہوں تو میں تمہارا کیا کر سکتا ہوں)۔ میں چونکہ اپریل میں پیدا ہوئی تھی اس لئے میرے ماں باپ نے میرا نام ایورل رکھا۔ میں نے کہا ایورل سے زیادہ بہتر تو سپرنگ ہوتا اور پھر یہ نام آپ پر سجتا بھی تھا۔ بے دھیانی میں بے اختیار خاتون نے کہا "ہاں واقعی"۔ پھر یکدم خیال آیا کہ کیا کہہ گئی تو کہنے لگی "آپ مذاق کر رہے ہیں"۔ میں نے کہا "بی بی میں نہیں کر رہا وہ تو آپ کے والدین نے کیا اور آپ خاموش رہیں۔ میں چونکہ پردیسی ہوں آپ کو میری سچی بات پر اعتبار نہیں آ رہا۔ حق پرستی میں تو انگریزوں کی بڑی روایتیں ہیں"۔ یہ مکالمہ جاری تھا کہ ایک شریف آدمی کمرے میں داخل ہوا اور سیدھا ایورل کے پاس پہونچا۔ دل محمد نے کہا۔ یہ بھی شاید میری طرح کا نو گرفتار ہے نمعلوم کہاں سے آیا ہے کہاں جائیگا۔ نمعلوم اس کا کورس کتنے عرصے کا ہو۔ قطرہ قطرہ۔ خانم میزبان نے کہ کاؤنٹر پر بیٹھی پیپر پڑھ رہی تھیں یکدم اس عمل کو موقوف کیا اور محبت سے کہا "دیر یہ آید"۔ میں کہ ابھی جواب کا منتظر تھا حسرت گوش لئے ہوئے ٹیکسی کی طرف سدھارا۔ حیف در چشم زدن ....

واپسی پر ہوٹل پہنچا اور ہوٹل سے صنم رستوران کہ مس کاڈپ نے بڑی شد و مد سے اسکی تعریف کی تھی۔ نقشہ بنا کر ساتھ لے گیا تھا اس لئے بغیر بھولے بھٹکے پہونچ گیا۔ کھانا کھایا تو مرچوں نے فشار نکال دیا۔ ناک پونچھتا تو پسینہ ٹپکتا۔ پسینہ خشک کرتا تو آنکھیں ڈبڈبا تیں۔ میں نے اپنے آپ کو لاکھ پٹھن دلی کے واسطے دیے۔ خان صاحب لوگ کیا کہیں گے۔ اتنی سی مرچوں میں سو سو کرنے لگے۔ کچھ حوصلہ کچھ استقامت لیکن دل محمد خان کہنے لگے۔ پٹھن دلی کا واسطہ مرچوں کے معاملے میں مت دینا ورنہ میں اس مرتبہ سے بھی انکار کر دونگا۔ میں شیخ میرا باپ شیخ دادا شیخ پردادا شیخ .... یہ صورت حال دیکھی کہ معاملہ ایمان سے ارتداد تک پہونچنے والا ہے تو میں نے بڑے خالص لاہوری انداز میں کاؤنٹر کے جوان کو کہ چہرہ فروغِ پان سے گلستان کئے ہوئے کھڑا تھا، آواز دی۔ "پلوان۔ پلوان آیا تو میں نے کہا "پلوان تمہارے ہمارے درمیان کون سی دشمنی ہے اور میرے گھوڑے کب تمہارے کھیت میں گھسے تھے پلوان کہ "یکے از محلہ" بھاٹی گیٹ معلوم ہوتا تھا بیسا صاحب دل نکلا کہ مزید وضاحت کئے بغیر واقعہ کی تہ تک پہونچ گیا (میرا چہرہ بھی یقیناً عرض حال کر رہا ہوگا)۔ کہنے لگا۔ "جی کیا سالن میں مرچیں زیادہ ڈال دیں"۔ میں نے کہا پلوان زیادہ کا لفظ ان مرچوں کے لئے صحیح لفظ ہی نہیں۔ پلوان نے فوراً باورچی کو آواز دی اور اس سے پہلے کہ باورچی آئے صورت حال کی وضاحت کے طور پر کہنے لگا۔ "باورچی۔ یہ بڑے کم بخت، بیہودہ ہیں۔ روز روز نئے نئے بندے پاکستان سے آجاتے ہیں اور اپنے آپ کو باورچی کہتے ہیں، کم بخت۔ یہ نہیں جانتے یہاں مرچیں بھی خالص ملتی ہیں"۔ یہ کہہ کر پلوان نے مجھے دہی کا پیالہ لا دیا کہ تلافی مافات و اتمام حجت کا اس سے بہتر اور کوئی طریقہ نظر نہ آتا تھا۔ ساتھ ہی پلوان نے مجھے اپنا نام بھی بتا دیا "جی میرا نوں بٹ آکھدے نیں"۔ ہوٹل سے ٹہلتا ہوا واپس آیا لیکن راستہ بھر رہ رہ کر ان مرچوں کے عواقب کا خیال ستاتا رہا۔ تا آنکہ ہوٹل کی دہلیز پر قدم رکھتے ہوئے یہ سوچ کر کہ ہنوز سحر دور است سچے مسلمان کی طرح ان وسوسوں کو دل سے نکال دیا۔

ٹی وی لاؤنج میں پہنچا تو سیکنڈوں نہیں تو بیسیوں حضرات و خواتین تشریف فرما تھے۔ یہ سارے کے سارے لوگ مختلف کورسز کے سلسلے میں آئے ہوئے تھے اور اسی ہوٹل میں پڑے تھے۔ ایکسٹینشن کورس کی ایک خاتون مسز ریڈ ہیڈ سے جو جزائر غرب الہند سے آئی تھیں اور صورت شکل سے بالکل ہندوستان پاکستان کا مال نظر آتی تھیں ملاقات ہوئی۔ ان کے علاوہ لنکا کے ارون اور انڈونیشیا کے عبدل سے بھی ملاقات ہوئی۔ یہ دونوں بھی اس ہی کورس پہ آئے تھے۔ فنانس کے جو لوگ تھے ان میں مسٹر کماچو سے کہ پناما سے آئے تھے، ملاقات ہوئی۔ ان کے علاوہ نائیجیریا کی مس باٹیوی اور ہندوستان کی کرشنا بھٹناگر سے بھی ملا۔ یہ سب لوگ آج ٹی وی لاؤنج ہی میں مل گئے۔

حسین شاہد

اُٹھ باندھ کمر کیا ڈرتا ہے

ایران میں میرا قیام قریب قریب دو سال تک رہا۔ اس وقت اَن گنت واقعات قطار اندر قطار میرے سامنے کھڑے ہیں۔ ہر واقعہ ملتجی ہے کہ مجھے بھی لکھ اور مجھے بھی۔ میں کچھ بھی تو نہیں لکھنا چاہتا۔ یہ چاہتا کا لفظ میں نے کیسے لکھ دیا۔ اسے جھوٹ سمجھئے۔ اس لیے نہیں لکھ رہا کہ ہر واقعہ پر میں خود سے سوال کرتا ہوں کہ اسے لکھنے سے کس کو کیا فائدہ ہوگا۔ پڑھنے والا غریب ہوگا تو دھاڑیں مار کر روئے گا۔ امیر ہوگا تو مجھے کوسے گا کہ خواہ مخواہ اس تحریر پر وقت برباد کیا حالانکہ پرو گرام کی ابھی تین کتابیں پڑھنے والی پڑی تھیں۔ اس شخص کو یہ بھی معلوم نہیں ادب تفریح کے لیے لکھا اور پڑھا جاتا ہے۔ اگر میرا قاری مڈل کلاسیا ہوا تو کہے گا یہ آدمی خود رحمی کا مریض ہے اور جھوٹا ہے۔ اس نے جو کچھ لکھا ہے اس میں زیب داستان کے لئے اپنی محرومیوں کو مبالغہ آمیز حد تک گمبھیر دیا ہے۔ اِن اَرا کا مجھے اس کے باوجود یقین ہے کہ میں اپنی بات کو من وعن اخباری رپورٹ کی طرح ہی کیوں نہ بیان کر دوں۔ لوگ کہیں گے ایسے دردناک اتفاقات تو فکشن میں لکھتے ہوئے بھی انسان جھجکتا ہے کہ کوئی مانے گا بھی یا نہیں۔

میں وہ سب کچھ اس لئے بھی نہیں لکھتا کہ میرے ساتھ جو کچھ پیش آتا رہا وہ میرے ہموطنوں کی اکثریت کا مقدر ہے۔ پھر مجھے کون سا سرخاب کا پَر لگا ہے جو خود کو اپنے بھائی بندوں سے ممتاز خیال کروں۔ میرے ساتھ جو کچھ بیتی اُس کا مجھے یوں بھی کوئی گلہ نہیں کہ اوروں کے ساتھ اس سے بھی بڑھ کر بیتی ہوگی۔ البتہ اس بات کا دُکھ مجھے بہت زیادہ ہے کہ میرے بیوی بچوں کو میرے بیوی بچے ہونا بہت مہنگا پڑا۔ جب تک میں ملازمت کرتا رہا وہ بالعموم لوگوں سے میرا محکمہ بتانے سے گریز کرتے اور اس طرح دروغ گوئی کے مرتکب ہوتے رہے۔ اگر کہیں بتا دیتے کہ ہمارے خاندان کا سربراہ کسٹم آفیسر ہے تو لوگ ان کو یوں دیکھتے جیسے گداشاہوں کو دیکھتے ہیں لیکن اگر کوئی ہمارے گھر کا چکر لگا جاتا تو دیکھنے کا عمل اُلٹ صورت اختیار کر جاتا۔ پھر جب میں نوکری چھوڑ کر باہر جانے لگا تو ہم سب کے دلوں میں اندر ہی اندر یہ چور تھا کہ کوئی دن کی بات ہے میں علی بابا کے غار میں پہنچ کر پہنچا اور دولت کے گدھے لاد کر لایا کہ لایا۔ لوگوں نے سُنا تو کہا خدا جانے کس خزانے کی چابی ہاتھ آگئی ہے کہ اس نے کسٹم آفیسری سے استعفیٰ دے دیا ہے لیکن ہوا وہی کہ جہیڑے ایتھے بھیڑے اوہ لہور وی بھیڑے۔ بیوی بچوں کی شامت یوں آتی رہی کہ لوگ تھانیداروں کے تفتیشی اور وکیل استغاثہ کے جرحی انداز میں ان سے پوچھا کرتے کہ پہلے —— اب باہر چلا گیا ہے آخر اتنی دولت کو کہاں لٹا دیتا ہے۔

گھر سے آنے والے خط میری بیٹی لکھا کرتی تھی۔ اس کی ماں نے پہلے ہی خط میں لکھ دیا تھا کہ اب ہمیں خود کو پس منظر میں رکھ کر بچوں کو آگے کرنا چاہیے بیٹی کے خط جو سب کی طرف سے ہوتے تھے پڑھ کر مجھے بیوی، بیٹی اور بیٹے کے لفظوں سے بھی محبت ہو گئی۔ میں سوچا کرتا تھا کہ میرے رب نے کتنا بڑا کرم کیا جو ان رشتوں میں ایسے انسان مجھ سے وابستہ کر دیے جن کا خاوند یا باپ ہونا خوش بختی کی علامت ہے لیکن کبھی کبھار وہ اپنے بھولپن میں کوئی ایسی بات

بھی لکھ جاتی جسے پڑھ کر شادی کرنے اور دو بچے پیدا کرنے کو میں اپنا جرم سمجھنے لگ جاتا۔ ایک خط میں ایک ہی ایسا جملہ ہوا کرتا تھا لیکن میں یاد رہ جانے والے چند جملے اکٹھے ہی لکھ رہا ہوں ———

——— "ابو! آپ کی جدائی کچھ کم تھی کہ ساتھ ہم لوگوں کی جیب بھی محاجت رہتے ہیں۔ ہاں یاد آیا البراوہ جو ہمارے گھر سے کچھ دُور رہتے ہیں۔ وہی جو ضرورت پڑنے پر استری ہمارے ہاں سے مانگنے آتے تھے، ٹیلیویژن اب ان کے گھر میں بھی آگیا ہے ...... ابو! کل خواہ مخواہ کی شرمندگی اٹھانی پڑی۔ میری ایک سہیلی آئی ہوئی تھی۔ اسے پانی میں بازار کی برف ڈال کر دی تو کہنے لگی یہ برف آن ہائی جینک ہوتی ہے۔ ہمیشہ فرج کی برف استعمال کیا کرو ...... ابو! وہ بڑھیا جس کے بیٹے نہ پڑھ سکے تھے اور نہ کوئی کام کر پاتے تھے۔ وہی جو ایک کوٹھڑی ہی میں دس کے قریب افراد رہتے ہیں۔ ان کا ایک لڑکا آپ سے کوئی چھ ماہ بعد کسی ملک میں باہر چلا گیا۔ اب اس کی ماں ہمارے ہاں آتی ہے تو بیٹے کی بھیجی ہوئی اشیاء ایک سانس میں گن نہیں پاتی۔ پھر ہم سے پوچھتی ہے تمہیں کیا آیا ہے۔ یہ لوگ دوسروں کے بارے میں کیوں پریشان رہتے ہیں؟" ———

گھر والوں کے علاوہ پاکستان میں میری خط و کتابت صرف ایک ہی بندے سے ہوا کرتی تھی جس کا نام فخر زمان ہے اور جس کی وجہ سے لفظ دوست میری زبان پر آتا ہے تو منہ میں مٹھاس سی بھر جاتی ہے۔ ہم ایک دوسرے کو پنجابی میں خط لکھا کرتے تھے۔ ایک خط میں اس نے لکھا "شاہد جی! میں ایہہ سوچ سوچ کے سڑ دا رہنداں پئی جے کدے تہاڈے ورگے لوکاں لئی کیوں رہ گئے نیں۔ جے تُسیں اگّا ناکام ہو گئے او تے چھیتی توں چھیتی واپس آجاؤ۔ مینوں ہن تائیں ایہہ سمجھ نہیں آئی پئی میں تہاڈیاں پیڑاں کیویں ونڈاں پر اک گل پکی سمجھو۔ میرا افر در سوخ اوس وقت تائیں جاری رہوے گا جدوں تائیں تہانوں ہزار باراں سو روپے مہینے دی کوئی جاب نہیں مل جاندی۔ میں ایس بارے کوشش شروع دی کر دتی اے۔ جے تُسیں آجاؤ تے ایہہ کم پتھر تے لکیر سمجھو۔ میں ایہہ کم کر کے ساہ لواں گا۔"

ایران میں گزرے ہوئے واقعات پھر صف باندھے آن کھڑے ہوئے ہیں۔ میں ان میں سے دو لطیفے سنانے پر اکتفا کروں گا کہ ادب تفریح کے لئے لکھا اور پڑھا جاتا ہے۔

دن کے وقت جس میز پر کام کیا کرتا تھا رات کو اُس کے نیچے سویا کرتا تھا۔ کیسی کامیڈی ہے؟۔ دو تین دفتروں کی مشترکہ آبداری میں کھانا پکایا کرتا تھا۔ آبداری اُس چھوٹے سے کمرے کو کہتے ہیں جہاں مہمانوں کے لئے مشروبات رکھتے ہیں۔ جیسا کہ نام ہی سے ظاہر ہے اس کمرے میں یا کولڈ ڈرنک ہوتے ہیں یا چائے بنائی جاتی ہے۔ میں اس سے جو کام لیا کرتا تھا وہ شرفاء کے نزدیک خلافِ آداب سمجھا جاتا ہے۔ شرافت ہی کا بھرم رکھنے کے لئے میں ہنڈیا اُس وقت چڑھایا کرتا تھا جب اس جگہ کا مجازی مالک وہاں نہیں ہوتا تھا۔ چوری کا اقبالِ جرم! مجازی مالک اس لئے کہ موصوف نے یہ جگہ حقیقی مالک سے کرائے پہ لے کر سب لیٹ (SUBLET) کی ہوئی تھی۔ وہ کمرے اُس کے اپنے مصرف میں تھے۔ میز کے نیچے سونا بھی شرفاء کے نزدیک معیوب تھا۔ اس ضمن میں پوری بلڈنگ کا چوکیدار میرا رازداں تھا۔ اسے فارسی میں پاسبان کہتے ہیں۔ میں نے ایک دن بڑھ کے اُس کے قدم لے لئے۔ ہر ماہ کچھ نذر و نیاز کا وعدہ کیا اور اس طرح وہ مجھے گدا سمجھ کے چپ ہو لیا۔ رشوت کا اقبالِ جرم! یہ دونوں اقبال میں اس لئے کر سکا ہوں کہ اب میں ایرانیوں کی دسترس سے باہر ہوں۔ دونوں لطیفوں کا تعلق میرے کھانا پکانے اور سونے سے ہے اگر بنیادی طور پر جانور نہ ہوتا تو کھانے اور سونے سے چند دن احتراز بھی تو کر سکتا تھا۔

کھانا پکانے کی سازش میں دفتر کا چپراسی میرا رازداں تھا۔ ہم نے لوگوں کے معمولات کا گہرا مطالعہ کیا اور اس غیر شریفانہ کام کو اُس وقت کیا کرتے جب ہم دونوں تنہا ہوتے۔ پھر کھانا پکانے کے بعد یخ سردی کے باوجود دفتر کے دروازے اور کھڑکیاں کھول دیا کرتے تاکہ بدبو، خوشبو، سڑاند، مہک، مشک، ہواڑ (پڑھنے والے اپنی پسند کا لفظ منتخب کر لیں) جلدی سے جلدی باہر نکل جائے۔ ایک دن ہم ابھی ابتدائی تگ و دو کے مراحل میں تھے کہ مجازی مالک

بالکل خلافِ معمول اُوپر سے آگیا۔ میں نے فوراً آبداری کا دروازہ بند کر لیا لیکن اُوپر کے چپڑاسی تمام کے تمام کردن میں ہوا کے دوش پر تھے۔ اُس نے جب یہ عجیب و غریب حادثہ اپنی ترت شلمہ کیساتھ ہوتا محسوس کیا تو آبداری کو لپکا۔ میں کہ سنے کا برتن چولہے سے اتار کر ایک طرف رکھ چکا تھا لیکن اس میں سے اٹھنے والی بھاپ کی وجہ سے رنگے ہاتھوں پکڑا گیا۔ جو چپ رہے گی زبانِ خنجر لہو پکارے گا آستین کا۔ میں آج تک اُس آدمی کا ممنون ہوں کہ اس نے مجھ سے تو کچھ نہیں کہا لیکن چپڑاسی لڑکے کو بلا کر اسے آناد کی سی فصاحت و بلاغت سے گالیاں دیں۔ جب وہ چلا گیا تو لڑکے نے پورے جوش سے کہا: "آغا شاہد! آج کے بعد بھی کھانا یہیں پکے گا اور یہ کیت پکے گا"۔ اس طرح ایرانیوں میں پھوٹ ڈال کر باقی عرصہ میں نے ان پر پورے ٹھہرے حکومت کی۔

سونے کا معاملہ یوں تھا کہ چھٹی کے وقت میں سب کے سامنے دفتر سے چلا جاتا اور پھر شام گہری ہونے پر واپس آ جایا کرتا۔ ایک دن اسی طرح آیا تو مجازی مالک ابھی تک دفتر میں موجود تھا۔ ہم دونوں بے وقت ایک دوسرے کو دفتر میں پا کر تحیر کی دلدل میں پھنس گئے۔ اس موجودگی کا اپنی اپنی جگہ ہم نے جو جواز پیش کیا وہ دروغ گوئی کی تاریخ میں سنہری حروف سے لکھا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد میرے اور اُس کے درمیان مسابقہ شروع ہو گیا کہ ہم میں سے پہلے کون نہیں جاتا۔ آخر کار وہ مجھ سے سیانا نکلا۔ اٹھا اور خدا حافظ کہہ کر چلا گیا۔ میں سوتے وقت دروازہ اندر سے مقفل کر لیا کرتا تھا اس ارادے کے ساتھ کہ کچھ ہو جائے دن چڑھے تک اسے کھولوں گا نہیں۔ رات کے کسی حصے میں میرے اندر کی آبداری نے اُبال کھایا اور مجھے اُٹھنا پڑ گیا۔ اچانک مجازی مالک کے کمرے سے آہٹ سی سنائی دی۔ میں نے کچھ سوچے بغیر اضطرار کی کیفیت میں دروازہ کھول دیا۔ نیم تاریک کمرے میں ایک صوفے پر میں نے وہ عمل ہوتے دیکھا جو ابتدائے ازل سے دنیا میں ہو رہا ہے اور انتہائے ابد تک ہوتا رہے گا لیکن اس کے بارے میں ابھی تک یہ فیصلہ نہیں ہو سکا کہ وہ عمل اچھا ہے یا برا۔ صبح ہونے سے کوئی دو گھنٹے پہلے عامل اور معمول کے درمیان کسی بات پر جھگڑا شروع ہو گیا اور بنتِ حوا کوسنے دیتی ہوئی باہر چلی گئی۔ میں خوش ہوا کہ مجازی مالک میرا کانا ہو گیا ہے اب پوں بارہ ہیں لیکن میری توقع کے برعکس اگلے روز مجھے ایک ہفتے کے نوٹس پر میز کے نیچے سونے سے محروم کر دیا گیا۔ نئے مالک نے میرے ساتھ جو سلوک کیا اس کا ذکر شاید کبھی آ جائے۔ وہ بھی مجازی مالک ہی تھا۔

ن۔م راشد مرحوم میرے ساتھ بڑی محبت سے پیش آیا کئے اور کئی دفعہ گھر میں بھی بلایا۔ غالب کے ہاں تو بوریا نہیں تھا یہاں گھر ہی نہیں تھا کہ ان کو بلاتا اور پھر کبھی ان کو دیکھتا اور کبھی اپنے گھر کو۔

سو قارئین! لطیفے تمام ہوئے۔ اگر آپ کو ہنسی نہیں آئی تو آپ کا باذوق ہونا مشکوک ہے۔

لندنی دوستوں نے مجھے کچھ ہدایات دی تھیں۔ ساتھ کہا تھا چھ ماہ تک ان فرمانوں پر نیک نیتی سے عمل کرو اگر پھر بھی کامیابی نہ ہوئی تو تمہارے بارے میں سوچا جائے گا۔ میں نے ان کی ہدایات پر اسی نیت سے عمل کیا جسے وہ نیک اور میں بد سمجھتا تھا لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ آخر کار ان کی طرف سے پیشکش آ گئی کہ جرمنی کی ایک فرم مجھے آزمائشی موقع دینے کو تیار ہے۔ اگر انہوں نے مجھے کارآمد پایا تو رکھ لیں گے نہیں تو اگو تیرے بھاگ لچھے۔ ایک دوست نے ہالینڈ میں بحالی کی امید دلائی۔ فرزبان کی پیشکش کا ذکر ہو ہی چکا ہے۔ فیصلے کی گھڑی آئی تو مجھ پر کئی دن سکتہ سا طاری رہا کہ کدھر کا رُخ کروں۔ سکتے کے عالم میں سوچتے سوچتے میری نظروں کے سامنے ایک ٹھنا سا لڑکا آ گیا جس کے بدن پر سر سے پاؤں تک صرف ایک قمیض (جھگا) ہوا کرتی تھی۔ موسم سردی کا ہو یا گرمی کا وہ ہر یلغار کا مقابلہ صرف جھگے سے کیا کرتا تھا۔ اس کے باوجود جماعت کا مانیٹر ہوا کرتا تھا۔ کتاب میں ایک نظم ہوا کرتی تھی جو جھگے والے نے دو دن میں ازبر کر کے سنا دی لیکن باقی جماعت کو یاد نہیں ہو پاتی تھی۔ ماسٹر صاحب دوسرے تیسرے دن جماعت کو کھڑا کر دیتے کیوں کہ بیٹھے رہنے سے لڑکے ہنگامے لگتے تھے۔ جھگا پوش آگے آگے بولتا اور لڑکے اس کے پیچھے پیچھے سُر اُٹھایا کرتے ؂

اُٹھ باندھ کمر کیا ڈرتا ہے   پھر دیکھ خدا کیا کرتا ہے

جب یہ لڑکا تھوڑا سا اونچا ہوا تو جھگّے کے نیچے ایک چیتھڑا تہبند کے نام پر باندھ دیا گیا کہ اب نیچے سے ننگا رہنا بے شرمی کی بات تھی۔ ان دنوں اُس نے "سوہنی کمہارن" نام کی فلم دیکھی جس کا ایک گانا اُس کے دل میں یوں اُتر گیا جیسے سوہنی اور مہینوال ایک دوسرے کو دیکھتے ہی ایک دوسرے کے دل میں اُتر گئے تھے مہینوال کو تو سوہنی مل گئی لیکن اُس لڑکے کے جوڑوں میں تمام عمر کے لئے وہ گانا بیٹھ گیا ؎

اٹھ جاگ سفر توں جانا ایں ایہہ دنیا مسافر خانہ ایں

اُس لڑکے نے مجھ سے کہا ڈرتے کیوں ہو جرمنی چلو۔ یہ لڑکا اِس تحریر کے ہیرو کا بے بی رول تھا۔

ہجرت در ہجرت کا فیصلہ غالباً میں نے اِس لئے بھی کیا کہ ہجرت میرے خون میں شامل تھی۔ آج سے کوئی ایک صدی پہلے سیالکوٹ کے ایک گاؤں میں دو بھائی رہا کرتے تھے جن کے پاس چند بیگھے زمین تھی۔ گاؤں کی اکثریت سکھوں پر مشتمل تھی جن کو یہ دونوں بھائی ایک آنکھ نہیں بھاتے تھے۔ ایک دفعہ کھُوہ جوتنے کی باری پر جھگڑا ہو گیا۔ سکھوں نے الٹی میٹم دے دیا کہ دوسری صبح وہ ہر قیمت پر کھُوہ جوتیں گے۔ اُن دونوں بھائیوں نے راتوں رات کھُوہ کی کانجن اکھاڑی اور اسے کہیں دُور دراز پھینک دیا۔ محتاط اندازے کے مطابق بھی یہ کام کم از کم پانچ آدمی ملتے تو مشکل کر پاتے۔ دوسرے روز سکھوں نے جب یہ ماجرا دیکھا تو باقی تمام عمر کے لئے ان کے دلوں پر ان بھائیوں کی دہشت سوار ہو گئی۔ بڑے بھائی کی پانچ چھ اولادیں تھیں لیکن چھوٹے کا ایک ہی لڑکا تھا۔ کچھ عرصے کے بعد ملک گیر طاعون پھیلی اور دونوں گھروں کے تمام افراد مر گئے۔ بڑے بھائی کا ایک بیٹا اور چھوٹے کا اکلوتا بیٹا شاید صرف اس لئے بچ گئے کہ یہ کتاب لکھی جا سکے۔ یہ دونوں بچے جب یتیم ہوئے تو خانہ بدوشی ان کا مقدر ٹھہری۔ یہ دونوں کارل مارکس کے صحیح کردار تھے کہ کسان بھی بنے اور مزدور بھی لیکن کسی قسم کا انقلاب نہ لا سکے۔ گاؤں گاؤں گھومتے رہے۔ ایک دن دونوں کے درمیان رنجش پیدا ہوئی۔ بڑے بھائی نے چھوٹے کو بُری طرح مارا۔ چھوٹا نہایت فرمانبرداری سے مار کھاتا رہا اور پھر شام تک غائب ہو گیا۔ خانہ بدوشی اب بھی جاری رہی لیکن راستے جدا جدا ہو گئے۔ چھوٹے نے اپنا اصل ٹھکانا کبھی نہ بتایا لیکن جب خون جوش مارتا تو کبھی کبھار آ نکلتا اور چند دن رہ کر پھر غائب ہو جاتا۔ آخر کار شیخوپورہ کے کسی گاؤں سے اُس کے بیمار ہونے کی اطلاع ملی۔ بڑا بھائی خبر لینے گیا۔ کوئی ایک مہینے کے بعد واپس آیا تو اُس غریب الدیار تنہا آدمی کو دفن کر کے آیا۔ اس کی موت پر کھلا کہ اُس نے تمام عمر شادی بھی نہیں کی تھی۔ جو دفن کر کے لوٹا تھا میں اُس آدمی کی پانچویں اور آخری اولاد ہوں۔ سب سے بڑی بیٹی تھی جو پندرہ سولہ سال کی عمر کو پہنچی تو مر گئی۔ تیسرے نمبر پر پیدا ہونے والا لڑکا بھی بچپن میں چل بسا۔ باقی بچے تین کہ تادمِ تحریر زندہ ہیں اور صاحبِ اولاد۔ ہجرت کا حسبِ توفیق حصہ ہم تینوں کو بھی ورثے میں ملا۔ بس مجھے ذرا زیادہ مل گیا۔

انگلستان کے بعد یورپ کا جو ملک میرے علم میں آیا وہ جرمنی ہی تھا۔ اتنی چھوٹی عمر میں اس ملک سے تعارف کا سبب اڈولف ہٹلر بنا جس نے مجھے پوری طرح ہوش بھی نہ سنبھالنے دیا کہ جنگ شروع کر دی۔ اُس وقت میری عمر آٹھ سال تھی۔ میری اطلاعات کا ذریعہ گاؤں کے وہ اَن پڑھ لوگ تھے جو ہٹلر کو "جرملیا" کہا کرتے تھے۔ یعنی ملک جرمل کا حاکم ان کے لئے لفظ جرمن کا تلفظ بھی مشکل تھا۔ جنگ کی خبر سب سے پہلے میں نے گاؤں کی مسجد میں سُنی کسی نے کہا کہ جرملیے نے انگریزوں کے ساتھ جنگ چھیڑ دی ہے۔ کہاں چھیڑ دی ہے یہ نہ ان کو معلوم تھا نہ مجھے معلوم ہو سکا۔ اس روز تو جنگ مجھے کسی اور ہی جہان میں ہوتی ہوئی لگی لیکن وقت گذرنے کے ساتھ برطانوی ہند نے مجموعی طور پر اور میں نے انفرادی طور پر جنگ کو آتے محسوس کیا۔ دوسری عالمگیر جنگ نے مجھے ہر وقت خوف و ہراس کی کیفیت میں مبتلا رکھا اور پھر یہ خوف و ہراس عمر بھر کے لئے میری عادتِ ثانی بن کر رہ گیا۔

سب سے پہلے تو جبری بھرتی کی افواہیں اڑیں۔ ہم تینوں بھائیوں میں سے صرف بڑا اس قابل تھا کہ اسے بھرتی کیا جا سکے۔ باقی افرادِ خانہ بھی کچھ نہ کچھ تشویش ہوا کرتے لیکن میرے دل کو تو جیسے روگ لگ گیا کہ کسی بھی وقت افسر آئیں گے اور میرے بھائی کو پکڑ کر لے جائیں گے۔ اس کے ساتھ ہٹلر کی ان کامیابیوں کا

چرچا ہوا جو اس نے جنگ کی ابتدا میں حاصل کیں۔ افواہ اُڑی کہ جوبلے نے کہہ دیا ہے وہ فلاں تاریخ کو فلاں وقت کلکتہ میں چائے پیئے گا۔ اس کے ساتھ ہٹلر کے ظالمانہ کارناموں کے قصے۔ مجھے یوں محسوس ہوا کرتا تھا کہ ہٹلر جیسے صرف مجھے پکڑنے اور اذیت دے دے کر مارنے کے درپے ہے۔ چیزیں مہنگی ہونی شروع ہوئیں تو گھر میں سب سے چھوٹا ہونے کے باوجود سب سے زیادہ غم مجھے ستانے لگا۔ پھر بمباری کی افواہوں کے ساتھ لوگوں نے گھروں کی چھتوں پر ریت ڈالنی شروع کی۔ کسی کو یہ تک معلوم نہ تھا کہ ریت کی یہ آدھ انچ تہہ بم کو اتنا ہی روک سکے گی جتنا ململ کی گُرتی گولی کو بدن کا لباس روک سکتا ہے۔ مجھے وہم مارنے لگ گیا کہ کیا معلوم جب بم ہمارے گاؤں پہ گرایا جائے تو وہ سیدھا ہماری چھت پہ ہی آن پڑے۔

جب جنگ کے دوران ہی پرائمری پاس کرکے "اعلیٰ" تعلیم کے لیے شہر کا رُخ کیا تو حالت اور بھی مضحکہ خیز ہو گئی۔ افواہوں کا ذکر شہر میں کسی سے کرتا تو وہ ہنس دیتا لیکن گاؤں پہنچ کر دیکھتا کہ نہ صرف افواہ پر یقین کیا جا چکا ہے بلکہ اس کے مطابق "حفاظتی" اقدامات بھی ہو رہے ہیں مثلاً ایک دفعہ کسی نے اڑا دیا کہ خون جمع کرنے کے لیے حکومت بچوں کے ختنے کرنے والی ہے اور ہر ختنہ سے ایک پاؤنڈ خون نکالا جائے گا۔ پھر کیا تھا گاؤں کی نائی برادری کے وارے نیارے ہو گئے۔ گاؤں میں پیدائش کے ساتھ ہی ختنہ کرنے کا رواج آج بھی نہیں ہے اور ان دنوں تو پانچ چھ برس کی عمر تک بھی لاپرواہی برتی جاتی تھی۔ چند ہی دنوں میں یہ عالم ہو گیا کہ کوئی نہ کوئی بچہ ہر گھر میں رالکھ بھبھوت کا لنگوٹ باندھے چارپائی سے لپٹا ہوا پایا گیا۔ گلی کوچے بچوں کے کھیل کود اور ہنگامہ آرائی سے محروم ہو گئے۔

آہستہ آہستہ ایک تو شہر میں آمد و رفت بڑھی، کچھ عمر بڑھی اور کچھ تعلیم تو اعتماد سا بحال ہونے لگ گیا۔ اس کے ساتھ تحریک پاکستان سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ جنگ کے بارے میں اب سوچ نے یہ رُخ اختیار کیا کہ اوّل تو وہ ہم سے بہت دُور ہے اور پھر ہم تک آ بھی گئی تو ہمہ یاراں دوزخ ہمہ یاراں بہشت اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے۔ ایک طبقہ اس خیال کا بھی تھا کہ جرمنی ہمیں فتح کرے تو اچھا ہے انگریزوں سے تو جان چھوٹے گی۔ خدا جانے ہٹلر کو اس طبقے کی موجودگی کا کیسے علم تھا کیونکہ البرٹ شپیر نے اپنی کتاب INSIDE THE THIRD REICH میں لکھا ہے کہ ہٹلر اپنے فوجی جرنیلوں سے کہا کرتا تھا کہ مزاحمت کا امکان صرف افغانستان تک سمجھو۔ ہندوستان میں تم رائفل در بغل داخل ہو جاؤ گے اور لوگ تمہارا استقبال کریں گے۔

ایک طرف آزادی کے چرچے تھے اور دوسری طرف فضا میں جنگ کی وجہ سے ہلچل تھی۔ ہر طرف ایک اشتہار نظر آیا کرتا تھا جو فوج میں بھرتی ہونے کی ترغیب دلایا کرتا۔ اس پر ایک فوجی تین انگلیاں کھڑی کیے ہوئے دکھایا گیا تھا اور نیچے لکھا ہوتا تھا۔ "تین باتیں۔ اچھی خوراک، اچھی تنخواہ، جلدی ترقی"۔ ہمارے کئی شاعر اور ادیب ترغیبی ادب لکھنے پر ملازم تھے، لیجئے میری قوتِ سامعہ بیدار ہو گئی۔ میں سکول سے گھر جا رہا ہوں۔ شہر کی فضا پر لاؤڈ سپیکروں کے ذریعے ساز و آواز کے ساتھ ایک نظم نازل ہو رہی ہے۔ چار قافیے مجھے اب بھی یاد ہیں۔ اُن قافیوں کی وجہ سے چار مصرعوں کا مفہوم بھی یاد آ رہا ہے۔ اس مفہوم کی مدد سے میں چاروں مصرعے بہت حد تک اپنے لفظوں میں گھڑ کر لکھ رہا ہوں۔ مثلاً

ایتھے اکھوانا ایں آریا وغیرہ اوتھے اکھوائیں رنگروٹ — بھرتی ہو جاویں
ایتھے پانا ایں ٹٹے لیتڑ اوتھے پاویں بوٹ — بھرتی ہو جاویں
ایتھے کھانا ایں سُکے ٹکر اوتھے کھائیں اخروٹ — بھرتی ہو جاویں
ایتھے پانا ایں پاٹے کپڑے اوتھے پاویں سُوٹ — بھرتی ہو جاویں

جنگ اپنے لطیفے بھی ساتھ لائی، مثلاً ایک سادہ لوح دیہاتی کا بیٹا فوج میں بھرتی ہوا تو وہ ہر کسی سے کہتی پھرتی "سُنا ہے جرنیلا بڑی کابل

طبیعت کا ہے اور بیٹا میرا بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ ڈرتی ہوں کہیں ہٹلر جیسا نہ ہو جائے"۔

جنگ کے بارے میں سنجیدہ اور مزاحیہ گراموفون ریکارڈ بھی تیار ہوئے۔ ایک مزاحیہ ریکارڈ جب شروع ہوتا تھا تو اس میں ایک عورت کی آواز ابھرتی جس کا بیٹا آج ہی فوج سے چھٹی پر آیا ہے۔ وہ اس کے لئے گوشت روٹی پکاتی ہے۔ پھر اسے کھانے کے لئے بلاتی ہے۔ اسے پاس بٹھا کر اس کے برتن میں سالن کے دو چمچے ڈالتی تو بیٹا "ہالٹ!" کہتا۔ ماں کی جانے بلا ہالٹ کیا ہوتا ہے وہ سمجھتی اور سالن مانگ رہا ہے۔ اب بیٹا ہالٹ ہالٹ پکارے جاتا لیکن ماں ہر ہالٹ پر ایک چمچہ اور ڈال دیتی۔ آخر کار بیٹا طیش میں آکر برتن ماں کے ماتھے پر دے مارتا اور ساتھ کہتا "وہاں ایک دفعہ ہالٹ کہنے سے ساری فوج رک جاتی تھی اور تو اکیلی دس دفعہ ہالٹ کہنے پر بھی نہیں رکی!"

جگہ جگہ جنگی مشاعرے ہوا کرتے۔ ایک شعر میری سماعت سے اب تک چمٹا ہوا ہے ؎

ذرا وچ لڑائی دے چل ویکھو اساں کیویں ہلان گرما دتا
ہٹلر نالوں دی قیصر[1] سی اوہ ظالم اوہدا بسترا گول کرا دتا

ہٹلر کے بارے میں الف لیلوی داستانیں سننے میں آیا کرتیں۔ مثلاً یہ کہ اس نے اپنے ارد گرد دس آدمی ایسے رکھے ہوئے ہیں جن کی شکل سو فیصد اس سے ملتی ہے تاکہ کوئی قاتل اسے شناخت نہ کر سکے۔ اس کے جنگی اوزاروں کے بارے میں ایسی ایسی "معلومات" بہم پہنچائی جاتیں جیسے یاروں نے انہیں خود استعمال ہوتے دیکھا ہو۔ افسانہ تراشی میں ہمارا مقابلہ کون کرے گا۔

جرمنی کے اس طرز تعارف کی بنا پر میرے ذہن میں جرمنی اور ہٹلر لازم و ملزوم ہو گئے۔ ہٹلر کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننے کا خیال ہمیشہ مجھے ہانٹ کرتا رہا۔ یہاں تک کہ میں نے اس کے زندہ وزیر رسد کی کتاب پڑھی پھر خود اس وزیر سے ملا تو ہانٹ کرنے والے اس موضوع کے بارے میں میرا تجسس ختم ہوا۔

اور اب میں اسی ہٹلر کے دیس جانے والا تھا۔

پروگرام کے مطابق پہلے انگلستان اور پھر چند دن قیام کے بعد جرمنی جانا تھا۔ لندنی دوستوں میں سے ایک نے پاکستان سے چل کر میرے پاس پہنچنا تھا اور پھر جرمن کمپنی کے ہاتھ میں میری بانہہ پکڑانے تک میرے ساتھ رہنا تھا۔ غالباً اس کی وجہ گھر میں میری وہ پوزیشن ہے جس کی نسبت شیخ سعدی کے نزدیک سگ بن جانا بہتر ہے کہ جب تک کوئی انگلی نہ لگائے میں کسی نئی منزل کو تنہا جانے سے اس عمر میں بھی گھبراتا ہوں۔

۱۹۷۵ء کا آغاز ہوا تو ایران میں میرے قیام کا انجام ہوا۔ دو تین دن کے مارجن سے "گیٹ ریڈی" کا تار ملا۔ وہ دو تین دن میں نے خود کو تہران سے اکھاڑنے میں صرف کئے۔ دو سال کے عرصے میں آدمی جس زمین پر رہ رہا ہوتا ہے اس میں کافی حد تک دھنس جاتا ہے چاہے وہ زمین موت کی دلدل ہی کیوں نہ ہو۔ دو سال تک تہران میں میرے ساتھ جو کچھ بیتی اس کی وجہ سے میں نے اس شہر پہ وہ نشان لگا دیا تھا جو پرتھو کے واقعے کے بعد خود شیف نے ہمارے پشاور پہ لگایا تھا لیکن جب تہران کو سچ مچ چھوڑنے کا وقت آیا تو تہران نے نہ صرف مجھ سے سارے گناہ معاف کر دائے بلکہ مجھے زیر بار کر کے رخصت کیا۔

دو ایرانی تاجروں کو مجھ سے کچھ انس ہو گیا تھا۔ ایک کو الوداعی سلام کہنے گیا تو باتوں باتوں میں نہ جانے کس وجہ سے میں نے ایک جملے کا آغاز ان لفظوں سے کیا۔ "تم تو جانتے ہی ہو میں حتی الوسع جھوٹ نہیں بولتا......" اس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا "آقا! در صادقی شما حرفی نیست اما در

---

[1] قیصر روم مسولینی

زندگی شما حرفی هست" یعنی تمہارے سچا ہونے میں کوئی شبہ نہیں لیکن تمہارا زیرک ہونا مشتبہ ہے۔ میں نے فوراً جواب دیا "تم مجھ سے اتفاق کرتے ہو کہ زیرک ہونے کا انحصار جھوٹ بولنے کی استعداد پر ہوتا ہے؟" —— چمکتی ہوئی آنکھوں سے میری طرف دیکھ کر بولا۔ "آقا! شما تاجر نیستی"

"در صادقی شما حرفی نیست ......" ان لفظوں نے مجھے روٹی کپڑے اور مکان میں سے کچھ بھی تو نہیں دیا تھا پھر بھی جب میں وہاں سے واپس آرہا تھا تو میری کیفیت اُس دن جیسی تھی جس دن میں نے کالج کی تقسیمِ اسناد کی تقریب میں پنجاب کے وزیرِ تعلیم سے گولڈ میڈل وصول کیا تھا۔

دوسرے دوست کے پاس گیا تو وہ میری بات سن کر حیرت زدہ ہوگیا۔ کہنے لگا "مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ تم اس حال میں ہو۔ میں تو سمجھا کرتا تھا کہ تم مزے میں ہو۔ اگر رک سکتے ہو تو اب بھی رک جاؤ۔ بولو کتنی تنخواہ میں گزارہ چل سکتا ہے۔ جو مال بیچو گے اُس پر کمیشن الگ ہوگا۔ تمہارے قیام کے لئے اگر کمپنی میں پارٹنر شپ کی ضرورت پڑی تو کسی نہ کسی حیلے سے میں یہ بھی کر دوں گا کیونکہ مجھے یقین ہے تم اس حیثیت کا ناجائز استعمال نہیں کروگے ..."۔ آہ اقبال!

آخر شب دید کے قابل تھی بسمل کی تڑپ   صبحدم کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا!

حدِ سکونت کے آخری تین دن تہران میں برفباری ہوتی رہی۔ یہ برف باری میرے لئے آرزوئیں سرد کرنے کا علامتی مفہوم لے کر آئی تھی۔

تہران سے لندن تک پروازوں کے کئی روٹ تھے جن میں کچھ روٹ بذریعہ بیروت بھی تھے۔ اگر بیروت میں ایک رات قیام کیا جاتا تو خرچ میں اُس رات کے قیام وطعام ہی کا فرق پڑتا تھا، گویا بیروت کی سیر تقریباً مفت میں کرنے کا امکان نکل رہا تھا۔ یہ بات مجھے اُس زیرکی کے باعث سوجھی تھی جو اب تھوڑی تھوڑی کرکے میرے سر میں آنا شروع ہو چکی تھی۔ میری اس زیرک تجویز پر ہم دونوں دیر تک ہوائی ٹائم ٹیبلوں کا مطالعہ اس انہماک سے کرتے رہے جس انہماک سے جنگی نقشوں کا مطالعہ ہٹلر کیا کرتا تھا۔ بالآخر جب دو مربوط پروازوں کی کڑی ڈھونڈ کر لائے ان میں سے پہلی پرواز یوں بھی بذریعہ جمبو جیٹ تھی گویا اِس جہاز پر سفر کرنے کی خوشی جھونگے میں مل رہی تھی لیکن برف نے میرا پیچھا یہاں بھی نہ چھوڑا۔

تہران کی ایک ہوائی کمپنی کا رومیو نام کا ایرانی ہمارے واقف کاروں میں سے تھا۔ ہم نے اسے اپنی منتخب کردہ پروازوں پر سیٹیں بک کرنے کو کہا تو وہ ایک فیل جثہ کتاب میں غرق ہوگیا۔ کچھ دیر کے بعد برآمد ہوا تو خبر لایا کہ جس پرواز سے ہم سفر کا آغاز کرنا چاہتے ہیں وہ متروک ہو چکی ہے —— بعد میں پتہ چلا کہ یہ اطلاع غلط تھی لیکن جتنا بڑا حجم کتاب کا تھا اُس کے مطابق اتنی سی غلطی کر جانا اس کا حق بنتا تھا اور پھر بعض اوقات ائیر لائن کے ملازمین مصلحت آمیز غلطیاں بھی تو کر جاتے ہیں —— دوبارہ اسی کتاب میں غوطہ زن ہو کر رومیو صاحب جو متبادل پروگرام لے کر ابھرے اُس کے مطابق بیروت کی سیر کے لئے دن کے تین گھنٹے مل سکتے تھے۔ علاوہ ازیں پہلی پرواز کو دمشق بھی رکنا تھا۔ بیروت کے اس قیام ناتمام کو دل میں اتارنے کے لئے میں نے دمشق کے خیال کو رہبر بنایا۔ اپنے تھوڑے بہت سفری تجربے کی بنا پر میں جانتا تھا کہ کسی بھی ملک کا بین الاقوامی ہوائی اڈہ اُس ملک کے بہت سے ثقافتی مظاہر کا حامل ہوتا ہے لہٰذا میں نے دمشق میں اُترنے اور پھر اڑنے کے امکان کو بیروت میں ایک رات کے قیام کا نعم البدل جانا لیکن برف نے میرا پیچھا یہاں بھی نہ چھوڑا یعنی نہ جمبو جیٹ ملا نہ دمشق!

ہر منزل پر پرواز بلند ہونے سے پہلے اعلان کر دیا جاتا ہے کہ اگلی منزل کہاں ہے اور وہاں ہم کتنے وقت میں پہنچیں گے۔ تہران سے دمشق پہنچنے کا وقت پورا ہو گیا لیکن پرواز اترنے کا کوئی اعلان نہ ہوا۔ اس کی بجائے جہاز نے چیل کی طرح چکر لگانے جو شروع کئے تو لگاتا ہی چلا گیا۔ میں نے اپنے ساتھی سے کہا کہ یہ پُراسرار چکر کیا معلوم اس لئے لگ رہے ہوں کہ جہاز اغوا ہو چکا ہے اور کپتان کے کیبن میں ہماری تقدیر دھمکیوں کے درمیان لٹک رہی ہو۔ وہ ہنس دیا اور میری سوچ نے رکنے کی بجائے آگے بڑھنا شروع کر دیا۔ میں نے سوچا اگر جان سلامت رہے تو جہاز کہیں بھی اُترے ایک ٹکٹ میں کئی کئی مزے ہوں گے۔ یہ تھرل بھی کیا کم ہوگا کہ ہمیں اغوا ہونے والے کسی جہاز کا چشم دید گواہ بننے کا موقع ملے گا۔ اغوا کنندگان تو یقیناً فلسطینی گوریلے

ہی ہوں گے۔ جب وہ کیبن سے نکل کر مسافروں کی جانب آئیں گے تو میں جھٹ سے کھڑا ہو کر اپنے پاکستانی ہونے کا اعلان کر دوں گا۔ گو وہ یقیناً مجھے وی آئی پی ٹریٹ منٹ دیں گے۔ جہاز کے چکر اور میری سوچ تقریباً آدھ گھنٹہ جاری رہی لیکن برف نے پیچھا یہاں بھی نہ چھوڑا۔

آخر کار خدا خدا کر کے جہاز کے مائیک کھلے اور آواز آئی "خواتین و حضرات! ہم پچھلے پچاس منٹ سے دمشق کے ہوائی اڈے پر اُترنے کی درخواست کرتے رہے ہیں لیکن موسم کی خرابی کے باعث ہمیں اجازت نہیں مل سکی۔ اب تھوڑی ہی دیر میں ہم بیروت کے ہوائی اڈے پر اُترنے والے ہیں۔ جن مسافروں کو دمشق اُترنا تھا ہم ان سے معذرت خواہ ہیں......"

دمشق بنو اُمیہ کا دارالسلطنت ہوا کرتا تھا۔ شاید اہلِ دمشق نے ہمیں بنو عباس کا طرفدار سمجھ لیا تھا۔ یہ حسرت دل ہی میں رہ گئی کہ جو لوگ قحط سالی پہ عشق تک فراموش کر دیتے رہے ہیں ان کی کچھ نشانیاں ہی دیکھ لیتے۔

بیروت پر آسمان صاف تھا۔ میں جہاز کی کھڑکی کے ساتھ ناک چپکا کر کے اور آنکھیں باہر نکال کر نیچے دیکھ رہا تھا۔ نیلا بحیرۂ روم ختم ہوا اور پیلے رنگ کے امریکی طرز کے سکرپر سلائڈ پہ چمکنے والی رنگین تصویر کی طرح نظر آنے۔ سمندر کے نیلے اور بستی کے پیلے رنگ کا امتزاج کسی کتاب کے خوبصورت ٹائیٹل کی طرح لگا۔ تادمِ تحریر میں دنیا کے کوئی درجن بھر ہوائی اڈوں پر اُتر چکا ہوں مگر رنگوں کی جو بہار استنبول اور بیروت پر اُترتے ہوئے مرکزِ دیدہ و دل بنی وہ کہیں اور نظر نہ آئی۔ یہ دونوں مناظر ہمیشہ کے لئے میری ذات کا حصہ بن چکے ہیں۔ میں انہیں شاید ہی کبھی خود سے جدا کر پاؤں۔

جلدی جلدی زینے لگا کر اڈے سے باہر نکلے تو چاروں طرف چمکتی ہوئی دھوپ میں ہر چیز اپنے رنگ سمیت بے اختیارانہ باہر کو آ رہی تھی۔ ایک ٹیکسی والے کو اپنی اگلی پرواز کا وقت بتایا اور کہا کہ ہمارے پاس بیروت کی سیر کے لئے یہی وقت ہے۔ اس نے کہا فکر نہ کریں میں آپ کو بیروت کا کافی حصہ دکھا کر بروقت واپس بھی لے آؤں گا۔ میرے لیے یہ مہم نئی نہیں ہے۔

ٹیکسی چلی اور ڈرائیور کا رواں تبصرہ شروع ہوا۔ ہمارے پاکستانی اور مسلمان ہونے کی وجہ سے ڈرائیور کے اندر سے خوش اخلاقی کا ذخیرہ ہم پر ارزانی ہوتا رہا۔ شاید عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان وہ تناؤ شروع ہو چکا تھا جس کی وجہ سے کوئی ایک ماہ بعد بیروت کی تزئین انسانی خون سے شروع ہو گئی۔ بڑی طاقتوں کی اسلحہ ساز فیکٹریوں نے سیاحوں کی اس جنت کو اپنی نئی منڈی کے طور پر منتخب کر لیا تھا اور اب اتنا ہی انتظار تھا کہ کھنڈرات میں تبدیل ہونے سے پہلے میں اسے دیکھ لوں۔ اگر مجھے اس بات کا پیشگی علم ہو جاتا تو میں عمر بھر بیروت کا رُخ نہ کرتا۔

راستے میں پڑنے والی عوامی عمارتوں کے بارے میں ڈرائیور کچھ نہ کچھ معلومات ہوا میں اڑا رہا تھا۔ اسے وہیل کا خیال بھی تو رکھنا تھا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ پرواز کے وقت میں باقی رہ جانے والے اور ہر لمحہ کم ہونے والے وقفے کا اعلان بھی اسی نے اپنے ذمے لے رکھا تھا۔ چلتے چلتے یکساں قسم کی بیلی عمارتیں دیکھ دیکھ کر میں اکتایا چاہتا ہی تھا کہ ایک جگہ پر جھگیوں کی قطار آ گئی۔ ڈرائیور کا یہ کہنا تھا کہ "یہ سب فلسطینی مہاجر ہیں" کہ میں اپنے ساتھی سے بچھڑ گیا۔ اس کے بعد دیر تک ڈرائیور پتہ نہیں کیا کچھ بتاتا رہا۔ میں اس کے تبصرے سے اس لئے بے نیاز ہو گیا کہ اب مائیک میرے اندر والے مبصر کے ہاتھوں میں آ چکا تھا۔

۱۹۴۷ء کے لگ بھگ کی بات ہوگی۔ جب ہم اپنی آزادی کے لئے انگریز، ہندو اور پنجاب کے بعض وڈیروں سے نبرد آزما تھے ——————

—————— انہی دنوں فلسطینیوں کو ان کے گھروں سے نکال کر وہاں ایک یہودی ریاست کے قیام کے منصوبے پر تیزی سے عمل جاری تھا۔ میرے وطن کا سادہ لوح مسلمان امیر مینائی کے اس شعر کا کردار ہے جو کسی پہ خنجر چلنے سے تڑپ اُٹھتا ہے مگر اسے خود میرے ملک کا دانشور بے عقل سمجھتا ہے۔ بھر غیروں کے طنز پر برا کیا ماننا۔ کسی نے اقوامِ متحدہ میں پاکستان کے مؤقف پر طنز کرتے ہوئے کہا تھا کہ "پاکستان عربوں سے بھی بڑھ کر عرب ہے"۔ بہر حال یہ سادہ لوح مسلمان ایک طرف اپنے گھر کی حفاظت بدیشی اور گھریلو لٹیروں سے کر رہا

تھا اور دوسری طرف فلسطینی مسلمانوں کو بے گھر کئے جانے کی خبریں سُن کر آتشِ زیر پا رہتا تھا۔ جب یہ خبر ہمارے ہاں پہنچی کہ بے بس فلسطینیوں نے ہتھیار اُٹھا لیئے ہیں تو "زمیندار" اخبار کے پہلے صفحے پر ظفر علی خاں مرحوم کی ایک نظم جلی حروف میں چھپی تھی جس کے شروع میں فلسطینیوں کی دلدوز داستان تھی اور آخر میں ایک شعر گھر کی صورتِ حال پر تھا۔ وہ نظم میرے حافظے پر یوں ٹیپ ہوئی کہ بعد میں جب بھی فلسطینیوں کا ذکر چھڑا وہ ٹیپ بجنے لگی ؎

اُڑتی سی خبر تار پہ آئی ہے عرب سے — میداں میں نکل آئے فلسطین کے غازی
بے یار و مددگار نہیں ہیں یہ مجاہد — ساتھ ان کے ہیں مصری و عراقی و حجازی
دہلی سے بھی پہنچا انہیں امداد کا پیغام — کام آگئی اسلام کے رشتے کی درازی
امریکہ و برطانیہ جو چاہیں سو کر لیں — یاروں نے بھی سر دھڑ کی لگا رکھی ہے بازی
اِس دور میں ہیں نیشنلسٹوں کے خداوند — ویول[1] جو حقیقی ہے تو گاندھی ہے مجازی

قیامِ پاکستان کے تھوڑا ہی عرصہ بعد ہمارے ہی سکول کے ہال میں ایک بہت بڑا مشاعرہ ظفر علی خاں کی صدارت میں ہوا تھا۔ اپنی باری پر انہوں نے مشاعرے میں یہی نظم سنائی تھی۔ صدارت کے دوران نحیف و نزار مولوی صاحب کو دیکھ کر میں سوچتا رہا کہ یہ کلام سنانے کے لیئے اٹھ بھی پائیں گے ...... یا نہیں لیکن نظم شروع ہوتی تو ضعیف العمری کی اس راکھ سے شعلے برسنے لگے۔ آواز کے دبدبے سے ہال کی دیواریں کانپ اٹھیں۔ سر دھڑ کی بازی لگانے والا مصرع جس دھمک سے انہوں نے ادا کیا اس کے ارتعاش سے مشاعرے کی فضا لرز کر رہ گئی۔

کچھ دنوں کے بعد شہر میں منادی سنی گئی کہ فلسطین کی جنگ میں حصہ لینے کے لیئے بھرتی ہونے والے نوجوان فلاں پتہ پر پہنچ جائیں۔ یہ پتہ گوجرانوالہ کے چوک دارالسلام کے آس پاس کا تھا۔ میں کئی دن اس پتے پر چوری چھپے جاتا رہا لیکن وہاں ایسے کسی فرد یا ادارے کو نہ پا سکا جو مجھے بھرتی کر کے فلسطین بھجوا سکتا، حالانکہ میرے ساتھ کم از کم تین اور دوست بھی گھر سے بھاگ کر بھرتی ہونے کو تیار تھے ——— جن لوگوں کے شانہ بشانہ لڑنے کے لیئے آج سے ۴۹ سال پہلے میں گھر بار چھوڑ کر ہزاروں میل دور آنے کو تیار تھا آج ان کے درمیان سے یوں گزر گیا جیسے وی آئی پی اپنے استقبال کرنے والوں کے درمیان سے گزر جاتے ہیں۔ مجھے اس بے حسی تک کس چیز نے پہنچایا ہے؟ تحلیلِ نفسی کے عالم متوجہ ہوں!

میرے اندر کا مبصر کہہ رہا تھا کہ جن لوگوں کو میں نے ابھی ابھی دیکھا ہے یہ وہ یقیناً نہیں جن کے ہتھیار اُٹھانے پر ظفر علی خاں نے نظم لکھی تھی۔ یہ ان کی دوسری نسل ہے۔ اُس وقت جو بچے پیدا ہوئے تھے وہ اب تیس کے پیٹے میں ہیں۔ یہ نسل در نسل اُس وقت تک کیمپوں میں رہیں گے جب تک ان کے لیئے بزورِ بازو اپنے گھروں میں واپس جانا ممکن نہیں ہو گا۔ اُس وقت تک امریکہ کے صدارتی اُمیدوار ان کی خانماں بربادی کے بل پر اپنی انتخابی مہم چلاتے رہیں گے جس دن یہ اپنے گھروں کو چلے گئے اسلحہ سازوں کا ایک گرم بازار بند ہو جائے گا۔ ستم بالائے ستم یہ کہ جن طاقتوں کے ہاتھ میں ان کی تقدیر ہے، ان کے ان یہودی باقی ملکوں سے زیادہ آباد ہیں اور امریکہ میں تو خود اسرائیل سے بھی زیادہ ہیں۔ اس وقت دنیا میں یہودیوں کی آبادی ڈیڑھ کروڑ کے لگ بھگ ہے جس میں ایک تہائی صرف امریکہ میں ہیں۔ اسرائیل میں تیس لاکھ اور روس میں ۲۶ لاکھ ہیں۔

جب مائیک دوبارہ ٹیکسی ڈرائیور کے ہاتھ میں آیا تو میں نے پوچھا "کیا کسی گوریلے سے ملاقات ہو سکتی ہے؟"۔ اس پر وہ ہنس دیا اور کہنے لگا۔ "آپ کے خیال میں گوریلے ہم سے کوئی الگ مخلوق ہوتے ہیں۔ جھگیوں میں آپ نے جن لوگوں کو چلتے پھرتے دیکھا ہے یہ سب گوریلے ہیں۔ کوئی پتہ نہیں کب حکم آ جائے اور ان میں سے کوئی ہتھیار باندھ کر "واردات" پر چلا جائے۔ ان کی یہاں موجودگی کی وجہ سے اسرائیلی جہاز اکثر ادھر آ نکلتے ہیں" اس کے ساتھ ہی وہ مختلف عمارتوں پر اسرائیلی حملوں کے نشانات کی طرف بھی اشارے کرنے لگا۔ یہ ڈرائیور بھی صاف انگریزی بول رہا تھا۔ (جاری ہے)

---

[1] لارڈ ویول اس وقت کا وائسرائے ہند

مرتضیٰ برلاس

ہم نے پہلے ہی کہا تھا تم نے یہ دیکھا، گرے
منہ اٹھا کر جو چلے ٹھوکر لگی، اوندھا گرے

یہ بھی ممکن ہے کہ گر کے پھیل جاؤں چار سُو
جس طرح اُونچے پہاڑوں سے کوئی جھرنا گرے

دوسرے منظر میں گر، وہ کچھ ہے جو پہلے میں تھا
یہ تماشائے ہزیمت ختم ہو پردہ گرے

ہم سنبھل کر اُٹھ نہیں پاتے کہ گر جاتے ہیں پھر
جس طرح چلنے کی کوشش میں کوئی بچہ گرے

اب تو ایسا پیڑ ہونا چاہیئے اس دشت میں
جس سے پت جھڑ میں بھی پتوں کی جگہ پیسہ گرے

کیف انصاری

دیکھ بے حُرمت ہُوا ہے کس قدر رزقِ ہوا
پھر رہا ہے خود شجر تا بہ شجر رزقِ ہوا
ہو گئے حرفِ سکوتِ شب سے بے معنی طلوع
راس آئے، اے چراغِ رہگزر، رزقِ ہوا
اب تو ہے در پیش بے منظر خلاؤں کا سفر
اب کہاں دستِ شجر، رختِ ثمر، رزقِ ہوا
حشر ہے ناقوں سے برپا بادباں در بادباں
ربِ موسم، رحم کر، کچھ لا اِدھر رزقِ ہوا
ہے اُسی کے رابطے سے تن پہ ملبوسِ حباب
پھر وہی قطرہ ہو، چھن جائے اگر رزقِ ہوا
منسلک سانسوں کی گنتی کیفِ الفت سے ہے کیف
مُجھ کو ہے اُس حسن کا حسنِ نظر، رزقِ ہوا

کرشن ادیب

پھول باتوں کے چُنیں، شبنمیں لہجہ دیکھیں
گیت کی جھیل پہ آواز کا بجرا دیکھیں

ہر گھڑی سامنے اک چاند سا چہرہ دیکھیں
بند آنکھوں سے کوئی جاگتا سپنا دیکھیں

بھولی بسری سی کوئی ساعتِ شیریں ڈھونڈیں
اب خرابے میں کوئی نقش پُرانا دیکھیں

تُو ہمیشہ ہی رہے یاد کے جگنو کی سفیر
شب کی ظُلمت میں کبھی تجھ کو نہ تنہا دیکھیں

کشتیاں بھر کے جو لاتا تھا حسیں خوابوں کی
کن جزیروں کو ہُوا آج روانا دیکھیں

تو بتا کون تھی وہ جس نے کہا تھا اک دن
موجۂ گُل میں رہیں شہرِ تمنّا دیکھیں

جانے کس جسم کی خوشبو ہے گھُلی پانی میں
کن گلابوں کو بہا لے گیا دریا دیکھیں،

کس قدر بکھرا ہُوا زیست کا شیرازہ ہے
اب مرا گھر ہے کوئی اور نہ دروازہ ہے

چیختا رہتا ہے جرأت کے سناٹے میں
زخم خوردہ سی کسی رُوح کا آوازہ ہے

تبصرہ کرتا ہے وہ مری زبوں حالی پر
کیا اُسے اپنی تباہی کا بھی اندازہ ہے

ایک میں ہی تو نہیں غم کی تپ میں پھنکے
اُس کے چہرے پہ بھی دُکھ درد کا اب غازہ ہے

کن گناہوں کی سزا ہے یہ میرا اپنا وجود
زندگی ہے تو یہ کس جرم کا خمیازہ ہے

جعفر شیرازی

نہ کر سکے گا کبھی گفتگو، ملے گا نہیں
عجیب ہوگا کہ جب مجھ سے تو ملے گا نہیں

بہار آئے گی لیکن خبر یہ لائے گی
چمن میں اب وہ گلِ رنگ و بو ملے گا نہیں

کئی زمیں، کئی موسم، پیامبر ہوں گے
مگر کبھی وہ بُتِ حیلہ جو ملے گا نہیں

خیال آئیں گے اور خواب جس کے ملنے کے
رہے گی اس کی بہت آرزو ملے گا نہیں

کچھ ایسی رنجشیں لے کر گیا ہے وہ جعفر
کبھی جو آ بھی گیا رُو برو ملے گا نہیں

مظفر حنفی

حیراں نہ ہو فضول کہ کیا ہے پسِ غبار
کچھ بھی نہیں، غبار کھڑا ہے پسِ غبار

پتوں نے اپنے کان کھڑے کر لئے ادھر
وحشی بگولہ ناچ رہا ہے پسِ غبار

آثار کہہ رہے ہیں کنارا قریب ہے
آندھی کا زور ٹوٹ چکا ہے پسِ غبار

شہ رگ اُچھل رہی ہے چھٹی حس کے ساتھ ساتھ
دشمن کوئی ضرور چھپا ہے پسِ غبار

مطلع تمام پھول گیا بادبان سا
دیکھو تو کتنی تیز ہوا ہے پسِ غبار

ہر موڑ پر خلیجِ فنا اس طرف پڑی
ہر سنگِ میل گوہِ ندا ہے پسِ غبار

لازم ہے اپنے پاؤں مظفر تراش لے
جو جس جگہ ہے آبلہ پا ہے پسِ غبار

سیّد امجد الطاف

چپکے سے کبھی آپ نے جو ہم سے کہا تھا
صدیوں کی شب و روز دعاؤں کا صلہ تھا

محجوب نگاہیں تھیں جھکی فرطِ حیا سے
اقرارِ وفا سنتے پہ دل مچلا ہوا تھا

جن سانسوں کی گرمی سے ملے روح کو ٹھنڈک
کس پیار سے ان سانسوں نے ہونٹوں کو چھوا تھا

دل ایک ہی آہنگ پہ دھڑکا کئے برسوں
پردہ کوئی باقی نہ من و تُو کا رہا تھا

گھر غنچے کے مانند کھلا رہتا تھا ہر دم
تتلی کا بھی سایہ نہ کبھی اس پہ پڑا تھا

احساسِ رفاقت بھی عجب چیز ہے جس نے
دنیا کی ہر اک چیز سے بیگانہ کیا تھا

مہکی ہوئی یادوں سے لپٹتے رہے شب بھر
ماضی کا دریچہ کوئی کل کھول گیا تھا

سیّد امجد الطاف

پھر وہی ہم اور وہی ہے جستجو
در بدر قریہ بہ قریہ کُو بہ کُو

پھر وہی موجیں، وہی شوریدگی
یم بہ یم دریا بہ دریا جُو بجُو

پھر وہی صحرا وہی آوارگی
پھر وہی آنکھیں، وہی بہتا لہو

پھر وہی دل ہے وہی وارفتگی
پھر وہی تصویر ہر دم رُوبرو

پھر وہی وحشت، وہی دیوانگی
پھر وہی طوقِ جنوں زیبِ گلو

پھر وہی تقدیر کی برگشتگی
بجلیوں کی زد میں نخلِ آرزو،

پھر وہی گھر ہے وہی تنہائیاں
پھر وہی دیوار و در سے گفتگو

پھر وہی ہم ہیں وہی سودائے خام
پھر وہی لَو اور تیری آرزو

پھر ترے در پہ جھکا جاتا ہے سر
ہاتھ میں تیرے ہماری آبرو

مظہر امام

کاش اب اپنی تمنّا کا خدا ہو جاؤں
تو ہمہ گوش ہے اب صوت و صدا ہو جاؤں

میں نے اس جنگ میں کیا کھویا کسی سے نہ کہوں
مرہمِ زخم بنوں، اپنی دوا ہو جاؤں

تجھ سے پہلی سی عنایت کی توقع نہ رکھوں
اپنے صحراؤں پہ خود برسوں، گھٹا ہو جاؤں

اپنی ہی خاک اُڑاتا پھروں ساحل ساحل
تیرے دریاؤں سے گزروں تو ہوا ہو جاؤں

کیا لکیریں ہیں کہ آتا ہی نہیں موسمِ قُرب
کیا میں سر تا بہ قدم دستِ دعا ہو جاؤں

اس دوراہے پہ کھڑا سوچ رہا ہوں کب سے
تجھ سے بچھڑوں کہ زمانے سے جُدا ہو جاؤں

آزاد گلاٹی

میرے اندر اس فراوانی سے گھر اُس نے کیا
ہر عمل میرا بہ اندازِ دگر اُس نے کیا

سب جہاں تعمیر جیسے اس کی بنیادوں پہ تھا
اس کو اک ہلکی سی جنبش سے کھنڈر اس نے کیا

وہ یقیناً اک ہیولا تھا مری ہی ذات کا
جس کو ساری عمر اپنا ہم سفر اُس نے کیا

کچھ نہ کرنا تھا تو مٹی میں ملا ڈالا اُسے
جب کیا تو ایک قطرے کو گہر اُس نے کیا

میں تو اس کو سونپ آیا تھا سحر کی تازگی
اُس کو غفلت سے کڑکتی دوپہر اس نے کیا

کم نہیں احسان یہ آزاد میری ذات پر
میرے جتنے عیب تھے سب کو ہنر اس نے کیا

ذوالفقار احمد تابش

لکھا ہوا ہے حرفِ سراسر کا سلسلہ
سطرِ خفی میں معنیٔ دیگر کا سلسلہ

لوحِ ہوا پہ نقش کوئی اَن کہی خبر
آنکھوں سے جھانکتا ہے کسی ڈر کا سلسلہ

اک شوقِ مستقل ہے کہ کب دیکھیے کھُلے
شہرِ دروں میں کوچۂ بے در کا سلسلہ

پھیلے گا رنگ دشت فلک پر یہاں وہاں
شب کو کھلے گا پھر گلِ اختر کا سلسلہ

اندر کی بات چہرے پہ آ کر لکھی گئی،
ساحل پہ رُک گیا ہے سمندر کا سلسلہ

کیا خوش کلام ہونٹ لہو میں نہا گئے
پیوندِ خاک حرفِ مؤقر کا سلسلہ

شاہد شیدائی

دیکھا تو میں پھول چُن رہا تھا
سوچا تو میں آگ پر کھڑا تھا

سر پہ تھا سائبان سورج
پیروں پہ سفر کا راستہ تھا

کتنے ہی دشت کاٹ آیا
کتنا ہی سفر ابھی پڑا تھا

دریا پاٹا تو میرے آگے
سینہ تانے جبل کھڑا تھا

رستوں رستوں کسے مسلسل،
کوئی آواز دے رہا تھا

حائل تھے راہ میں سمندر
میں ایسے دیس کھو گیا تھا

صحرا صحرا اداسیوں میں
کس کس کا دھیان آ رہا تھا

کاٹے سے کب کٹی ہیں گھڑیاں
لمحہ لمحہ پہاڑ سا تھا

تم تو میرے قریب تر تھے
چاہے کتنا ہی فاصلہ تھا

اقبال ساجد

کمانِ شب سے سحر کا وہ تیر چھوڑ گیا
ستارہ ٹوٹ گیا روشن لکیر چھوڑ گیا

یہاں کے لوگ تو خوشبو سے خوف کھاتے ہیں
گلاب نقش کہاں راہ گیر چھوڑ گیا

یہ اور بات کہ اس پر کوئی چلے نہ چلے
لکیر چھوڑنے والا لکیر چھوڑ گیا

اب اس میں زہر ملاؤ کہ تم مٹھاس پیو
پہاڑ کاٹ کے وہ جوئے شیر چھوڑ گیا

پھر آج شہر کی سب سے بڑی حویلی میں
تمام دن کی کمائی فقیر چھوڑ گیا

زمینِ سنگ پہ وہ آئینہ بکف ساجد
جو عکس چھوڑ گیا دلپذیر چھوڑ گیا

دل کو دانا کہوں کہ سودائی
بھیڑ میں ڈھونڈتا ہے تنہائی

میں وہ ناداں کہ شہرِ طفلاں میں
بیچتا پھر رہا ہوں دانائی

گفتگو کا ہنر نہ کام آیا
عقل کی جیب کٹ گئی بھائی

یہ بتا شہرتوں کی منڈی میں
بک گئی کیسے تیری رسوائی

رک کے چلنا بھی ہے دلیلِ سفر
حوصلوں کی نہیں ہے پسپائی

پیار کر اس قدر سمندر سے
خود صدف لے کے آئے گہرائی

میں اسے کیسے مان لوں دریا
جس نے ہرنوں کو پیاس پہنائی

کون سا گیت مر گیا ساجد
سسکیاں بھر رہی ہے تنہائی

سعید احمد اختر

وفا کا پیڑ برسوں سے جواں ہے
مگر اس مہرباں کا پھل کہاں ہے

جہاں سے اس قدر دل بدگماں ہے
یہ مسجد مدتوں سے بے اذاں ہے

بلائیں ہر قدم پر جاگتی ہیں
مرے حق میں زمیں بھی آسماں ہے

مری آنکھوں پہ بے تابی کا پہرا
ترے چہرے پہ کرنوں کا دھواں ہے

برہنہ تن پہ کانٹوں کی کشیدہ
مری گل پوشیوں کی داستاں ہے

ہم بھی جاگے ہیں بہت آپ بھی رو دیے ہیں بہت
آئیں سو جائیں کہ صدمے ابھی آگے ہیں بہت

فرش میرا مری چھت کا نہیں باور کرتا
میرے در کو مری دیوار سے شکوے ہیں بہت

اشک پی جانے کا فن سیکھ لیا ہے دل نے
ورنہ ہم آج بھی اک شخص کو روتے ہیں بہت

وہ کسی کے تو ہوئے ہم تو خود اپنے بھی نہیں
وہ برے ہوں گے مگر ہم سے تو اچھے ہیں بہت

مل کے ہر ایک کسی اور میں کھو جاتا ہے
ورنہ ہر موڑ پہ ہر سمت کو رستے ہیں بہت

جاگ لیں گے تری دوری کے عذابوں میں بھی
ترے پہلو کے گلابوں میں بھی سوئے ہیں بہت

کیوں زمیں پر انہیں بھیجا ہے خدا نے اختر
وہ جو انسان بہت کم ہیں فرشتے ہیں بہت

شاہین بدر

ہے زمیں حیرت زدہ اور آسماں بھی دنگ ہے
ایک آئینہ بدن جو پاسبانِ سنگ ہے

بھیگے ساون کی دھنک بن کر نکھر آئی ہے یاد
آج تنہائی کا منظر کس قدر خوش رنگ ہے

میں وہ قطرہ ہوں کہ جس سے سیپ کی بجھتی ہے پیاس
تم سمندر ہو تو پھر کیوں دل تمہارا تنگ ہے

ناچتی ہے وقت کے بازیگروں کے ہاتھ میں
زندگی بھی تاش کے پتّوں سے ہم آہنگ ہے

چیختے ہیں پیڑ کی شاخوں پہ پتّے خوف سے
جانے کیسا موجۂ بادِ صبا کا رنگ ہے

آئینے کو جھوٹ کی عادت نہیں شاہینؔ بدر
میرا چہرہ، میرے احساسات کی فرہنگ ہے

قیصر قلندر

مجھے آسودہ رفتہ ساعتوں کی سرخوشی دے دو
بڑی تاریک تنہائی ہے تھوڑی روشنی دے دو
میرے بے خواب لمحوں پر چھڑک دو نیند کی شبنم
میرے دشتِ تمنا کو توجہ کی نمی دے دو
دُعا کے ہاتھ کاٹے جا رہے تھے شور برپا تھا
ارادے کی بلندی، حوصلے کی پختگی دے دو
وفا نے یاد کی کرنوں سے کاڑھا تھا جو پیراہن
اُجالے جس پہ قرباں ہیں مجھے وہ تیرگی دے دو
محبت روگ ہے، آوارگی ہے، غم پرستی ہے
مگر ہے حاصلِ عمرِ گریزاں بھی یہی۔ دے دو!
جنہیں اندازہ طوفاں نہیں ساحل پہ بیٹھے ہیں
اُنہیں موجوں کا بے باکانہ رنگِ زندگی دے دو
در و دیوار سناٹوں کے گھیرے میں سکڑتے ہیں
حسیں یادوں کی زنجیریں ہلا دو، لے کلی دے دو
تبسم کی بکھیرو چاندنی ارضِ تمنا پر
لبوں کا انگبیں، لمسِ طرب کی بے خودی دے دو
جو اپنی ذات کی پہنائیوں میں کھو گئے قیصرؔ
اُنہیں پیکار کی لذت، اجالِ آگہی دے دو

اکبر حیدری آبادی

زندانِ صبح و شام میں تو بھی ہے میں بھی ہوں
اِک گردشِ مدام میں تو بھی ہے میں بھی ہوں

بے فرش و بام سلسلۂ کائنات کے
اس بے ستوں نظام میں تو بھی ہے میں بھی ہوں

بے سال و سن زمانوں میں پھیلے ہوئے ہیں ہم
بے رنگ و نسل نام میں تو بھی ہے میں بھی ہوں

اس دائمی حصار سے راہِ سفر کہاں
ذرّوں کے ازدحام میں تو بھی ہے میں بھی ہوں

ہر تیرہ فام صبح کا ورثہ ہے مشترک
ہر نور دیدہ شام میں تو بھی ہے میں بھی ہوں

صحراؤں کا سکوت ہمارا ہی عکس ہے
دریاؤں کے خرام میں تو بھی ہے میں بھی ہوں

رنگوں میں نکہتوں میں ہماری ہی گونج ہے
اس بے صدا پیام میں تو بھی ہے میں بھی ہوں

جس کا وجود تشنۂ تکمیل ہی رہا
اُس نقشِ ناتمام میں تو بھی ہے میں بھی ہوں

یہ دل کی رزمگاہِ تمنا کہیں جسے
اس محشرِ تمام میں تو بھی ہے میں بھی ہوں

تیرے مرے بکھرنے سے ہے سارا انتشار
ترتیب و اہتمام میں تو بھی ہے میں بھی ہوں

تیرا زیاں بھی میرے زیاں سے ہے منسلک
خرابوں کے انہدام میں تو بھی ہے میں بھی ہوں

یوسف جمال

(آزاد غزل)

خود اپنی پہچان مٹ چکی ہے، میں کیسے بولوں
انیک رنگوں کے پیکروں میں بٹا ہوا ہوں

کتنے رنگوں کا اک کھنڈر ہوں
یہ زرد صورت، یہ سُرخ آنکھیں، سیہ سیہ خوں

کسی کی ممتا، کسی کی بیتاب چاہتوں سے نراش ہوکر
میں اپنی قسمت کو ایک لاغر ضعیفہ جانوں

میں حال کے وسوسوں کے سورج کی زرد کرنوں میں غسل کر کے
سفید فردا کی اُجلی راتوں کی چاندنی کا لباس پہنوں

لبوں سے گیتوں کی بارشیں مستعار لے کر
کثیف رشتوں کا پارہ پارہ لباس دھوؤں

فریب ایسا دیا ہے لمحوں کی بے لبی نے
گناہ کے سبز کالے بن میں پابہ زنجیر خود کو دیکھوں

عنوان چشتی

اور کیا اس کے سوا ہو جاؤں
قرض کی طرح ادا ہو جاؤں

زندگی اور میں کیا ہو جاؤں
اپنے ہی ذہن پہ وا ہو جاؤں ،

میرے سائے نے کہا چپکے سے
اپنے ہی قد سے بڑا ہو جاؤں

لفظ ہوں ہونٹ کا چھالا تو نہیں
تم جو چاہو تو ادا ہو جاؤں

مرمریں، نرم، خنک اس کا بدن
رات کی گرم ہوا ہو جاؤں

اس نے سمجھا ہی نہیں رشتۂ دل
شاخ سے کیسے جدا ہو جاؤں

بندگی غیر کی کرنا ہے تو پھر
آپ اپنا ہی خدا ہو جاؤں

ضیا شبنمی

ان گنت شمعیں سرِ مژگاں جلا دیتا ہے کون
شام ہوتے ہی مری راہیں سجا دیتا ہے کون

رات کی دہلیز پر سوئی ہوئی رسوائی کو
صبحدم ، سورج نکلتے ہی ہوا دیتا ہے کون

بھیگتی ہے رات تو میں پوچھتا ہوں چاند سے
آئینہ در آئینہ مجھ کو صدا دیتا ہے کون

خیمۂ شب کی طنابیں ٹوٹتے ہی دفعتہً
زخم تیری یاد کا دل میں جگا دیتا ہے کون

رات کے پچھلے پہر گھر کے در و دیوار پر
تیری تصویریں ہی تصویریں سجا دیتا ہے کون

دستکیں دیتی ہے کیوں پگلی ہوا ، شب بھر ضیاؔ
میرے گھر کا راستہ اس کو بتا دیتا ہے کون ،

اکبر حمیدی

اگر وہ کچھ نہیں دیتے دعا زیادہ دے
کشادِ ظرف بھی تجھ کو خدا زیادہ دے

گلہ نہیں ہے کوئی تیرے دستِ رحمت سے
بس اب تو قوتِ صبر و رضا زیادہ دے

اگرچہ چمک ہے مرے اپنے شعلۂ جاں میں
تو غم نہیں جو زمانہ ہوا زیادہ دے

بگڑ گیا ہوں تو اس میں خطا ہے تیری بھی
بُرا نہیں ہوں محبت ذرا زیادہ دے

وہ قحطِ رزق ہے سب قتل ہونے آئے ہیں
کسی بھی ہاتھ سے جو خوں بہا زیادہ دے

سفر اکیلے بھی کٹ جائے گا مگر اکبر
وہ ساتھ ہو تو زمیں راستہ زیادہ دے

شہپر رسول

ہو گی اس ڈھیر عمارت کی کہانی کچھ تو
ڈھونڈ الفاظ کے ملبے میں معانی کچھ تو

لوگ کہتے ہیں کہ تو مجھ کو بُرا کہتا ہے
میں بھی سُن لوں ترے ہونٹوں کی زبانی کچھ تو

نقشِ پا تک بھی نہ چھوڑے گی ہوا ہے پاگل
کون جانب مجھے جانا ہے، نشانی کچھ تو

بھول بیٹھے ہیں وہ بچپن کے فسانے لیکن
یاد ہو گی انہیں پریوں کی کہانی کچھ تو

برف نے کرب کی پتوار کو بھی توڑ دیا
دل کے دریا کو عطا کر دے روانی کچھ تو

تیرے احساس میں شعلے ہیں یہ مانا شہپر
صرف رسمی ہی سہی برف بیانی کچھ تو

سید احسن شیرازی

یہ کس نے ہات رکھا روشنی کی آنکھوں پر
اندھیرے اُگنے لگے ساعتوں کے چشموں پر
مہک مہک اٹھے تخئیل کے ترنم زار
یہ کون چھا گیا میری چھلکتی سوچوں پر
پُھنے تھے رُوح نے جو چاہتوں کے قریوں سے
محیط ہو گئے لمحے وہ لاکھ پہروں پر
پڑی وہ ضرب کہ لو دے اٹھی رگِ احساس
سنور سنور گئے موتی پلوں کی پلکوں پر
بکھیرا کرتی ہے گالوں پہ تیرے نور، دھنک
بسیرا کرتی ہیں خوشبوئیں تیری سانسوں پر
وہ دل کہ زیست کی تابانیوں کا طالب تھا
تمام عمر جلا ہے کلی کے طاقوں پر،
بس ایک لمحے میں طائر تو جان سے گزرا
ہر اک کے دوش پہ رقصاں رہے ہیں مدتوں پر
کوئی نہ ہوگا زمانے میں مجھ سا فرزانہ
گلوں کے کھیت اگاتا رہا ہوں شعلوں پر
جلا رہا ہوں اپنی ہی آتش میں آج تک احسن
تمام عمر چلا ہوں خود اپنی کرچیوں پر

اقبال نواز

ہر اک لمحے کی فطرت جانتے ہیں
ہم اپنے کرب کو پہچانتے ہیں

سکھایا تھا جنہیں فن گفتگو کا
وہی مجرم ہمیں گردانتے ہیں

اگرچہ دست و بازو کٹ چکے ہیں
مگر ہم پھر بھی سینہ تانتے ہیں

ہے وہ قحطِ حدیثِ دل کہ پھر سے
سکوتِ شب کا لوہا مانتے ہیں

نوآز اخلاص کے ذروں کی خاطر
غبارِ دشتِ الفت چھانتے ہیں

ساحل احمد

جگنو کا پر جلتا ہے
دشت بھی اپنا لگتا ہے

بوڑھے زرد درختوں کو
آندھی کا ڈر رہتا ہے

آج بھی دل کی بستی میں
درد کا سکہ چلتا ہے

سبز فرشتے اترے ہیں
جنگل سہما لگتا ہے

فطرت افشاں کھینچتی ہے
سورج آنکھیں ملتا ہے

گھٹتا بڑھتا سایہ بھی
شہر کی باتیں کرتا ہے

شعر ہمارے سن کر وہ
رنگ بدلنے لگتا ہے

یاد کی پیلی رنجش بھی
ملنے سے کتراتی ہے

راہی تھک کر بیٹھے تو
منزل پیر دباتی ہے

دھیرے دھیرے پیڑوں کی
کھال اترتی جاتی ہے

کتنے تشنہ پتوں کی
شبنم پیاس بجھاتی ہے

نیند بھی ساحل آنکھوں میں
جستہ جستہ آتی ہے

حسین سحر

گونج اٹھی جو سفر کی آہٹ
دب گئی شور میں گھر کی آہٹ

روز آتی ہے دیارِ دل میں
تیری یادوں کے سفر کی آہٹ

بے صدا رات کے سناٹے میں
پھیلتی جاتی ہے ڈر کی آہٹ

سن رہا ہوں میں سکوتِ شب میں
طائرِ فکر کے پر کی آہٹ

مدتوں بعد تری یاد آئی،
دشت میں آئی ہے گھر کی آہٹ

کس نے دیکھی ہے لبوں کی خوشبو
کون سنتا ہے نظر کی آہٹ

بند ہیں رسمِ وفا کی راہیں
اب کہاں آئے اُدھر کی آہٹ

ہمہ تن گوش ہیں آنکھیں شب کی
آنے والی ہے سحر کی آہٹ

سرور عثمانی

آتے جاتے موسموں کا سلسلہ باقی رہے
روز ہم ملتے رہیں اور فاصلہ باقی رہے

کل کوئی بوڑھا مصور مجھ سے ملنے آئے گا
اے مرے منصف مری تھوڑی سزا باقی رہے

کھا گئیں دریا کی موجیں خواب آور گولیاں
بادبانی کے لئے پاگل ہوا باقی رہے

آنے والی نسل خود پہچان جائے گی مجھے
پتھروں کے شہر میں میری صدا باقی رہے

آسماں نیلے سمندر کی طرح پیاسا نہیں
حشر تک میرے لہو کا ذائقہ باقی رہے

شاعری کرتے رہے رہو! لیکن رہے اتنا خیال
دشمنوں سے دوستی کا حوصلہ باقی رہے

اعتبار ساجد

بھٹک نہ جائے نظر کی پناہ میں رکھنا
وہ دُور ہے جو ستارا نگاہ میں رکھنا
لہو نچوڑ کے رکھنا چراغِ جاں روشن
پھر اس دیئے کو ہواؤں کی راہ میں رکھنا
یقیں اسے بھی دلانا محبتوں کا مگر
اسیر خود کو سدا اپنی چاہ میں رکھنا
کھلے نہ آئینہ میں دل کا کنول یہ دھیان رہے
تمام عمر اسے اشتباہ میں رکھنا
جنوں میں یوں نہ بکھرنا کہ پھر سمٹ نہ سکو
لئے دیئے ہوئے خود کو نباہ میں رکھنا
سفر پہ قید نہیں اس کی ہمرہی میں مگر
مراجعت کی نشانی بھی راہ میں رکھنا
تراشنا بھی اگر لب کشائیوں کا جواز
تو اعتقادِ سخن سردآہ میں رکھنا
حصارِ غم میں تمنا کی روشنی جیسے
کوئی چراغ درِ خانقاہ میں رکھنا

انجم نیازی

زہر سارے پیڑ کا اُس کے ثمر تک آگیا
ایڑیوں سے درد اُٹھا اور سر تک آگیا
نیند سے جاگا تو مجھ کو یوں لگا جیسے کوئی
دوپہر کی دھوپ بن کر بام و در تک آگیا
اتنے اُونچے آسماں سے بھی میں اوجھل تھا کبھی
گرتے گرتے اب زمانے کی نظر تک آگیا
ایک عرصے تک نہ آئی پاس جب دریا کی موج
لے کے ساحل آپ لوگوں کو بھنور تک آگیا
کتنا پُراسرار لگتا ہے مجھے اس کا وجود
اک بگولا جو مری اس رہ گزر تک آگیا
اس کے پیچھے تھا کوئی جذبہ کہ یہ تھا اتفاق
اس کے گھر کو ڈھونڈتا میں اپنے گھر تک آگیا
اب تو سینے سے لگاؤں گا اسے انجم ضرور
دشت اپنے آپ چل کر میرے گھر تک آگیا

نسیمِ سحر

اب لوگ کیوں مُصر ہیں کہ سُورج سیاہ تھا
سچ بولنا تو کل کا بھیانک گناہ تھا

اپنی حدود کا بھی تعین نہ ہو سکا
خود اپنا ہی وجود فصیلِ نگاہ تھا

معیار کچھ عجیب تھے شہرِ مُراد کے
جو شخص سُرخرو تھا وہی رُوسیاہ تھا

میرے خلاف بولنے والا بھی اِک وہی
اور میں مُصر۔ وہی مرا اک خیر خواہ تھا

کچھ نیک لوگ اس میں بھی زندہ ضرور تھے
لیکن معاشرہ ہی بڑا کم نگاہ تھا

اس عہدِ بے اصول کا حاصل ہے یہ اصول
وہ سیدھی راہ پر تھا جو گُم کردہ راہ تھا

حلقوم پر جمی تھیں مری اپنی اُنگلیاں
میرا بدن ہی میرے لئے قتل گاہ تھا

مضبوط کچھ گھروں کی چھتیں بھی نہ تھیں نسیم
بارش کا بھی عذاب بڑا بے پناہ تھا

تنویر صہبائی

دھنک رنگوں سے گذرا تھا کبھی عکسِ رواں اپنا
سفر کے مرحلوں میں کھو گیا وہم و گماں اپنا

مساموں میں اُتر جاتا ہے ہر گذرا ہوا لمحہ
بیاضِ جسم پر تحریر کرتا ہے نشاں اپنا

مرا اندر سکوتِ لامکاں کا ایک حصہ ہے
اُبھرتے لفظ کی آہٹ سُنے کیسے جہاں اپنا

ہوا کی طرح اپنی صورتیں میں بھی بدلتا ہوں
بتائے کون اب مجھ کو ٹھکانہ ہے کہاں اپنا

مری آواز کی انگلی پکڑ کر لوگ چلتے ہیں
روایت بن نہ جائے ایک دن طرزِ بیاں اپنا

ارادہ ہے گھنے سورج کی شاخوں میں بسر جا کر
جڑوں کی قید میں کب تک رہے گا کارواں اپنا

مسافت نے لکیروں میں بدل ڈالا ہے نقطے کو
رہے گا اپنی گردش میں وجودِ نیم جاں اپنا

مرا چہرہ کئی چہروں کے خال و خد میں بکھرا ہے
تماشہ آئینہ دیکھے اکیلے میں کہاں اپنا

کرن کے دوش پر دیتا ہوں میں دستک خلاؤں کو
مسافر ہی سہی لیکن کہے گی کہکشاں اپنا

اُٹھائے پھر رہا ہے ایک ہی منظر نگاہوں میں
پچھلے موسم سے ملتا ہی نہیں کوئی سماں اپنا

کبھی تو وہ بھی اس اندھے کنویں میں جھانک کر دیکھے
ہجومِ خلق میں تنہا بھٹکتا رازداں اپنا

بشیر سیفی

اُڑا لیے ہیں سمندر نے کیا گہر کے لیے
وہ اشک میں نے جو چاہے تھے چشمِ تر کے لیے

گرا رہا ہوں میں اپنے ہی زور میں جس کو
نہ ہو کہ بعد میں ترسوں اسی شجر کے لیے

کھڑی ہے سر پہ ہمارے یہ کیوں پہاڑ سی رات
دعائیں ہم نے نہ مانگی تھیں کیا سحر کے لیے

پھر اس کے بعد اندھیروں کا شور گونجے گا
یہ رنگ و نور کے نغمے ہیں لمحہ بھر کے لیے

معاشرت کے تضادوں میں یہ بھی کیا کم ہے
کما رہا ہوں جو سیفیؔ گزر بسر کے لیے

راغب شکیب

گھر میں اُتر کے دھوپ مجھے قتل کر گئی
سُورج کی تیغ میرے بدن میں اُتر گئی

دونوں رہے ہیں لازم و ملزوم کس قدر
جس وقت پیڑ گر گئے، چھاؤں بھی مر گئی

اب بھی ہیں میری آنکھ میں تاریکیاں وہی
مانا، دیئے کی روشنی ہر سُو بکھر گئی

پھرتا رہا میں شہر کی گلیوں میں رات بھر
اور شام درد میرے لیے میرے گھر گئی

مانا، شکیبؔ دھوپ سے جلتا رہا بدن
لیکن وہ آشنا مجھے سائے سے کر گئی

غلام حسین ساجد

میرا گاؤں مرے سینے میں اب بھی مری امانت ہے
اے لاہور تری گلیوں سے پھر بھی مجھے محبت ہے

سُنو، محبت اِک رستہ ہے، مایوسی، محرومی کا،
اس رستے پر چلنے والوں کی تقدیر ہزیمت ہے

میں کہتا ہوں، سب سانسوں سے کیسی خوشبو آتی ہے
وہ کہتے ہیں، چُپ ہو جاؤ، سارا شہر سلامت ہے

چلنے والو، گھر کو واپس ہونے کے دن بیت چکے
اب تو ساری عمر اندھیرے کی تاریک مسافت ہے

آج تو شاید وہ بھی اپنے سُکھ کی نیند سے جاگے گا
آج تو اُس کے چہرے پر بھی اِک انجانی وحشت ہے

ساجد اب کجلائی آنکھیں خون سے دُھلنے والی ہیں
دیکھو تو سب آئینوں میں اِک بے نور شباہت ہے

حیدر قریشی

لفظ تیری یاد کے سب بے صدا کر آئے ہیں
سارے منظر آئینوں سے خود مٹا کر آئے ہیں

جل چکے ساری مہکتی خواہشوں کے جب گلاب
موسموں کے دُکھ نگاہوں میں جلا کر آئے ہیں

ایک لمحے میں کئی صدیوں کے ناطے توڑ کر
سوچتے ہیں اپنے ہاتھوں سے یہ کیا کر آئے ہیں

راستے تو کھو چکے تھے اپنی ہر پہچان تک
ہم جنازے منزلوں کے خود اٹھا کر آئے ہیں

سارے رشتے جھوٹ ہیں سارے تعلق پُر فریب
پھر بھی سب قائم رہیں یہ بد دُعا کر آئے ہیں

ہر چھلکتے اشک میں تصویر جھلکے گی تری
نقش پانی پر ترا اَنمٹ بنا کر آئے ہیں

موت سے پہلے جہاں میں چند سانسوں کا عذاب
زندگی جو قرض تیرا تھا ادا کر آئے ہیں

سارے شکوے بھول کر آؤ ملیں حیدر انہیں
وہ گئے لمحوں کو پھر واپس بلا کر آئے ہیں

جاذب قریشی

بہت دنوں سے وہ کچھ اور ہی گمان میں ہے
میں بجھ رہا ہوں چراغاں مرے مکان میں ہے

جو تُو نہیں ہے تو آنکھوں میں خواب ہیں تیرے
وہ تشنگی ہوں کہ دریا مری کمان میں ہے

میں اپنی سمت چلوں تو پکارتا ہے کوئی
کہ اِک فصیلِ شب و روز درمیان میں ہے

جو مجھ کو یاد دلاتا ہے خال و خد اپنے
زمین پر ہے وہ چہرہ کہ آسمان میں ہے

کسی بدن کسی پرچھائیں کی حقیقت کیا
غبار پھول میں ہے آئینہ چٹان میں ہے

سفر سے لوٹ کے گھر جاؤں تو نہ جانے دے
وہ رنگ رنگ اُجالا جو بادبان میں ہے

مرے لہو کی گواہی تو مِل گئی مجھ کو
کہ اِک پرندہ ستارہ صفت اڑان میں ہے

کوئی نہیں جو اندھیرے پہن کے ڈوبا ہو
وہ جل رہا ہے جو سورج کے سائبان میں ہے

میں روشنی بھی ہوں میں غم کا استعارہ بھی
کہ میرے ساتھ نہیں وہ جو میرے دھیان میں ہے

باقی احمدپوری

میرے دل کی ہر تمنا کا زیاں اُس نے کیا
اعتبارِ دوستی پھر بھی کہاں اُس نے کیا

میں نے جس کو روشنی کے راستے سمجھا دیئے
ظلمتوں سے آشنا میرا جہاں اُس نے کیا

اپنے نقشِ پا بھی ظالم نے کہیں چھوڑے نہیں
میری منزل کو بھلا کیوں بے نشاں اُس نے کیا

آئینے کے سامنے پہچان میری کھو گئی
پھول سے چہرے کو پابندِ خزاں اُس نے کیا

نفرتوں کے شہر میں پھرتا رہے گا عمر بھر
کیسی کیسی چاہتوں کو رائیگاں اس نے کیا

جس تصور کی پرستش میں نے کی شام و سحر
مجھ کو میرے ہی نگر میں بے اماں اُس نے کیا

سر زمینِ دل پہ غم کے کارواں چلنے لگے
رُوحِ مردہ تھی جسے رُوحِ رواں اس نے کیا

آج کیوں باقی مری آنکھوں میں آنسو آ گئے
داستاں کس کی تھی وہ جس کو بیاں اُس نے کیا

زاہد نوید

دُور ہوگا، اس کا گھر اتنا، یہ اندازہ نہ تھا
اور کُھلا اس شہر کا، کوئی بھی دروازہ نہ تھا

عمر ویراں جزیرے کی رُتیں سب دیکھ لیں
ایک بھی منظر کے رُخ پر، شبنمی غازہ نہ تھا

ڈھونڈتے پھرتے رہے صحنِ چمن میں شام تک
پر ہمارے نام کا، کوئی گلِ تازہ، نہ تھا

میں نے تو یونہی پلٹ کر، دیکھنا چاہا۔ نوید
تھا تعاقب میں بگولہ، کوئی آوارہ نہ تھا

صفدر صدیق رضی

تُو مجھ پہ بیت چکی ہیں قیامتیں لکھ دے
مرے نصیب میں کچھ اور چاہتیں لکھ دے
وہ لغزشیں کہ جواب مری دسترس میں نہیں
جو مجھ کو چھوڑ چکی ہیں وہ عادتیں لکھ دے
میں جن کو بھول چکا ہوں وہ صورتیں ہیں کہاں
جنہیں میں یاد نہیں وہ شباہتیں لکھ دے
تُو مری منزلِ مقصود سہی پھر بھی
کبھی نہ ختم ہوں ایسی مسافتیں لکھ دے
کبھی تو کر مرے سینے میں نقش پا تحریر
غبارِ راہ کے ماتھے پہ سطوتیں لکھ دے

عادل فریدی

کر گئے تجھ سے بدگمان مجھے
تیرا لہجہ، تری زبان مجھے

دولتِ اَب وجہ ہوئی تقسیم
تیر اُس کو ملا کمان مجھے

ہے اسی خاک سے نمودِ وجود
راس آئی نہیں اُڑان مجھے

بے مسافت کٹی حیات مری
شش جہت کا نہیں تھا گیان مجھے

میں اسیرِ چراغِ خانۂ شب
جز سحر کچھ نہیں ہے دھیان مجھے

لمحۂ فکر ہے کہ ہمسایہ،
بھیک میں دے گیا مکان مجھے

پر شکستہ تھا اس لئے عادل
آسمان سمجھا بے امان مجھے

نیاز حسین لکھویرا

تنِ نحیف کی خاطر ردا نہیں مانگی
بہت دنوں سے خدا سے دُعا نہیں مانگی
خود اپنی لاش کو اپنے لہو سے ڈھانپا ہے
ہری رتوں سے گلوں کی قبا نہیں مانگی
چھتوں پہ پیاس پڑاؤ کئے رہی لیکن
سیاہ بخت گھروں نے گھٹا نہیں مانگی
کوئی شجر نہ خریدا خلوصِ جاں کے عوض
شدید دھوپ میں ٹھنڈی ہوا نہیں مانگی
سکوتِ مرگ لبوں کو پسند ہے لیکن
جو مستعار ملے وہ صدا نہیں مانگی
نزولِ موسمِ تحقیرِ جاں سے بچنے کی
گلاب ایسے بدن نے دعا نہیں مانگی

انجم ترازی

اک دو باتیں باقی رہ گئیں قصے کی
چھین لی اُس نے سانس بھی میرے حصّے کی

اس کے بعد تو انسانوں کا کال پڑا
جب ہم بچھڑے آخری شب تھی میلے کی

سوکھی شاخوں والے ننگے پیڑوں سے
خاموشی باتیں کرتی تھی رستے کی

کانپ رہے تھے کھُلے ہوئے پر ہوا کے ساتھ
ساکت پڑی ہوئی تھی لاش پرندے کی

چاروں جانب آوازوں کا شور دکھا
بیچ میں اک تصویر بنا سنّاٹے کی

میری سوچوں کا سرمایہ بٹتا رہا
لے گئے لوگ کمائی خون پسینے کی

آج مری امید کا سورج ڈوب گیا
انجم ٹوٹ گئی اب لاٹھی اندھے کی

آسی خانپوری

ہوں تجھ سے دُور مگر قربتوں کی قید میں ہوں
کسی سے کیسے کہوں چاہتوں کی قید میں ہوں

وہ خوش ہے قوسِ قزح کی حسین وادی میں
میں گرد گرد اُٹے منظروں کی قید میں ہوں

تُو کب سے توڑ چکا چاہتوں کے رشتے کو
میں کب سے گزرے ہوئے موسموں کی قید میں ہوں

تمہاری زلف کا سایہ ملے کبھی شاید
ابھی تو تپتے ہوئے سُورجوں کی قید میں ہوں

کبھی تو منزلِ راہِ وفا بھی آئے گی
غبارِ رہ کی طرح راستوں کی قید میں ہوں

تُو کب سے پھول کی صورت ہے دل کے آنگن میں
میں کب سے مہکی ہوئی خوشبوؤں کی قید میں ہوں

اَنا کے بند دریچوں سے جھانک تو اے دوست
ابھی تلک میں تری الفتوں کی قید میں ہوں

شعیب جاذب

جا کے تھوڑی دُور واپس اپنے گھر آیا ہوں میں
رینگتے لمحوں کے شانوں سے اُتر آیا ہوں میں

سانس کے آسیب رہتے تھے جہاں سایہ فگن
ان بھیانک راستوں سے اب گزر آیا ہوں میں

چڑھتے دریا سے گزرنا تو بہت دشوار تھا
کس سلیقے سے بھنور کے دوش پر آیا ہوں میں

ذات ہی کے خول سے باہر نکلنا تھا کٹھن
ایسا خنجر ہوں کہ خود کو کاٹ کر آیا ہوں میں

رولتا پھرتا ہوں کرچیں بانٹتا پھرتا ہوں جسم
کیسے شہرِ سنگ سے لیکر ثمر آیا ہوں میں

یوں جُھلستے جسم پر اب تک ہے چھاؤں کا اثر
جیسے کوئی اوڑھ کر برگِ شجر آیا ہوں میں

دل کے دروازے پہ دستک دے رہی ہے کس کی یاد
یہ جو روتی آنکھ کے مانند بھر آیا ہوں میں

یہ بلندی مجھ کو جاذب کس قدر مہنگی پڑی
دیکھنے والوں کو اک تارا نظر آیا ہوں میں

ناھید فخری

وہ شہر چھوڑ دیا جس میں دوست رہتے تھے
مگر یہ ہونا تھا یہ ہجرتوں کے ورثے تھے

یہ کیا ہوا کہ ہوا بستیاں اُجاڑ گئی
میری دعا تو فقط خوشگوار جھونکے تھے

پھر اس کے بعد سمندر کبھی خفا نہ ہوا
وہ کون لوگ تھے جو پانیوں میں اُترے تھے

میں اک درخت پہ جب نام لکھ رہا تھا تیرا
تو آس پاس کے کچھ پیڑ مل کے روئے تھے

نئی رُتوں میں کھلے ہیں وہ زخم کی صورت
جو قرب گزرے ہوئے موسموں میں بوئے تھے

تمہارے ہاتھ پہ لکھا ہوا ہی سچ نکلا
جو خواب میں نے سُنے تھے وہ سب ادھورے تھے

اے آفتاب تیرے منتظر رہے صدیوں
یہ اور بات کہ ہم بادلوں کے ٹکڑے تھے

پرایا شہر تھا میں پھر بھی خوش رہا فخری
وہاں بھی پھول تھے اور خوشگوار چہرے تھے

شریف منوّر

سب تھے سعیٔ برتر میں
دریا گئے سمندر میں

نظریں کم ہی جاتی ہیں
منظر سے پس منظر میں

وہ تو بسنا چاہتا ہے
اس گھر میں یا اُس گھر میں

کشتی ٹوٹنے والی ہے
وہ بھی بیچ سمندر میں

اس لیے موسم بارش نے
آگ لگا دی بستر میں

سمٹیں، اُلجھیں کتنے پاؤں
اک چھوٹی سی چادر میں

طالب قریشی

کب سے شبِ فراق تلاشِ سحر میں ہے
سورج مرے نصیب کا لمبے سفر میں ہے

محرومیوں کی دھوپ سے تپتے ہیں بام و در
ماحول سازگار کہاں میرے گھر میں ہے

پھر تشنگی ہے قوسِ قزح کا سماں لیے
آبِ رواں ہے آنکھ میں صحرا نظر میں ہے

فانوس جگمگائے ہوئے ہیں مکان کے
کائی مگر جمی ہوئی دیوار و در میں ہے

سب ہی مری تلاش میں نکلے ہیں ہر طرف
طالب کہیں چھپا ہوا اپنی نظر میں ہے

لطیف ساحل

خواہشوں کے آنگن میں رات دن بسیرے تھے
تتلیاں تمہاری تھیں اور پھول میرے تھے

چاند آسماں سے جب زمیں پہ اترا تھا
دیکھنے میں راتیں تھیں اصل میں سویرے تھے

اب تمہارے کہنے پر خود کو کیا سمیٹیں ہم
چاہیئے تھی خوشبو تو پھول کیوں بکھیرے تھے

دُور تک نکلنا بھی، پھر سے لوٹ آنا تھا
وادیوں نے کچھ ایسے راستے بکھیرے تھے

آخر ایک دن مجھ کو دوستوں میں بٹنا تھا
میری ذات کے اندر چاہتوں کے ڈیرے تھے

لُٹ گئے جو ہم دونوں، تو قصور کس کا ہے
خواہشیں بھی تیری تھیں، فیصلے بھی تیرے تھے

مصدق اقبال

رات بھر دشتِ خموشاں میں رہا میرا قلم
صبح دم دیکھا گیا ہے خستہ پا میرا قلم

درد کے گونگے قبیلے دے رہے ہیں اب صدا
معجزہ دکھلا گیا سب سے جُدا میرا قلم

جگمگاتے آنچلوں پر تبصرہ کرنے لگا،
دیکھتے ہی ہو گیا پل میں ہوا میرا قلم۔

رات بھر میرا بدن ہی حادثوں کی زد میں تھا
میں خبر تھا سُرخیاں لکھتا رہا میرا قلم

میں مصدّق آسمانِ تیرگی بن کر رہا
روشنی دیوارِ شب کو دے گیا میرا قلم

طارق پیرزادہ

شب کو روشن کوئی مشعل، کوئی تارا کرنا
شب نوردوں کے لئے کچھ تو خدارا کرنا

اِک ذرا پھر وہی نفرت کی نظر ڈال کے دیکھ
چاہے پھر شوق سے آنکھوں میں اتارا کرنا

جسم کی برف تو اِک آن میں گھل جائے گی
بس ذرا دیر کڑی دھوپ گوارا کرنا

یہ دکھی ہیں انہیں شاخوں سے اڑاؤ گے تو پھر
عُمر بھر کے لئے حسرت سے پُکارا کرنا

وہ جو ساحل پہ سمندر ہے لہو پیتا ہے
تم ذرا اُس کے سرابوں سے کنارا کرنا

ہم تو مٹی سے بنائے گئے بُت ہیں طارقؔ
ٹوٹ جائیں تو کبھی ذکر ہمارا کرنا

انور جمال

شبوں کا زہر رگوں میں اتارنا ہوگا
میں سو بھی جاؤں تو خوابوں میں جاگنا ہوگا

ابھی سے منظرِ احساس کیوں ہے گرد آلود
ابھی تو دشتِ مسافت کا سامنا ہوگا

وہ صبحِ حُسن کا سُورج سہی مگر اس کو
حریمِ شام کے پہلو میں ڈوبتا ہوگا

ہم اس مدار کی سرحد پہ ہیں جہاں ہم کو
خود اپنی ذات کے محور پہ گھومنا ہوگا

یہی ہے دشتِ تمنا تو دیکھنا اِک دن
ہوا کے پیچھے تسلسل سے بھاگنا ہوگا

اُسی سے رکھنی ہے گر دوستی تو پھر انورؔ
انا کے گنبدِ بے در کو توڑنا ہوگا

صالحہ خاتون

شب کے سناٹے میں دل کی دھڑکنیں سنتی ہوں میں
وہ نہیں آیا مگر اُس کے لئے بیٹھی ہُوں میں

بدنصیبی کا گھنا جنگل ہے میرے چار سُو
اور مثالِ آہوئے وحشت زدہ پھرتی ہوں میں

میں تو اک عرصے سے ہوں اپنے خیالوں میں مگن
اور اس پر لوگ کہتے ہیں کہاں رہتی ہوں میں

پھر شکستہ گھر وہ میرا یاد آتا ہے مجھے
جب کبھی اُونچے مکانوں کی طرف تکتی ہوں میں

صالحہ بخشا ہے کس نے شاعری کا فن مجھے
کون سا وہ شخص ہے جس کے لئے لکھتی ہوں میں

نوازش علی

اِک صدا گونجتی ہے کانوں میں
روشنی آئے گی مکانوں میں،
رُوح پہنچی تھی آسمانوں میں،
تیر کھنچتے رہے کمانوں میں
خوفِ ساحل تھا یا کہ لذتِ مرگ
خود کئے چھید بادبانوں میں
کیسی مانوس سی صدا ہے یہ
دل دھڑکنے لگا ہے کانوں میں
غمِ دنیا کبھی، کبھی غمِ عشق
شخصیت بٹ گئی ہے خانوں میں
چھیڑئیے اب کوئی بہار کا گیت
پیڑ ننگے ہیں گلستانوں میں
کیسے پہنچے صدا مکینوں تک
کوئی روزن نہیں مکانوں میں

ڈاکٹر بیدل حیدری

خونِ تازہ، جو بہا جسم کا صدقہ اُترا
مطمئن ہوں کہ کسی رنگ تو دریا اُترا

جن کی آغوش میں سوتے تھے پرندے شب بھر
رات طوفاں کا اُنہیں پیڑوں پہ غصّہ اُترا

لوگ تو سطحِ سمندر ہی پہ سیراب ہوئے
تشنگی میری زیادہ تھی، میں گہرا اُترا

احتیاطاً کوئی جگنو ہی قبا میں رکھ لے
کام دے گا جو مسافت میں اندھیرا اُترا

تیز آندھی جو چلی، صحنِ چمن میں بیدلؔ
سانس کے ساتھ بدن میں مرے صحرا اترا

ذوالفقار علی فرخ

سفر کی بھول بھلیوں میں ہمسفر، وہ نظر
تھکن سے چور تھے بے بال و پر مگر وہ نظر
چھپا کے مجھ کو خنک اجنبی خلاؤں میں
تلاش کرتی پھری مجھ کو در بدر، وہ نظر
گداز بخشا ہے اس نے سِلوں کو صدیوں سے
سِلوں میں چُن دی گئی تھی جو بے خطر، وہ نظر
کھڑے تھے آج برہنہ ہرن قطاروں میں
بنی تھی آج بھی ان کے لئے شجر وہ نظر
دہل گئے تھے عقابوں سے آہنی لشکر
سمٹ گئی تھی برہنہ کٹار پر وہ نظر
گزر گیا تھا جہاں سے میں بے خیالی میں
اسی مقام پہ تھی میری منتظر وہ نظر
تمام عمر یہی یاد ساتھ تھی فرخؔ
وہ راستے وہ پرندے وہ سوتے گھر وہ نظر

ساجد امجد

راستے ٹھہرے ہوئے ہیں راہ میں
کون آیا ہے تماشہ گاہ میں

اس گلی میں ہم فقیروں پر کھلا
کچھ نہیں دستار و عزّ و جاہ میں

رات اور دن کی صفوں میں بٹ گیا
اک ستارہ آسماں کی چاہ میں

مجھ کو میری آنکھ پر روشن کیا
اک ہنر ایسا بھی تھا بدخواہ میں

کچھ تو آندھی میں گرے پیڑ اور کچھ
تیز آندھی کی فقط افواہ میں

رات دن ملنے کے دن تھے اور اب
دن بدلتے ہیں کہیں اک ماہ میں

وصل کی قسمت ہی ساجد ہجر ہے
اب گزارہ کر اسی تنخواہ میں

سلمان سعید

مسافر چلتے چلتے تھک گیا ہے
سفر جانے ابھی کتنا پڑا ہے

مکاں کے سب مکیں سوئے پڑے ہیں
ہوا کا شور مجھ سے کہہ رہا ہے

وہ میرے سامنے بیٹھا ہے لیکن
دلوں کے بیچ کتنا فاصلہ ہے

جسے ملنے تم آئے ہو یہاں پر
وہ کب کا اس مکاں سے جا چکا ہے

اگرچہ ہو رہی ہے خشت باری
مگر اک شخص چلتا جا رہا ہے

طلائی تثلیث | سجاد نقوی

جناب عطاء الحق قاسمی مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے کئی ماہ کی شبانہ روز تگ و دو کے بعد ایک ادبی جریدہ "معاصر" نکالا ہے جو اپنی ضخامت کے اعتبار سے خاصے کی چیز ہے۔ اس پرچے کے اجرا سے مجھے اس لئے بھی خوشی ہوئی ہے کہ اس کے حرفِ آغاز میں عطاء الحق قاسمی صاحب نے اپنے پرچے کے جس ادبی مؤقف کا شدومد سے اظہار کیا ہے وہ "اوراق" کے اداریوں میں بڑے التزام کے ساتھ پہلے سے پیش ہوتا رہا ہے۔ گویا انہوں نے "معاصر" نکال کر "اوراق" ہی کے ادبی مؤقف کو آگے بڑھانے کی کوشش فرمائی ہے اور بحیثیت اعزازی مدیر "اوراق" مجھے یہ بات اچھی لگی ہے۔ مثلاً اپنے 'حرفِ آغاز' میں مدیرِ معاصر لکھتے ہیں:۔

"ہمارے نزدیک، ہمارے اردگرد کی سب سے بڑی حقیقت پاکستان کا وجود ہے چنانچہ وہ تمام فلسفے اور تمام نظریے ہمارے لئے چیلنج ہیں جو اس حقیقت کو ماند کرنے کے لئے سامنے آتے ہیں۔ لہٰذا ہم اس ضمن میں دائیں اور بائیں کی تفریق کو بھی تسلیم نہیں کرتے۔ ہمیں وہ "اسلام پسند" مذہر لگتے ہیں جو اپنے اکابر کے حوالے سے اس سرزمین کی نفی کرتے ہیں اور ان "ترقی پسندوں" سے بھی نفرت ہے جو اس کی بنیادوں میں کیڑے نکالتے رہے ہیں۔۔۔۔ ہمارا اتحاد بھی (لیفٹ رائٹ کی تفریق کے بغیر) ان ادیبوں سے ہے جو اس زمین، اس زمین پر بسنے والے عوام اور ان عوام کے عقیدوں اور آدرشوں کو عزیز رکھتے ہیں"

یہ بات جناب عطاء الحق قاسمی نے ۱۹۷۹ء کے آخری ایام میں کہی ہے گو ان کا لہجہ بہت حد تک کرخت اور جھنجلاہٹ کا آئینہ دار ہے "اوراق" کے شمارہ مارچ اپریل ۱۹۷۳ء کے "پہلا ورق" میں آج سے تقریباً چھ برس قبل یہی بات انتہائی شائستگی اور ملائمت سے کہی گئی تھی۔ ملاحظہ کیجیے:۔

"اب ہم کس طرح اپنے مہربانوں اور کرم فرماؤں کو بتائیں کہ ادب، ادب ہے۔ اسے دائیں اور بائیں، سرخ، سبز یا سیاہ میں تقسیم کرکے ایک کی حمایت اور دوسرے کی مذمت کرنا ایک بالکل غلط نظریہ ہے۔ ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں کہ کسی 'ادب پارے' کا خالق کس گروہ سے منسلک یا کس نظریئے کا قتیل ہے۔ ہمیں تو محض یہ دیکھنا ہے کہ اس نے ادب پیدا کیا ہے یا پمفلٹ۔ ادب کی صورت میں ہمارے لئے یہ تحریر ایک قیمتی اثاثہ ہے چاہے اسے سرخ رنگ کی پلیٹ میں رکھ کر پیش کیا جائے یا سبز رنگ کی پلیٹ میں۔ پمفلٹ کی صورت میں ہم اظہارِ ہمدردی ہی کر سکتے ہیں"

عطاء الحق قاسمی نے اپنے اداریے میں دوسری بات 'ارضِ وطن' سے محبت کے سلسلے میں کہی ہے۔ اس ضمن میں تو "اوراق" کا مؤقف

شروع ہی سے بہت واضح رہا ہے۔ چند اقتباسات دیکھئے:۔

"ارضِ وطن ایک مقدس اثاثہ ہے جس کے ناموس کے تحفظ کے لئے خون کا آخری قطرہ بہا دینا بھی عین سعادت ہے ....
ہم سمجھتے ہیں کہ کسی ملک کے ادب کو اس کی ثقافت اور تہذیب سے الگ نہیں کیا جا سکتا اور ثقافتی ماحول زمین کی باس، پانی، نمک اور فضا پر عناصرِ آفاق کے عمل سے پیدا ہوتا ہے۔ "اوراق" زمین کو اہمیت دینے میں اس لئے پیش پیش ہے کہ زمین عورت کی طرح تخلیق کرتی ہے لیکن وہ آسمان کی اہمیت کو بھی نظر انداز نہیں کرے گا کہ آسمان اس تخلیق میں ایک اہم کردار ادا کرتا ہے وغیرہ"
"اوراق کا پہلا شمارہ اس جذبۂ حُبّ الوطنی کے ترجمان دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے جسے ہم فن کی عالم گیریت کے ساتھ مشروط کر کے ادبِ عالیہ کی اساس قرار دیتے ہیں"

اوراق شمارۂ خاص ۱ ۱۹۶۶ء

"حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ آفاقیت کے نام پر اپنے وطن کی مقدس سرزمین کی نفی کرتے ہیں، ان کی حالت ایک خانہ بدوش سے کسی صورت بہتر نہیں"

اوراق شمارۂ خاص ۳ ۱۹۶۶ء

"اوراق نے زمینی اور آسمانی رشتوں کے ذریعے وطن کی تاریخ اور ثقافت میں ادب کی جڑوں کو تلاش کرنے کے نظریے کو پیش کیا ہے۔"

اوراق شمارۂ خاص ۳ ۱۹۶۷ء

"اوراق" کے اداریوں سے اس قسم کے لاتعداد اقتباسات پیش کئے جا سکتے ہیں جو اس بات کا کھلا ثبوت ہیں کہ "اوراق" وہ پہلا پرچہ تھا جس نے دائیں بازو اور بائیں بازو کے نظریوں کو بالائے طاق رکھ کر پاکستانیت کا برملا اظہار کیا اور حُبّ الوطنی کی اساسی اہمیت کو اُجاگر کیا۔ اُس زمانے میں "اوراق" کو اپنے مُوقف کے اظہار پر جس تلخ و ترش ردِ عمل کا سامنا کرنا پڑا اس سے ادب کا ہر قاری واقف ہو گا۔ مگر اب دیکھئے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ادبی رویّوں میں کس قدر فرق آ گیا ہے کہ وہی بات جو آج سے پندرہ برس پہلے قابلِ مذمت تھی، آج باعثِ افتخار ہے! بہرحال مجھے ذاتی طور پر اس بات کی خوشی ہے کہ عطاء الحق قاسمی نے "معاصر" کے پہلے ہی شمارے میں "اوراق" کے ادبی مُوقف کو دُہرا دیا ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ اس ضمن میں "اوراق" کا حوالہ بھی دے دیتے مگر شاید اس زمانے میں حوالہ دینے کی رسم مستحسن نہیں سمجھی جاتی۔

(۲)

انسانی فطرت بھی عجیب ہے کہ انسان جس پیڑ کے سائے میں چند ساعتوں کے لئے سستاتا ہے، چلتے وقت اس کی شاخوں پر ہاتھ بھی صاف کرتا ہے۔ کچھ ایسا المیہ "معاصر" کے سلسلے میں پیش آیا ہے کہ 'اداریے' میں تو "اوراق" کے مُوقف پر شب خون مار لیا گیا مگر متن میں یہ ضروری سمجھا گیا کہ مدیرِ اوراق کی مشہور کتاب "اُردو شاعری کا مزاج" کو جس میں یہی مُوقف تہذیبی اور فلسفیانہ سطح پر زیرِ بحث آیا ہے، منہدم کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس کام کے لئے مدیرِ معاصر کی نظرِ انتخاب جناب رشید ملک پر پڑی اور رشید ملک صاحب نے کئی ماہ کی محنت کے بعد ایک مضمون بعنوان "طلائی تثلیث" مرتب کیا جسے مدیرِ موصوف نے نہ صرف بڑے اہتمام سے شائع کیا بلکہ "معاصر" کی اشاعت سے پہلے اور بعد اُس مضمون کے حق میں ایک مہم بھی چلائی۔ چونکہ اس مضمون کا روئے سخن میری طرف ہے اور رشید ملک نے مجھ پر نظرِ عتاب

بھی ڈالی ہے کہ میں نے "معاصرین کی نظر میں" اِن کے قیمتی مشورے لئے بغیر ہی شائع کر دی۔ لہٰذا میں مناسب سمجھتا ہوں کہ رشید ملک صاحب کے ان چاروں نکات کا جواب دوں جو انہوں نے اپنے اس مضمون میں اُٹھائے ہیں۔ ویسے ڈاکٹر وزیر آغا صاحب قابلِ مبارک باد ہیں کہ انہوں نے ایک ایسی ہنگامہ خیز کتاب لکھی کہ آج پندرہ برس گزرنے کے بعد بھی یار لوگ اس کے مطالب پر بحث و مناظرہ کرنے میں تھکاوٹ محسوس نہیں کرتے اور بعض تو اس کتاب کو اپنے لئے اتنا بڑا چیلنج سمجھتے ہیں کہ اِسے مٹائے بغیر اُن کا زندہ رہنا بھی مشکل ہے۔ میں نے "اُردو شاعری کا مزاج" کے شائع ہونے کے کچھ ہی عرصہ بعد وہ تمام مضامین کتابی صورت میں یکجا کر دیئے تھے جو اس وقت تک اس کتاب کی حمایت یا مخالفت میں لکھے گئے تھے مگر یہ سلسلہ تو پندرہ برس سے جاری ہے۔ اگر اللہ تعالےٰ نے توفیق دی تو میں ایک اور کتاب بھی مُرتب کروں گا جس میں "معاصرین کی نظر میں" کے بعد شائع ہونے والے مضامین شامل ہوں گے۔ اس کتاب میں رشید ملک صاحب کا مضمون "طلاقِ تثلیث" بھی ضرور شامل ہوگا۔ ساتھ ہی زیرِ نظر مضمون بھی تاکہ اہلِ نظر کو معلوم ہو سکے کہ "اُردو شاعری کا مزاج" پر رشید ملک صاحب کے اعتراضات کس قدر بے بنیاد اور غلط ہیں۔

(۲)

"اُردو شاعری کا مزاج" پر رشید ملک صاحب کا پہلا اعتراض "نظریۂ تکوینِ کائنات" کے ضمن میں ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنی کتاب کے ابتدائی صفحات میں تکوینِ کائنات کے عمل کو دل کی حرکات کے مماثل قرار دیتے ہوئے لکھا تھا کہ جس طرح دل بسط اور قبض کی حرکات پر مشتمل ہے بالکل اسی طرح کائنات بھی پھیلنے اور سمٹنے کے عمل میں مبتلا ہے۔ ضمناً انہوں نے 'تکوینِ کائنات' کے سلسلے میں سائنس کے دو مقبول نظریوں کا حوالہ دیا جن میں سے ایک BIG BANG اور دوسرا STEADY STATE تھیوری کہلاتا ہے۔ مقدم الذکر تھیوری کے مطابق کائنات کی تخلیق ایک دھماکے سے ہوئی ہے۔ مؤخر الذکر تھیوری کے مطابق کائنات کی ابتدا کسی دھماکے سے نہیں ہوئی بلکہ کائنات میں مادہ ہر لحظہ پُراسرار طریق سے خلق ہوتا رہتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی کتاب میں سائنس کی مقدم الذکر تھیوری کو زیادہ قرینِ قیاس قرار دیتے ہوئے کائنات کے بار بار پھیلنے اور سمٹنے کے نظریے کو پیش کیا ہے جس پر اب اتفاقِ رائے پایا جاتا ہے۔

رشید ملک صاحب کا اندازِ تنقید دیکھئے کہ ڈاکٹر صاحب نے تو تکوینِ کائنات کے بارے میں سائنس کے کم از کم دو نظریات کا ذکر کیا مگر ملک صاحب نے قارئین کو یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ ڈاکٹر صاحب کو سائنس کی STEADY STATE THEORY کے وجود کا علم تک نہیں۔ اس سے بھی زیادہ افسوسناک ان کا یہ فرمانا ہے کہ تکوینِ کائنات کے متعدد نظریات میں سے ڈاکٹر صاحب نے دھماکے والے نظریے کو منتخب کیا تو اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ افلاطون اور عیسائیت کے حوالے سے تکوینِ کائنات کا جو مابعد الطبیعاتی نظریہ مستعمل رہا ہے، ڈاکٹر وزیر آغا اس سے متاثر تھے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ "ان کے ذہن پر تین ہزار سالہ فرسودہ ہندو فلسفہ تھا۔" ان کی پہلی بات کے سلسلے میں عرض ہے کہ اگر آغا صاحب کسی مابعد الطبیعاتی نظریے سے متاثر بھی تھے تو اس میں کیا حرج ہے۔ تکوینِ کائنات کے سلسلے میں مابعد الطبیعاتی توجیہہ کو قبول کرنا اللہ تبارک تعالیٰ کے وجود کا اقرار کرنے کے مترادف ہے۔ رشید ملک صاحب کو یہ بات بُری کیوں لگی ہے؟ پھر یہ بھی دیکھئے کہ مابعد الطبیعاتی توجیہہ محض عیسائیت یا افلاطونی افکار تک تو محدود نہیں بلکہ خود اسلامی تعلیمات کے مطابق بھی ہے۔ "کُن فیکون" کے الفاظ تو ملک صاحب نے بھی سُنے ہوں گے کیا اُن کا ترقی پسند ذہن "کُن" سے کائنات کی تخلیق کے نظریئے کو ماننے پر تیار نہیں؟ جو بھی ہو اُن کو یہ حق تو نہیں پہنچتا کہ وہ مذہبی عقائد کو رجعت پسندی کا مظہر قرار دے کر مسترد کرنے کی جسارت فرمائیں۔ رہی ان کی دوسری بات کہ آغا صاحب نے کائنات کے خلق ہونے، پھیلنے اور پھر واپس آنے کا نظریہ ہندوؤں کے نظریات سے اخذ کیا ہے تو یہ بھی رشید ملک صاحب کے بہت سے مفروضوں میں سے ایک

سفرِ دمنہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے ETERNAL RETURN کے تصور کے ماخذات کا کئی جگہ پر ذکر کیا ہے اور ان میں ہندو نظریے کے علاوہ بھی بہت سے نظریئے ہیں مثلاً "تخلیقی عمل" میں ایک جگہ لکھتے ہیں:-

"نطشے کا نظریہ کہ کائنات میں کوئی نئی شئے ظہور پذیر نہیں ہوتی بلکہ جو کچھ ہوتا ہے وہ اس سے لاکھوں بار پہلے ہو چکا ہے، بنیادی طور پر انسانی سوچ کے اس خاص انداز ہی سے ماخوذ ہے جو زندگی اور کائنات کو دوّار قرار دیتا ہے۔ نطشے سے بہت پہلے فیثا غورث اور افلاطون کے پیروکاروں نیز رواقی فلسفیوں کے ہاں یہ نظریہ بہت مقبول تھا کہ سارا کائناتی نظام ایک دائرے ہی میں گھومتا ہے۔ چنانچہ وہ کہتے تھے کہ ہر دور میں پچھلے واقعات کی تجدید ہوتی ہے اور کوئی نیا یا انوکھا واقعہ کبھی ظہور پذیر نہیں ہوتا۔ اسی طرح قدیم زمانے کے ہندوؤں نے وقت کو منوَنتر، کلپ اور مہایگ اور پھر مہایگ کو ست یگ، ترتیا یگ اور کل یگ میں تقسیم کر کے ان میں ہر ایک کے سال بھی مقرر کر دیئے تھے اور اپنے اس عقیدے کا برملا اظہار کر دیا تھا کہ ہر مہا ونتر کے بعد دوسرا مہا ونتر آتا ہے اور کائناتی وقت کا دائرہ ازلی و ابدی ہے۔"

رشید ملک صاحب نے اپنے مضمون میں بھی آغا صاحب کے اس اقتباس کو پیش کیا لیکن ان کے پیشِ نظر یہ مقصد ہے کہ وہ آغا صاحب کے نظریات کو ہندو نظریات سے ماخوذ ثابت کریں اس لیئے انہوں نے مندرجہ بالا اقتباس کو اس کے سیاق و سباق سے الگ کر کے پیش کیا تا کہ کسی کو علم نہ ہو سکے کہ آغا صاحب نے "دائرے" کے نظریے کے سلسلے میں ہندوؤں کے علاوہ دوسرے ماخذات کا بھی ذکر کیا ہے۔ کیا ملک صاحب اس بات کو ہی آدابِ تنقید کا نام دیتے ہیں؟

لیکن بات تکوینِ کائنات کے سائنسی نظریات کے بارے میں تھی۔ رشید ملک صاحب نے یوں ہی بہت سی ضمنی باتیں چھیڑ کر اس کو الجھا دیا ہے ان کا اصل اعتراض صرف یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے یہ جو کائنات کے دھماکے والے نظریے پر اپنے تھیسس کی بنیاد رکھی ہے تو چونکہ یہ نظریہ ہی مسترد ہو چکا ہے لہٰذا اس بنیاد پر قائم ہونے والی عمارت کا کیا جواز باقی رہ جاتا ہے۔ اپنے مؤقف کو تقویت پہنچانے کے لئے انہوں نے دھماکے والے نظریے کو جھٹلانے کے لیئے سات نکات پیش کئے ہیں جن میں سے بیشتر انہوں نے جگجیت سنگھ کی کتاب سے اخذ کئے ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے HOYLE کی ایک کتاب کے آخری دو ابواب کا مطالعہ بھی کیا ہے اور ان کی مدد سے بھی BIG BANG THEORY کو ملیامیٹ کرنے کی کوشش کی ہے مگر اس سلسلے میں ان کے اصل گرو صرف جگجیت سنگھ ہی قرار پاتے ہیں لہٰذا انہیں یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ آپ ٹو ڈیٹ اور وسیع مطالعہ کئے بغیر یہ تاثر دینے کی سعی فرمائیں کہ وہ تکوینِ کائنات کی تھیوریوں کو نہ صرف پوری طرح سمجھتے ہیں بلکہ حسبِ منشا ان میں کسی بھی تھیوری کو دریا بُرد کرنے کے مجاز ہیں مثلاً جگجیت سنگھ کی مدد سے انہوں نے تکوینِ کائنات کی BIG BANG THEORY کو تو اپنے تئیں مسترد کر دیا لیکن کیا واقعی وہ ایسا کر سکے ہیں؟

مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ میں سائنس کا طالب علم نہیں ہوں اس لئے جگجیت سنگھ کے ان دلائل پر بحث نہیں کر سکتا جنہیں رشید ملک صاحب نے اپنے الفاظ میں الجھا کر پیش کیا ہے۔ میں تو ایک عام سے طالب علم کی حیثیت سے چند اقتباسات پیش کروں گا جو تکوینِ کائنات کے بارے میں سائنس کے جدید ترین رویّے کو پیش کرتے ہیں۔ ان کے مطالعہ سے قارئین خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ملک صاحب اور ان کے جگجیت سنگھ اپنے مؤقف میں کہاں تک حق بجانب ہیں۔ اس سلسلے میں پہلا اقتباس تو HARLOW SHAPLEY کی کتاب TIME AND ITS MYSTERIES سے ہے۔ یہ کتاب پہلی بار ۱۹۶۲ء میں چھپی تھی۔ کتاب کے پیش لفظ میں HARLOW SHAPLEY رقم طراز ہیں:-

"پلومر کی دوربین سے کئے گئے مشاہدات اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ جو کہکشائیں اس وقت اربوں روشنی کے سالوں

کے فاصلے پر ہیں، آج سے اربوں روشنی کے سالوں قبل ان کی رفتار نسبتاً زیادہ تھی۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ کائنات کا پھیلاؤ مدھم پڑ رہا ہے اگر اس سب سے زیادہ طاقت ور دُور بین سے مزید مشاہدات نے مدھم پڑنے کے اس امر کو ثابت کر دیا تو پھر آنے والے اربوں روشنی کے سالوں کے بعد ہم ایک نہ پھیلنے والی کائنات اور پھر سُکڑنے والی کائنات کا تصور کر سکتے ہیں۔ اس بات کا قوی امکان ہے کہ آخر کار سُکڑتی ہوئی مادی کائنات ایک عظیم ابتدائی ذرّے میں سمٹ آئے گی۔ اگر ایسا ہوا تو پھر سوال یہ ہے کہ کیا یہ دوبارہ دھماکے کے ساتھ پھٹ جائے گی؟ کیا ہمارے سامنے ایک دھڑکتی ہوئی کائنات کا منظر ہے؟ کیا ہمیں لامحالہ دھماکے والی تھیوری (جس میں پھیلتی ہوئی کائنات واپسی سے ناآشنا ہے) اور بغیر دھماکے کی تھیوری (جس کے مطابق کائنات آغاز اور انجام سے بے نیاز ہے) میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہے؛ یا ہمیں مسلسل اور متواتر ہونے والے کائناتی دھماکوں کے نظریے کو قبول کرنا ہے؟۔ اس تیسرے نظریے کی خوبی یہ ہے کہ اس کے مطابق ابتدائی ذرّے کا مرحلہ بار بار آتا ہے اور کائنات کے بار بار پھیلنے کے ازلی و ابدی عمل کی گواہی ملتی ہے۔"[1]

گویا شیپلے نے تکوینِ کائنات کی تین صورتوں کی نشان دہی کی ہے۔ ایک وہ جس کے مطابق کائنات دھماکے سے پیدا ہوئی مگر پھیلتی جائے گی، واپس نہیں آئے گی۔ دوسری جس کے مطابق کائنات کا نہ آغاز ہے نہ انجام اور تیسری جس کی رُو سے کائنات کی تخلیق تو دھماکے سے ہوئی مگر واپس آئے گی۔ اس کے بعد ایک اور دھماکہ ہوگا، وہ پھیلے گی مگر پھر واپس آئے گی اور یوں COSMIC THROBS آتے ہی چلے جائیں گے۔ شیپلے نے مؤخر الذکر صورت کو زیادہ قرین قیاس کہا ہے اور ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنی کتاب میں یہی نظریہ پیش کیا ہے۔ لکھتے ہیں:۔

"ایک معین عرصے کے بعد جب دھچکے کا اثر زائل ہو جائے گا تو ابتدائی ذرّے کے اجزاء اصل کی طرف لوٹنے لگیں گے اور بالآخر سمٹ کر ابتدائی ذرّے میں یکجا ہو جائیں گے۔ پھر عدم کا ایک طویل وقفہ آئے گا۔ ————

جس کے بعد تخلیق کا دوسرا دھماکہ ہوگا اور یہ سلسلہ ایک بار پھر شروع ہو جائے گا۔"

مگر رشید ملک صاحب کا خیال ہے کہ ڈاکٹر وزیر آغا نے کائنات کی دھڑکن کا یہ تصور ہندو نظریات سے اخذ کیا ہے۔ کیا ہی اچھا ہو اگر وہ یہی بات HARLOW SHAPLEY کے بارے میں بھی فرما دیں کہ یہ شخص بھی جب COSMIC THROBS کی بات کرتا ہے تو دراصل رادھا کمل مکرجی سے متاثر ہو کر ایسا کرتا ہے۔

اَب آگے چلیئے!

رشید ملک صاحب اگر جگجیت سنگھ کی کتاب کے علاوہ بھی کچھ پڑھنے کی زحمت گوارا کرتے تو انہیں معلوم ہوتا کہ تکوینِ کائنات کے بارے میں جو مختلف نظریات پیش کئے گئے ہیں ان میں سے دھماکے والے نظریے کی توثیق اب فلکیات کے جدید ترین شعبے RADIO ASTRON.MY سے بھی ہو گئی ہے نیز STEADY STATE تھیوری جو ملک صاحب کو عزیز ہے، ریڈیو اسٹرانومی کی جدید ترین تحقیقات نے مسترد کر دی ہے۔ اس سلسلے میں F.GRAHAM SMITH نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف RADIO ASTRONOMY (جس کا ۱۹۶۷ء کا ایڈیشن اس وقت میرے سامنے ہے) میں BIG BANG تھیوری کے بارے میں یہ الفاظ لکھے ہیں:۔

---

[1] HARLOW SHAPLEY _ TIME AND ITS MYSTERIES P. 8

The physical conditions in the early explosive stages of the expanding universe are simple : all material was in the form of a uniform hot soup, filled both with matter and radiation .... At a certain stage of expansion the ingredients of the soup fell apart, sothat the temperature fell without the densities of matter and rediation containing to adjust to aquiliberium values. The remaining radiation from this stage is known as the 'relict-radiation' while the dispersing atomic material is available for the formation of galaxies and stars.[1]

آگے چل کر اس نئے تصور یعنی RELICT RADIATION کے بارے میں گراہم سمتھ نے لکھا ہے:۔

There is a direct observation of what is believed to be the 'relict radiation' dating back to before the formation of galaxies. It has been described by the cosmologist DENNIS SCIAMA as 'perhaps the most magical of all astronomical discoveries'[2]

گویا اب تک تو تکوینِ کائنات کے سلسلے میں پیش کردہ نظریے 'تھیوری' کی سطح تک تھے مگر اب پہلی بار ریڈیو اسٹرانومی کی بدولت RELICT RADIATION کا مشاہدہ کرنے میں کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ گراہم سمتھ رقم طراز ہیں:۔

The expected intensity of the relict radiation was calculated in 1965 by ROBERT DICKE of Princeton University. The intensity and the spectrum, was that of thermal radiation from the whole sky, with a temperature of a few degrees absolute and certainly less than 40 K. —

Very few exciting discoveries of radio astronomy

have been made as a result of theoretical predictions! The discovery of the 3K background radiation, which must rank as one of the greatest astronomical discoveries of all time, was made accidently and without any knowledge of prediction. The remarkable fact of its existence is matched by the accuracy of the predicted intensity. Dicke had calculated the equivalent temperature of the radiation by assuming that radiation and matter "became decoupled" only 100 seconds after the big bang, when the temperature was 10^9 degrees absolute. Thenceforward the temperature decayed, falling with the square root of the time after the big bang. The 3K radiation is indeed a relict radiation, anyone who detects it in a short-wave length radio-telescope ought to pause and contemplate the ease with which he can look at the traces of the most ancient event imaginable.[1]

میں اس طویل انگریزی اقتباس کے لئے معذرت خواہ ہوں مگر چونکہ یہ رشید ملک صاحب کے سارے تھیسس کو حرفِ غلط کی طرح مٹانے کے لئے ضروری تھا اس لئے میں "دراز ترگفتم" کا مرتکب ہوا۔ گویا ریڈیو اسٹرانومی نے تو اب حتمی طور پر دھماکے والی تھیوری پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی ہے۔ اس کے بعد ملک صاحب کا اس تھیوری کے بارے میں: بسنگو کے پیش پا افتادہ نظریات پیش کرنا کیا معنی رکھتا ہے؟

میں نے شروع ہی میں عرض کیا تھا کہ میں کوئی سائنسدان نہیں ہوں البتہ سائنس کے ذریعے جو انکشافات ہوتے رہتے ہیں ان کا ایک حقیر طالب علم ضرور ہوں اور اپنے ذخیرۂ علم میں اضافہ کرنے کی تگ و دو کو اپنے لئے باعثِ فخر سمجھتا ہوں۔ چنانچہ پچھلے دنوں مجھے مشہور مصنف JOHN L. WILHELM کا ایک مضمون BLACK HOLES کے مطالعے کا اتفاق ہوا۔ یہ مضمون ریڈرز ڈائجسٹ نومبر ۱۹۷۷ء میں چھپا ہے۔ اسے رشید ملک صاحب فرصت میں پڑھ سکتے ہیں۔ میں اب اس مضمون سے ایک اقتباس پیش کرتا ہوں۔ جان ولہیم لکھتے ہیں۔

---

[1] GRAHAM SMITH - RADIO ASTRONOMY Pages, 174-175

We have known for five decades that the Universe is expanding and the current consensus is that this expansion is the result of a primordial explosion that blew apart the gigantic 'Cosmic egg' of matter from which all was formed. Will the Universe continue to expand, flying outward forever with matter getting spread out more thinly? Or will the gravitational attraction of the stars and galaxies eventually arrest this expansion and cause the Universe to start contracting? The equations and ideas of Einstein predict that the Universe will one day do exactly this, collapse upon itself [1]

لیجیے ایک عالم تو دھماکے والے نظریے کو مان رہا ہے مگر رشید ملک صاحب کو اس سے اختلاف ہے۔ میرا اپنا خیال یہ ہے کہ ان کے اس اختلاف کے پس پشت یہ خوف پایا جاتا ہے کہ اگر اس نظریے کو تسلیم کر لیا گیا تو پھر لا محالہ تکوینِ کائنات کو "کُن فیکون" کا نتیجہ قرار دینا پڑے گا یعنی اس کے مابعدالطبیعاتی پس منظر کو ماننا پڑے گا۔ چونکہ "کُن فیکون" کے عمل میں ذاتِ باری کے وجود کا ایک اہم ثبوت مضمر ہے اس لئے BIG BANG نظریہ اللہ تبارک تعالیٰ کی ہستی کا ایک سائنسی ثبوت قرار پایا ہے۔ اس طرح ڈاکٹر وزیر آغا کا BIG BANG تھیوری کو قرینِ قیاس قرار دینا اللہ تعالےٰ کے وجود کو سائنسی ثبوت کے ساتھ ماننے کے مترادف ہے اور یہ ایک مبارک بات ہے جبکہ رشید ملک صاحب کا اس تھیوری کو مسترد کر کے STEADY STATE THEORY کے حق میں آواز بلند کرنا ان کے تشکک کو اجاگر کرتا ہے۔ چلتے چلتے ان کی پسندیدہ تھیوری یعنی STEADY STATE تھیوری کے بارے میں گراہم سمتھ مصنف ریڈیو اسٹرانومی کا VERDICT ملاحظہ فرمائیے:۔

. . . . the only clear result is the disproof of the Steady-State Univarse The possibilities which remain are usually known as big-bang Univarses, in which the galaxies rushing apart so dramatically at this time are flying apart from a central explosion which occurred 10,000 million years ago. [2]

---

[1] JOHN L. WILHELM - BLACK HOLES   [2] GRAHAM SMITH - RADIO ASTRONOMY P.173

لہٰذا رشید ملک صاحب اپنی پسندیدہ تھیوری کے بارے میں حد سے بڑھے ہوئے یقین کا اظہار نہ کریں۔ زمانہ بہت آگے نکل گیا ہے۔ انہیں بھی چاہیے کہ اب جگجیت سنگھ کے سحر سے باہر آئیں اور فلکیات کا اپ ٹو ڈیٹ مطالعہ کریں۔ رشید ملک صاحب نے "مابعد الطبیعاتی" کہہ کر جب BIG BANG تھیوری کو مسترد کیا تو مجھے بے اختیار اکبرالہ آبادی کا یہ شعر یاد آگیا۔

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا کر یہ تھانے میں　　کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

(۴)

ڈاکٹر وزیر آغا نے "اردو شاعری کا مزاج" میں محض اشارۃً یہ لکھا تھا کہ دھماکے کے بعد ابتدائی گنجان ذرّے کے اجزاء باہر کی طرف جائیں گے اور جب دھماکے کا زور ٹوٹ جائے گا تو قوس سی بنا کر واپس آنے لگیں گے۔ اس پر رشید ملک صاحب نے یہ اعتراض کیا ہے:۔

"ان کا (یعنی آغا صاحب کا) یہ بیان محلِ نظر ہے۔ اوّل اس وجہ سے کہ دھماکے کے نظریے کے تحت کائنات کے اجزاء اس لئے دوبارہ اکٹھے نہیں ہوں گے کہ وہ خطِ مستقیم کی بجائے دائرے یا قوس میں حرکت کر رہے ہیں بلکہ ان کو دوبارہ اکٹھا کرنے والی قوتِ کششِ ثقل ہے!"

میں رشید ملک صاحب سے گزارش کروں گا کہ ان کا یہ انکشاف کہ ایک چیز کششِ ثقل بھی ہوتی ہے جس کا شاید ڈاکٹر صاحب کو علم نہیں ایک بالکل مدرسانہ رویّہ ہے۔ مجھ ایسا شخص بھی جو سائنس کا طالب علم نہیں ہے، جانتا ہے کہ نیوٹن کا پیش کردہ کششِ ثقل کا نظریہ جس EQUATION کی اساس پر استوار ہے وہ یہ ہے۔

$$F = G\frac{mm'}{d^2}$$

یہاں m سے مراد ایک چیز کا MASS، m' سے مراد دوسری چیز کا MASS۔ d ان کا درمیانی فاصلہ ہے اور G کو GRAVITATIONAL CONSTANT کہا گیا ہے۔ جب ڈاکٹر صاحب نے لکھا کہ ابتدائی ذرّے کے اجزاء اصل کی طرف لوٹنے لگیں گے اور بالآخر سمٹ کر ابتدائی ذرّے میں یکجا ہو جائیں گے تو کیا وہ کششِ ثقل کے نظریے سے واقف ہوئے بغیر ایسا کہہ سکتے تھے؟ مگر انہوں نے ملک صاحب کی طرح خود کو محض ایک سائنسی نظریے تک محدود نہیں رکھا۔ انہیں علم ہے کہ نیوٹن کی کائنات آئن سٹائن کی کائنات سے مختلف ہے۔ نیوٹن کے قوانین اس بات سے مشروط ہیں کہ روشنی سیدھی لکیر پر سفر کرتی ہے لیکن آئن سٹائن کی جنرل تھیوری نے ثابت کیا ہے کہ شعاعیں GRAVITATIONAL FIELDS سے متاثر ہوتی ہے لہٰذا روشنی کائنات میں موجود MASSES کے باعث سیدھی لکیر میں سفر کرنے کے بجائے قوس سی بنا لیتی ہے۔ آئن سٹائن نے SPACE CURVATURE کا نظریہ پیش کیا۔ اس کی رُو سے:۔

If a 'Spacetrian' who leaves the earth and continually travels in a space-line will always end up again at the earth – moreover, there is no outside edge to the Universe, for we have seen that continual travel in a Spaceline brings us back to the

Starting point. Our Universe closes on itself.[1]

اب ملاحظہ کیجیے اس سلسلے میں گراہم سمتھ کیا کہتے ہیں:۔

On a naive Newtonian view the smaller scale Geometry formulated by Euclid can be extended indefinitely to cover all of space. Relativity physics shows us that in a large-scale universe containing matter, Euclidean geometry cannot be correct; it is not even a simple matter to define a straight line.[2]

لہٰذا جب ڈاکٹر وزیر آغا گنجان ذرّے کے اجزاء کے واپس آنے کو CURVATURE OF THE UNIVERSE کے حوالے سے بیان کرتے ہیں تو وہ GRAVITATIONAL FIELDS کا اقرار کرتے ہوئے ایسا کرتے ہیں، تاہم وہ رشید ملک صاحب کی طرح کائنات کو نیوٹن کی نگاہوں سے نہیں بلکہ آئن سٹائن کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ ملک صاحب محض کششِ ثقل کی بنیاد پر مطالعہ کرنے کے مقام پر رُکے ہوئے ہیں جبکہ سائنس تو اس سے بہت آگے نکل گئی ہے۔ مثلاً آئن سٹائن کی UNIFIED FIELD THEORY میں تو کششِ ثقل کو ELECTRO MAG-NATISM سے مربوط بھی کر دیا گیا ہے اور GRAVITATIONAL FIELD کے متوازی NUCLEAR FIELD کے وجود کو بھی پیش کر دیا گیا ہے مگر رشید ملک صاحب شاید ابھی نیوٹن کے زمانے سے باہر نہیں آپائے۔

یہ تو خیر سائنس کی بات ہوئی۔ اب ایک عام سے مشاہدہ کی بات بھی دیکھیے۔ جب آپ پوری قوّت سے کوئی کنکر پھینکتے ہیں تو وہ ایک حد تک تو آپ کی مہیا کردہ طاقت کے سہارے جاتا ہے مگر جب یہ طاقت صرف ہو جاتی ہے تو وہ قوس سی بنا کر زمین کی طرف آتا ہے گویا زمین کی کششِ ثقل اُسے سیدھی لکیر میں سے اُچک نہیں لیتی بلکہ قوس بنانے دیتی ہے۔ یہی صورت کائنات کی بھی ہے کہ ابتدائی دھماکے کی طاقت کے کمزور پڑنے کے بعد اجزاء مختلف MASSES کی کششِ ثقل سے متاثر ہو کر قوس سی بنا کر واپس آئیں گے کیونکہ پوری کائنات اپنے MASSES کے باعث ایک CURVATURE رکھتی ہے۔ مگر میں پھر یہ عرض کروں گا کہ "اُردو شاعری کا مزاج" فلکیات کی کتاب نہیں ہے۔ اس کے ابتدائی چند صفحات میں فلکیات کی طرف محض اشارے سے ملتے ہیں۔ رشید ملک صاحب نے فلکیات سے ناواقفیت کی وجہ سے ان اشاروں کو اپنی درسی معلومات کی روشنی میں پڑھا اور غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے۔ مجھے ان سے ہمدردی ہے۔

(۵)

اُوپر تکوینِ کائنات کے سلسلے میں کچھ باتیں ہوئیں۔ اب کچھ باتیں مرگِ کائنات کے بارے میں بھی ہو جائیں۔ سائنس نے اس سلسلے میں ایک تو مرگِ حرارت کا تصور دیا ہے جو LAW OF ENTROPY کے تابع ہے اور دوسرا BLACK HOLES کا تصور بعض سائنس دانوں

---

[1] JAMES A. COLEMAN : RELATIVITY FOR THE LAYMAN — P.No. 125, 126.

[2] F. GRAHAM SMITH : RADIO ASTRONOMY — P.No: 175

کا خیال ہے کہ یہ ممکن ہے کہ ہر کہکشاں کے بطون میں ایک BLACK HOLE ہو جو اس کہکشاں کو کھا رہا ہو۔ شاید کائنات کا نوّے فیصد مادہ پہلے ہی ان بلیک ہولز میں گم ہو چکا ہے۔ کائنات کے کناروں پر پُر اسرار QUASERS کا پتہ چلا ہے کیا عجب وہ بھی بلیک ہولز ہوں۔ ہربرٹ گرسکی نے تو یہ تک کہہ دیا ہے کہ ممکن ہے پوری کائنات بجائے خود کو ایک ایسا بلیک ہول ہو جو اپنے وجود کو کھا رہا ہے۔ مرگِ کائنات کے اِن تصورات کا ذکر میں نے ایک متوازی تصور کے طور پر کیا ہے۔ سائنس نے کائنات کے پھیلنے اور سمٹنے کے عمل کو تو تسلیم کر لیا ہے مگر دوسری طرف ایک اور حقیقت بھی اُبھر رہی ہے کہ اس عمل کے دوران خود کائنات ہست سے نیست اور پھر نیست سے ہست میں آ رہی ہے۔ اصلاً یہ بھی پھیلنے اور سمٹنے ہی کی ایک صورت ہے مگر اس کی DIMENSION ذرا مختلف ہے۔

میں نہیں چاہتا کہ ان مسائل پر تفصیل سے گفتگو ہو کیونکہ قارئین کا ایک بڑا طبقہ فلکیات کی دقیق باتوں کو پوری طرح سمجھ نہ پائے گا میں نے مرگِ کائنات میں بلیک ہولز کا ذکر اس لئے کیا کہ اس سے زماں کی کارکردگی پر کچھ روشنی پڑ سکتی ہے۔ یہ اس لئے ضروری تھا کہ رشید ملک صاحب نے اپنے مضمون میں یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ زمان و مکان کے مفاہیم کو ڈاکٹر صاحب تو کیا سمجھیں گے، انہیں صرف ملک صاحب ہی گرفت میں لے سکتے ہیں۔

میں عرض کر دوں کہ زمان و مکان کے مسائل بے حد پیچیدہ ہیں اور طبیعات کے بیشتر سنجیدہ طالب بھی ان کی تہہ تک پہنچنے میں دقّت محسوس کرتے ہیں۔ میں بھی اس مسئلے کو مکمل طور پر سمجھنے سے قاصر ہوں، تاہم میں اس بے حد پیچیدہ مسئلہ کی اُوپر کی سطح کو ضرور چھوؤں گا۔ اس سے زیادہ کا دعوٰے رشید ملک صاحب ہی کو زیب دیتا ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا نے "اُردو شاعری کا مزاج" کے ابتدائی صفحوں میں ثنویت کے تصور کو واضح کرنے کے لیے جہاں فرد اور معاشرہ ٹوٹم اور ٹیبو، ین اور یانگ وغیرہ کا ذکر کیا وہاں زمان و مکان کی طرف بھی سرسری سا اشارہ کیا اور لکھا کہ:

"ابتدائی ذرّے کے پھٹنے اور اس کے اجزاء کا کروڑوں کہکشاؤں کی صورت میں پھیلتے چلے جانے کا عمل وقت کے آغاز اور اس کے پھیلاؤ کا عمل ہے"

آگے چل کر ایک جگہ تحریر کیا کہ:

"جس طرح زمان جب تک مکان کی بنیاد پر ایستادہ نہ ہو باقی نہیں رہ سکتا وغیرہ"

رشید ملک صاحب کی سمجھ میں آغا صاحب کے یہ دونوں اشارے نہیں آئے لہٰذا انہوں نے پہلے تو انہیں طعنہ دیا کہ صاحب زمان و مکان کا مسئلہ اتنا آسان نہیں جتنا آپ سمجھتے ہیں۔ ساتھ ہی یہ بھی ارشاد فرمایا کہ آپ زمان کے ہندوانہ تصور کو بار بار کیوں دُہراتے ہیں نیز یہ کہ آپ دائرہ کو بڑی اہمیت دیتے ہیں شاید اس لئے کہ آپ دائرہ کو مکمل ترین مکان تصور کرتے ہیں وغیرہ۔ کسی علمی نکتے کو رد کرنے کیلئے اس قسم کا رویہ قابلِ افسوس ہے۔ طعنہ زنی کوئی دلیل نہیں ہے۔ ڈاکٹر صاحب زمان کے ہندوانہ تصور کا ذکر کریں تو یہ گناہ ہے اور ملک صاحب اگر اپنے گرو جگجیت سنگھ کے بغیر بات نہ کر سکیں تو یہ عین ثواب ہے۔ پہلے فرمایا کہ ڈاکٹر صاحب دائرے کو بڑی اہمیت دیتے ہیں اور پھر "شاید" سے ایک مفروضہ قائم کیا۔ پھر اس مفروضے کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کی حالانکہ ڈاکٹر صاحب نے دائرے اور خطِ مستقیم دونوں کو اہمیت دی ہے (ملاحظہ ہو ان کی کتاب "تخلیقی عمل") مگر ملک صاحب کو اس سے کوئی غرض نہیں۔ چونکہ رشید ملک صاحب نے زمان و مکان کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کے اشارات کو ناقابلِ فہم جانا ہے اس لئے میں اس سلسلے میں کچھ وضاحت کر دوں تو مناسب رہے گا۔

آئین سٹائن کے نظریۂ اضافیت کے مطابق 'زمان' 'مکان' کا چوتھا بُعد DIMENSION ہے۔ لہٰذا جب ڈاکٹر صاحب نے تکوینِ کائنات کے ذکر میں مادہ کے پھیلاؤ کا ذکر کیا تو اس سے مکان اور پھر زمان کا وجود میں آنا مشروط ٹھہرا۔ اگر کائنات ایک خلا ہو تو اس میں نہ مکاں ہوگا اور نہ زماں۔ MASS کا ہونا مکاں کی حدود کو متعین کرتا ہے اور مکان کے اندر EVENT کا ہونا زماں کے نقوشِ قدم کو واضح کرتا ہے۔ اگر MASS ختم ہو جائے تو مکان باقی نہیں رہے گا اور ساتھ ہی زماں بھی ختم ہو جائے گا۔ اس ضمن میں سب سے دلچسپ چیز SPACE - TIME کی وہ تھیوری ہے جس کی نوید آئین سٹائن کے نظریۂ اضافیت نے دی ہے اور جس کے مطابق بلیک ہول کے نزدیک جانے پر وقت کی رفتار کم ہو جاتی ہے۔ بات کو مزید وضاحت سے پیش کرنے کے لئے میں یہ عرض کروں کہ اگر دو خلاباز کسی بلیک ہول کی طرف روانہ ہوں۔ ان میں سے ایک بلیک ہول سے فاصلے پر رہے جبکہ دوسرا بلیک ہول کے قریب چلا جائے تو دونوں کے وقت مختلف ہو جائیں گے۔ بلیک ہول کے قریب جانے والے خلاباز کے ہاں وقت کی رفتار کم ہوتے ہوتے بالکل ختم ہو جائے گی گویا وقت مر جائے گا۔ جس کا سبب یہ ہے کہ وقت، وجود (ہست) اور اس کے EVENTS سے مشروط ہے۔ بلیک ہول عدم سے مشابہ ہے جہاں کوئی EVENT باقی نہیں رہتا لہٰذا وقت بھی مر جاتا ہے۔ سو ڈاکٹر صاحب کا کہنا کہ مادے کا کروڑوں کہکشاؤں میں پھیلنے اور بڑھنے کا عمل وقت کے آغاز اور اس کے پھیلاؤ کا عمل ہے، دراصل SPACE TIME تھیوری ہی کو پیش کرتا ہے۔ اس طرح ان کا کہنا کہ "زمان جب تک مکان کی بنیاد پر ایستادہ نہ ہو، وقت کو مکان کے چوتھے بُعد کے طور پر پیش کرتے ہوئے اس بات کا انکشاف کرتا ہے کہ زمان، مکان سے مشروط ہے۔ بے شک یہ باتیں اتنی آسان نہیں ہیں اور انہیں عام سی کاروباری زبان میں پیش کرنے سے غلط فہمیاں بھی پیدا ہو سکتی ہیں لیکن اگر رشید ملک صاحب کو اپنے سائنس دان ہونے کا دعوےٰ ہے تو انہیں ڈاکٹر صاحب کے اشاروں میں مضمر سائنسی معلومات سے آشنائی ہو جانا چاہیئے تھی اور اگر ایسا نہیں ہو سکا تو میں پھر اس کے سوا اور کیا کہہ سکتا ہوں کہ انہوں نے محض گرد اڑانے کیلئے یہ ساری بحث چلائی ہے

(۶)

اب میں رشید ملک صاحب کے تیسرے اعتراض کی طرف آتا ہوں۔ "اُردو شاعری کا مزاج" میں ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے کہ جب آریہ ۱۵۰۰ ق م کے لگ بھگ اس برصغیر میں وارد ہوئے تو انہیں وادیٔ سندھ کے باشندوں سے متصادم ہونا پڑا۔ رگ وید میں وادیٔ سندھ کے قلعوں کو 'پور' کہا گیا ہے جنہیں ان کا دیوتا اندر بیخ و بن سے اکھاڑتا ہے۔ مزید یہ ان لوگوں کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ وہ 'غلیظ' ہیں! کالے ہیں اور ڈھور ڈنگر چراتے ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنی تحقیق کی بنا پر ان لوگوں کو 'دراوڑی' کہا ہے۔ مگر رشید ملک صاحب کا ارشاد ہے کہ وہ دراوڑی نہیں تھے، کچھ اور تھے۔ ویسے انہوں نے اس بات کو مان ضرور لیا ہے کہ دراوڑ کوئی نسل نہیں ہے بلکہ لفظ آریہ کی طرح ایک لسانی گروہ کا نام ہے جس میں بہت سی نسلیں اور قبائل آ جاتے ہیں۔ رزلے کے مطابق ہندوستان میں تین نسلی گروہ تھے یعنی دراوڑی، ہند آریائی اور منگول۔ مگر A.C. HADDIN نے رزلے سے مکمل طور پر اختلاف کرتے ہوئے کہا کہ

> The pre-Dravidians, Dravidians (brunette dolichocephals), the Indo Aryans (fair dolichocephals), Indo Alpines (brachycephals) and Mongolians constitute the racial elements in the population of India.

رشید ملک صاحب نے ہندوستان کی نسلوں کے احوال میں زیادہ تر انحصار رزلے پر کیا جب کہ رزلے اس معاملے میں ایک کم تر اتھارٹی ہے۔ اب دیکھیے کہ PRE - DRAVIDIANS کے بارے میں محققین کی کیا رائے ہے۔ J. H. HUTTON نے لکھا ہے کہ ہندوستان کے اوّلین باشندے نیگرو نسل کے تھے۔ اس کے بعد پروٹو آسٹرولائیڈ آئے۔ پھر بحیرۂ روم کی نسل کی ایک ابتدائی لہر آئی۔ پھر مشرقی یورپ کی طرف سے بحیرۂ روم کی نسل کی ایک اور لہر آئی۔ اس لہر نے وادیٔ سندھ میں شہری ریاستوں کو آباد کیا۔ ہالڈن اور ہٹن دونوں کے مندرجہ بالا حوالے D.N. MAJUMDAR کی کتاب میں درج ہیں[1]

اب وادیٔ سندھ کی نسل کے بارے میں جدید ترین تحقیق کے نتائج ملاحظہ فرمائیے۔ MAJUMDAR لکھتا ہے:۔

"مہنجوڈرو کی تہذیب اصلاً دراوڑی تھی اور اغلباً وہ نسل جس سے مہنجوڈرو کے باسی متعلق تھے، بحیرۂ روم کے علاقے سے آئی تھی۔ جس زمانے میں پروٹو آسٹرولائیڈ جو ہندوستان کے اوّلین باشندے تھے ابھی NEO - LITHIC دور سے گزر رہے تھے، اس زمانے میں دراوڑی لوگ وادیٔ سندھ میں ایک شہری تہذیب کو جنم دے رہے تھے۔"[2]

رشید ملک صاحب نے اپنے مضمون میں تھاپر کی کتاب کا بار بار ذکر کیا ہے۔ اب تھاپر کی اسی کتاب کا یہ اقتباس دیکھیے:۔

The proto-Austroloid were the basic element in the Indian population and their speech was of the Austric-linguistic group, a specimen of which survives in the Munda Speech of certain primitive tribes. The Mediterranean Race is generally associated with Dravidian Culture.[3]

اور ہڑپہ مہنجوڈرو کلچر میں بحیرۂ روم کی نسل کی موجودگی اب طے شدہ امر ہے۔ اب دیکھیے A. C. BOUQUET اس سلسلے میں کیا کہتے ہیں:۔

"دراوڑی سفیدی مائل سیاہ تھے۔ انہوں نے ۳۲۵۰ اور ۲۷۵۰ کے درمیانی عرصہ میں وادیٔ سندھ میں ایک عظیم تہذیب کو جنم دیا اور پھر جنوب کی طرف لنکا کے جزیرے تک پھیلتے چلے گئے۔"[4]

اس سب کے باوجود جناب رشید ملک محض اس لئے اس بات کو مسترد کر رہے ہیں کہ انہوں نے درسی کتابوں میں پڑھ رکھا ہے کہ دراوڑ صرف جنوبی ہندوستان میں ملتے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے ملک صاحب نے شملہ کی پہاڑیوں سے لے کر گجرات کاٹھیاواڑ تک ایک فرضی لکیر کھینچ کر یہ مفروضہ قائم کیا کہ اس لکیر کے شمال مغرب کی طرف دراوڑ آباد نہیں تھے۔ دراوڑ تو اس لکیر کے جنوب کی طرف ہمیشہ ہمیشہ سے آباد تھے۔ دیکھنا چاہیے کہ رشید ملک صاحب کا یہ مفروضہ کہاں تک صحیح ہے؟

محققین اس بات پر متفق ہیں کہ جنوبی ہندوستان کے اصل باشندے دراوڑی نہیں تھے بلکہ PROTO - AUSTROLOIDS تھے مثلاً

---

[1] ، [2] D. N. MAJUMDAR - RACES & CULTURE OF INDIA. P. 48, 49

[3] THAPER : A HISTORY OF INDIA P. 26

[4] A. C. BOUQUET : COMPARATIVE RELIGIONS P. 117

MAJUMDAR نے لکھا ہے کہ

The various tribes like the Mundas, the Santhals, the Juangs, the Korwas, the Soaras, the prajas, the Khonds, the Paniyans and many jungle tribes in the South can be affiliated to the same i.e. proto-Austroloid racial Stock.

پروٹو آسٹرولائیڈ کی نسلی ابتداء کے بارے میں محققین کچھ وثوق سے نہیں بتا سکے مگر اُن کا عام خیال یہ ہے کہ وہ آسٹریلین سلسلۂ نسب رکھتے تھے۔ ہندوستان کے مختلف GROUPS کا تجزیہ کرنے کے بعد MAJUMDAR لکھتا ہے کہ پروٹو آسٹرولائیڈ ہی ہندوستان کے قدیم ترین باشندے تھے ۱؎ اس کے علاوہ بھیل، منڈا اور دوسرے نسلی گروپ بھی پروٹو آسٹرولائیڈ ہی سے متعلق تھے اور اب ملاحظہ کیجیے CENSUS REPORT OF INDIA - 1931 میں کیا درج ہے۔

There is no doubt they (the Bhils) represent a race which inhabited India earlier than the Aryans and the Dravidians ... The Bhils are one section of the great Munda race which occupied the pre-Dravidian India ... and it is perhaps in contact with the Dravidians in the Outside in Gujrat that they acquired their present appellation. ۲؎

اس اقتباس میں بڑی دلچسپ بات یہ ہے کہ بھیلوں نے دراوڑوں سے اثرات قبول کئے جو جنوبی ہندوستان سے باہر گجرات کاٹھیاواڑ (سوراشٹرا) کے رہنے والے تھے جس کا واضح مطلب یہ ہے کہ جنوبی اور وسطی ہندوستان کے باشندے اُن مختلف نسلی گروپوں پر مشتمل تھے جن کا سلسلۂ نسب پروٹو آسٹرولائیڈ سے ملا ہوا تھا۔ بعدازاں جب مغرب کی طرف سے دراوڑی نسل، اس کی زبانیں اور تہذیب جنوبی ہندوستان کی طرف آئی تو ان پر دراوڑی تہذیب کا اثر ہی نہ پڑا بلکہ دراوڑوں سے نسلی آمیزش بھی ہوئی۔ اب بات یوں کھلتی ہے کہ وادیٔ سندھ کے باشندے دراوڑی النسل تھے۔ جب آریاؤں نے وادیٔ سندھ پر حملہ کیا تو ان میں سے کچھ لوگ تو مرکھپ گئے، زیادہ تر شودر وغیرہ بن کر معاشرے سے منسلک رہے اور کچھ راجپوتانے کو عبور کر کے جنوبی ہندوستان چلے آئے۔ جنوبی ہندوستان کی قدیم اُردو میں پنجابی الفاظ کی آمیزش اس کا ایک ثبوت بھی ہے۔ لہٰذا رشید ملک صاحب کا جنوبی ہند کے قبائل گونڈ، بھیل، نجاڑ وغیرہ (جو غیر آریائی تھے) کو دراوڑی قرار دینا قطعاً غلط اور بے بنیاد ہے۔ یہ قبائل PRE - DRAVIDIANS تھے اور یہ بات اب طے ہو چکی ہے۔ افسوس یہ ہے کہ ملک صاحب نے اپنی معلومات

۱؎ MAJUMDAR: RACES AND CULTURE OF INDIA P. 61

۲؎ CENSUS REPORT OF INDIA - 1931 - VOL I - P. 111, 1935

زیادہ تر رزلے سے لی ہیں جب کہ جدید ترین تحقیقات نے رزلے کے بہت سے نتائج کو غلط ثابت کر دیا ہے۔

مزید براں دیکھئے کہ ریلف لنٹن اس سلسلے میں کیا لکھتا ہے:۔

"بحیثیت مجموعی جنوبی ہندوستان میں پروٹو آسٹرولائیڈ عناصر سب سے زیادہ مضبوط ہیں۔ شمال مشرق میں منگولائیڈ عناصر سب سے زیادہ توانا ہیں اور وادیٔ سندھ میں سب سے طاقتور عناصر CAUCASIC MEDITERRANEAN ہیں اور یوں لگتا ہے جیسے وہیں سے مشرق اور جنوب کی طرف پھیلے ہیں۔ اس میں قطعاً کلام نہیں کہ سارے برصغیر کے ابتدائی باشندے پروٹو آسٹرولائیڈ تھے اور پہلے حملہ آور بحیرۂ روم کی نسل کے لوگ تھے"۔ [1]

کچھ آگے وہ رقمطراز ہے:۔

"شمالی ہندوستان کی ہند یورپی زبانوں میں دراوڑی زبانوں کے الفاظ کی موجودگی اس بات پہ دلالت کرتی ہے کہ کبھی سارے برصغیر میں دراوڑی زبانیں بولی جاتی تھیں"۔ [2]

اب دیکھئے انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا میں کیا لکھا ہے:

"شمال مشرق میں براہوی قبیلے کے ہاں دراوڑی بولی آج بھی بولی جاتی ہے"۔ [3]

رشید ملک صاحب نے تو کہہ دیا کہ براہوی زبان دراوڑی زبان نہیں بلکہ دراوڑی زبانوں سے مماثلت رکھتی ہے مگر انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا نے اسے دراوڑی زبان کہا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر سندھ کے علاقے میں دراوڑ آباد ہی نہیں تھے تو پھر دراوڑی زبان کہاں سے آگئی؟ غالباً اُڑ کر آئی ہو گی۔

اور اب آخر میں مشہور ماہر لسانیات عین الحق فریدکوٹی کی کتاب "اُردو زبان کی قدیم تاریخ" سے یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے جو اس سلسلے میں حرفِ آخر کا درجہ رکھتا ہے۔ عین الحق فریدکوٹی لکھتے ہیں:۔

"یہ امر پایۂ ثبوت تک پہنچ چکا ہے کہ آریاؤں کی آمد کے وقت وادیٔ سندھ میں دراوڑی قبائل کو بالادستی حاصل تھی"۔ ص ۹۲

"جہاں تک ہڑپائی تہذیب کا تعلق ہے اسے دراوڑی تسلیم کرنے میں کوئی باک نہیں۔ سر جان مارشل، ڈاکٹر ایچ آر ہال، جناب ولیم ولسن ہنٹر اور دیگر کئی صاحب الرائے حضرات اس نظریے کے حامی ہیں"۔ ص ۹۸

ٹھیک! مگر رشید ملک صاحب اس نظریے کے حامی نہیں ہیں اس لئے کہ انہوں نے اس موضوع پر گہرا مطالعہ کرنے کی کبھی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ اگر وہ فقط عین الحق فریدکوٹی کی کتاب ہی پڑھ لیتے تو انہیں کم از کم اپنے مضمون کا یہ حصہ لکھنے کی زحمت نہ اُٹھانا پڑتی۔

اُوپر میں نے رشید ملک صاحب کے اس مفروضے کو غلط ثابت کر دیا ہے کہ "وادیٔ سندھ کی تہذیب سے متعلق لوگ دراوڑی نسل کے نہیں تھے"۔ اب میں اُن کے دوسرے مفروضے کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ ملک صاحب کا ارشاد ہے کہ جب آریہ ہندوستان آئے تو وادیٔ سندھ کی تہذیب ختم ہو چکی تھی اور اس علاقے میں کچھ نیم وحشی قبائل آباد تھے جن کو رگ وید نے "پانی" کا نام دیا ہے (ویسے رشید ملک صاحب کی

حاشیہ [1] RALPH. LINTON : TREE OF CULTURE - P. 472

[3] ENCYCLOPEADIA BRITANNICA - VOL VII (1959) P. 626

اطلاع کے لئے یہ عرض کردوں کہ انہوں نے انگریزی کتابوں میں PANI پڑھ کر اِسے 'پانی' لکھ دیا ورنہ یہ لوگ پانڑی کہلاتے تھے۔ رشید ملک ایسے "محقق" کو اصل تلفظ سے آشنا ہونا چاہیے تھا۔ بقول رشید ملک صاحب رگ وید میں جس تصادم کا سُراغ ملتا ہے وہ آریاؤں اور نیم وحشی قبائل کا تصادم تھا۔ وادیٔ سندھ کی تہذیب سے منسلک لوگوں سے آریاؤں کی "ملاقات" ہی نہ ہو سکی۔ ثبوت میں وہ فرماتے ہیں کہ "وادیٔ سندھ کی تہذیب کے اختتام اور آریاؤں کی آمد کے آغاز کے درمیان چند صدیوں کا عرصہ حائل ہے اس لئے یہ کہنا کہ آریاؤں نے وادیٔ سندھ کی تہذیب کو غارت کیا، غلط ہے"۔ سوال یہ ہے کہ کیا تہذیبوں کے آغاز اور اختتام کیلنڈر کی تاریخوں کے مطابق ہوتے ہیں جب کوئی تہذیب زوال پذیر ہوتی ہے تو سینکڑوں برسوں تک نہیں مرتی بلکہ آنے والی تہذیب سے اثرات قبول کرکے پھر سے پھلنے پھولنے لگتی ہے۔ رہا وادیٔ سندھ کی تہذیب کا معاملہ تو اس نے پوری ہندو تہذیب پر اتنے گہرے اثرات ڈالے ہیں کہ محققین ان کی نشان دہی کرتے تھکتے نہیں ہیں۔ سوچنے کی بات ہے کہ اگر بقول رشید ملک وادیٔ سندھ کی تہذیب آریاؤں کی آمد سے پہلے ہی "مر" چکی تھی تو پھر آنے والی ہندوستانی تہذیب پر اس کے اتنے گہرے اثرات کیسے پڑ گئے؟ اس سلسلے میں ریلف لنٹن کے یہ الفاظ دیکھیے:۔

"There can be no doubt that the Indus Culture contributed very keenly to the development of later Indian Civilization... one is tempted to believe that during the interval between the arrival of the Aryans and the completion of the Vedas a fusion took place between the invaders and the survivors of the Indus Civilization." [1]

اور دیکھیے A.C. BOUQUET کیا لکھتا ہے:۔

It is evident that quite a number of the invaders (Aryans) took to themselves Dravidian wives. Anyhow, in the course of a few centuries the religions and cultures of NORDICS (Aryans) and Dravidians had become intermingled. [2]

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ محققین تو آریاؤں اور دراوڑوں کے نسلی اور ثقافتی اختلاط کی بات کر رہے ہیں مگر رشید ملک صاحب کا کہنا ہے کہ آریائی تہذیب کی دراوڑی تہذیب سے "ملاقات" ہی نہیں ہوئی تھی۔

اور اب ملاحظہ کیجیے MAJUMDAR کے الفاظ:۔

The aniconic character of the Indo-Aryans met

---

[1] RALPH LINTON : TREE OF CULTURE - P. 481

[2] A.C. BOUQUET : COMPARATIVE RELIGIONS - P. 118

the Mediterraneans and the Alpines in the Punjab — (afterwards) the cultural superiority of the Mediterraneans asserted itself and transferred the nomadic aniconic civilization (i.e. Arayan Civilization) into an iconic one.[1]

اور سر مارٹیمر ویلر رقم طراز ہے:۔

In 1958 definite evidence was found for the first time that the Indus Culture, including the characteristic terracota "Cakes" had leapt or circumvented the barriers of desert and jungle which had previously been thought to exclude the Civilization from the Jamna basin and had reached Alamgirpur, near a tributory of that river 17 miles west of Meerut and only 28 miles North East of Delhi.[2]

گویا سر مارٹیمر ویلر یہ کہہ رہے ہیں کہ وادیٔ سندھ کی تہذیب دہلی کے نواح تک پھیل گئی تھی اور INDUS POTTERY تو اس سے بھی آگے کشمیر تک میں ملی ہے مگر رشید ملک صاحب فرماتے ہیں کہ آریا ورت کے باسیوں نے وادیٔ سندھ کو ہمیشہ 'علاقہ غیر' جانا، عجیب بات ہے ! کیا آریہ لوگ کابل سے کوئی ہوائی جہاز چارٹر کر کے سیدھے آریہ ورت پہنچ گئے تھے کیونکہ 'علاقہ غیر' درمیان میں آتا تھا جو انہیں پسند نہیں تھا۔ ہماری معلومات تو یہ ہیں کہ وہ پیدل آتے تھے اور کہیں سینکڑوں سال بعد گنگا جمنا کے میدان میں پہنچے تھے۔ کیا وہ یہ سارا عرصہ 'علاقہ غیر' کو چھوئے بغیر ہی گزرتے رہے۔

مزید براں سر مارٹیمر ویلر نے لکھا ہے کہ سندھ (موہنجوڈرو اور امری) میں تو وادیٔ سندھ کی تہذیب زوال پذیر ہوئی لیکن سوراشٹر (گجرات کاٹھیاواڑ) میں یہ ایک نئے CHALCOLITHIC SMALL-TOWN مرحلے میں داخل ہوئی اور اس نے وسطی ہندوستان کی دیہاتی زندگی سے رابطہ قائم کیا۔[3] اسی طرح صفحہ ۹۰ پر لکھا ہے کہ نربدا سسٹم اور زیریں سندھ میں ثقافتی لین دین موجود تھا۔ اس سے پہلے میں نے اس بات کا حوالہ بھی دیا ہے کہ بھیلوں نے سوراشٹر کی دراوڑی تہذیب سے گہرے اثرات قبول کئے تھے۔ یہ تمام باتیں کس نتیجے پر ہمیں پہنچاتی ہیں ؟ یہی کہ وادیٔ سندھ کی تہذیب زوال پذیر تو ہوئی مگر بعض حصوں میں زوال پذیر نہیں بھی ہوئی اور موت سے ہمکنار تو یقیناً نہیں ہوئی۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے "اردو شاعری کا مزاج" میں ہمیں تفصیل سے بتایا ہے کہ کس طرح آنے والے ایام کی ہندوستانی تہذیب

---

[1] MAJUMDAR : RACES AND CULTURES OF INDIA P.28

[2] [3] SIR MORTIMER WHEELER — CIVILIZATION OF THE INDUS VALLEY AND BEYOND P.63

میں وادیٔ سندھ کی تہذیب کے اہم عناصر موجود تھے۔ آج بھی اگر رشید ملک صاحب مہنجوڈرو اور ہڑپہ کے عجائب گھروں کا مطالعہ کریں تو اس موجودہ زمانے کی پاک و ہند تہذیبوں میں وادیٔ سندھ کی تہذیب کے شواہد بکثرت مل سکتے ہیں۔ حد یہ ہے کہ آج کے دیہاتی کھلونے بھی وادیٔ سندھ کے کھنڈرات سے دستیاب ہوئے ہیں حتیٰ کہ بعض صورتوں میں تو داڑھی کی تراش خراش تک وہی ہے۔ مذہب کے سلسلے میں دیکھئے کہ ہندوؤں کے یہاں آریائی دیوتا "برہم" تو پس منظر میں چلا گیا اور وشنو، شیو اور کالی وغیرہ جو ابتداً دراوڑی دیوتا اور دیویاں تھے، مسلط ہو گئے۔ مشہور ماہر لسانیات ڈاکٹر سہیل بخاری نے اپنی کتاب[1] میں سنیتی کمار چیٹرجی کی اس بات کا حوالہ دیا ہے کہ "کرم، عمل اور آواگون کے خیالات، یوگ، شو اور وشنو جیسے دیوتا، پوجا پاٹ، پرانوں کی کتھائیں، دیومالا کی کہانیاں، رہن سہن، سماجی اور دوسرے ریت رواج، ہندوستانی کھانے (چاول، ترکاریاں، املی وغیرہ) دیہاتی کلائیں، ہندو بانا (دھوتی اور ساری) بیاہ کی رسمیں، دھرم کارج اور بہت سی دوسری باتیں آریاؤں کے پہلے سے چلی آ رہی ہیں۔" لہٰذا رشید ملک صاحب اس وہم میں نہ رہیں کہ وادیٔ سندھ کی تہذیب ۱۵۰۰ ق م کسی ہائیڈروجن بم سے تباہ ہو گئی اور جب آریہ یہاں پہنچے تو میدان بالکل صاف تھا۔ تاہم چونکہ ان کا مدمقابل بھی ہونا چاہیے تھا جس کو وہ فتح کرتے اس لئے انہوں نے باہر سے کچھ نیم وحشی قبائل منگا کر ان پر فتح حاصل کر لی۔ یوں لگتا ہے جیسے رشید ملک صاحب نے تہذیبوں کے عروج و زوال کی کہانی کسی ہندی فلم سے اخذ کی ہے۔

ویسے میں یہ بھی عرض کرتا جاؤں کہ آریاؤں کی آمد کسی سکندرِ اعظم کے حملے کی صورت میں نہیں تھی۔ آریہ تو لہروں میں آئے اور اب تک ان کی تین وسیع لہروں کی نشان دہی ہو چکی ہے۔ وہ اسی طرح آئے جیسے خانہ بدوش آتے ہیں۔ چند روز ایک جگہ قیام کیا اور آگے بڑھ گئے گویا وہ چھوٹے چھوٹے گروہوں کی صورت میں لڑتے بھڑتے، اشلوک پڑھتے اور دیسی عورتوں سے شادیاں رچاتے آگے بڑھتے چلے گئے۔ اس سفر میں اگر انہوں نے وادیٔ سندھ کے باسیوں سے لڑائیاں کیں، تو انہیں قرینِ قیاس کیوں نہ سمجھا جائے؟ ویسے بھی جب صورتِ حال یہ ہو کہ وادیٔ سندھ کی تہذیب ۱۷۰۰ تا ۱۵۰۰ ق م کے لگ بھگ زوال پذیر ہوئی اور آریہ بھی ۱۷۰۰ تا ۱۵۰۰ ق م کے لگ بھگ ہندوستان میں وارد ہوئے تو ان دونوں واقعات کو ایک دوسرے کے ساتھ کیوں نہ منسلک کیا جائے؟ ہاں قلعوں کے مسمار کرنے کا معاملہ تو ان کی تعداد کے سلسلے میں تو میں رشید صاحب سے بحث نہیں کرتا البتہ ان سے یہ گزارش ہے کہ اگر انہیں کچھ فرصت ہو تو چولستان کا دورہ کریں اور سندھ سسٹم کے متوازی ہاکڑہ سسٹم کو دیکھیں جو وادیٔ سندھ کی تہذیب کا ایک بڑا حصہ تھا۔ یوں لگتا ہے کہ وادیٔ سندھ کے تین بڑے حصے تھے۔ وادیٔ سندھ، وادیٔ ہاکڑہ اور سوراشٹر۔ یہاں ہر چند میل کے فاصلے پر قدیم بستیوں کے "ڈھیر" ملتے ہیں جن میں بیشتر قلعے بھی ہو سکتے ہیں۔ عظیم تر وادیٔ سندھ کا یہ علاقہ راجستھان کے بھارتی علاقہ کالی بانگان اور وادیٔ ہاکڑہ سے لے کر صوبۂ سرحد میں رحمان ڈھیری تک پھیلا ہوا تھا۔ دوسری طرف سرسوتی کے دہانے سے لے کر سوراشٹر تک اس کے شواہد ملتے ہیں۔ کیا اتنے طویل و عریض علاقے میں پھیلی ہوئی ایک مرتب اور منظم تہذیب آریاؤں کو نظر ہی نہ آئی یا اُن کی آمد کی خبر سن کر ہی وہاں سے نو دو گیارہ ہو گئی؟ مگر خیر یہ تو کامن سنس کی بات تھی۔ کوئی "محقق" اگر چاہے تو اس سے صرفِ نظر کر سکتا ہے مگر جب سر مارٹیمر وہیلر ایسا محقق بھی آریاؤں اور وادیٔ سندھ کے باشندوں کے تصادم اور ربطِ باہم کی بات کرے تو پھر اس سلسلے میں کسی مزید ثبوت کی ضرورت کیسے باقی رہ سکتی ہے تو ملاحظہ فرمائیے سر مارٹیمر وہیلر کیا کہتے ہیں:

---

[1] اُردو کا روپ از سہیل بخاری۔ صفحہ ۲۸

... the possibility has often been remarked that in the modern place-name Harrapa may be recognized the Hari-Yūpīyā which is mentioned in the Rig Veda — the early hymnal that reflects the Aryan invasion — as a scene of a defeat of the Non-Aryan inhabitants by the invaders.

And in a more general sense, the picture presented by the Rig Veda is consistent with the sort of situation which may have accompanied the end of the civilization in the Indus Valley itself. In the Vedic hymn, the Arayan invasion of the land of the Five (originally Seven) Rivers, the Punjab and its environs, constantly assumes the form of an onslaught upon the walled cities — the discovery of fortified mounds at Harappa and Mohenjo-dero at the Harapa sites of Sutkagan Dor in Makran, Ali Murad in Sind and now at Kalibagan in Rajisthan has suggested that these may represent the strongholds of Indra's enemies.[له]

اصل صورت یہ ہے کہ آثارِ قدیمہ کے شواہد سے محققین نے جو تصویر بنائی ہے اس میں آریاؤں اور غیر آریاؤں کے درمیان کئی جنگوں کا سراغ ملتا ہے۔ پھر یہ بات تو مکمل طور پر تسلیم کر لی گئی ہے کہ ہندوستانی تہذیب پر وادیٔ سندھ کی تہذیب نے گہرے اثرات چھوڑے۔ اس لئے ایک عام سی سوجھ بوجھ کا مالک انسان بھی بات کی تہہ تک پہنچ سکتا ہے کہ ایک طرف تو آریاؤں نے وادیٔ سندھ کے باسیوں سے جنگیں لڑیں تو دوسری طرف آریائی تہذیب اور وادیٔ سندھ کی تہذیب میں تصادم اور پھر لین دین بھی ہوا۔ چونکہ وادیٔ سندھ کی تہذیب ایک ارضی تہذیب تھی اور اس کی جڑیں زمین کے اندر اتری ہوئی تھیں اس لئے اس نے آریاؤں کی خانہ بدوش تہذیب پر گہرے اثرات چھوڑے۔ ہندوستان کی پوری ثقافتی تاریخ اس بات کی گواہ ہے۔

(۷)

اُوپر کی بحث سے دو باتیں طے ہو گئیں۔ ایک یہ کہ وادیٔ سندھ کی تہذیب دراوڑی تھی۔ دوسری یہ کہ جب آریا پنجاب میں داخل ہوئے تو وہ دراوڑوں سے متصادم ہوئے اور آریائی تہذیب اور دراوڑی تہذیب کی آمیزش ہوئی۔ اب میں رشید ملک صاحب کے اس

له SIR MORTIMER WHEELER : CIVILIZATION OF THE INDUS VALLEY AND BEYOND P. 78

ارشاد کا تجزیہ کرتا ہوں کہ وادیٔ سندھ کی تہذیب مادری نہیں تھی بلکہ پدری تھی۔ اس دعوے کے ثبوت میں ملک صاحب نے مادری نظام کے تمام ادصاف گنائے ہیں جو عمرانیات کی کسی بھی کتاب میں دیکھے جا سکتے ہیں مگر دیکھنا یہ ہے کہ کیا ڈاکٹر وزیر آغا نے وادیٔ سندھ کی تہذیب کو محض مادری نظام کہا ہے یا کچھ اور بھی فرمایا ہے۔ "اردو شاعری کا مزاج" میں ڈاکٹر صاحب وادیٔ سندھ کی تہذیب کے بارے میں رقمطراز ہیں۔

۱۔ دراوڑی تہذیب پروٹو آسٹرولائیڈ نسل اور بحیرۂ روم کی نسل کے تصادم اور انضمام کی پیداوار تھی۔

۲۔ پروٹو آسٹرولائیڈ نسل پر تہذیب الارواح ANIMISM کا گہرا اثر تھا اور زرخیزی مت کا غلبہ تھا۔

۳۔ بحیرۂ روم کی نسل کے ہاں پدری نظام کے کچھ آثار ضرور ہوں گے لیکن اصلاً یہ مادری نظام کے تابع تھی۔

۴۔ دو نسلوں کی آمیزش سے جو تیسری نسل عالم وجود میں آئی وہ ایک ارضی اور مادی تہذیب کی علم بردار تھی اور اس پر مادری نظام کی چھاپ بھی تھی۔

۵۔ بحیثیت مجموعی یہ ایک ایسا منضبط اور منظم معاشرہ تھا جو ایک طرف تہذیب الارواح اور دوسری طرف مادہ پرستی کے رجحانات سے متاثر تھا۔ جسم ہر شے پر مسلط تھا اور زرخیزی کے تصور کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔

اب آپ دیکھیے کہ ڈاکٹر صاحب نے دراوڑی تہذیب کو مختلف ثقافتی عناصر کا آمیزہ قرار دیا ہے۔ اس میں مذہب الارواح بھی تھا اور زرخیزی مت بھی، جنگل اور زراعت سے وابستگی بھی تھی اور شہری زندگی سے لگاؤ بھی۔ اس میں پدری نظام کے کچھ شواہد بھی تھے مگر مادری نظام کی چھاپ زیادہ تھی۔ بحیثیت مجموعی یہ ایک ارضی اور مادی معاشرہ تھا جو 'دھرتی پوجا' کے مسلک کے تابع تھا۔ ڈاکٹر صاحب کے اس تجزیے سے دراوڑی تہذیب کی جو صورت ابھرتی ہے وہ آپ کے سامنے ہے مگر رشید ملک صاحب اسے صرف مادری نظام کے زاویے سے دیکھنے کی کوشش کر رہے ہیں جو بنیادی طور پر ایک غلط بات ہے۔

البتہ ایک نکتے کی طرف میں اشارہ کر دوں۔ رشید ملک صاحب نے وادیٔ سندھ کی تہذیب کے بارے میں بڑے وثوق سے یہ کہہ دیا ہے کہ یہ پدری اصول پر استوار تھی مگر اس ضمن میں کسی اتھارٹی کا کوئی حوالہ فراہم نہیں کیا۔ ان کی یہ بات "اٹکل پچو" ہی کہی جا سکتی ہے۔ اس کے برعکس ڈاکٹر صاحب نے وادیٔ سندھ کی تہذیب پر مادری نظام کی جس چھاپ کا ذکر کیا ہے اُسے محققین نے جابجا تسلیم کیا ہے۔ مثلاً رلیف لنٹن لکھتا ہے۔

> Crude female figures, nude except for elaborate ornaments, are exceedingly numerous and probably represent a mother goddess.[1]

اوپر میں نے اس بات کے حوالے دیے ہیں کہ وادیٔ سندھ میں بحیرۂ روم کی نسل آباد تھی۔ دیکھیے اس نسل کے بارے میں MAJUMDAR کیا لکھتا ہے۔

> The Mediterraneans must have been matriarchal.[2]

---

[1] RALPH LINTON : TREE OF CULTURE . P. 476

[2] D.N. MIJUMDAR : RACES AND CULTURE OF INDIA . P. 21

ان اقتباسات کے بعد مزید کچھ کہنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ وادیٔ سندھ کی دراوڑی تہذیب بنیادی طور پر ارضی، مادی اور مادری تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے کہیں نہیں لکھا کہ وہ صرف مادری تھی۔ جب تک کھدائی مزید گہری نہ ہو اور وادیٔ سندھ کا رسم الخط پڑھا نہ جائے، یہ کہنا بے حد مشکل ہے کہ اس میں ما۔ری تہذیب کا عالم کیا تھا لیکن چونکہ اس کے باشندوں کی ایک بڑی تعداد بحیرۂ روم کی نسل پر مشتمل تھی اور بحیرۂ روم کی نسل مادری نظام سے وابستہ تھی اس لئے وادیٔ سندھ کی تہذیب میں مادری نظام کے واضح نقوش کی تلاش یقیناً نتیجہ خیز ثابت ہو سکتی ہے۔

اس نکتے پر اپنی بحث ختم کرنے سے پہلے میں جناب رشید ملک کی خدمت میں یہ گزارش کروں کہ کوئی بھی نظامِ حیات ہو (مادری، پدری یا کچھ اور) اس کی ایک تو سماجی تہذیبی سطح ہوتی ہے اور دوسری نفسیاتی ثقافتی سطح! وقت گزرنے کے ساتھ سماجی تہذیبی سطح پر دیگر عناصر کی آمیزش ہو بھی جائے تو نفسیاتی ثقافتی سطح یقیناً قائم رہتی ہے۔ جدید نفسیات نے اس بات کو تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے۔ بالخصوص ینگ کا اجتماعی لاشعور تو سب تمام ثقافتی نقوش کا گودام ہے اور خود فرد بھی نفسیاتی سطح پر پیدائش سے جوانی تک ان تمام ثقافتی مراحل سے گزرتا ہے جن سے انسانی معاشرہ گزر چکا ہے۔ کسی بھی سوسائٹی کے سلسلے میں تجریدی صورت کا ملنا محال ہے۔ ہر سوسائٹی بہت سے ثقافتی عناصر کا تال میل پیش کرتی ہے البتہ جب کوئی ایک عنصر ابھرا ہو تو ہم اسی کی نسبت سے اس سوسائٹی کے ثقافتی مزاج کی نشان دہی کرتے ہیں۔ مثلاً جرمن قوم کے یہاں پدری نقوش غالب ہیں اور اُن کا اپنے ملک کو FATHER LAND کہنا ان کے ایک خاص رویّے کو پیش کرتا ہے۔ اسی طرح ہندوؤں کے یہاں 'دھرتی ماتا' کہنے کا رجحان ملتا ہے جو ایک خاص ثقافتی ورثے کو سامنے لاتا ہے۔ بالخصوص مذہب، عقیدہ، رہن سہن وغیرہ کی سطح پر ہندو سوسائٹی میں مادری نظام کا ورثہ زیادہ نمایاں ہے۔ خاص طور پر دھرتی ماتا، گائے ماتا، گاں ماتا اور درخت پوجا (اُن کے نزدیک درخت کی مادری حیثیت ہے) یہ سب مادری نظام کی نفسیاتی ثقافتی سطح ہی کو اجاگر کرتے ہیں۔ اس بارے میں پی تھامس لکھتے ہیں:

> An interesting feature of Hindu mysticism is that the active principle in the Universe is always conceived as feminine. The Hindus assert that Sakti (literally energy) of a god is responsible for this activity. This Sakti is said to be feminine and is worshipped as the wife of the god.[۱]

چونکہ ہندو سوسائٹی نے وادیٔ سندھ کی تہذیب سے گہرے اثرات لئے ہیں اور وادیٔ سندھ کی تہذیب میں دیویوں کی تعداد بہت زیادہ ہے، درخت کو پوجنے کے شواہد عام ہیں اور زمین سے لگاؤ بہت زیادہ ہے نیز اس میں آباد بحیرۂ روم کی نسل واضح طور پر مادری ہے، اس وجہ سے اگر وادیٔ سندھ کی تہذیب کی نفسیاتی ثقافتی سطح کو مادری نظام کی باقیات میں شمار کیا جائے تو اس میں کیا حرج ہے؟ کسی بھی سوسائٹی کی اصل کی پہچان اس کی اُوپر کی سطح سے نہیں بلکہ نچلی سطح سے ہوتی ہے۔ رشید ملک صاحب نے مادری نظام کو شادی بیاہ کی رسوم اور جائیداد کی خرید و فروخت تک محدود کر کے اس کی نفسیاتی ثقافتی سطح کو یکسر نظر انداز کر دیا ہے۔ میں اسی وجہ

---

۱ P. THOMAS : KAMA KALPA - P, 119

سے اس بات کا بار بار اظہار کر رہا ہوں کہ تحقیق کے سلسلے میں ملک صاحب کا سارا رویّہ درسی ہے، تخلیقی بالکل نہیں !

(۸)

یہی درسی رویّہ ان کے اس اعتراض سے ظاہر ہے جو انہوں نے بُدھ مت کے سلسلے میں ڈاکٹر وزیر آغا پر کیا ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے ابتدا ڈاکٹر صاحب کے اس اشارے سے کی ہے کہ "مہاتما بدھ سماج کے نچلے درجے سے تعلق رکھتا تھا" اور نہایت وثوق سے ساتھ فرمایا ہے کہ وہ کھشتری قبیلے سے تعلق رکھتا تھا اور یہ ورن ہندوؤں میں برہمنوں کے بعد سب سے اونچا ورن ہے۔ میں عرض کروں کہ ہندوستان کی قدیم تاریخ صدیوں کی گرد کے نیچے دبی ہوئی ہے اور وثوق سے کچھ کہنا ممکن نہیں۔ خود بُدھ کے رنگ وجود کے بارے میں بھی مختلف آراء میں اور اس کی جو تصویر مجسموں کے ذریعے سامنے آئی ہے خیالی ہے اور بُدھ کے کئی سو سال بعد پیش ہوئی ہے۔ لہٰذا اس معاملے میں جناب رشید ملک اتنے یقین کا مظاہرہ نہ کریں۔ ڈاکٹر صاحب نے تو محض اشارةً بات کہی اور بلا جواز بھی نہیں کہی۔ سپنگلر کے یہ الفاظ پڑھیے:۔

Buddha himself may have been a Sudra, like the "Caesar" Asoka, whose grandfather Chandragupta was of the most humble origin.[1]

اسی طرح BOUQUET لکھتا ہے:۔

There are those who think that Gotma may have been of Mongolian stock. This ofcourse is not established, though it may well be that there was a Mongolian Strain in his pedigree. It must be remembered that no portrait of him exists.[2]

اب بدھ مت کے سلسلے میں رشید ملک صاحب کے اعتراضات ملاحظہ کیجیے۔ فرماتے ہیں کہ "بُدھ ازم کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کے بیانات "مسلمہ روایات، اعتقادات اور نظریات" سے متصادم ہیں" تو کیا یہ کوئی بُری بات ہے؟ میں نے جب "معاصرین کی نظر میں" مرتب کی تو دیباچے میں لکھا تھا کہ "اس کتاب (یعنی اُردو شاعری کا مزاج) کا ایک حصہ تاریخی ادوار اور تحریکات کو ایک نئی روشنی میں پیش کرتا ہے اور اس پر تاریخ کے نقطۂ نظر سے بحث ہو سکتی ہے مثلاً آریائی اور دراوڑی تہذیبوں کا تصادم یا بدھ مت کے بارے میں مصنف کے اجتہادی خیالات وغیرہ"۔ میں نے یہ بات اس لئے کہی تھی کہ کل کلاں اگر کوئی رشید ملک ایسا محقق بات کا آغاز کرے تو اُسے معلوم ہو کہ بُدھ مت کے بارے میں ڈاکٹر صاحب نے جو کچھ کہا ہے، وہ کتابوں میں درج مسلمہ روایات، اعتقادات اور نظریات سے مختلف ہے لہٰذا جس چیز کی نشان دہی میں خود کر چکا ہوں اُسے اپنے ذہنِ رسا کا کرشمہ قرار دینا جناب رشید ملک کو زیب نہیں دیتا۔

---

[1] SPENGLER : DECLINE OF THE WEST. P, 333

[2] A.C. BOUQUET : COMPARATIVE RELIGIONS. P, 154

اپنے مضمون "طلاقِ تثلیث" کے اس حصے تک پہنچتے پہنچتے فاضل نقاد بالکل گڑبڑا سے گئے ہیں اور مضمون کو محض طویل بنانے کیلئے کتابوں میں درج پٹی ہوئی اور بیش افتادہ معلومات کے یونہی انبار لگاتے چلے گئے ہیں مثلاً ڈاکٹر صاحب کا ایک فقرہ تھا کہ "وید دراوڑی تہذیب کے تحت اپنی پاکیزگی، رفعت اور انسانی مزاج سے دست کش ہو چکے تھے"۔ رشید ملک صاحب نے فوراً اس فقرے پر وار کیا مگر اس طور کہ جناب نے ویدوں کے تقدس کا ذکر کیا تو آتیے میں آپ کو بتاؤں کر وید کیا تھے۔ اس کے بعد وہ صفحے کے صفحے ویدوں پر لکھتے چلے گئے ہیں اور آخر میں یہ فرما کر بحیثیت مجموعی آریہ وحشی اور غیر مہذب تھے یہ فیصلہ دیتے ہیں کہ "یہ ہیں اس تہذیب کے خدوخال جس کو ڈاکٹر صاحب تمدنی تہذیب خیال کرتے ہیں"۔ مجھے اپنی زندگی میں اَن گنت علمی مضامین کے مطالعے کی سعادت حاصل ہوئی ہے مگر جتنی ژولیدگی اور بے سروپائی رشید ملک صاحب کے مقالے کے اس حصے میں ہے، مجھے کہیں اور نظر نہیں آئی۔ ملک صاحب نے ڈاکٹر صاحب کی واضح باتوں کو بالکل اُلجھا کر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا کہنا تھا کہ بدھ کے زمانے تک آتے آتے وید اپنی پاکیزگی، رفعت اور انسانی مزاج سے دست کش ہو چکے تھے۔ منتر، جادو کی رسوم اور ٹونے ٹوٹکوں کی بھرمار ہو گئی تھی۔ "تقدس" کا لفظ ڈاکٹر صاحب نے استعمال نہیں کیا یہ ملک صاحب کے ذہن کی اپنی اختراع ہے؛ ڈاکٹر صاحب نے بدھ مت کو آریائی ردِ عمل ثابت کرنے کے لئے ویدوں کے انہی حصوں سے مدد لی ہے جو دراوڑی اثرات کے تحت اُن غیر آریائی رسوم اور رویوں کا مظاہرہ کرنے لگے تھے جنہیں بدھ مت نے ناپسند کیا۔ اپنے جوشِ بیان میں رشید ملک صاحب نے ڈاکٹر صاحب کے نظریے کو رد کرنے کے بجائے اُلٹا اس کی تصدیق کر دی حالانکہ مضمون کی فرمائش کرنے والوں کی واضح ہدایت تھی کہ کوئی لفظ یا فقرہ ڈاکٹر صاحب کی حمایت میں نہ لکھا جائے۔ رشید ملک صاحب نے بدھ مت کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کے اجتہادی خیالات سے بظاہر اختلاف کیا ہے لہٰذا ضروری ہے کہ قارئین کے لئے "اردو شاعری کے مزاج" سے ایک اقتباس پیش کر دیا جائے تاکہ اس سلسلے میں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے۔

"بدھ مت نے دراوڑی تہذیب کے اثرات کو کئی زاویوں سے زائل کرنے کی کوشش کی۔ سب سے پہلے تو اس نے ویدوں کو ماننے سے انکار کر دیا۔ بظاہر اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بدھ مت آریائی ضابطۂ حیات سے بغاوت کی ایک صورت تھی لیکن بات اس کے بالکل برعکس ہے۔ واضح رہے کہ رگ وید کے ابتدائی حصے تو آریاؤں کے ضابطۂ حیات کے عکاس تھے لیکن وقت کی گزران کے ساتھ ساتھ دراوڑی تہذیب کے اثرات رگ وید پر مرتسم ہونے لگے تھے۔ رگ وید کا آخری حصہ اور اتھرووید کا بیشتر حصہ منتروں، جادو کی رسموں اور ٹونے ٹوٹکے کے ان مظاہر پر مشتمل ہے جو دراوڑی تہذیب سے مستعار تھے، چنانچہ برہمن کا منصب ان رسوم کی ادائی کے سوا اور کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ اس صورتِ حال نے جہاں ایک طرف اپنشدوں کے مکاتبِ فکر کو جنم دیا جو گویا منتخب اور ممتاز افراد کے ذہنی "ردِ عمل" کی ایک صورت تھی وہاں اس نے بدھ مت کو بھی وجود میں آنے کی تحریک دی جو عوام کی سطح پر دراوڑی تہذیب کے خلاف محاذ قائم کرنے کی ایک سعی تھی۔ اگر بدھ مت نے ویدوں کو تسلیم کرنے سے انکار کیا تو اس کے پس پشت تاثر محض یہ تھا کہ وید دراوڑی تہذیب کے اثرات کے تحت اپنی پاکیزگی، رفعت اور انسانی مزاج سے دست کش ہو چکے تھے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ بدھ مت میں کھلم کھلا برہمنوں کی رسوم، جادو کے مظاہر اور اوہام پرستی کو ہدفِ طنز بنایا گیا ہے۔" ص ۶۷

ڈاکٹر صاحب نے عام فہم زبان میں بدھ مت کے اس نئے پہلو کی طرف اشارے کئے ہیں مگر رشید ملک صاحب حوالوں اور اقتباسات

کے بغیر کسی چیز کو ماننے کے لئے تیار نہیں۔ ان کی تسلی کے لئے میں یہ چند اقتباسات پیش کرتا ہوں جو اس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ بدھ مت اصلاً ویدک دھرم اور فلسفے ہی پر استوار تھا۔

Buddhism is based on a belief that was part of Buddha's and his Hindu Opponents common Indic ancestral cultural heritage.

— A Study of History – Toynbee, illustrated. P-339.

بنارس کے قریب بدھ نے جو مشہور خطبہ دیا اس کے بارے میں سپنگلر لکھتا ہے:۔

Its roots lay in the rationalistic – atheistic Sankhya philosophy, the world-view of which it tacitly accepts

— Decline of the West. P. 356.

اور اب پوسنے کی کتاب COMPARATIVE RELEGIONS سے اقتباسات ملاحظہ کیجیے۔

It appears that Gotama began with Upanishadic background. P. 158.

It is quite clear that he in the main accepted the Upanishadic background of Unknowable Absolute. P-161.

Nirvana is not so much extinction as another form of the Hindu Upanshadic exalted state of Consciousness. P-162.

Much has been made of the emphasis by the Buddha upon the statement 'existence is suffering' but although he did emphasize it, it was not his own, but the world negating conclusions of other Upanshadic thinkers; to say that existence is bound up with Dukha, anicca and anatta is not original. It is the remedy which Gotama proposes and this is practical, ethical and free from extremes. Otherwise we might

justly say that Buddhism is the international missionary form of Hinduism, with the Absolute for Deity. P. 162.

ڈاکٹر وزیر آغا نے کہا ہے کہ بُدھ مت نے جو اخلاقی رویہ اپنایا اور ذات پات کے تصوّر کو پاش پاش کیا تو یہ اس لئے کہ آریائی تہذیب دراوڑی اثرات کی وجہ سے اپنی پہلی سی سادگی، پاکیزگی اور رفعت سے نا آشنا ہو چکی تھی۔ یہ ایک بالکل نیا اور انوکھا خیال ہے اور جہاں تک مجھے علم ہے، ڈاکٹر صاحب سے پہلے کسی نے بھی اس زمانے کی ہندوستانی تہذیب کو اس نظر سے نہیں دیکھا۔ یقیناً یہ رشید ملک صاحب کے اعتقادات اور نظریات کے مطابق نہیں ہے اور اس کی یہی خوبی مجھے اچھی لگی ہے۔ بے شک رشید ملک صاحب بھی بدھ مت کو ایک "ردِ عمل" مانتے ہیں مگر صرف "برہمنوں اور اُن کی ہوس پرستی" کے خلاف یہ ایک بالکل سطحی سی بات ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ بدھ مت نے ویدک مت میں در آنے والی بہت سی اُن ارضی رسوم اور رویّوں کے خلاف ردِ عمل کا اظہار کیا جو اصلاً دراوڑی تہذیب کی عطا تھیں۔ برہمنوں کی ہوس پرستی بھی تو ان دراوڑی رویوں ہی کا شاخسانہ تھا۔

جناب رشید ملک کے اس مضمون "علائی تثلیث" کی خاص "خوبی" یہ ہے کہ یہ تضادات کا پلندہ ہے۔ وہ اس میں پہلے تو ایک مفروضہ قائم کرتے ہیں پھر کتابوں سے مختلف نظریات کی خوشہ چینی کرتے ہوئے ایک اور مفروضہ بنا لیتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ اُن کے اس دوسرے نظریے سے پہلا نظریہ باطل ہو جاتا ہے۔ اس طرح تضادات در تضادات پیدا ہو جاتے ہیں۔ مثلاً انہوں نے مضمون کے کئی صفحات محض اس بات کے لئے کالے کئے ہیں کہ ویدوں کا "تقدس" ثابت کیا جائے۔ فرماتے ہیں "رگ وید کے مضامین کے بارے میں یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ یہ بیگانہ ہیں۔ یہ غیر منظم اعتقادات کا ملغوبہ ہیں وغیرہ" آخر میں طعنہ دیا ہے کہ کیا یہ 'سماوی' تہذیب کے علمبردار ہیں؟ اس کے فوراً بعد ملک صاحب اپنشدوں کی بات کرتے ہیں اور اُن کو 'الہامی' قرار دیتے ہوئے ان کی تعریف میں رطب اللسان ہو جاتے ہیں حالانکہ وہ تسلیم کرتے ہیں کہ اپنشد دراصل ویدوں کے تتمے ہیں۔ اگر ایسی بات ہے اور اپنشدوں کا فلسفہ ویدوں کی دین ہے تو پھر کیا ویدوں کی مذمت اور اپنشدوں کی ثنا ایک زبردست تضاد پیش نہیں کرتی؟ اسی طرح وہ کبھی تو ڈاکٹر صاحب پر الزام دھرتے ہیں کہ انہوں نے دراوڑوں کے مقابلے میں آریاؤں کی بہت زیادہ تعریف کی ہے اور کبھی کہتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب نے آریاؤں کے ویدوں، اپنشدوں وغیرہ کا مرتبہ کم کرنے کی کوشش کی ہے۔ میرا اپنا خیال یہ ہے کہ رشید ملک صاحب "اُردو شاعری کا مزاج" کا موقف سمجھ ہی نہیں پائے۔ انہیں چاہیے کہ پہلے اس بات کا فیصلہ کر لیں کہ ڈاکٹر وزیر آغا آریائی تہذیب کے حامی ہیں یا دراوڑی تہذیب کے اور پھر اس سلسلے میں لب کشائی فرمائیں۔ میں نے "معاصرین کی نظر میں" اس نکتے کو اٹھایا تھا کہ بعض ناقدین نے ڈاکٹر صاحب کو دراوڑی تہذیب کا حامی سمجھا ہے اور بعض نے لکھا ہے کہ ان کا جھکاؤ آریائی تہذیب کی طرف ہے۔ اس پر میں نے اس بات کی وضاحت کی کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنی کتاب میں کہیں بھی ایک تہذیب کو دوسری تہذیب پر ترجیح دینے کی کوشش نہیں کی مگر اُس وقت مجھے اس بات کا علم نہیں تھا کہ میری کتاب کی اشاعت کے بارہ برس بعد جناب رشید ملک ایسا محقق بھی آئے گا جو اس بات کا فیصلہ ہی نہ کر پائے گا کہ کتاب دراوڑی تہذیب کے حق میں ہے یا آریائی تہذیب کے حق میں۔ بہرحال 'یہ کارنامہ' رشید ملک صاحب نے بخوبی سرانجام دیا ہے۔

اور اب میں ان کے چھوٹے چھوٹے اعتراضات میں سے چند ایک کے جواب دیتا ہوں۔ چونکہ ان کے سب اعتراضات ایک ہی وضع کے ہیں لہٰذا نمونے کے طور پر صرف چند ایک کے جوابات دینے پر ہی اکتفا کرتا ہوں۔

پہلا اعتراض :- ڈاکٹر صاحب کی یہ بات غلط ہے کہ قدیم انسانی سوسائٹی وقت اور تاریخ سے بے نیاز صرف حال کے دائرے میں مقید ہے۔ مصر کی طرف لوٹ جائیے!

حضور آپ کا حکم سر آنکھوں پر! مگر قدیم سوسائٹی سے اگر آپ کی مراد وہ سوسائٹی ہے جو تاریخی عمل سے وجود میں آئی تو یہ آپ کی غلط فہمی ہے۔ تاریخ تہذیب کو پیش نظر رکھیں تو مصر، سمیریا، بابل اور وادیٔ سندھ قدیم سوسائٹیاں (PRIMORDIAL SOCIETIES) نہیں ہیں۔ قدیم سوسائٹی سے ڈاکٹر صاحب کی مراد جنگلی قبائل کی وہ سوسائٹی ہے جو وقت اور تاریخ سے بے نیاز ہوتی ہے۔ اس سوسائٹی کے نمونے آج بھی دور دراز مقامات پر مل جاتے ہیں۔ مزید معلومات کے لئے مرسیا ایلیاڈ کی کتاب کاسموس اینڈ ہسٹری کا مطالعہ کیجیے۔

دوسرا اعتراض :- ڈاکٹر صاحب نے فرمایا ہے کہ چونکہ "گنگا کا میدان زمین کا وہ ٹکڑا ہے جو سب سے آخر میں سمندر سے ابھرا۔ کاش ڈاکٹر صاحب کسی بھی جغرافیہ یا علم الارض کی ابتدائی کتاب سے اپنے اس بیان کا تقابل کر لیتے۔"

جواب حاضر ہے کہ اگر رشید ملک صاحب کو جیولوجی سے ذرا بھی لگاؤ ہوتا تو ان پر یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہوتی کہ جنوبی ہندوستان جسے گونڈوانہ لینڈ کہا گیا ہے، جس PLATE پر ایستادہ ہے وہ ایشیا کی PLATE کے ساتھ دست و گریباں ہے اور اس PUSH کے باعث برتر ہمالیہ اور کم تر ہمالیہ وجود میں آئے ہیں اور جنوبی ہند کی پلیٹ اور ایشیا کی پلیٹ کے درمیان کوری ڈور میں سندھ اور گنگا کے میدان بھی اسی وجہ سے عالم وجود میں آئے ہیں۔ گنگا کے میدان کا آخری حصہ جسے خلیج بنگال کا نام ملا ہے، آج بھی خشکی اور سمندر کے درمیان کی کوئی چیز ہے۔ جو ادبا رائٹرز گلڈ کے ٹکٹ پر سندر بن دیکھنے گئے تھے، ان سے پوچھیے کہ چوبیس گھنٹوں میں پورا سندر بن ایک بار تو سمندر کے نیچے چلا جاتا ہے۔ گویا خشکی کا یہ ٹکڑا ابھی تک سمندر سے پوری طرح برآمد نہیں ہوا۔ چونکہ رشید ملک صاحب حوالہ جات کی کتب کے بہت زیادہ رسیا ہیں۔ اس لئے میں انہیں ڈی این MAJUMDAR کی کتاب جس کا نام RACES AND CULTURE OF INDIA ہے، کے صفحہ ۲ کی طرف متوجہ کرتا ہوں۔

تیسرا اعتراض :- "متھن کے بارے میں ان کا (ڈاکٹر وزیر آغا کا) پورا بیان KAMASLIP A LESSON کی کتاب سے ماخوذ ہے۔ اس میں ایک حوالہ DANIELOU کا آتا ہے اور راقم الحروف (رشید ملک صاحب) کو یقین ہے ڈاکٹر صاحب اس عالم کی شخصیت اور علمی کاوشوں سے قطعاً واقف نہیں ہیں۔"

رشید ملک صاحب! یہاں آپ نے علمی تحقیق سے منہ موڑ کر علم نجوم سے رجوع کر لیا ہے لہٰذا اس سلسلے میں میں کیا عرض کر سکتا ہوں۔ رہا متھن کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کا بیان تو وہ درج ذیل ہے :-

"ہندو مندروں میں متھن کی اس صورت کو بعض حلقوں نے جنسی بے راہ روی، غلاظت اور گناہ قرار دیا ہے۔ اس کے جواب میں جو دلائل پیش ہوئے ہیں ان میں سے مقبول ترین دلیل کمار سوامی کی ہے۔ کمار سوامی نے مرد اور عورت کے اس ملاپ کو بندے اور خدا کے وصال کی صورت قرار دیا ہے[1] دوسری طرف پنڈت نہرو نے کہا ہے کہ متھن کی یہ صورت اس زمرے میں شامل ہے جس میں موسیقی، رقص، مصوری، تھیٹر اور ادب شامل ہے[2] متھن کے جواز میں سب سے قرین قیاس

---

[1] A.K. COMAR SWAMI : ART AND ARCHETECTURE OF INDIA. P. 162

[2] NEHRU : DISCOVERY OF INDIA. P. 171

نظریہ الین ڈینلیو کا ہے۔ اس نظریے کی صداقت کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب ہم فرشتے[1] کا یہ بیان پڑھتے ہیں وغیرہ"۔

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ متھن کے بیان میں ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنی طرف سے کچھ نہیں کہا اور نہ وہ خود کو اس بارے میں اتھارٹی سمجھتے ہیں کہ ایسا کرتے۔ انہوں نے متھن کے بارے میں تین آراء پیش کی ہیں اور جن جن کتابوں سے ان آراء کو لیا ہے ان کے حوالے دیئے ہیں۔ اب اس میں کون سی ایسی بات رہ گئی تھی جو LESSON کی کتاب سے اخذ کی جاتی؟

چوتھا اعتراض:۔ رشید ملک صاحب کا یہ اعتراض حوالہ جات کے سلسلے میں ہے۔ ان کی یہ خواہش ہے کہ ہر بات کا حوالہ دیا جائے فرماتے ہیں کہ "اُردو شاعری کا مزاج" میں حوالہ جات پر توجہ نہیں دی گئی مثلاً ٹائن بی سے 'ین اور یانگ' کے الفاظ تو لے لئے گئے مگر ان کا حوالہ نہیں دیا گیا۔

گزارش ہے کہ چونکہ رشید ملک صاحب کی تنقید کا عام انداز تفتیشی ہے اس لئے وہ حوالہ جات کے کچھ اس حد تک رسیا ہیں کہ عام چیزوں کو بھی بغیر حوالے کے قبول نہیں کرتے۔ اب اگر COLLECTIVE UNCONSCIOUS، LIBIDO، SUPERMAN، ELAN VITAL، NOUMENON، LOGOS، MONAD، GESTALT ایسے الفاظ جن کی ماہیت کا علم ہر پڑھے لکھے شخص کو ہونا چاہیے، حوالوں کے محتاج ہوں تو بات کرنا مشکل ہو جائے۔ "اُردو شاعری کا مزاج" پرائمری پاس لوگوں کے لئے نہیں ہے۔ یہ ان لوگوں کے لئے ہے جنہوں نے پہلے سے کچھ مطالعہ کر رکھا ہے اور جو جانتے ہیں کہ سپرمین کا لفظ آئے گا تو نطشے کی طرف، NOUMENON کے لفظ سے کانٹ کی جانب، لبیڈو کے لفظ سے فرائڈ کی طرف اور ین اور یانگ سے ٹائن بی اور ژونگ کی طرف ذہن ضرور جائے گا۔

حوالہ جات ہی کے سلسلے میں ملک صاحب کا ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ "اُردو شاعری کا مزاج" میں ایک جگہ ایک خاص کتاب کا حوالہ دیئے بغیر اس کتاب میں درج حوالہ جات کا حوالہ دے دیا گیا ہے۔ اول تو ایسا کہیں نہیں ہوا اور اگر ہو بھی جائے تو اس میں عیب کی کون سی بات ہے؟ ہاں اگر حوالہ غلط ہے تو مطلع فرمائیے۔

پانچواں اعتراض:۔ جناب رشید ملک فرماتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب اپنی کتاب "تصورات عشق و خرد۔ اقبال کی نظر میں" میں مہاتما بدھ کے بارے میں یہ لکھتے ہیں:۔

> "یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ آرفس نامی کوئی شخص واقعتاً گزرا ہے یا نہیں بعینہٖ جس طرح کنفیوشس، بدھ اور زرتشت کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ انہیں تاریخی حیثیت حاصل تھی"

اور پھر اعتراض کیا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے یہ خیال سر رادھا کرشنن کی کتاب سے بغیر حوالے کے لے لیا ہے اور اس میں نئے معنی پیدا کر دیئے ہیں۔

سب سے پہلے تو میں رشید ملک صاحب کی خدمت میں عرض کروں کہ انہوں نے کم از کم کتاب کا متن تو احتیاط سے پڑھ لیا ہوتا۔ "تصورات عشق و خرد" میں ڈاکٹر صاحب بدھ مت کے موضوع پر رقم طراز نہیں تھے، آرفس مت کی بات کر رہے تھے۔ بدھ کا ذکر تو ضمنی طور

۱؎ FONCHET : THE EROTIC SCULPTURE OF INDIA - P. 77-78

پر کنفیوشس اور زرتشت کے ساتھ آیا۔ دوسرے میں اُن سے بصد ادب یہ سوال کروں گا کہ انہوں نے کس لمحۂ خود فراموشی میں یہ فرمادیا کہ ڈاکٹر صاحب نے خیال میں نئے معنی پیدا کر دیئے ہیں۔ ایسا توصیفی کلمہ تو ان کے مضمون کی اسپرٹ کے بالکل منافی ہے مگر ایک اور دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کے فوراً بعد رشید ملک صاحب نے رادھا کرشنن کی کتاب سے اقتباس پیش کیا ہے۔ میرا خیال تھا کہ اس اقتباس میں رادھا کرشنن نے بھی یہی بات کہی ہو گی مگر اقتباس پڑھا تو پتہ چلا کہ رادھا کرشنن نے تو آرفس، کنفیوشس اور زرتشت کا ذکر تک نہیں کیا البتہ بدھ کی کہانی کو متحد قرار دینے کا الزام ایم سٹارٹ پر لگایا ہے اور وہ خود ڈاکٹر صاحب کے مؤقف سے مختلف رائے رکھتے ہیں۔ تب میں نے سوچا کہ ملک صاحب نے یہ مفروضہ کیوں قائم کیا کہ خیال رادھا کرشنن کی کتاب سے لیا گیا ہے۔ یہ کیوں نہ کہا کہ ایم سٹارٹ کی کتاب سے لیا گیا ہے مگر یہ تو اس صورت میں ممکن تھا کہ رشید ملک صاحب رادھا کرشنن کی انگریزی عبارت کا مفہوم سمجھ پاتے۔ عین ممکن ہے کہ انہوں نے جانتے بوجھتے تجاہلِ عارفانہ سے کام لیا ہو۔ کون جانے! تاہم میں یہ عرض کروں کہ بدھ کی کہانی کو متحد قرار دینے کی طرف اشارہ بدھ مت پر لکھی گئی غالباً تمام کتابوں میں موجود ہے۔ رشید ملک صاحب نے چونکہ اس بارے میں صرف رادھا کرشنن کی کتاب پڑھی لہٰذا انہوں نے خیال کیا کہ ہو نہ ہو ڈاکٹر صاحب نے یہ خیال رادھا کرشنن سے لیا ہو گا۔ رشید ملک صاحب کی تحقیق کا عام انداز یہی ہے۔

چھٹا اعتراض:۔ کتاب (معاصرین کی نظر میں) کے مؤلف سجاد نقوی نے اس کی (یعنی جس نے اختلاف کرنے کی کوشش کی) خوب خبر لی ہے۔ یہاں تک کہ پڑھے لکھے لوگوں میں جو ایک حدِ ادب اور رکھ رکھاؤ ہوتا ہے، اس کو بھی بالائے طاق رکھ دیا گیا ہے۔

اس کے بعد جناب رشید ملک نے میری اس مرتب کردہ کتاب کے صفحات ۲۳، ۲۲، ۲۷ وغیرہ کا حوالہ دیا ہے۔ میں نے از رو تجسس ان صفحات پر اپنے ایڈیٹوریل نوٹس کو دوبارہ پڑھا تو مجھے ان میں ایک لفظ بھی ایسا نہیں ملا جس سے حدِ ادب اور رکھ رکھاؤ مجروح ہوتا ہو۔ کتاب مارکیٹ میں دستیاب ہے اور قارئین اس کا مطالعہ کر کے از خود نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں البتہ رشید ملک صاحب کے زیرِ نظر مضمون "طلائی تثلیث" کا لہجہ دیکھنے کے قابل ہے۔ فرماتے ہیں۔

۱۔ مصنف (یعنی ڈاکٹر وزیر آغا) کے ذہن پر تین ہزار سالہ فرسودہ ہندو فلسفہ سوار ہے اور وہ اس قسم کی مجہول کوشش میں مصروف ہیں جس طرح مذہبی جنونی ......

۲۔ ہیگل کی جدلیات ذیادہ سہل زیادہ سادہ اور کہیں زیادہ ترقی یافتہ ہیں۔ وہ بچوں کی طرح نر اور مادہ کے چکر میں نہیں پڑتا (اشارہ اُردو شاعری کا مزاج کے مصنف کی طرف ہے) ......

۳۔ (ڈاکٹر صاحب) کا یہ بیان ذہنی سادگی کی غمازی کرتا ہے کہ کسی خط کے مستقیم یا منحنی ....

کیا فاضل نقاد جناب رشید ملک کا یہ 'لہجہ' "پڑھے لکھے لوگوں میں جو ایک حدِ ادب اور رکھ رکھاؤ ہوتا ہے" اس کے عین مطابق ہے؟ سچ کہا ہے شاعر نے ؎

اتنی نہ بڑھا پاکیٔ داماں کی حکایت دامن کو ذرا دیکھ ذرا بندِ قبا دیکھ

نوٹ:۔ میں اس مضمون کی تیاری میں ڈاکٹر انور سدید، پروفیسر غلام جیلانی اصغر اور عصمت اللہ کا ممنون ہوں کہ انہوں نے مجھے نہایت مفید مشورے دیئے اور مختلف موضوعات کے سلسلے میں اہم کتب کی نشاندہی کی۔ اسی طرح میں ڈاکٹر وزیر آغا کا بھی شکرگزار ہوں کہ انہوں نے مجھے اپنی لائبریری کی کتابوں سے استفادہ کرنے کی سہولت فراہم فرمائی۔ (سجاد نقوی)

لنڈا وینٹنک | رام لعل کے ساتھ کچھ باتیں

لکھنؤ۔ ۲۵ جولائی ۱۹۷۹ء۔ میں نئی دہلی سے لکھنؤ میل کے ذریعے صبح سات بجکر بیس منٹ پر لکھنؤ پہنچ گئی۔ میں نے اُردو کے ممتاز افسانہ نگار رام لعل صاحب کو تار کے ذریعے اپنے مختصر سے پروگرام سے مطلع کر دیا تھا۔ وہ اسٹیشن پر موجود تھے۔ میں نے کچھ اور لوگوں کو بھی تار بھجوائے تھے۔ اُن میں سے صرف انیس اشفاق دکھائی دیے جو لکھنؤ یونیورسٹی سے اُردو شاعری میں علامات پر ریسرچ کر رہے ہیں۔ وہ نوجوان شاعر اور نقاد بھی ہیں اُن کے ساتھ ایک اور شاعر قمر آغا صاحب بھی تھے۔ ہم سب سیدھے رام لعل صاحب کے ریلوے فلیٹ میں گئے۔ رام لعل صاحب کی بیگم اور اُن کے بچوں سے میرا تعارف کرایا گیا۔ چائے پی گئی۔ بہت سے رسالے دیکھے گئے۔ پھر میں نہا دھو کر سب لوگوں کے ساتھ ناشتے کے ٹیبل پر جا بیٹھی۔ اُسی وقت محمد شیث خاں بھی آگئے۔ اِدھر اُدھر کی باتیں چھڑ گئیں۔ امریکہ میں اُردو ادب پر ریسرچ کیوں ہو رہی ہے؟ اور بھی کئی لوگ کرتے رہے وغیرہ وغیرہ۔ پھر دوسرے لوگ اندر جا بیٹھے۔ میں اور رام لعل صاحب اُسی ٹیبل پر بیٹھے رہے۔ میں نے اُن کے سامنے ٹیپ آن کر دیا۔ وہ چائے پیتے رہے اور سگریٹ بھی ہاتھ میں اُٹھائے اُٹھائے رہے۔ پوری گفتگو میں انہوں نے ایک ہی سگریٹ کو کئی بار سلگایا جو برسات کی نمی کی وجہ سے بار بار بجھ جاتی تھی یا وہ خود کش لگانا بھول جاتے تھے۔

لنڈا:۔ یہ بتائیے آپ کا پہلا افسانہ کون سا تھا۔ کس سنہ میں چھپا؟

رام لعل:۔ پہلا افسانہ؟

لنڈا:۔ جی ہاں

رام لعل:۔ پہلا افسانہ ۱۹۴۳ء میں لاہور کے ایک ہفتہ وار 'خیام' میں شائع ہوا تھا اُس کا عنوان تھا "مُحرّک"۔

لنڈا:۔ 'خیام'۔ اچھا سنا ہے اُس کا نام اور اُس کے بعد تقسیم کے بعد آپ کہاں آئے؟

رام لعل:۔ میں تقسیم کے بعد ہی یہاں آیا۔

لنڈا:۔ اور "محرک" کے بعد ہر سال افسانے برابر چھپوا رہے تھے؟

رام لعل:۔ ہاں ایسا ہوا کہ ۱۹۴۵ء میں میرا پہلا مجموعہ چھپ گیا تھا 'آئینے' کے نام سے۔ جس کا دیباچہ ——— افسانہ نگار احمد ندیم قاسمی نے لکھا تھا جو مجھ سے بڑے تھے۔ انہوں نے میرا جو تعارف لکھا تھا وہ میرے لئے بڑا حوصلہ افزا تھا اور اُس کے بعد ہی میں نے کچھ افسانے لکھے۔ لیکن آزادی تک جو میرا پیریڈ تھا وہ میرے لئے ایک اپرنٹس شپ کا پیریڈ تھا یعنی مشق کرنے کا زمانہ تھا اور آزادی

کے فوراً بعد میرا خیال ہے کہ میں جس طرح کے کرب کا شکار ہوا۔

لنڈا:- ہجرت؟

رام لعل:- وہ ہجرت کا کرب تھا۔ مصیبتیں میں نے دیکھیں، قتل و غارت دیکھی اور جس مصیبت سے میں ہندوستان میں پہنچا اور جس طرح سے میں نے دوسرے لوگوں کو مصیبت میں مبتلا دیکھا اُس کا مجھ پر بہت گہرا اثر پڑا۔

لنڈا:- ہاں۔ آپ کے افسانے ہجرت کے بارے میں مشہور ہیں۔ تبھی میں آپ سے پوچھنا چاہتی ہوں کن کن لوگوں نے ہجرت کے بارے میں افسانے لکھے۔

رام لعل:- جی ہاں! کرشن چندر اور دوسرے جن بزرگ ادیبوں نے فسادات کے بارے میں افسانے لکھے اُن کے افسانوں اور میرے افسانوں کے درمیان ایک فرق ہے۔ میرے افسانے زیادہ انوالومنٹ کے بارے میں تھے جبکہ میں اُن کے افسانوں کو انوالومنٹ سے الگ سمجھتا ہوں۔ اس لئے کہ وہ لوگ بمبئی میں بیٹھے تھے۔ کوئی شخص کلکتہ میں بیٹھا تھا جو فسادات میں سے نہیں گذر رہا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ ذہنی طور پر تکلیف محسوس کر رہا ہو لیکن میں ذہنی اور جسمانی دونوں طرح سے دُکھ بھوگ رہا تھا اور جب میں ہندوستان میں آگیا تو میں نے اپنے سامنے بہت سے لوگوں کو ـــــ رفیوجیوں کو دیکھا ان کے RESETTLEMENT کے مسائل کو دیکھا میں خود بھی اُنہی میں سے ایک تھا۔ مجھے یہ زیادہ موقعہ ملا کہ اُن کی جو حقیقی PROBLEMS ہیں جب وہ لوگ UPROOTED ہو گئے جڑوں سے اُکھڑ گئے۔ وہ کیا پھر سے جڑیں پکڑ سکتے ہیں کہ نہیں پکڑ سکتے؟ اُس کی کیا شکل ہوگی اور اُن کے جو نفسیاتی اثرات پڑیں گے اُن کا ذہنی انتشار کس قسم کا ہے، جو آپس میں لڑتے ہیں اُن کے درمیان حسد کی کیفیات ہیں، دُکھ ہیں، تکلیفیں ہیں، اُسی کو میں نے اپنا موضوع بنایا اور اس طرح کا موضوع پاکستان میں بھی موجود تھا جیسے بزرگ افسانہ نگار سعادت حسن منٹو اور احمد ندیم قاسمی کے علاوہ ہمارے ہم عصر افسانہ نگار۔ شوکت صدیقی، انتظار حسین، اشفاق احمد وغیرہ اور کچھ اور بھی افسانہ نگار تھے، اُبھر چکے تھے ہندوستان میں میں لکھ رہا تھا اور میرے ساتھ دو چار اور افسانہ نگار تھے۔ میں سمجھتا ہوں ہم زیادہ انوالوڈ (INVOLVED) تھے۔ بزرگ ادیبوں کی نسبت جنہوں نے فسادات دیکھے نہیں تھے۔ اُن کے بارے میں سُنا تھا انہوں نے ـــ اخباروں وغیرہ کے ذریعے۔

لنڈا:- اُس زمانے میں انتظار حسین نے ایک مضمون لکھا تھا۔ ۱۹۵۲ء میں جو "ہمایوں" میں چھپا تھا جو ایک کتاب میں بھی بعد میں چھپا ہے اور گوپال متل نے بھی لکھا تھا کہ اُس وقت ترقی پسند تحریک ختم ہونے والی تھی۔ آزادی کے ہی زمانے میں۔ لیکن چونکہ فسادات کا ایک نیا موضوع مل گیا اس لئے وہ زندہ رہ گئی۔ کیا اُس وقت آپ ترقی پسند تحریک میں شامل تھے؟ یا اُس سے کوئی تعلق رکھتے تھے؟

رام لعل:- لنڈا، ایسا ہے اُس زمانے میں میں ترقی پسند تحریک کے نظریے کو یا اُس کی تھیوری کو ٹھیک طرح سے سمجھتا بھی نہیں تھا۔ جب ہمیں آزادی ملی۔ اُس کا نام ہی سُنا تھا۔ اُس کے بارے میں مضامین پڑھ رہا تھا۔ جتنے مباحثے ہوتے تھے اور رسالوں میں چھپتے رہتے تھے لیکن میں اُن میں انوالو (INVOLVE) نہیں تھا۔ اس وقت یہ میری سمجھ سے باہر کی کوئی چیز تھی اور اُس زمانے میں میں بالکل BEGINNER تھا۔ آزادی کے فوراً بعد جب میں دو چار میٹنگوں میں شریک ہوا۔ ایک میٹنگ میرے گھر پر بھی ہوئی۔ میں اُس زمانے میں بنارس میں رہتا تھا۔ اُس کے بعد میں لکھنؤ آگیا اور یہاں کی میٹنگوں میں شریک ہونے لگا تب اُس تحریک کا سارا ڈھانچہ میری سمجھ میں آیا لیکن اب دو باتیں ہیں ایک انتظار حسین اور گوپال متل کے حوالے سے ہوگی اور دوسری بات آپ نے مجھ سے پوچھی ہے کیا میں اس تحریک سے وابستہ تھا؛ ان

دو باتوں کا جواب دینا پڑے گا۔ پہلی بات تو یہ کہ آپ نے انتظار حسین اور گوپال متل کے بارے میں کہا ہے کہ اگر آزادی کے فسادات نہ ہوئے ہوتے تو ترقی پسند تحریک ختم ہو چکی تھی۔ میرے خیال میں یہ کہنا صحیح نہیں ہے کیونکہ ابھی تو وہ ترقی پسند تحریک کے عروج کا زمانہ تھا۔ وہ اپنے کلائمکس پہ آ رہی تھی اور کسی بھی تحریک کو زوال پذیر ہونے کے لئے کم سے کم تیس سے لے کر چالیس یا پچاس سال کا عرصہ چاہیے۔ کسی تحریک کے بارے میں اگر یہ کہیں کہ یہ صرف دس سال میں ختم ہو جائے گی یا بیس سال زندہ رہ کر ختم ہو جائے گی یہ بات اگر انتظار حسین نے یا گوپال متل نے کہی ہے تو یقیناً PREJUDICED ہو کر کہی ہے یعنی تعصب سے کام لے کر کہی ہے۔

لنڈا:۔ اُسی وقت سردار جعفری نے بھی ترقی پسند ادب کتاب میں بتایا تھا کہ اُردو ادب میں جمود ہے۔ اُسی زمانے میں ۱۹۵۲ء یا ۱۹۵۳ء میں ڈاکٹر وزیر آغا اور محمد حسن عسکری نے بھی لکھا کہ اُردو ادب میں جمود ہے۔

رام لعل:۔ ایسا ہے کہ یہ بات ۱۹۵۲ء اور ۱۹۵۵ء کے بعد کی ہے۔ آزادی کے فوراً بعد کی نہیں ہے۔ آزادی ۱۹۴۷ء میں ملی تھی اور محمد حسن عسکری نے تو اُس تحریک پر حملہ کرنا شروع کر دیا تھا لیکن سردار جعفری نے یہ کتاب غالباً ۱۹۵۲ء کے بعد لکھی ہے اور یہ نعرہ جو لگایا گیا کہ اُردو ادب میں جمود ہے وہ نعرہ اپنی جگہ کسی حد تک صحیح بھی تھا کیونکہ جتنے افسانے لکھے جا رہے تھے جتنی نظمیں لکھی جا رہی تھیں اور جس طرح کی تنقید کی جا رہی تھی اُن سب میں یکسانیت آ گئی تھی۔

لنڈا:۔ اچھا۔ یعنی یہ سب فسادات کے بارے میں لکھنے کی وجہ سے تھا یا.....

رام لعل:۔ نہیں نہیں، یہی یکسانیت آ گئی تھی کہ وہی مزدور ہے وہی کسان ہے وہی لال جھنڈا ہے۔ وہی فسادات ہیں لیکن اس کا صحیح تجزیہ کرنے والے نقادوں کی کمی تھی۔ اُنہوں نے یہ نہیں دیکھا کہ کون اچھے یا جینوئن (GENUINE) رائیٹرز ہیں جو نظمیں عام زندگی کے بارے میں یا افسانے اور ڈرامے عام زندگی کے بارے میں لکھ رہے ہیں۔ اُن کی نشاندہی کرنے میں ہمارے نقاد ناکام رہے ہیں اور یہ اُن نقادوں کی ٹیم تھی جنہوں نے جمود کا نعرہ لگایا جو پہلے گروہ کے ترقی پسند رائٹرس کے ساتھ پیدا ہوئے تھے۔

لنڈا:۔ ہاں۔ جیسے خلیل الرحمٰن اعظمی ـــــ

رام لعل:۔ نہیں۔ خلیل الرحمٰن اعظمی بعد میں آتے ہیں یہ تو ایک بالکل دوسرا گروہ ہے۔ انہوں نے تو ترقی پسند تحریک سے بغاوت کی اگرچہ وہ پہلے ترقی پسند ہی تھے۔ میں احتشام حسین کی بات کر رہا ہوں۔ میں آل احمد سرور کی بات کر رہا ہوں۔ میں سردار جعفری اور وقار عظیم وغیرہ کی بات کر رہا ہوں جو اُس ایج گروپ میں آتے ہیں جس ایج گروپ میں سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی۔ اِس طرح کے رائٹر آتے ہیں یہ لوگ اپنے ساتھ اپنے نقاد بھی لے کر آ گئے اور یہ اتفاق تھا کہ جب یہ سارے شاعر اور افسانہ نگار جب اُبھرے تو اُن کے ساتھ نقاد بھی پیدا ہو گئے۔ پُرانے نقادوں کے بعد ہمارے ساتھ نئے نقاد نہیں پیدا ہوئے تھے۔ یہ ایک المیہ ہے چونکہ نقاد پُرانا تھا۔ پُرانے طریقے سے سوچتا تھا۔ اُس نے اس تبدیلی کو نہیں محسوس کیا کہ نئے رائٹرس کس طرح سے سوچ رہے ہیں۔ انتظار حسین کس طرح سے سوچ رہا ہے۔ شوکت صدیقی کس طرح سے سوچ رہا ہے یا میں کس طرح سے سوچ رہا ہوں یا ممتاز شیریں کس طرح سے سوچ رہی ہے اور قرۃ العین حیدر کس طرح سے سوچ رہی ہے۔ یہ وہی ایج گروپ ہے جو کرشن چندر وغیرہ کی نسل کے بعد آتا ہے۔ اُن کے بارے میں ٹھیک طرح سے تجزیہ کرنے والے نقاد نہیں تھے۔ کچھ عرصہ بعد نئے نقاد آئے۔ جیسے وزیر آغا آئے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی آئے۔ شمس الرحمٰن فاروقی اور گوپی چند نارنگ تو بہت بعد میں آتے ہیں۔ دو ایک نقاد اور ہیں جو زیادہ

اہم نہیں ہیں لیکن انہوں نے بھی نئی نسل کو سامنے لے آنے میں بہت دیر لگائی۔ انہوں نے بھی اپنا امیج بنانے میں چھٹی دہائی..... (SIXTIEES) تک انتظار کیا۔ اس سے پہلے اُن کا کوئی CONTRIBUTION نظر نہیں آتا۔

لنڈا:۔ پھر کیوں انہوں نے جمود کے بارے میں لکھا۔

رام لعل:۔ اب جیسے خلیل الرحمٰن اعظمی نے بغاوت کی۔ ترقی پسند تحریک کے اس سیاسی غلبے کے خلاف وہ ہمیں پانچویں دہائی..... (FIFTIES) کے آخر میں ملتی ہے جب اُن کی کتاب 'نیا عہد نامہ' جو اُن کی نظموں کا مجموعہ ہے چھپی ہے جس کا دیباچہ لکھ کر انہوں نے تحریک پر پہلا پتھر مارا تھا جو بڑا مؤثر ثابت ہوا اور دوسری نسل کے جتنے بھی لوگ تھے اُن سب نے بغاوت کر دی۔ اب آپ نے جو بات چھیڑی تھی کہ میں ترقی پسند تحریک کے ساتھ کس حد تک وابستہ تھا! اس بات کا جواب بھی آپ کو دے دوں کہ میں ذہنی طور پر سوشلزم کا حامی ہوں۔ ہمارے ملک میں ایک سوشلسٹ انقلاب آنا چاہیے۔ میں یہ سوچ بھی نہیں سکتا کہ جب ہماری آبادی اتنی زیادہ ہے کروڑوں کی، کیا اس کا کبھی اور طریقے سے بھلا ہو سکتا ہے؟ CAPITALISM کے ذریعے شاید نہیں ہو سکتا کیونکہ ہمارے سامنے تازہ ترین چین کا بہت بڑا انقلاب ہے۔ انہوں نے انقلاب کے ذریعے ہی اپنے مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی اور اس کوشش میں ابھی تک لگے ہوئے ہیں۔ وہ دنیا کی سب سے بڑی آبادی والا ملک ہے لیکن یہ تو بات سیاسی سطح کی ہوئی لیکن لٹریری سطح پر میں نے کہیں پروپیگنڈہ نہیں کیا۔ چاہے میں دل سے سوشلسٹ ہی ہوں لیکن آپ کو میری کہانیوں میں کسی قسم کا پروپیگنڈہ نہیں ملے گا اگر کوئی جھلک اس کی نظر آتی بھی ہے تو وہ جیسے کسی تحریک کا وقتی اثر ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے میں نے کچھ کہانیاں اس طرح کی شروع شروع میں لکھ دی ہوں یا میں نے خود ایسے لوگوں کو CONDEMN کیا جنہوں نے مجھ سے کہا اسے بھئی اس کہانی میں تھوڑی سی سُرخی ڈال دو تو یہ کہانی ترقی پسند ہو جائے گی۔ میں نے اُن کی رائے کو تسلیم نہیں کیا جب تک کہانی اپنے اندر سے پروگریسو بن کر نہیں آئی، اور کہانی کو کہانی ہونا چاہیے۔ پروگریسو یا نان پروگریسو کیا چیز ہوتی ہے کہانی کو کہانی، لٹریچر کو لٹریچر ہونا چاہیے۔ اب میں روس کے بڑے بڑے ادیبوں کو سامنے رکھتا ہوں جیسے چیخوف ہیں ——— چیخوف نے کبھی پروپیگنڈہ نہیں کیا۔ اُس نے عام آدمی اور عام آدمی کے احساسات کے بارے میں کہانیاں لکھیں جو ساری دنیا کے انسانوں کے دل کو چھو لیتی ہیں۔ اب اتفاق سے وہ روس میں پیدا ہوا اور روس نے یا روسی نظریات یا روسی تنظیم نے انہیں پروپیگنڈے کے طور پہ استعمال کیا تو اس میں چیخوف کا کیا قصور ہے اور ٹالسٹائے کا وہ ناول جنگ اور امن دیکھ لیجیے جو ایک ایپک بھی ہے اور تاریخ بھی اس میں کوئی پروپیگنڈہ نہیں ہے۔

لنڈا:۔ ہم اُسی سوال پہ ذرا واپس جائیں۔ جب ترقی پسند تحریک ختم ہو رہی تھی اور شاہراہ اور صبا میں جمود کے بارے میں چھپتا تھا اُسی وقت سوغات اور تحریک شروع ہوئے۔ سوغات اور تحریک اور دوسرے پرچوں کا کیسے فروغ ہوا؟

رام لعل:۔ لنڈا۔ تمہارا یہ سوال بہت اچھا ہے کہ شاہراہ کے زمانے میں جب میں کہانیاں لکھ رہا تھا تو میری کہانیاں شاہراہ میں نہیں چھپتی تھیں۔ میں دیکھتا تھا کہ وہاں ایک سیاسی غلبہ ہے اور میں سیاسی غلبے کے زیرِ اثر کہانی لکھنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ میری دو ایک کہانیاں پرکاش پنڈت نے واپس کی تھیں جو شاہراہ کے ایڈیٹر تھے۔ وہ غالباً یہ چاہتے تھے کہ میری کہانی کو ایک سیاسی پروپیگنڈہ ہونا چاہیے

لنڈا:۔ وہ کون سے افسانے تھے؟

رام لعل:۔ اب یاد کرنا مشکل ہے۔ پتہ نہیں پھر وہ کہاں چھپ گئے۔ مجھے کچھ یاد نہیں آتا لیکن جب پرکاش پنڈت وہاں سے ہٹا دئے گئے

ان کی جگہ پر وامق جونپوری آئے۔ انہوں نے مجھ سے کہانی مانگی تب بھی میں نے کہانی نہیں بھیجی۔ وہ ترقی پسند تھے میری طرح، لیکن میرے دماغ میں غصہ بھرا ہوا تھا۔ یہ ہی تھی کہ میں اس طرح سے کہانی لکھنے کے لئے تیار نہیں ہوں جس طرح سے یہ میرے ساتھ سلوک کرتے ہیں۔ جب میں چھپ رہا تھا تو صرف شاہراہ ہی ایک رسالہ نہیں تھا اور بھی کئی رسالے تھے۔ صبا میں بھی چھپتا تھا اور بھی کتنے رسالوں میں۔ اگر میری واقعی کوئی اہمیت تھی تو وہ ابھی بن رہی تھی جس کے بارے میں ابھی تک مجھے یقین نہیں ہے اور میں کسی خوش فہمی کا شکار بھی نہیں ہونا چاہتا۔ ——— لیکن میں اس رسالے میں لکھنے کے لئے تیار نہیں تھا جس کے ایڈیٹر بھی بدل رہے تھے وامق جونپوری کے بعد ظ انصاری آگئے۔ انہوں نے بھی مجھے لکھنے کی دعوت دی۔ میرے گھر پہ بھی لکھنؤ میں آئے تھے۔ میں نے انہیں بھی کچھ نہیں بھیجا۔ پھر اس کے بعد کسی حد تک ہنسراج رہبر وابستہ ہو گئے۔ اُس زمانے میں میں نے ٹینیسی ویلیمز کا ڈی ایچ لارنس کی زندگی پر لکھا ہوا ایک ڈرامہ I RISE IN FLAMES, CRIED PHEONIXS کا اُردو میں 'آتش خود' کے نام سے ترجمہ کیا تھا جو اسی شاہراہ میں چھپا۔ میں سمجھتا ہوں وہ شاہراہ کا آخری دور تھا اور شاہراہ نے ان تبدیلیوں کو قبول کر لیا تھا۔

لنڈا: یہ کس سال کا واقعہ ہے؟

رام لعل: چھٹی دہائی کا۔

لنڈا: یعنی اُس وقت ایسی تبدیلیاں پیدا ہونی شروع ہو گئی تھیں۔

رام لعل: جی ہاں شاہراہ اُن تبدیلیوں کو قبول کر رہا تھا لیکن وہ بھی دم توڑ رہا تھا۔ اُس کے بعد اس کے بس دو ایک شمارے اور نکلے پھر وہ ختم ہو گیا۔ تحریک ۱۹۵۲ اور یا ۱۹۵۳ میں نکلنا شروع ہوا تھا جس کی پالیسی ادبی کم اور سیاسی زیادہ تھی۔ سراسر انٹی کمیونسٹ تھی۔ سوغات ۱۹۵۵ اور یا ۱۹۵۶ میں نکلنا شروع ہوا تھا۔ سوغات کے ذریعے لٹریچر میں ایک نئی تبدیلی لے آنے کی کوشش ملتی تھی کہ ایک نئی تبدیلی آنی چاہیے اور محمود ایاز بہت ہی ذہین ایڈیٹر ہیں۔ وہ شاعر بھی اچھا ہے لیکن اس میں ترقی پسند ادیب بھی لکھتے تھے جیسے محمد حسن کا ایک مضمون اُردو افسانے کے پچیس سال ۱۹۵۹ء میں چھپا۔ اُس میں ڈاکٹر محمد حسن نے مجھے اُس وقت کے نئے اُردو افسانہ نگاروں میں سرفہرست رکھا تھا اور میرے دو افسانوں کا بطور خاص ذکر کیا تھا جیسے ایک شہری پاکستان کا اور اوسی۔ دونوں افسانوں کے بارے میں انہوں نے یہ لکھا کہ مجھ پہ چیخوف اور گورکی کا بہت اثر ہے جبکہ میں نے اُس وقت تک چیخوف اور گورکی کو پڑھا ہی نہیں تھا بلکہ اُس کے بعد ہی ان دونوں کی کتابیں میں نے ڈھونڈ ڈھونڈ کر پڑھیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ سوغات میں اُس زمانے میں ترقی پسند اور غیر ترقی پسند دونوں لکھتے تھے اور افکار اور شاعر اور صبا میں بھی لکھنے والے دونوں طرح کے تھے لیکن صبا میں بھی ایک تبدیلی آ رہی تھی۔ میں آپ کو واقعہ بتاؤں کہ ۱۹۶۵ء میں میں حیدر آباد میں تھا اور سلیمان اریب کے گھر ٹھہرا ہوا تھا جب ایک شام کو انہوں نے سردار جعفری کو بھی اپنے یہاں اِنوائیٹ کیا جو وہاں ایک فلم آسمان محل کی شوٹنگ کے سلسلے میں خواجہ احمد عباس کے ساتھ گئے ہوئے تھے۔ وہاں سلیمان اریب اور سردار جعفری کے درمیان ایک بات پہ جھگڑا ہوا تھا (جب ہم بیٹھے شراب پی رہے تھے) سلیمان اریب کا یہی کہنا تھا کہ آپ نئی تبدیلیوں کو کیوں نہیں قبول کر رہے ہیں کہ زمانہ تیزی سے بدل رہا ہے۔ اندازِ فکر بھی بدل رہا ہے۔

لنڈا: یہ کب کا واقعہ ہے؟

رام لعل: یہ ۱۹۶۵ء کا، دوسری یا تیسری ستمبر کی بات ہوگی وہ۔ میں پہلی ستمبر سے پانچ ستمبر تک وہیں رہا تھا۔ اس بات کا ذکر میں نے اپنے ایک رپورتاژ میں بھی کیا ہے جو میں نے سلیمان اریب کی موت کے بعد رسالہ کتاب میں چھپوایا تھا۔ اُس میں اس گفتگو کا بھی ذکر موجود ہے۔ تو تبدیلیاں اُن رسالوں میں بھی آ رہی تھیں جو ترقی پسند تھے اور صبا اُن میں سے ایک تھا۔

لنڈا: یہ کافی دیر میں ہوا جبکہ جدیدیت ۱۹۶۰ء کے لگ بھگ نظر آتی ہے مگر کیا آپ کو ایسا لگتا ہے کہ یہ تبدیلی ہندوستان میں دہلی میں اور پاکستان میں لاہور میں شروع ہوئی جبکہ لکھنؤ بہت عرصے سے مشہور ہے اُردو کے لئے۔ جدیدیت لکھنؤ کی بجائے دہلی میں کیوں شروع ہوئی؟

رام لعل: لکھنؤ کے بارے میں آپ کی غلط فہمی دُور کر دوں۔ لکھنؤ ہمیشہ سے پُرانے خیالات کا ایک شہر رہا ہے۔ یہ بہت ہی قدامت پسند شہر ہے جس کو اب کئی لوگ مُردہ شہر بھی کہتے ہیں۔ ایک زوال پذیر شہر! یہ اپنی زبان کی وجہ سے تو بہت مشہور رہا ہے۔ زبان کی نوک پلک سنوارنے کے لئے۔ زبان کو خوبصورت بنانے کے لئے لیکن اس زبان نے کوئی زیادہ بڑے شاعر یا بڑے افسانہ نگار نہیں پیدا کئے ———— یہاں باہر سے اکثر لوگ بستے رہے ہیں۔ باہر سے آئے ہوئے لوگوں نے ترقی کی ہے اور نام پیدا کیا ہے اور اس شہر کو بھی ایک شہرت دی ہے لیکن اس شہر کے رہنے والے بہت کم لوگ ایسے ہیں چاہے وہ کلاسیک گریڈ میں آ لیے چاہے وہ اچھی زبان کی وجہ سے مشہور رہے ہیں چاہے اُن کی شاعری میں کوئی بھی نقص نظر نہ آئے لیکن اُن کے یہاں اس نئی فکر کی بڑی کمی محسوس ہوتی ہے جس کی سب سے اچھی اور بڑی مثال یہی دی جا سکتی ہے کہ جب پورا لٹریری سین دنیا میں بدل رہا تھا اُس کے مزاج میں ایک تبدیلی واقع ہو رہی تھی تو لکھنؤ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوا۔ یہ ابھی تک وہیں کھڑا ہے اور اب بھی بدلنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ صرف کچھ لوگ ہیں جو خود کو بدل رہے ہیں وہ اپنے آپ کو تنہا بھی پاتے ہیں کیونکہ اُن کے آس پاس کا معاشرہ انہیں بدلتا ہوا نظر آتا ہے۔ آپ نے دلّی اور پاکستان کی بات چھیڑی ہے۔ پاکستان میں جو تبدیلیاں آئی ہیں وہ آزادی کے فوراً بعد آتی ہوئی محسوس ہونے لگی تھیں۔ شاید اس لئے کہ اُس کا مغرب کے ساتھ زیادہ مضبوط رشتہ استوار ہو گیا۔ خاص طور پر امریکہ کے ساتھ سیاست، تعلیم، تجارت اور سیر و سیاحت کے سلسلے میں۔ وہاں کے لوگ امریکہ اور دوسرے یورپین ممالک میں جاتے رہے۔ ادھر تعلیمی میدان میں بھی ترقی ہوئی۔ دماغوں کی بند کھڑکیاں کھلنے لگیں۔ انہوں نے نئے رویّوں اور نئے رجحانات کو قبول کیا۔ اُن کے تجربات کئے۔ یہ سارے رسالے چھٹی دہائی میں ہی آ لئے ہیں۔ ساتھ رنگ کا اجرا بھی شروع چھٹی دہائی میں کراچی سے ہوا تھا۔ جب لاہور کے ادبی دنیا کا پانچواں دور شروع ہوا اُس میں ڈاکٹر وزیر آغا، مولانا صلاح الدین احمد کے ساتھ شریک مدیر کے طور پر شامل ہو گئے تھے۔ اس میں بھی نئی تبدیلیوں کا احساس ہوتا تھا اگرچہ مولانا ایک قدامت پسند دانشور تھے۔ وزیر آغا ان کے مقابلے میں زیادہ موڈرن تھے۔ وزیر آغا کی وجہ سے ادبی فضا میں تبدیلیاں آئیں۔ پھر جب ادبی دنیا بند ہو گیا تو انہوں نے اپنا رسالہ اوراق نکالا۔ اُس کے ذریعے بھی تبدیلیوں کو فروغ ملا اور اسی کے ساتھ ساتھ ـــ

لنڈا: سویرا؟

رام لعل: سویرا تو بہت پہلے سے نکل رہا تھا۔ آزادی کے وقت سے نکل رہا تھا۔ اُس نے جن تبدیلیوں کا احساس دلایا وہ ایسی جدید نہیں تھیں جیسی کہ آج ہمارے سامنے موجود ہیں۔ سویرا بھی دراصل ایک ترقی پسند میگزین تھا لیکن اُس کی فکر کی سطح باقی ترقی پسند رسالوں سے بلند تھی۔ آپ سویرا کی پُرانی فائلیں اُٹھا کر دیکھ سکتی ہیں۔ اُن میں نہرو کے خیالات کے اقتباسات بھی نظر آ جاتے ہیں۔ وہ لوگ نہرو کو بھی

اُسی ترقی پسند سطح کا ایک بہت بڑا مفکر اور سیاستدان سمجھتے تھے۔ اُسی سویرا میں انتظار حسین نے بہت اچھی کہانیاں لکھیں۔ واجدہ تبسم نے اُسی دور میں اچھی کہانیاں لکھی تھیں۔ اشفاق احمد اور احمد ندیم قاسمی نے بھی اعلیٰ درجے کی کہانیاں چھپوائی تھیں۔ میری بھی دو ایک کہانیاں شائع ہوئیں (میرا وار اور آخری تماشائی) اور بھی کئی ادیبوں کی۔ سویرا فکری اعتبار سے ایک ترقی پسند رسالہ تو تھا لیکن بہت اچھا رسالہ تھا۔ اُسے آپ پوری طرح سے جدید تو نہیں کہہ سکتے لیکن جدیدیت کی بنیاد ڈالنے والوں میں ضرور شامل کر سکتے ہیں۔

لنڈا:۔ جب محمد سلیم الرحمٰن مدیر مقرر ہوئے وہ حنیف رامے کے وقت بھی جدید تھے۔

رام لعل:۔ ہاں حنیف رامے کے ساتھ محمد سلیم الرحمٰن بھی شامل ہو گئے تھے لیکن وہ حنیف رامے سے زیادہ جدید تھے۔ حنیف رامے ایک اچھے آرٹسٹ تھے، نئے خیالات اور نئی فکر کے مالک تھے اور وہ سیاستدان بھی تھے۔ بعد میں وہ پنجاب کے چیف منسٹر بھی بن گئے۔

لنڈا:۔ محمد سلیم الرحمٰن کا کیا CONTRIBUTION رہا؟

رام لعل:۔ محمد سلیم الرحمٰن ایک نیا شاعر تھا اور اُس نے رسالے کے ذریعے نئے لکھنے والوں پر ایک اثر یقیناً ڈالا ہے۔ اب مجھے نہیں معلوم کہ سویرا کا موجودہ ایڈیٹر کون ہے۔

لنڈا:۔ صلاح الدین محمود۔

رام لعل:۔ اچھا۔ اب میں چھٹی دہائی کے کچھ اور رسالوں کا ذرا اور تفصیل سے ذکر کروں۔ سنہ چھیاسٹھ میں شب خون نکلنا شروع ہوا۔ اور یہ نئی تبدیلیاں اُسی زمانے سے ہی نیز تر ہو گئی تھیں۔

لنڈا:۔ اور اُسی زمانے میں (۱۹۶۵ء میں) اوراق بھی نکلنا شروع ہوا تھا اور سیپ بھی۔

رام لعل:۔ جی ہاں۔ سیپ بھی شروع ہوا۔ اوراق بھی۔ فنون بھی۔ اور بیا دور

لنڈا:۔ نہیں فنون ۱۹۶۳ء میں نکلا تھا۔

رام لعل:۔ جی ہاں ۱۹۶۳ء میں ہی نکلا ہوگا۔ ٹھیک یاد نہیں۔ میرے پاس اس کی فائلیں موجود ہیں۔ جب سنہ چھیاسٹھ میں شب خون نکلا تو مجھے شمس الرحمٰن فاروقی سے متعارف کرانے والے احتشام حسین صاحب ہی تھے جو ایک معروف ترقی پسند نقاد تھے۔ تعارف کراتے وقت انہوں نے کہا تھا وہ ایک بہت اچھا رسالہ نکالنے جا رہے ہیں۔ اس رسالے کے ایڈیٹوریل بورڈ پر سید احتشام حسین اور ڈاکٹر اعجاز حسین کے بھی نام تھے۔ بعد میں وہ لوگ رسالے سے الگ ہو گئے جب انہوں نے دیکھا کہ یہ رسالہ تو بالکل جدید بن رہا ہے اور ترقی پسندوں پہ حملے بھی کرنے لگا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ جو سارے رسالے اور رجحانات ہمارے سامنے آتے ہیں اور ہماری نئی فکر کو پیش کرنے میں معاون بنتے رہے ہیں، ہمارے کرب اور ہماری جینوئن تنہائی کو پیش کرتے ہیں وہاں تک تو ٹھیک ہے لیکن جب یہی نئی فکر ترقی پسند عقائد پر بھی حملہ آور ہوتی ہے وہ بات مجھے بہت ہی BIASED معلوم ہوتی ہے اور سیاسی معلوم ہوتی ہے جس طرح ایک ترقی پسند ادیب ایک سیاسی رجحان رکھتا ہے تو ترقی پسند عقائد پر حملہ کرنے والا موڈرن رائٹر بھی تو سیاسی ذہن رکھتا ہے۔ اس کا مطلب تو یہی ہوا ناکہ سیاست سے سیاست ہی ٹکرا رہی ہے۔ اس معاملے میں میری لڑائی دونوں سے رہی ہے ترقی پسندوں سے بھی رہی ہے کہ آپ ادب کو سیاسی سطح پر کیوں پرکھتے ہیں اور موڈرن رائٹرس سے بھی جھگڑا ہوتا ہے کہ آپ بھی سیاسی سطح پر کیوں کھڑے ہوتے ہیں؟ آپ اس طرح سے کیوں دیکھتے ہیں کہ کسی تخلیق میں پروگریسیوازم ہے یا اس میں پروگریسیوازم کے جراثیم کیوں پائے

جاتے ہیں؟ آپ یہ دیکھئے کہ اُس میں ادب کے جراثیم کتنے ہیں اور بعض لوگوں نے میرے اس استدلال کو، اس منطق کو تسلیم بھی کیا۔ ہمارے شمس الرحمٰن فاروقی بہت اچھے مضامین لکھتے ہیں۔ بہت اچھے حوالے دیتے ہیں، بہت اچھی دلیلیں دیتے ہیں۔ ادب کو بالکل نئے زاویے سے دیکھتے ہیں لیکن جہاں اسی مضمون میں کمیونسٹوں پر حملہ کرتے ہیں یا ترقی پسندوں پر وہاں اُن کی بات مجھے BIASED معلوم ہونے لگتی ہے۔ مضمون کا سارا اثر زائل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح جیسے وارث علوی ہیں۔ وہ بڑی اچھی زبان استعمال کرتے ہیں جو بہت ہی تیز اور تند بھی ہوتی ہے جس کی کوئی کاٹ نہیں نظر آتی لیکن وہ بھی جب اُسی مضمون میں ترقی پسندوں پر حملہ آور ہو جاتے ہیں تو وہ مضمون بھی مجھے سیاسی نظر آنے لگتا ہے۔

لنڈا:۔ ترقی پسندی کے ردِّعمل کے علاوہ جدیدیت کی اور کون سی خصوصیات ہیں؟

رام لعل:۔ ہاں اگر یہی ردِّعمل نہ ہو اور آپ سنہ ستّر اور پچھتّر تک کے پُرانے اور نئے لکھنے والوں کا تجزیہ کریں تو میں سمجھتا ہوں کہ وہ زندگی کے یا انسان کے کرب کو، اُن کی محرومیوں کو، اُن کی تکلیفوں کو، اُن کی جدید فکر کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے۔ اُن کے رویّے عام آدمی کے رویّے جو جدید ہیں، وہ بھی۔ ہم اس ٹیبل پر بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں۔ اسی ٹیبل پر ہم یہ گفتگو ریکارڈ کر رہے ہیں۔ ہم شام کو ٹی وی دیکھتے ہیں، سائنس کے کئی میگزین پڑھتے ہیں، اسکائی لیب پر بحث کرتے ہیں۔ یہ ساری چیزیں ہیں لیکن پنکھے کے بارے میں کہ یہ پنکھا کیسے چلتا ہے یا ٹرانزسٹر کیسے بجتا ہے، اُن کے پیچھے کون سی سائنس ہے اُس سے اُن کا مطلب ہی نہیں ہوتا۔ ان سارے لوگوں کے بارے میں وہ جو ایک رویّہ پیش کرتے ہیں۔ ہمارے افسانے، ہماری کہانیاں، اُن لوگوں کو، جو سائنس سے دُور ہیں لیکن ہیں وہ اور اُنکی اہمیت ہے۔ جو لوگ سائنس کا علم رکھتے ہیں وہ بھی ہیں اور وہ بھی اہمیت رکھتے ہیں۔ اُن کے بارے میں جدید رویّوں کی جتنی کہانیاں، نظمیں، ڈرامے یا ناول ہیں، میں سمجھتا ہوں اُن میں کئی جینوئن تخلیقات ہیں لیکن اُس کے بعد ——

لنڈا:۔ ایسی کونسی جینوئن تخلیقات ہیں یا ایسے افسانہ نگار؟

رام لعل:۔ جیسے انتظار حسین اور انور سجاد۔ یہ پاکستان کے راسرس ہیں۔ اُن کی تخلیقات کے نام بتانا اس وقت مشکل ہوگا۔ پاکستان کے اور بھی کئی ادیب ہیں منٹو، ممتاز مفتی، آغا بابر، ممتاز شیریں، احمد ندیم قاسمی، مسعود مفتی، فرخندہ لودھی، ذکاالرحمٰن، سائرہ ہاشمی، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، غلام عباس، رشید امجد، آغا سہیل، ضمیرالدین احمد، غلام الثقلین نقوی، رحمان مذنب، الطاف فاطمہ، جمیلہ ہاشمی، رضیہ فصیح احمد —— کتنے سارے اور بھی نام ہیں۔ احمد داؤد، رخسانہ صولت بھی۔ یہ نام تو مجھے فوراً یاد آگئے اور آپ چاہیں تو میری قوتِ یادداشت کی داد بھی دے سکتی ہیں (ہنسی) میں پاکستانی رسالے اُٹھا کر دیکھوں تو کئی اور اہم نام بھی بتا سکتا ہوں۔ نجم الحسن رضوی اور ——

لنڈا:۔ خالدہ اصغر؟

رام لعل:۔ ہاں خالدہ اصغر بھی تو لیکن خالدہ اصغر پہ ایک اور طریقے سے بحث کرنی ہوگی اور اُن کے طرزِ فکر کے ساتھیوں پر بھی۔ اس بحث کو ذرا دیر کے لیے الگ ہی رکھ دیا جائے۔

لنڈا:۔ اور یہاں؟

رام لعل:۔ یہاں پر —— راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، عصمت چغتائی، خواجہ احمد عباس، اختر اورینوی، رضیہ سجاد ظہیر، شکیلہ اختر، سہیل عظیم آبادی، قرۃ العین حیدر ہیں، ستیش بترا، جوگندر پال، سریندر پرکاش، ہرچرن چاولہ، احمد یوسف، ظفر اوگانوی، جیلانی بانو،

اقبال متین، غیاث احمد گدی، قمر حسن، رتن سنگھ، کلام حیدری، انور قمر، انور خان، سلام بن رزاق، حمید سہروردی کئی ہیں۔ رضوان احمد بلراج مین را اور انور امام اور الیاس احمد گدی بھی اور ــــ حسین الحق، شوکت حیات اور ــــ

لنڈا:۔ کیا یہ سب جدید افسانہ نگار ہیں!

رام لعل:۔ نہیں، میں جدیدیت کے اُن معنوں میں ابھی بات نہیں کر رہا ہوں جو آپ کے ذہن میں ہے۔ میں بات کر رہا ہوں اُن کے بارے میں جو کسی بھی ازم سے ہٹ کر افسانے لکھتے رہے ہیں لیکن ان میں سے بعض کے سیاسی نظریات بھی تھے۔ قرۃ العین حیدر نے کبھی کسی ازم سے یا جدیدیت سے یا ترقی پسندی سے خود کو وابستہ نہیں کیا۔ میرا خیال ہے انتظار حسین نے بھی خود کو کسی ازم سے وابستہ نہیں کیا۔ بھلے ہی کچھ CONTROVERTIAL مضامین لکھے ہوں لیکن اُن کی افسانہ نگاری تمام تر تجربوں پر مبنی رہی ہے۔ ایسا ہر جینوئن افسانہ نگار کو کرنا چاہیے قرۃ العین حیدر نے بھی ایک جینوئن افسانہ نگار کے طور پر تجربے کئے ہیں۔

لنڈا:۔ جدیدیت میں آپ کن لوگوں کو شامل کرتے ہیں؟

رام لعل:۔ اب جدیدیت تو ایک رجحان ہے۔ جدیدیت کوئی سیاسی گروہ تو ہے نہیں۔ اگر ہے تو اُسے نہیں ہونا چاہیے۔ ادب کی حفاظت کے لیے بہت سے لوگ تجربے کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔

لنڈا:۔ یہ کوئی تحریک ہے کیا؟

رام لعل:۔ نہیں یہ تحریک نہیں ہے محض ایک رجحان ہے۔ اس TREND کو بہت سے لوگوں نے تخلیقی تجربے کے طور پہ قبول کر لیا ہے۔ جیسے جوگندر پال بہت پرانے لکھنے والے ہیں۔ اُن کے بہت سے افسانے نئے رجحانات کے حامل ہیں جن میں کئی افسانے بہت خراب بھی ہیں اُن میں بوریت کی حد تک دُہرانے کا عمل ملتا ہے اور انہوں نے محض بھیڑ چال میں لکھے ہیں۔ ہرچرن چاؤلہ بھی روایت پرستی سے نکل کر نئے تجربے کر رہا ہے جو توجہ کے قابل ہیں۔ بلراج مین را نے اپنا سفر ۱۹۶۰ء سے پہلے شروع کیا تھا۔ سریندر پرکاش اور رتن سنگھ ۱۹۵۲ء سے لکھ رہے ہیں۔ انہوں نے رفتہ رفتہ ہی خود کو نئی طرز پہ FORMULATE کیا یعنی اپنے آپ کو بدلا لیکن خود کو فارمولیٹ کر لینا بھی اچھی بات نہیں ہے۔ اُس کے بعد وہ پھر بدلے پہلے ایک فکر کو بنیاد بنایا پھر اُس کے بعد نئی فکر کو اپنایا۔ یہ ایک تخلیقی پروسس ہے جو ایک رائٹر کا ہونا چاہیے اور یہ بالکل جینوئن رویہ ہوگا۔ اس میں پُرانے یا نئے کی کوئی قید نہیں ہو سکتی۔ لکھنے والا ہمیشہ خود کو بدلتا رہتا ہے نئی شکل دیتا رہتا ہے۔

لنڈا:۔ اس نئے رجحان کی خصوصیات کونسی ہیں؟

رام لعل:۔ نئے رجحان کے بارے میں اپنے نقطۂ نظر سے بات کروں تو کہوں گا کہ زندگی کے بارے میں اگر آپ کا رویہ بہت ہی متوازن اور عصری حسیت کا حامل اور دُور درشی (FORESIGHTED) ہے وہ تو ایک رویہ ہو سکتا ہے لیکن اگر آپ یہ کہیں کہ ہر طرف اندھیرا ہے ہر طرف بے حد فرسٹریشن ہے۔ کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ میں سمجھتا ہوں یہ ایک فیشن کا رویہ تو ہو سکتا ہے، گمراہ کن رویہ تو ہو سکتا ہے۔ اپنی عارضی اور فوری شناخت پانے کا بھی رویہ ہو سکتا ہے کہ میں کوئی بات کہوں اور فوراً مشہور ہو جاؤں لیکن یہ کوئی دیرپا رویہ نہیں ہے جو کسی کو دیر تک زندہ رکھ سکے کیونکہ اگر کوئی کنفیوژن ہے تو دُنیا میں ہے ہمارے آس پاس ہے۔ میں تو ادیب ہوں اگر میں اپنے آپ کو انٹلکچول کہتا ہوں تو اس کنفیوژن کو سمجھنے کے لئے بھی میرے اندر صلاحیت ہونی چاہیے، اُس دُھند کے پار دیکھنے کے لئے بھی

میرے پاس ایک تیز نظر ہونی چاہیے تاکہ میں کہانی، نظم یا ڈرامہ لکھ کر اپنے قاری پر واضح کر سکوں کہ یہ دھند کیسی ہے؟ اور کیوں ہے اور اس کے پار ہم کیوں نہیں دیکھ پاتے؟ یہ گہرا گرد و غبار کس نے پھیلا دیا ہے؟ یہ فردی کہاں سے آگئی ہے؟ اس تنہائی کا جنم داتا کون ہے؟ ہمارے اندر اس کا شدید احساس کس نے پیدا کر دیا ہے؟ ایک انٹلکچول ان سب کا تجزیہ تو کر سکے، اپنی تخلیقات کے ذریعے جو ادیب خود کو جدید کہتا ہے وہ اپنے طرزِ تحریر کو بھی اگر کنفیوزڈ (CONFUSED) بنا دیتا ہے جس کو کوئی سمجھ نہیں سکتا ہے تو اس کا ابلاغ کیونکر ہو گا؟ قاری تک وہ بات کیسے پہنچ سکے گی؟

لنڈا:۔ آپ کے خیال میں جدیدیت کی یہ خصوصیت زیادہ تر موضوع کے اعتبار سے ہوئی نا؟ اکثر لوگ اسلوب پر زور دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جدیدیت والے افسانے علامتی اور تجریدی افسانے ہیں۔ تجریدیت بھی جدیدیت کی خصوصیت ہے یا نہیں؟

رام لعل:۔ دیکھیے تجریدی، علامتی، ڈرامائی یا کسی بھی شکل کا افسانہ —— افسانے کے فن کی ایک فارم ہے۔ آپ فارم کے ایک ہزار ایک تجربے کر سکتے ہیں۔ افسانے پر کوئی قید نہیں لگائی جا سکتی کہ آپ اُسے کون سے تجربے کے تحت لکھیں گے۔ اب جیسے کسی اخبار میں چھپی ہوئی ایک چھوٹی سی خبر ہے یہ بھی تو اپنی جگہ ایک کہانی ہے۔ یہ کہانی کہاں تک مؤثر ہو سکتی ہے اور اُس کی کیا کوئی فکری بنیاد بھی بنتی ہے یہ بات سوچنے کی ہے۔ اسی طرح قتل، ریپ یا فوجداری کی بھی کوئی خبر ہو سکتی ہے لیکن وہ کہانی کب بن پائے گی جب اُس کو ایک سچے ادیب کا قلم لکھے گا۔ اسی طرح دو آدمیوں کے درمیان ایک مکالمہ ہوتا ہے وہ بھی کہانی کا ایک فارم ہے۔ جس میں ادیب نہیں بولتا ہے صرف دو آدمی بولتے ہیں۔ وہ بھی اپنی جگہ ایک کہانی ہے۔ ایک کہانی ایسی ہے جسے افسانہ نگار بیان کرتا چلا جاتا ہے جس میں کوئی مکالمہ ہی نہیں ہے؟ جس میں کوئی بھی کردار نہیں بولتا وہ بھی ایک کہانی ہے۔ کہانی کی شکلیں تو بے شمار ہیں۔ یہ سارے اس کے فارم ہیں۔ اب آپ یہ کہیں کہ صرف تجریدی کہانی جدید ہے ——

لنڈا:۔ تجریدی کہانی کیا ہے!

رام لعل:۔ جس کو آپ ایبسٹریکٹ (ABSTRCT) کہانی کہتی ہیں۔

لنڈا:۔ ہاں مگر تجرید کیا ہوتی ہے؟

رام لعل:۔ اب میری سمجھ میں تو اس سے زیادہ نہیں آتا کہ جو گوناگوں رنگ یا واقعات یا جملے متاثر کر سکتے ہوں۔ کوشش میں نے بھی کی۔ میں نے بھی کچھ تجربے کیے تھے۔ جیسا میرا ایک افسانہ تھا "یہ میرا گھر ہے" جو "نقوش" دہلی میں چھپا تھا اور ایک دو افسانے اور بھی ہیں۔ میرا ایک مجموعہ ہے۔ "چراغوں کا سفر" اُس کے آخری حصے میں وہ موجود ہیں۔ اس مجموعے کے سولہ افسانوں کو میں نے آٹھ اور آٹھ دو حصوں میں پیش کیا تھا۔ دوسرے حصے میں کچھ تجریدی افسانے ہیں لیکن میں ان سے مطمئن نہیں ہوا۔ اس لیے کہ وہ جو رائٹر کی ایک ذہنی کیفیت ہوتی ہے اُس میں مَیں خود کو زیادہ دیر تک رکھنے کے لیے تیار نہیں ہو سکا۔

لنڈا:۔ وہ افسانے کس حد تک تجریدی ہیں اور ان میں کون سی خصوصیت ہے جو انہیں تجریدی بناتی ہے؟

رام لعل:۔ جیسے میں نے ایک مصوّر کی نگاہ سے زندگی کو دیکھا۔ رنگ آتے ہیں، بکھرتے ہیں ٹوٹتے ہیں۔ زندگی واقعی بہت بکھری ہوئی ہے۔ میں نے اس انداز سے اسے دیکھنے کی کوشش کی لیکن میں نے محسوس کر لیا یہ میرا حقیقی میدان نہیں ہے اور یہ میرا اصلی اظہار بھی نہیں ہے یہ میرا اسلوب نہیں بن سکتا۔ اور چونکہ جدیدیت فارم میں نہیں ہے بلکہ رویّے میں ہوتی ہے اس لیے میں نے اس سے اپنے آپ کو الگ کر لیا کیونکہ میں اس سے

بہتر طریقے سے دوسرے فارم میں تجربے کر سکتا تھا اور وہ میں نے کئے بھی۔ جیسے میرا ایک افسانہ 'ہیڈلیس ٹیڈ ھا' ہے۔ اس میں بھی میں نے پینٹنگ کا سہارا لیا ہے۔ وہ باقی افسانوں سے بالکل ہٹا ہوا ہے یا میں نے وہ افسانہ 'آخری تماشائی' لکھا۔ وہ بھی ایک پینٹر کی زندگی کے بارے میں ہے۔ اس کی پینٹنگز کی نمائش کے موقعہ پر میں نے لوگوں کے تاثرات جمع کرائے تھے جو لوگ آتے ہیں وہ ایک کتاب میں اپنے تاثرات لکھ لکھ کر چلے جاتے ہیں۔ انہی تاثرات پر میں نے وہ افسانہ لکھا تھا یا میرا ایک اور افسانہ 'چاپ' ہے اور 'بھیڑ اور بھیڑئیے' اور 'اکھڑے ہوئے لوگ' بھی ہے۔ تو میں سمجھتا ہوں فکر کی جو ایک سطح ہوتی ہے وہاں پہنچ کر آپ ایک موڈرن رویّہ دیتے ہیں۔ وہ آپ کو جدید بنا سکتا ہے۔

لنڈا :۔ میں 'چاپ' کا ذکر کرنے ہی والی تھی، جب میں نے چاپ پڑھا تو مجھے ایڈگرایلن پو کی یاد آئی حالانکہ اس کی سچوایشن الٹ ہے جیسے اس آدمی کو انہوں نے مارا تو ان کے دل کی آواز نیچے سے آتی ہے۔ چاپ میں وہ خود نیچے ہے جو اُوپر کی آوازوں کو سُن رہا ہے۔ کیا آپ ایڈگرایلن پو کے افسانے سے متاثر ہوئے تھے؟

رام لعل :۔ جی نہیں، میں نے اُس کا اس طرح کا کوئی افسانہ نہیں پڑھا بلکہ مجھ پہ اس افسانے کے سلسلے میں ایک اور الزام لگا تھا۔ یہ 'بحث شب خون' میں چھپی تھی مجھے اُس رائٹر کا نام بھی نہیں معلوم تھا نہ ہی اُس کا افسانہ پڑھا تھا۔ کیول سوری نے لکھا تھا کہ یہ افسانہ اُس افسانے سے متاثر ہو کر لکھا گیا ہے لیکن میں نے کسی کے افسانے سے متاثر ہو کر اسے نہیں لکھا تھا بلکہ ہوا یہ کہ چھٹی دہائی میں ہی پاکستان کے پریذیڈنٹ جنرل ایوب خاں نے اعلان کیا تھا کہ جو ہندوستانی رفیوجی پاکستان میں اپنا روپیہ یا سونا کہیں دفنا کر چھوڑ گئے ہوں وہ ہماری پولیس کی مدد سے آکر نکال کر لے جا سکتے ہیں۔ میری بیوی کے ماما جی کے بارے میں معلوم ہوا تھا کہ وہ اپنا بہت سا سونا اپنے گھر میں کسی جگہ گاڑ کر آگئے تھے لیکن انہیں یقین تھا کہ ان کے مکان کے ہر کمرے میں ہل چلا دیا گیا ہوگا۔ یہی خبر میرے دماغ میں ایک مدت تک گردش کرتی رہی تھی۔ اس کے علاوہ انسان کے سامنے روپیہ، سونا اور عورت صدیوں سے ایک بنیادی کشش بنی رہی ہیں۔ اُن کو حاصل کرنے کے لئے وہ ہمیشہ کوشش کرتا رہا ہے۔ اُن کے بارے میں خواب بھی دیکھتا رہا ہے۔ یہ کہانی اُسی خواب کے بارے میں ہے کہ اُسے اتنا روپیہ مل جائے۔ جب دکاس کو گاڑی کے اندر، جب وہ اپنی بیوی سے ملنے کے لئے جا رہا تھا جو بے حد خوبصورت تھی اپنا ہی ایک ہم شکل اور ہم نام ملتا ہے اور اُسے یہ بتاتا ہے کہ جس گھر میں وہ رہتا ہے اُس کے ایک کمرے میں ایک بیش بہا خزانہ دبا پڑا ہے تو وہ اپنی خوبصورت بیوی کی کشش بھول کر گھر لوٹ جاتا ہے۔ یہ کہانی علامتی تھی کیونکہ اُس کا ہم شکل اور ہم نام جو دراصل اُس کا ہمزاد تھا غائب ہو جاتا ہے اور اُس کے دل میں خزانے سے متعلق ایک وہم سا بیٹھ گیا۔ یہ اُس کے اپنے دل کی آواز تھی کہ اُس کے گھر میں خزانہ مدفون ہے جس نے اُس کے ذہن سے بیوی کا خیال نکال دیا اور روپیہ حاصل کرنے کی کشش تیز تر کر دی۔ وہ گھر لوٹ کر چوری چوری اپنا فرش کھودتا ہے اور اُس کے اندر بالکل چھپ سا جاتا ہے۔ جب وہ خزانہ حاصل کر لیتا ہے تو وہ اس قدر لاغر اور کمزور ہو چکا ہوتا ہے کہ وہ اُٹھ کر کھڑا بھی نہیں ہو سکتا۔ اس کی بیوی اس سے خزانے کا گھڑا لے لیتی ہے اُسے اپنے آدمی سے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ اُس پر بھی دولت کی لالچ حاوی ہو گئی۔ اُس کے اُوپر مٹی گرانے لگتی ہے اور پھر اُس کے اُوپر فرش پکا کر دیا جاتا ہے اور پھر وہ اپنے اُوپر اپنی بیوی کو کسی اور آدمی کے ساتھ چلتا ہوا محسوس کرتا رہتا ہے۔ جس دن اُسے یہ احساس ہو گیا کہ یہ میں ہوں جو پھر پیدا ہو گیا ہے اور وہ اس کی بیوی کے ساتھ چل رہا ہے اُس کا بے چین احساس مر جاتا ہے۔

لنڈا :۔ وہ کون سے سال میں لکھی گئی تھی؟

رام لعل :۔ وہ بھی چھٹی دہائی کی تھی۔ اب میں ٹھیک ٹھیک سال تو نہیں بتا سکوں گا مجھے ڈائری دیکھنا پڑے گی۔

لنڈا: تو آپ اُسی زمانے میں جدید قسم کے افسانے لکھ رہے تھے؟ یعنی جب جدید علامتی دور آیا تھا۔

رام لعل: بات یہ ہے کہ میں نئے رجحانات کے افسانے ضرور لکھ رہا تھا۔ میرے اندر ایک تبدیلی بھی آ رہی تھی اور میں اُسے قبول کر رہا تھا۔ تبدیلی کو میں نے ہمیشہ قبول کیا ہے اگر آپ میری ۱۹۴۴ء کی لکھی ہوئی کہانیاں دیکھیں تو ان کہانیوں میں اور موجودہ کہانیوں میں بھی فارم کی ایک مماثلت نظر آئے گی اور یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ کوئی ایک طریقے سے سوچے اور اُس کے بارے میں یہ کہا جائے کہ وہ تو روٹ پسند ہے۔ تجربے ۱۹۴۲ء میں بھی کئے گئے۔ ۱۹۲۵ء میں بھی اور بعد میں بھی اور اُس سے پہلے بھی کئی لوگوں نے ضرور کئے ہوں گے۔ میں اپنے بارے میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ تبدیلی کو میں نے ہمیشہ پسند کیا۔ تبدیلی جو میرے اندر اندر خود پیدا ہوئی۔ میری کہانیوں نے پیدا کی۔ میں کہانی کو اپنے طریقے سے زبردستی لکھنا چاہوں تو آگے نہیں چل سکتی ہے۔ یہ راستہ خود دکھاتی ہے کہ مجھے اس طرح سے لکھو۔ مجھے اس فارم میں لکھو مجھے اس کردار کی زبان سے لکھواؤ یا اپنی زبان سے کہلواؤ۔ ہر کہانی کا اپنا مطالبہ ہوتا ہے۔ میں اسی حساب سے کہانی لکھتا رہا ہوں۔ میرے اندر جو تبدیلیاں آئی ہیں وہ چھٹی دہائی میں بھی یقیناً آئیں لیکن اس سے پہلے بھی آتی رہی ہیں لیکن ان کا تجزیہ کرنے والا کون ہے؟ میں خود کروں تو کروں۔ کون کتنا کچھ پڑھتا ہے۔ آج کتنے آدمی ہیں جو پچھلا پلٹ پلٹ کر پڑھتے ہیں؟

لنڈا: "تماشا" میں بھی جدیدیت نظر آتی ہے:

رام لعل: "تماشا" بھی چھٹی دہائی میں لکھی گئی تھی۔ ۱۹۶۲ء یا ۱۹۶۳ء میں جو نقوش میں چھپی تھی۔ جب یہ کہانی میں نے یہاں ایک میٹنگ میں سُنائی جس کی صدارت سید احتشام حسین کر رہے تھے تو سب لوگ پوچھنے لگے کہ وہ آدمی کون تھا؟ اُس کا نام کیا تھا؟ وہ ایسا کیوں کرتا تھا؟ لیکن وہ کہانی اُس آدمی کے بارے میں تھی نہیں۔ یہ بات احتشام صاحب نے بھی کہی۔ بھئی یہ کہانی اُس آدمی کے بارے میں نہیں ہے —————— بلکہ یہ کہانی لوگوں کے بارے میں ہے جو ہیرو ورشپ کا شکار ہو جاتے ہیں۔ کوئی بہت اچھا یا بڑا کام کرتا ہے تو وہ اُسے اپنا ہیرو مان لیتے ہیں۔

لنڈا: نہ صرف ہیرو ورشپ کرتے ہیں بلکہ وہ اپنے تماشے کے لئے اُسے ایکسپلائٹ بھی کرتے ہیں۔ اپنی انٹرٹینمنٹ کے لئے۔

رام لعل: ہاں۔ اُس میں ایکسپلائٹرز آ جاتے ہیں۔ تماشا دیکھنے والے ٹورسٹ جو دوربینیں لگا کر دیکھتے ہیں اور اُسی جائے وقوعہ پر کوکا کولا بیچنے والے بھی پہنچ جاتے ہیں اور شرطیں لگانے والے بھی آ جاتے ہیں۔ ظاہر ہے اُس میں پبلک کی تفریح تو ہوتی ہی ہے۔ شاید میں نے اُسی کہانی میں اشارہ بھی کیا ہے کہ یہ وہ منظر تھا جو صدیوں پہلے روم کے ایرینا میں ہوتا تھا جب آدمی اور شیروں کو لڑایا جاتا تھا۔ اور لوگ دیکھتے تھے اور خوش ہوتے تھے اور واہ واہ کرتے تھے۔

لنڈا: اُس افسانے کا پس منظر کیا تھا؟

رام لعل: یہ میرا آنکھوں دیکھا واقعہ نہیں تھا۔ ریلوے کے ایک ریسٹ ہاؤس میں میرے ایک ساتھی نے جب یہ واقعہ سنایا تو میں نے فوراً محسوس کر لیا کہ اُس میں ایک اچھی کہانی کی POTENTIALITY ہے۔ جب میں نے کہانی لکھ لی اور اُس آدمی کو بتایا تو وہ بہت خوش ہوا۔

(زور سے ہنسی)

لنڈا: تو آپ کو ریلوے میں کام کرنے کی وجہ سے بہت سی کہانیوں کے پلاٹ ملے ہیں؟

رام لعل: لنڈا، ہمارے ملک میں ریلوے کا ایک بہت بڑا جال بچھا ہوا ہے۔ ہندوستان بھی بہت بڑا ملک ہے۔ مجھے ریلوے میں ملازم ہونے کی وجہ سے بہت فائدہ بھی پہنچا ہے کہ میں دُور دُور تک گھوم آیا۔ گاؤں میں، قصبوں میں، بڑے شہروں میں، چھوٹے شہروں میں اور گاڑی کے سفر میں مجھے بے شمار

لوگ ملے، کئی طرح کے لوگ ملے۔ مجھے کئی کہانیاں ملیں۔ ویسے تو ہر آدمی ایک کہانی ہے۔ جب آدمی سفر میں ہوتا ہے تو باتیں بھی کرتا ہے۔ کچھ نئے نئے چہرے بھی دیکھتا ہے۔ عجیب عجیب چہرے اور عجیب عجیب رویے بھی سامنے آتے ہیں۔ وہ سب ذہن پر نقش تو ہو ہی جاتے ہیں۔ کوئی کہانی فوراً بن جاتی ہے کوئی دس سال کے بعد جا کر بنتی ہے اور کوئی بیس سال کے بعد بھی۔ ہاں ریلوے نے ہی مجھے یہ موقعے دیئے کہ میں خوب گھومتا رہا ہوں۔

انٹرو: جب ۱۹۶۰ء کے لگ بھگ جدیدیت شروع ہوئی اُس وقت آپ کیا اسی شہر میں تھے؟

رام لعل: ہاں! میں لکھنؤ میں تھا۔

انٹرو: لکھنؤ میں! آپ لکھنؤ میں کب آئے؟

رام لعل: میں یہاں ۱۹۵۱ء سے ہوں اور چھٹی دہائی میں جب یہ تبدیلی آئی جدیدیت کی، تو میں نے یہاں جدیدیت پر ایک سیمینار کرایا۔ پھر جدید فکشن پر ایک اور سیمینار کرایا۔ شمس الرحمن فاروقی، گوپی چند نارنگ، محمود ہاشمی، خلیل الرحمن اعظمی، شہریار، بلراج کومل، فضل جعفری، جتنے بھی جدید ادیب ہیں وہ سب آئے۔ قاضی عبدالستار بھی آئے تھے۔ علی عباس حسینی اور ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی بھی۔

انٹرو: وہ کس سال میں آئے؟

رام لعل: وہ چھٹی دہائی میں ہی آئے تھے۔ اُن سیمیناروں کے رپورتاژ 'شب خون' اور 'اوراق' میں چھپے ہوئے ہیں۔ اُن سے آپ کو صحیح تاریخیں بھی معلوم ہو سکتی ہیں اور اُن میں بعض پُرانے خیالات کے لوگ بھی تھے جیسے قاضی عبدالستار اور عابد سہیل۔ وہ دونوں پُرانے خیالات کے ہی ہیں۔ اُن کے ساتھ خیالات کا ٹکراؤ بھی ہوا تھا اور حیات اللہ انصاری بھی شریک تھے۔ وہ بھی پُرانے لکھنے والے ہیں لیکن چونکہ وہ اینٹی پروگریسو ہیں اس لئے انہوں نے ترقی پسندوں پر حملے کئے۔ اُن کے خیالات شمس الرحمٰن فاروقی وغیرہ کو اچھے لگتے تھے لیکن میں نے اُس کی مخالفت کی کہ آخر وہ ہیں تو پُرانے۔ اگر وہ ترقی پسندوں پر حملہ کرتے ہیں تو محض اسی وجہ سے اچھے تھوڑے ہی ہو جاتے ہیں۔ اچھا ہونے کے لئے ضروری ہے کہ آدمی اچھا ادیب ہو۔ یہ ضروری نہیں کہ کوئی چونکہ اینٹی کمیونسٹ ہے اس لئے اچھا ہے اور اس طرح سے کوئی اینٹی کمیونسٹ آدمی گھٹیا رائٹر بھی ہے تو ہم اُسے اچھا کیسے کہہ سکتے ہیں؟ اس کا بھی کوئی معیار ہونا چاہیے نا! بہر حال وہ سیمینار بہت کامیاب تھے اور انہیں سے ہندوستان میں جدیدیت کا رجحان عام ہوا۔ علی گڑھ یونیورسٹی نے اس قسم کے سیمینار بعد میں کئے لیکن یہ سیمینار خود لکھنؤ میں کوئی تبدیلی نہیں لا سکے۔ چند ذہین لڑکے اب سامنے آ رہے ہیں، لیکن فاروقی صاحب بھی یہاں چند سال رہ کر واپس چلے گئے۔ انہوں نے بھی یہی کہا کہ یہاں بڑا سناٹا ہے اور میں تو ہمیشہ ہی تنہائی محسوس کرتا رہا ہوں اور یوں بھی عام طور پر سفر پر رہتا ہوں اس لئے لوگوں سے بہت کم ملتا ہوں لیکن میں بھی اپنے آپ کو تنہا ہی محسوس کرتا ہوں۔ ایک بات اور بھی ہے کہ ادیب ہمیشہ تنہا ہی ہوتا ہے۔ وہ کسی گروہ کا آدمی ہوتا نہیں ہے۔ فرض کیجیے پچیس آدمی ہم خیال ہوں بھی تو وہ چوبیس گھنٹے ایک دوسرے کے ساتھ نہیں رہ سکتے۔ چوبیس گھنٹے تو میاں بیوی بھی ایک دوسرے کے ساتھ نہیں رہ سکتے" تو آدمی بنیادی طور پر تو تنہائی پسند ہے ہی۔ اس میں کوئی شک نہیں لیکن ایک تنہائی تخلیقی ہوتی ہے۔ جہاں آدمی ایک اور سطح پر جا کر سوچتا ہے اور اُسے تنہا ہی ہونا چاہیے یا پورے شہر میں اُس کا ایک بھی ہم خیال نہ ہو یا جس شہر کی اتنی بڑی اہمیت ہو وہاں آپ کی قدر ہی نہ ہو۔ یا آپ کی تنہائی کو کوئی سمجھ ہی نہ سکے یا آپ کے طرزِ فکر کو پسند نہ کر سکے یا آپ جیسا لکھنے والے ہی نہ ہوں۔ پسند کرنا بھی کوئی اہم بات نہیں ہوتی ہے۔ اختلاف کی بھی بڑی اہمیت ہوتی ہے بشرطیکہ وہ بھی تخلیقی سطح پر کیا جائے لیکن ایک بڑے

شہر میں نئے خیالات کی اپج تو ہونی چاہیے۔ یہاں مجھے اُپج کی بڑی کمی محسوس ہوتی رہی ہے۔ اب کچھ لوگوں کو دیکھتا ہوں تو خوشی محسوس ہوتی ہے کہ ایک نئی نسل پیدا ہوئی تو ہے۔ چاہے ہماری مخالفت میں پیدا ہوئی ہے یا ہمارے ردِّعمل میں پیدا ہوئی ہے اور ہماری کاٹ کرتی ہے، ہمیں ردّ کرتی ہے، ہمارے ساتھ لڑتی ہے جھگڑتی ہے لیکن پیدا ہوئی تو ہے۔ جس کے ساتھ ہم کچھ اُمیدیں وابستہ کر سکتے ہیں۔

لنڈا:۔ یہ نئی نسل کب سے آئی ہے؟ کیا SIXTIES میں ہی آئی ہے؟

رام لعل:۔ یہ ساتویں دہائی کی پیداوار ہے۔ کچھ تو چھٹی دہائی کے رسالوں کی مدد سے آئی تھی کچھ نئے رسالوں سطور، آہنگ، مفاہیم، کہسار، جواز، ہم زبان وغیرہ کے ساتھ آرہی ہے۔

لنڈا:۔ کون کون لوگ قابلِ ذکر ہیں ان میں؟

رام لعل:۔ کچھ ذہین لڑکے ہیں جو ابھی یونیورسٹی میں ہیں یا وہاں سے نکل آئے ہیں۔ ایک تو انیس اشفاق ہیں جو بہت اچھے جدید نقاد بن کر اُبھریں گے۔ وقار ناصری ایک ہونہار شاعر ہے جو ورکشاپ میں کام کرتا ہے۔ کچھ لوگ ذائقہ بدلنے کے لئے جدید طرز کی شاعری کر لیتے ہیں کبھی کبھی۔ ایک خاتون افسانہ نگار عائشہ صدیقی سے بھی اُمیدیں وابستہ کی جا سکتی ہیں۔

لنڈا:۔ آپ نے سیمیناروں کا ذکر کیا تھا اور رسالوں میں اُن کی رپورٹس کے بھی چھپنے کا۔ کیا صرف سیمینار ہی کسی نئے رجحان کو ترقی دینے میں مددگار بنتے ہیں یا اُن کے ساتھ رسالوں کا ہونا بھی ضروری ہوتا ہے؟

رام لعل:۔ دونوں مل کر اس کام کو آگے بڑھاتے ہیں۔ ایک مقامی سطح کی بحث کو دوسرے شہروں تک پہنچانے میں رسالے ہی معاون بنتے ہیں اور یہ ضروری ہے کہ سیمیناروں کی تفصیلی روئداد ادبی ہفتہ واروں اور ماہناموں میں چھپے۔ یوں بھی اچھے ادبی رسالے اچھے ادب کے فروغ کا باعث بنتے ہیں۔ یہ نہ ہوں تو لکھنے والے اپنے خیالات کو دوسروں تک کیسے پہنچائیں گے۔ دونوں ایک دوسرے کی ترقی اور شناخت کا باعث بن جاتے ہیں۔

لنڈا:۔ شاید آپ تھک گئے ہوں گے۔ مجھے بھی کئی اور لوگوں سے ملنا ہے اور کل ہی دہلی واپس بھی جانا ہے۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔ شاید باہر بارش ہو رہی ہے۔ اب ذرا بارش کا بھی لُطف اٹھایا جائے!

ہم لوگ کھڑکی کے سامنے کھڑے ہو کر سڑکوں، عمارتوں، بسوں اور لوگوں کو بھیگتا ہوا دیکھتے رہے اور ہنستے رہے۔

رین اجیارا — دوہرے جذبے کی شاعری*

محمد اجمل نیازی

رین اجیارا کا تخلیقی تاثر ذہن و قلب میں ایک دگنی تاثیر لیے اترتا ہے اور پھر ابھرتا ہے۔ ممکن ہے شاعر کو بھی ہر ایک شعری تجربے اور تہذیبی عمل سے دوبارہ گزرنا پڑا ہو۔ جسم و روح کے سحر اس کو کسی تخیلی احساس میں سمیٹنے اور سمونے سے ایک پُرکشش اور پُردرد کیفیت پیدا ہوئی ہے۔ اس لیے اس کتاب کو ایک ہی وقت میں کم از کم دوبارہ پڑھنے میں کوفت نہیں ہوتی جب کہ آج کسی کتاب کو ایک بار پڑھ لینا جواں مردی بلکہ جاں فشانی سے کم نہیں۔ ہمارے پاس سطحِ فکر و خیال تو ہے۔ سمندر بچھڑ گیا ہے۔ مردہ ساحلوں کی ہوا گہرے لفظوں کو تلاش کرتی پھر رہی ہے۔ کوئی ان میں ڈوب کر ابھرے تو دلوں کی بستیاں طوفان سے آشنا ہوں۔ کچھ اسی قسم کی آشنائی نے یہ گواہی دی ہے کہ دوہرے جذبے سے لکھے جاتے ہیں۔

میرے پیار کی ارتھی نکلے جگ میں چاروں کھونٹ
جی چاہے ہے مر جاؤں رکھ اس کے ہونٹ پہ ہونٹ

پرتو، مایا، جیون، پریت اور برہا۔ رین اجیارا میں یہ لفظ اتنی کثرت اور ایسی بصیرت سے استعمال ہوئے ہیں کہ ذوق و وجدان کو لمس دینے لگے ہیں۔ میرے نزدیک یہ پرتو کی شاعری کے عناصرِ خمسہ ہیں۔ پرتو اس کا تخلص ہے۔ یہ اس کے ہستی کا تجسس بھی ہے جسے اس نے اپنے اندر بھی سلامت رکھا ہے اور باہر بھی۔ اس نے کبھی خود کو بڑا شاعر کہلوانے یا بنوانے کی کبھی کوشش نہیں کی جس طرح افسر سے ہٹ کر بھی وہ کچھ ہے۔ اسی طرح اس کے لہو میں شاعر کے علاوہ بھی کوئی شے ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کی دُہری شخصیت عام افسروں کے لیے ایک ڈھال ہے۔ میں یہ نہیں کہنے والا کہ وہ کوئی کامل شاعر یا انسان ہے۔ دوست بڑا پکا ہے۔ کچے رشتوں کی معاشرت میں یہ حیران کُن بات ہے اور اب تو یہاں بے چارے کو سلیقے سے حیران ہونا بھی میسر نہیں ہے۔

خان صاحب کی زندگی کرنے اور شاعری کرنے کے اسلوب میں جلال و جمال کا ایک متوازن استقلال موجود ہے۔ اُسے اپنے خوابوں اور خیالوں سے وفا کرنے میں بڑی استقامت حاصل ہے۔ وہ اپنے آپ سے کسی بھی صورت میں غداری کرنے کے حق میں نہیں۔ وہ نہ اپنے راستوں کو چھوڑنا چاہتا ہے اور نہ اپنے رابطوں کو توڑنا۔ ساری عمر بھی دُھن میں گزارتے رہنے کی لگن میں مگن رہنا بھی کوئی بات ہے کہ نہیں۔ صرف اس لیے کہ دل کا ارادہ بے توقیر نہ ہو اور روح کا لبادہ داغدار ہونے سے بچ جائے۔ وہ جو بہت سی باتوں پر قادر ہو کر بھی خود کو قاصر سمجھنے پر مصر ہو، اُسے کیا کہیے۔ ایسا نہ ہوتا تو اُسے ملتان پر ندوں کے گلشن جیسا شاداب چہرہ کیسے نصیب ہوتا اور سدا بہار لفظوں کی مستقل صحبت کس طرح فراہم ہوتی۔ وہ زندگی میں اور شاعری کے تمام مرحلوں میں اپنے آپ پر حرف نہ آنے دینے کی خواہش کو لازوال دیکھنا چاہتا ہے۔ گھر سے لے کر محفلِ مشاعرہ تک وہ کہیں بھی اپنے سامنے

---

* پرتو روہیلہ کی کتاب پر یہ مضمون ۱۸ جون ۱۹۷۹ء کو اسلام آباد میں پڑھا گیا۔

شرمسار نہیں ہونا چاہتا۔ وابستگی آدمی کے لیئے وارفتگی نہیں بنتی تو پھر وہ منافقت کے علاوہ کچھ نہیں۔ عظیم ہونے کے لیئے قدیم پیمانے بھی ٹھیک ہیں، تاریخ کے ہاتھ میں جو ترازو ہے بعض اوقات زندگی کے بظاہر عام اور ننھے منے عمل کے بوجھ سے جھک جاتا ہے۔

جس کے پاس لنگی ہو تاری، بال چڑھیں پروان
سب سے اونچا گیانی ہے وہ سب سے بڑا ودوان

آج فیلی سسٹم کی افراتفری میں یہ بات کشت کی طرح دل میں دھڑکنے لگتی ہے۔ مختار علی خان کے ہاں، خوشبو کی طرح گھر میں بکھر جانے کی خواہش، نے مجھے بتایا ہے کہ اس حوالے سے آدمی واقعی بڑا آدمی ہوتا ہے۔

مایا۔ محبوبیت اور معصومیت کا استعارہ ہے یہ کہیں گوری کا نام پاتی ہے، کہیں تاری بنتی ہے۔ حسن کے زرخیز ہونے کی اس سے بڑی مثال اور کیا ہو۔

تیرے جوبن کھلیانوں کو دیکھ کے اچرج ہوئے
جھولی بھر بھر ڈھوئیں پریمی پھر بھی کم نہ ہوئے

وہ اسے مایادیوی بھی کہتا ہے کہ محبوب اور معبود میں فرق ہی کیا ہے۔ محبت میں عبادت کا سا خلوص نہ ہو اور عبادت میں محبت کی ادا نہ ہو تو جذب و تعلق نہ صرف ناخالص ہے، نامکمل بھی ہے۔ یہی کردار پرتو روہیلہ کی پہلی کتاب "پرتو شب" میں ثروت کے روپ میں ظاہر ہوتا ہے۔ یہ دونوں لفظ ہم معنی ہیں اور ہمراز بھی۔ محبت سے بڑی متاع انسان کے پاس تو ہے نہیں، آج آدمی اس کے بغیر کتنا غریب ہو رہا ہے۔ شاید اس لیئے بھی کہ اس نے شاعری پڑھنا چھوڑ دی ہے۔ شاعروں نے دوہے لکھنا کم کر دیئے ہیں، اور گاؤں کے لوگ دوہڑے کا نا بس کر گئے ہیں۔ دوہڑے اور دوہے غالباً انسان کی ایک جیسی کومل کیفیت کا ثمر ہیں۔ ندیم صاحب کی کتاب "رم جھم" دوہڑے ہی کا عکس جمیل ہے۔ رین اجیارا میں دوہوں کی فضا نکہتِ زر سے بھری ہوئی ہے، جس میں سانولی اجلی صبح جیسے گاؤں کا نقشہ نظر آتا ہے، جہاں ویران چھاؤں کی طرح کی مجبوریوں کا عالم بھی موجود ہے۔ دوہا دیہات کی طرف مراجعت کا گیت ہے۔

ساجن اپنے سنتروں کو لے کر آیا میرے گاؤں
میں چادر سرہانے لینے گھر گھر بھاگی جاؤں

ہمیشہ دوہے سنتے ہوئے اور پڑھتے ہوئے بھی عجیب گنگناہٹوں نے میرے آس پاس بے حد گداز آہٹوں کا شبستان سجا دیا۔ اور میرا بہت زور کر کے چاہا کہ میں بھی گاؤں طرف جاتے ہوئے رستوں پر اونچے سُروں میں کھل کر گاؤں۔ جب کہ میں جانتا ہوں کہ صرف میرا قلب ہی سکتا ہے۔ اگر قلب نغمہ گری پر مائل ہو تو پھر اور کیا چاہیئے۔ "رین اجیارا" کے دوہوں نے میری تڑپ میں یہ تمنا بھی تخلیق کی ہے کہ آج ہمارے گاؤں بھی ایسے ہی ہو جائیں، جن کا منظر نامہ ان میں جھلکتا مہکتا ہوا ملتا ہے۔ میں نے یہ دوہے اپنے شکستہ خیال گاؤں کی دھوپ اور چاندنی پر نقش کرنے کی کوشش کی کہ یہاں لوگوں نے اب دوہڑے گانا بس کر دیئے ہیں۔ شاعروں نے دوہے کہنا چھوڑ دیئے ہیں۔ اور ہم بہت غریب ہو رہے ہیں۔ ایسے میں پرتو روہیلہ کی یہ کتاب خود کو صاحبِ ثروت کرنے کی جستجو کا عمل ہے۔ ایک سیدھے سادھے جیون کا جیون آباد کرنے کا خواب ہے۔ تازہ رنگ آرزوؤں کے جنم کا دعا نامہ ہے۔ مختار علی خان پرتو روہیلہ کے لفظوں کی آنکھ سے جس طرح کے گاؤں کا آفاق نمودار ہوتا ہے جیسے اسی میں جی اٹھنے کا نام جیون ہے۔

مگر اب وہ گاؤں اُجڑا ہوا ہے اور وہ جیون مر رہا ہے۔ یہاں باطن کی شکستگی اور خرابوں کی آزردگی سے ایک اداس اور درد انگیز لہجہ دوہوں میں ظہور کرتا ہے۔ سنسان جیون میں مثبت تہذیبی رویّوں کی بے قدری سے ایک ملائم احتجاج ایک مضبوط استفہام کی طرف لوٹتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ جب کہ اس سفر میں تفکر اور تعلق کی خوشبو ساتھ ساتھ رہتی ہے۔ اُسے سُندر جیون کی صفات کے لُٹ جانے کا بڑا رنج ہے۔ مجبوریوں اور محرومیوں کی بازی گاہ میں اپنے تماشا بن جانے کا افسوس ہے۔ جہاں آدمی، آدمی سے بے تعلق ہے، خود سے بھی لاتعلق۔ اس کا کوئی ساتھی نہیں اور وہ خود بھی اپنا ساتھ دینے کی صلاحیت گنوا بیٹھا ہے۔ میرا یہ طویل بیان اور پرتو روہیلہ کا صرف ایک دوہا۔

جیون ایک کنواں ہے جس میں گونجے بس سناٹے
دکھ کی ناگن اس میں لوٹے اس کی مٹی چاٹے

اس کنوئیں میں خود کو کوئی دیکھے تو سہی ورنہ پھر "رین اجیارا" پڑھ لے۔ جس میں ان گمبھیر سناٹوں کی گونج ہے اور اس کی گونج کی بازگشت بھی۔ البتہ اس دوہے کی تشریح اس کے اسرار کو تباہ کر دے گی۔ مگر ایک بات یہ کہ ہم اس میں سے نکلنا نہیں چاہتے۔ مختار علی خان کی شاید یہ بھی مرضی ہے کہ ہم اس جیون کنوئیں کو اور گہرا کھودیں۔ شاید اس کی گہرائیوں میں وہ بلند خیال جہان ہو جو انسان کے پوتر پریت جذبوں کے جیون میں بستا ہے۔

جیون بھید اسی نے پایا جس نے پریت لگائی

پریت جیون کی ایک لگن ہے۔ اس لگن سے بھی آگے نکل جانے کی بھی لگن ہے۔ پریت ایک انسانی ریت ہے، فطرت ہے۔ اس حوالے سے وہ دو صادق سیرتوں کو خالق کی صفات کا بدل سمجھتا ہے۔

دو ہی رنگ میں ہم تک پہنچے ایشور کی ہنکار
ماتا کی چمکار سکھی یا بالک کی کلکار،

اگر جدید رہن سہن کی یلغار میں یہ قدیم بے لوث سچائیاں ہر عمل کا عنوان بن جائیں تو جیون پھر سے جی اٹھے اور گاؤں کی فضا دوہوں سے آباد ہو جائے۔

یہ پریت کے اظہار کی قدیم ترین آوازیں ہیں۔ یہ انسان سے بچھڑتی ہوئی صدیوں کی صدائیں ہیں جو "رین اجیارا" کے نئے آہنگ میں ڈھل کر سماعتوں کے منتظر زمانے تلاش کر رہی ہیں۔ دوہے اس لئے بھی کم لکھے جا رہے ہیں کہ مٹی ہم سے بیزار ہو رہی ہے، بانجھ ہو رہی ہے۔ کسی خیال میں ایک پورے زمانے ایک مکمل تہذیب کے دَر سے دوہا تخلیق ہوتا ہے۔ یا وہ شخص جو کسی گمشدہ تہذیب کو اپنے لہو میں تلاش کرلے۔ تہذیبی آگہی اور اپنے اندر اس کے احیا کا درد ہی کسی سے دوہے کہلوا سکتا ہے۔ نیم مردہ تہذیبی عمل میں کوئی کیسے دوہے لکھے اور کیوں گائے۔

پرتو روہیلہ نے گیان، دھیان کی منزلوں میں نشاطِ خاک سے ایک جذبِ خلوص دریافت کرنا چاہا ہے۔ کسی خطۂ پریت میں سب کو لے جا کر بسانے کی خواہش اُسے چین سے نہیں بیٹھنے دیتی۔

پھر اس کے ہیرے اگلیں مٹی اُگلے سونا
دُکھ کی اس دھرتی کے اُوپر سُکھ کا ایک بچھونا

یہ گہری رومانیت اور سچی روحانیت کے سنگم پر کھڑے ایک کھرے آدمی کی حیرتوں اور فکروں کا منظر نامہ ہے۔ جس میں ہم اپنی ذات دیکھتے ہیں۔ ہماری ذات ہمیں دیکھتی ہے۔ گھٹتے مٹتے جذبوں کی جنگ سازی میں ہماری ذات ریا اور جفا کا بھیس بدلتی نجانے کیا ہوتی چلی جا رہی ہے۔

پرتو روہیلہ اس سے بھی باخبر ہے، پھر بھی۔

سمجھ کتنا بھولا تھا میں کتنا تھا نادان

پھولوں سے جھولی بھر کر آ نکلا رن میدان

مگر وہ یہ بھی جانتا ہے کہ ان پھولوں کی خوشبو ایک ذات میں جاگتی ہے تو پوری کائنات مہک اُٹھتی ہے۔

پریت کے پُرسوز موسموں برہا کے پھول بھی کھلتے ہیں۔ برہا ایک ازلی تجربہ ہے جسے صدیوں قربانیوں نے ابدیت دی ہے۔ یہاں پہنچ کر "رین اجیارا" میں مجھے دوہا باقاعدہ دوہائی بنتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ کسی سچے فراق کے مراقبے میں لذتِ انتظار کی فریاد سنائی دیتی ہے۔

پھوڑوں دونوں نیناں سکھیو کاٹوں سارے کیس

جیون کٹیا آگ لگاؤں بالم گئے پردیس

کتاب کا پیش لفظ لکھنے والے ڈاکٹر جمیل جالبی کو "رین اجیارا" میں جگنو ہی جگنو نظر آتے ہیں۔ یہ چمک دائمی نہیں ہوتی مگر کسی خیال یا احساس کو منور کرنے کو کافی ہوتی ہے۔ جس طرح گہری رات کے گھور اندھیاروں میں ستارے ٹوٹتے ہیں تو آنکھیں چونک اٹھتی ہیں تو ان دوہوں میں ٹوٹتے ستاروں جیسی اکھیاں بھی ملیں جو جاگتے ارادوں میں ریزہ ریزہ گھل کر آئینے بناتی رہتی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں عرض ہے کہ مختار علی خاں پرتو روہیلہ کی شاعری صرف جگنو پکڑنے کا کام نہیں، تاریکیوں سے لبریز رات میں لپکتی ہوئی بجلیوں کے کوندے محفوظ رکھنے کا عمل بھی ہے۔

کتابوں کی باتیں

جلوۂ نمو | سیّد حرمت الاکرام

سید حرمت الاکرام کا شمار برِ صغیر کے ان نامور شعرا میں ہوتا ہے جو کسی خاص مکتبۂ فکر سے الحاق کرنے کے بجائے اپنے فن کا سہارا لیتے ہیں اور صرف اپنی تخلیقات کے بل بوتے پر اپنا سکۂ ادب منوا لیتے ہیں۔ ان کی کتاب "کلکتہ ایک رباب" شائع ہوئی تو اسے ایک مخصوص ماحول کی تہذیبی اور ثقافتی زندگی کا ایک ایسا مرقع قرار دیا گیا جس میں سید حرمت الاکرام کا احساس اور تجربہ بھی موجود تھا چنانچہ یہ جذبے اور مشاہدے کی نادر دستاویز قرار دی گئی۔ اس کتاب کو اتنی شہرت حاصل ہوئی کہ ایک عرصے تک سید حرمت الاکرام کی پہچان اسی کتاب کے حوالے سے کی جاتی رہی۔ درآنحالیکہ حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے ترسیل اور ابلاغ کی مشکلات میں الجھے بغیر اتنی اچھی شاعری پیش کی کہ نظام صدیقی جیسے نقاد کو ان کے ہاں ہیپناٹک کیفیت کارفرما نظر آئی اور سردار جعفری نے لکھا کہ وہ حرمت الاکرام کی شاعری کے ہمیشہ سے معترف اور مدّاح ہیں۔

"جلوۂ نمو" بظاہر "کلکتہ ایک رباب" کے تخلیق نگار حرمت الاکرام کی نظموں، غزلوں اور رباعیوں کا مجموعہ ہے تاہم اس کتاب کی اپنی انفرادیت یہ ہے کہ اس مجموعے میں حرمت الاکرام نے بیانیہ شاعری سے آگے قدم بڑھایا ہے اور اپنے خارج پر نظر دوڑانے کے علاوہ اپنے داخل کی سرگوشی کو بھی گوشِ ہوش سنا اور پھر اسے تخلیقی عمل سے گزار کر نظم اور غزل کا پیکر عطا کر دیا ہے چنانچہ ایک طرف تو وہ اپنی نمو کا جلوہ دکھانے اور ایک لمحے کے رقصِ شرر سے کائنات کو جگمگانے کے آرزومند نظر آتے ہیں تو دوسری طرف وہ اپنی روح کو یکسر نغمے میں اور خیال کو ملکوتی موسیقی میں ڈھال کر قاری کے تصور میں ایک نئی قوسِ قزح پیدا کرنے کے لئے بھی بے قرار دکھائی دیتے ہیں۔ میرے خیال میں سچے شاعر کا منصب یہی ہے کہ وہ قاری کی سطح پر اترنے کے بجائے قاری کے ذوق و مزاج کو رفعت آشنا کرے اور اسے موسیقی اور شعر کی لطیف ترین لہروں میں شامل ہونے اور ان سے اکتسابِ جمال کرنے کا ذوق عطا کر دے۔ "جلوۂ نمو" میں یہ کیفیت متعدد مقامات پر پیدا ہوتی ہے اور صاف نظر آتا ہے کہ شاعر رنگ بدلتے موسموں میں صرف زخموں کے ناز ہی نہیں اٹھا رہا بلکہ وہ لذتِ دوام سے بھی گزر رہا ہے اور نشاطِ غم کی کیفیت سے بھی دوچار ہے اور اس کا قاری ہر مقام پر ان کے ساتھ ہے۔ آخری بات یہ کہ اپنی آزاد حیثیت کے باوصف سید حرمت الاکرام نے معاشرے کے ساتھ ایک معنی خیز وابستگی اختیار کر رکھی ہے اور ان کے ہاں ایک مخصوص اندازِ فکر نمایاں ہے۔ ان کی شاعری کا یہ زاویہ ایک مستقل موضوع ہے جس پر کسی صاحبِ نظر کو ضرور قلم اٹھانا چاہیے۔ نظموں، غزلوں اور رباعیوں کا یہ دلآویز مجموعہ حلقۂ ترویجِ ادب، رام باغ مرزا پور (یو پی) سے شائع ہوا ہے اور قیمت صرف پندرہ روپے ہے۔ طباعت اور اشاعت کے لحاظ سے بھی یہ ایک معیاری کتاب ہے۔

انور سدید

شعلۂ جام | طفیل ہوشیار پوری

ادبی اور فنی سطح پر طفیل ہوشیار پوری اب اس مقام رفیع پر پہنچ چکے ہیں جہاں پہنچ کر کسی اور بامِ بلند کی حسرت نہیں رہتی۔ طفیل ہوشیار پوری کی آواز گذشتہ نصف صدی سے ادب کے معروف ایوانوں میں گونج رہی ہے اور لطف کی بات یہ ہے کہ اس تمام عرصے میں اس آواز نے رندِ بادہ کام کیفیت پیدا کرنے کے بجائے آرزؤں کو سہلایا، تمناؤں کو لوریاں دی ہیں اور خواب میں ہلکورے لینے والے انسانوں کو شبنم کی تازگی سے جگانے اور پھر معرکۂ کارزار میں شریک ہو کر اپنی تمناؤں کو روبہ تعبیر کرنے کی تلقین کی ہے چنانچہ طفیل ہوشیار پوری شعلے کو جب جام سے گذارتے ہیں تو اس کی کیفیت یکسر بدل جاتی ہے اور صاف نظر آتا ہے کہ شعلگی میں نئی تعمیر کا اور اس کی حدت میں نئی تشکیل کا زاویہ شامل ہو گیا ہے۔

"شعلۂ جام" طفیل ہوشیار پوری کی غزلوں کا مجموعہ ہے جو روایتی حسن و آرائش سے شائع ہوا ہے۔ اس کے معنوی حسن کو ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر عبادت بریلوی اور شاعر لکھنوی نے اپنے خیال افروز دیباچوں کے ذریعے اُجاگر کیا ہے چنانچہ طفیل ہوشیار پوری کی شیریں بیانی، بے تکلف پیرایۂ اظہار اور اجلی اور پاکیزہ زبان اور غزل آشنا مزاج کو ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب نے کھل کر سراہا ہے، ڈاکٹر عبادت بریلوی نے باندازِ دگر انہیں یوں داد دی ہے کہ "طفیل صاحب نے اپنی غزل میں حُسن کا بیان کیا ہے اور یہ بیان ان کے ہاں حُسنِ نظر بن گیا ہے" شاعر لکھنوی نے بجا لکھا ہے کہ طفیل ہوشیار پوری کا شعور...... انہیں اظہار کے صاف ستھرے اور رواں دواں سانچے فراہم کرتا ہے۔ طفیل ہوشیار پوری کے ہاں سخن کو شائستہ کرنے کی جو روش ملتی ہے، درحقیقت یہی ان کی انفرادیت ہے اور اسی سے انہیں دوام حاصل ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ طفیل ہوشیار پوری کا زیرِ نظر مجموعہ "شعلۂ جام" ان کی سابقہ تخلیقات کی طرح مقبول ہوگا کہ یہ غزل کی روایت میں ایک خوبصورت اضافہ ہے۔

انور سدید

لوحِ بدن | پریم کمار نظر

بولتا اور لَو دیتا ہوا بدن اُردو شاعری کی ایک محرک قوت ہے تاہم بعض شعرا نے بدن سے دانستہ اغماض برتا اور یوں جذبے کو معنوی طور پر پابہ زنجیر کرنے کی کوشش شروع کر دی اس کے برعکس بعض شعرا نے بدن کو اپنی ہوس کے اظہار کا وسیلہ بنایا اور یوں عریانی اور فحاشی کی مجملہ حدود کو بھی پاٹ ڈالا، پریم کمار نظر کے ہاں بدن ایک ایسی لوح ہے جسے پڑھنے کے لئے ہی اس نے شاعری اختیار کی چنانچہ یہ بات بالخصوص متاثر کرتی ہے کہ پریم کمار نظر کی شاعری میں بدن ایک خوبصورت موضوع بن کر اُبھرا ہے اور شاعر نے اس موضوع کی جملہ پرتیں آشکار کرنے میں بڑے خلوص اور صداقت سے کام لیا ہے، دوسری طرف جب بدن کی قوسِ قزح رنگوں کا نیا امتزاج پیش کرتی ہے تو پریم کمار نظر کے ہاں معصوم حیرتیں جاگتی ہیں اور وہ اس نیرنگِ تماشا میں گم ہو جانے کے بجائے اسے اپنی ذات پر وارد کرتا ہے اور پھر اپنے تجربے کو شعر میں ڈھال کر اس بوقلمونی میں قاری کو بھی شریک کر لیتا ہے۔ بقول ڈاکٹر وزیر آغا "نہ تو اس (پریم کمار نظر) نے بدن اور اس کے چمکتے بولتے ہوئے سے خود کو محروم کیا ہے اور نہ ہی خود کو اس کا مطیع ہونے کی اجازت دی ہے"۔ بالفاظِ دیگر پریم کمار نظر نے سلگتے ہوئے جسم کے ارزاں تقاضوں کی پیروی کرنے کے بجائے اس ارفع پہلو کو تقویت دی ہے جس سے شاعر باوقار اور جذبہ بے اختیار عبادت بن جاتا ہے۔ اسلوب میں "لوحِ بدن" کو جدید غزل کی ایک منفرد کتاب شمار کرتا ہوں۔ مجھے اس میں ایسی عبارتیں آشکار ملی ہیں جن کے اظہار کے لئے ہر بڑا فنکار ایک الگ اسلوبِ اظہار تلاش کرتا ہے۔

"لوحِ بدن" کا معنی خیز دیباچہ شمس الرحمان فاروقی نے اور خیال انگیز پیش لفظ ڈاکٹر وزیر آغا نے لکھا ہے۔ یوں ابتدا میں ہی پریم کمار نظر کو اس عہد کے دو متوقر ناقدین کی تنقید کا سامنا کرنا پڑا اور وہ اس امتحان میں پورے اُترے۔ میں اسے پریم کمار نظر کی بہت بڑی کامیابی تصور کرتا ہوں۔ بقول منیر نیازی پریم کمار نظر بہت ہی خوبصورت شاعر ہے (صوری طور پر یہ کتاب بھی شاعر کی طرح ہی خوبصورت ہے) پریم کمار نظر نے کتاب کا انتساب اپنی بیوی کے نام کیا ہے اور یہ "لوحِ بدن" کی معنویت کی مزید گرہ کشائی بھی کرتا ہے۔ کتاب پر قیمت درج نہیں کی گئی۔ ملنے کا پتہ مکتبہ منیر، ۶۲ ماڈل ٹاؤن ہوشیار پور، مشرقی پنجاب (بھارت)

انور سدید

ریت کی دیوار | سائرہ ہاشمی

کچھ زیادہ عرصے کی بات نہیں کہ اُردو افسانے کے اُفق پر ایک نیا نام اُبھرا اور دیکھتے ہی دیکھتے کہنہ مشق افسانہ نگاروں کی کہکشاں میں پوری آب و تاب سے جگمگانے لگا، یہ سائرہ ہاشمی تھی جس کا ابتدائی سفر اپنی بڑی بہن جمیلہ ہاشمی کے سائے میں شروع ہوا لیکن بہت جلد اس نے اپنی انفرادیت تسلیم کروالی اور اب اُردو ادب میں ان دونوں بہنوں کا ذکر اسی احترام سے کیا جاتا ہے جیسے انگریزی ادب میں "برونٹی سسٹرز" کا یا اُردو ادب میں خدیجہ مستور اور ہاجرہ مسرور کا۔ "ریت کی دیوار" سائرہ ہاشمی کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے جس میں زندگی کی جراحت کو نمایاں کرنے کے بجائے حقیقت کو رنگوں اور روشنیوں سے آشکار کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ نتیجہ وہ خوشبو اور موسیقی ہے جو افسانہ نگار کی اپنی شخصیت سے پھوٹی اور پھر مختلف افسانوں کی صورت میں قاری کی طرف منتقل ہو گئی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ کہانی کہنے کا سلیقہ عورت کو ہی آتا ہے۔ تاہم ادب میں اس فرض کو مردوں نے کچھ اس فنکاری سے ادا کیا کہ عورت کی سلیقہ مندی پس منظر میں ڈوبتی نظر آنے لگی، پھر عصمت چغتائی نے بغاوت کی پہلی صدا بلند کی اور ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کو فلاح کی راہ دکھانے والے افسانے لکھنے کے بجائے ایسے افسانے پیش کیے جن میں سلگتا ہوا جذبہ آتش فشاں کا دہانہ نظر آنے لگا، اور یوں یہ افسانہ نگار خاتون ایک دفعہ پھر باندازِ دگر مرد کا مرکزِ توجہ بن گئی اور اسے حیرت کی نظر سے دیکھا جانے لگا، بلاشبہ عصمت چغتائی کا چونکا دینے والا یہ حربہ بہت کامیاب ثابت ہوا اور جب بھی کسی نئی خاتون افسانہ نگار نے شہرت کے زینے کی طرف عاجلانہ قدم بڑھایا تو اس نے عصمت چغتائی کے آزمودہ نسخے پر ہی عمل کیا۔ سائرہ ہاشمی اپنی سہیلیوں سے یوں مختلف ہے کہ وہ ہیجانی کیفیت پیدا کرنے اور سستی جذباتیت ابھارنے کے بجائے صورتِ واقعہ کو ہموار اور متوازن انداز میں پیش کرتی ہے اور یوں ان کیفیات کی نقاب کشائی کر دیتی ہے۔ جن کے پس پشت فطرت کا اَن دیکھا عمل کارفرما ہے۔ "ریت کی دیوار"، "خوابِ پریشاں"، "زرد دن"، "ایکلوپس"، "سرابِ جستجو"، "گنبد کی آواز" اور "مداوائے درد" وغیرہ افسانوں میں عورت ایک جذباتی حقیقت بن کر نمایاں ہوتی ہے اور اپنے وجود کے اثبات کے لیے نہ صرف تگ و دو کرتی ہے بلکہ بعض اوقات اپنی جان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتی ہے۔ سائرہ ہاشمی کی انفرادیت یہی ہے کہ اس نے عورت کو مرد کا روپ دھارنے کی اجازت نہیں دی بلکہ اسے بیوی، بیٹی اور ماں کی صورت میں دیکھا۔ سائرہ نے اپنے افسانوں میں ان خوابوں کو زندہ کیا ہے جنہیں عورت محبوبہ بن کر دیکھتی ہے اور بالآخر متذکرہ تینوں صورتوں میں مجسم کر ڈالتی ہے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی کی یہ رائے حقیقت پر مبنی ہے کہ سائرہ ہاشمی نے تجربات کے اظہار و ابلاغ کا مشکل کام تفصیل و جزئیات کے باوجود کچھ اس طرح اشاروں اور کنایوں میں سرانجام دیا ہے کہ اس کے افسانوں میں بیشتر مقامات پر مصوری کی شان پیدا ہو گئی ہے۔

"ریت کی دیوار" میں سائرہ ہاشمی کے ۱۲ مقبول افسانے شامل ہیں۔ واحد علیمز پبلشرز نے اسے بے حد خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے لیکن قیمت درج نہیں کی۔

انور سدید

لذت لفظوں کی | راج نرائن راز

میں راج نرائن راز کا شمار ان شاعروں میں کرتا ہوں جو لفظ کی ابدیت پر اپنا ایمان پختہ رکھتے ہیں چنانچہ وہ ان تمام آوازوں کو پکڑنے کی کوشش میں مصروف ہے جو فضا میں صبحِ ازل سے تیر رہی ہیں اور کبھی رہٹ کا نغمہ، کبھی پرندے کی صدا اور کبھی شاعر کا شعر بن جاتی ہیں۔"لذت لفظوں کی" راج نرائن راز کی شاعری کا دوسرا مجموعہ ہے۔ میں نے جب راز کو پہلی دفعہ پڑھا تو یوں محسوس ہوا کہ ایک جدید شاعر خود اپنے آپ کو تلاش کر رہا ہے۔ "لذت لفظوں کی" میں یہی شاعر فطرت کے اسرار کا کھوج لگانے میں سرگرداں نظر آتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب اس کی ذات اور فطرت میں کچھ زیادہ فاصلہ نہیں رہا چنانچہ وہ نہ صرف مناظر میں دلچسپی لیتا ہے اور کہتا ہے۔

شام کے شنگرفی اجالوں میں / آسماں اس طرح سے روشن تھا / جیسے قوسِ قزح کے کچھ ٹکڑے
ٹوٹ کر گھل گئے ہوں پانی میں

بلکہ وہ اس حقیقت سے بھی آشنا ہے کہ

نہیں / ہرگز نہیں / میں کوئی بحرِ بیکراں کب ہوں
میں اک قطرہ، فقط اک بوند ہوں / آغوشِ گل میں / صبح دم جو مسکراتی ہے / ....
فضا کی / نکہتوں، رنگینیوں کی جزوِ جاں ہو کر / وجود اپنا گنوا دیتی ہے / ...... لامحدود ہوتی ہے۔

چنانچہ راج نرائن راز اثباتِ ذات اور تحفظِ انا کا شاعر نہیں بلکہ وہ انضمامِ فطرت سے ذات کی حدود کو عبور کرنے کی سعی میں مبتلا ہے اور یوں اس اضطراب سے گزر رہا ہے جو آدم نے جنت سے اخراج کے لمحے میں محسوس کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے اپنی نظموں کو فطرت کا بیانیہ بنانے کی بجائے سوالات ابھارنے کا وسیلہ بنایا ہے۔ اس کی شاعری میں رُتیں رنگ بدلتی ہیں۔ دھرتی نئی قبا میں پہنتی ہے۔ جزیرے دھند میں لپٹے جاتے ہیں، ستارے بے عنوان روشنی بکھیرتے ہیں اور وہ ان سب سے فطرت کے راز دریافت کرنے کی سعی کر رہا ہے۔

جیسے نیند میں کھویا مطرب / اپنی انگلی کی جنبش سے / خواب آور نغمات جگائے

اس کتاب میں راج نرائن راز اپنے منفرد اسلوب اور الگ ذائقے سے صاف پہچانا جاتا ہے اور اس قاری کو جو فطرت کی سرگوشی کو سننے کا سلیقہ رکھتا ہے متاثر کرتا ہے۔ بلاشبہ راج نرائن راز اب جدید اردو نظم کی ایک اہم آواز بن چکا ہے۔ زیرِ نظر مجموعہ اس کے شعری قد کو مزید اونچا کرنے میں معاونت کرتا ہے۔

مجموعے کا عنوان "لذت لفظوں کی" ہے، تاہم کتاب کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ راج نرائن راز نے لفظوں کو شعوری طور پر لذت آشنا کرنے کی سعی نہیں کی، لفظ تو راز کے اظہار کا وسیلہ ہیں اور وہ انہیں اس چابکدستی سے استعمال کرتا ہے کہ اس کے داخل کا کرب، فطرت سے ہم آہنگ ہونے کا جذبہ اور تلاشِ حقیقت کی خواہش نمایاں ہوتی چلی جاتی ہے۔ مجھے اس کتاب میں لذتیت کا ارضی زاویہ کہیں نظر نہیں آیا۔

اس لحاظ سے کتاب کا نام اس کی معنویت کی طرف پورا اشارہ نہیں کرتا۔ کتاب کا معنی افروز دیباچہ باقی نے لکھا ہے۔ سرورق پر محمود ہاشمی، سجاد نقوی اور رشید امجد کی آراء سے راج نرائن راز کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ کتاب کی قیمت دس روپے ہے۔ ملنے کا پتہ۔ سمت نامہ پبلی کیشنز ۸/۲۸ ماجندر نگر۔ نئی دہلی (انڈیا)

انور سدید

برگِ صحرا | محسن نقوی

محسن نقوی کا نیا مجموعۂ غزل "برگِ صحرا" سادگی اور پُرکاری کی مثال ہے۔ محسن نقوی کا استعارۂ غزل واقعۂ کربلا سے اکتساب ہوا ہے چنانچہ اس نے کلاسیکی وضعداری سے نہ صرف روایت کی پاسداری کی ہے بلکہ متذکرہ استعارے کو عصرِ حاضر پر پھیلا کر اپنی غزل کو جدیدیت آشنا کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ اہم بات یہ کہ محسن نقوی حقیقت کے کھردرے جسم کو نمایاں کرنے کے بجائے اس کی معنوی صورت پیش کرتا ہے۔ اس کے ہاں ضرب المثل بنانے اور اخلاقی سبق اجاگر کرنے کا رجحان زیادہ روشن ہے اور وہ ذات کے کرب کو اُجاگر کرنے کے بجائے ایسے موضوعات میں زیادہ دلچسپی لیتا ہے جن میں عامۃ الناس کا اجتماعی مزاج سامنے آسکے۔ اس تجربے کو دیکھ کر باور کرنا پڑتا ہے کہ محسن نقوی شدتِ احساس کا شاعر ہے اور وہ احساس کی ہر کروٹ کو فوری طور پر شعر میں پیش کرنے پر قادر ہے۔ یہ کتاب ماورا پبلشرز راولپنڈی نے پیش کی ہے اور اُردو کتابوں کی طباعت و اشاعت کا نیا معیار پیش کرتی ہے۔ قیمت تیس روپے ہے۔

انور سدید

غمِ لازوال | مخدوم منوّر، وزیری پانی پتی

"غمِ لازوال" واقعۂ کربلا پر نامور اہلِ قلم کے مضامین اور منظومات کا مجموعہ ہے اور اسے مخدوم منوّر اور وزیری پانی پتی نے باندازِ دگر مُرتب کیا ہے۔ مُرتبین نے اس مبارک اقدام کی غرض و غایت یہ بیان کی ہے کہ روایتی ڈگر سے ہٹ کر حسینؑ اور حسینیتؑ کا عرفان حاصل کیا جائے چنانچہ اس مقصد کے لیے انہوں نے مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر سید اعجاز حسین، خواجہ غلام السیدین، پروفیسر سید احتشام حسین اور ڈاکٹر ذاکر حسین کے مضامین جمع کئے ہیں تو ان کے پہلو بہ پہلو سید قدرت نقوی، الیاس عشقی اور کریم بخش خالد کے ادبی مضامین کو بھی جگہ دی گئی ہے۔ جوش ملیح آبادی، فیض احمد فیض، اُمید فاضلی، عارف عبدالمتین اور وزیری پانی پتی نے شہادت حسینؑ پر مرثیے لکھے ہیں۔ نئے لکھنے والوں میں سے رئیس فروغ، فردت حسین، اقبال ارشد اور مخدوم منوّر کی نظمیں بھی شاملِ کتاب ہیں۔ گویا نالے کو پابندِ نَے کرنے کے بجائے اسے مختلف انداز میں پرِ پرواز عطا کیا گیا ہے۔ اور یوں تاریخ کے اس واقعۂ عظیم کے علمی، ادبی اور تہذیبی زاویے اُجاگر کر کے انسان کو غم اندوزی کا موقعہ فراہم کیا گیا ہے۔ اس اقدام پر مرتبین مبارکباد کے مستحق ہیں۔ ملنے کا پتہ۔ ادبی معیار پبلی کیشنز، صدر کراچی ۳

انور سدید

ولایتی زعفران | سید ضمیر جعفری

اُردو ادب کے منفرد مزاح نگار سید ضمیر جعفری نے اپنے جوہرِ فن کا ایک اور قابلِ قدر نمونہ زیرِ نظر کتاب "ولایتی زعفران" کی صورت

میں پیش کیا ہے اور اہلِ ادب کو پہلی مرتبہ اس حقیقت پر غور کرنے کا موقعہ عطا کیا ہے کہ انگریزوں کا احساسِ مزاح ہمارے مزاحی مزاج سے کتنا مختلف ہے۔ اس کتاب میں سید ضمیر جعفری نے انگریزی کی فکاہیہ اور طنزیہ نظموں کو اُردو کا روپ دیا ہے۔ میں نے ان نظموں کو ترجمہ کہنے سے دانستہ گریز کیا ہے۔ وجہ یہ کہ سید صاحب نے انگریزی نظموں کا لفظی ترجمہ نہیں کیا، اگر وہ ایسا کرتے تو شاید بہجت اور مسرت کی وہ لہر جو ان نظموں کے بطون میں موجود ہے سطح پر پوری طرح ظاہر نہ ہو پاتی۔ اس کے برعکس ضمیر جعفری نے نظموں کے عکس کو پہلے اپنی روح میں اتارا اور پھر تخلیقی عمل سے گزار کر انہیں اُردو میں پیش کر دیا۔ اس لحاظ سے سید ضمیر جعفری کی یہ کاوش محض ترجمہ نہیں بلکہ اس پیش کش میں ان کی اپنی شائستہ مزاجی، بہجت نفسی اور شگفتہ فکری بھی شامل ہے۔

اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ ہمارے اں مزاح نے بڑی مضحک صورت اختیار کر لی ہے۔ ان دنوں بعض "طباع نوجوان" اکبر الہ آبادی کی غیر تخلیقی تقلید کر رہے ہیں۔ یہ نوجوان اُردو میں انگریزی کے بجائے پنجابی، پشتو، سندھی اور بلوچی کے الفاظ سمو کر مزاح پیدا کرتے ہیں، بلاشبہ اس پیوند کاری سے توجہ پیوند کی طرف مبذول تو ہو جاتی ہے اور بعض اوقات خود لکھنے والا بھی نمائشِ دنداں کرتا نظر آتا ہے لیکن وہ شائستگی جو مزاح کی برجستگی سے پیدا ہوتی ہے کہیں نظر نہیں آتی۔ سید ضمیر جعفری نے ایسے لوگوں کے سامنے طنز و مزاح کے بہت سے اعلیٰ نمونے پیش کئے ہیں میں یہاں مثال کے طور پر صرف ایک مختصر سی نظم "کتے کے پٹے پر" پیش کرتا ہوں کہ اہلِ نظر اس سے مزاح کی معیاری صورت ملاحظہ کر سکیں۔

میں ہوں ننگ مگر میں ہوں / بادشاہ کا کتا / کج کلاہ کا کتا
لیکن اسے جنابِ من / آپ کس کے کتے ہیں۔

اس مجموعے کی نظمیں "مسز ولیم"۔ "چالاک مسافر"۔ "سخت گیر باپ"۔ "روشنی کے اندھے"۔ "مشورہ" وغیرہ حقیقت کو اس سادگی سے پلٹتی ہے کہ لب پر بے اختیار ایک بے نام سی مسکراہٹ پیدا ہو جاتی ہے اور قاری ایک نئی تازگی سے آشنا ہو جاتا ہے۔ اُردو ادب میں اِس کتاب کی حیثیت نسیمِ بہار کے جھونکے جیسی ہے اور یہ جھونکا ہمیشہ مسرتیں اور مسکراہٹیں بکھیرتا رہے گا۔ سرورق کا تعارف مشہور شاعر جمیل یوسف نے لکھا ہے۔ یہ کتاب دھن پوٹھوہار اکادمی تصویر کدہ چکوال نے شائع کی ہے۔ قیمت صرف ۲۰ روپے۔

انور سدید

رِشتۂ کلام | محسن زیدی

"رشتۂ کلام" بھارت کے ایک ایسے شاعر کی غزلوں کا مجموعہ ہے جس نے ذات کے گنبدِ بے دَر سے پر فشاں ہو کر نئے مناظر کو گرفت میں لینے کی کوشش کی ہے۔ یہ شاعر محسن زیدی ہے۔ محسن زیدی کے ہاں تخلیقی سفر دو نہایتوں پر سفر کرتا ہے۔ اولاً وہ ذات کی آگہی کے لیے کوشاں ہے، ثانیاً اس کے ہاں کائنات منظر در منظر طلوع ہوتی ہے۔ ان دونوں کے امتزاج کی ایک صورت عصری آگہی میں ظاہر ہوئی ہے۔ چنانچہ کربِ ذات، آشوبِ کائنات، ماضی سے کٹ جانے کا الم، مستقبل کی ناآگہی، فرد کی تنہائی وغیرہ ایسے موضوعات ہیں جو محسن زیدی کے ان فطری انداز میں اُبھرتے ہیں اور شدید ردِ عمل کی پیٹ میں آجاتے ہیں، اتفاق کی بات یہ ہے کہ میں نے کچھ عرصہ قبل پاکستانی شاعر محسن نقوی کا مجموعۂ کلام "برگِ صحرا" پڑھا تو اس کے ہاں کربلا کا استعارہ نمایاں نظر آیا، بھارتی شاعر محسن زیدی نے بھی تاریخ کے اِس واقعۂ عظیم سے بہت زیادہ اکتساب کیا ہے۔ فرق یہ کہ محسن نقوی کے ہاں واقعۂ کربلا صحرا کے علائم و رموز سے نمایاں ہوا ہے اور محسن زیدی نے اس حادثے سے عصری صداقت کو اُبھارنے کی سعی

کی ہے۔ مثال کے طور پر ان کا صرف ایک شعر ملاحظہ کیجیے جو واقعۂ کربلا کی بالواسطہ عطا نظر آتا ہے۔

چاروں طرف بلند نشاں تیرگی کا تھا رکھا ہوا نصیل پہ سر روشنی کا تھا

محسن زیدی کے ہاں اسلوب کی پختہ کاری اظہار کی جذباتی کیفیت سے ہم آہنگ ملتی ہے، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ محسن زیدی کو اپنے تجربے کا نہ صرف عرفان حاصل ہے بلکہ وہ اسے لطافتِ فن سے شعر میں بھی پیش کر سکتا ہے۔ یہ کتاب مکتبہ جامعہ نئی دلّی سے دستیاب ہے اور قیمت صرف دس روپے ہے۔

انور سدید

راستے بھی چلتے ہیں | سُلطان سُبحانی

"راستے بھی چلتے ہیں" سلطان سبحانی کے افسانوں کا نیا مجموعہ ہے، سلطان سبحانی ایک ایسے نوجوان کا نام ہے جس نے اپنی زندگی کا بیشتر سفر بیسویں صدی کے ربع سوم میں طے کیا ہے چنانچہ اس نے ایک طرف انسان کی خلانوردی کا مشاہدہ کیا تو دوسری طرف اپنے گرد و پیش میں پھیلی ہوئی غربت کو دیکھا۔ ان دونوں مشاہدات میں جو بُعد المشرقین ہے اس نے سلطان سبحانی کے ہاں ایک عجیب سی زہرخند کیفیت پیدا کی ہے، وہ مسرتوں کو حاصل ہی نہیں کرنا چاہتا بلکہ انہیں تقسیم کرنے کی آرزو بھی کرتا ہے، تاہم جب زندگی اپنے اصلی روپ میں ظاہر ہوتی ہے تو وہ طنز کی زہرناکی سے بھی اپنا دامن چھڑا نہیں سکتا۔ "راستے بھی چلتے ہیں" درحقیقت زندگی کی حقیقی راہوں کا سفر ہے جسے سلطان سبحانی اجنبی نگاہوں سے طے کر رہا ہے اس راستے پر اُسے پھولوں سے کم اور ببولوں سے زیادہ واسطہ پڑا ہے۔ زیرِ نظر کتاب کے افسانے انہیں ببولوں کا حقیقت افروز تجزیہ کرتے ہیں، اور یوں قاری پر غور و فکر کے نئے در وا کر دیتے ہیں۔

سلطان سبحانی کے افسانے تاثر کی ڈولتی ہوئی کرن کو پکڑنے کی کوشش کرتے ہیں، یہ تاثر بعض اوقات چند جملوں میں سما جاتا ہے اور کسی کنکریٹ کردار کا سہارا تک نہیں لیتا، بعض اوقات یہی تاثر طویل افسانے کا روپ دھارتا ہے اور نہ صرف پوری صورتِ واقعہ کو ابھارتا ہے بلکہ کرداروں اور فضا کی تخلیق بھی کرتا ہے۔ اوّل الذکر صورت میں "واردات"، "خوشی کا احترام" اور "آئینہ" وغیرہ افسانوں کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ مؤخرالذکر کے تحت "سارہ اور ابراہیم"، "اے عشق کہیں لے چل" اور "منزل کہاں ہے" وغیرہ افسانے پیش کیے جا سکتے ہیں۔ دونوں صورتوں میں سلطان سبحانی حقیقت سے ٹکراتا ہے، ٹھوکر کھاتا ہے اور پھر راستوں کو ساتھ لے کر دوبارہ چل کھڑا ہوتا ہے۔ ہر چند یہ سفر کچھ زیادہ خوش گوار نہیں تاہم اس کا اسلوبِ بیان شاعری سے مملو نظر آتا ہے، جس سے کبھی کبھی تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ سلطان سبحانی حقیقت کی جراحت سے گلاب اُگانے کی کوشش کر رہا ہے۔

یہ کتاب مکتبہ اُردو، اسلام پورہ مالیگاؤں سے شائع ہوئی ہے اور قیمت صرف دو روپے پچاس پیسے ہے۔

انور سدید

شعلوں کا شجر | چندر بھان خیالؔ

"شعلوں کا شجر" اُردو ادب کے ایک تازہ وارد شاعر چندر بھان خیالؔ کا اوّلین مجموعۂ شعر ہے۔ اسے پڑھ کر سب سے پہلے یہ احساس

جاگتا ہے کہ چندر بھان خیال نے شاعری کے ریاض میں خاصہ وقت صرف کیا ہے اور جدید کہلانے کے لئے فن کی حدود کو دانستہ توڑنے کی سعی نہیں کی، دوسری بات یہ کہ اس نے نہ صرف معاصر شاعری سے استفادہ کیا ہے بلکہ بعض مقبول آوازوں کو اپنے پیکر میں سمونے کی کوشش بھی کی ہے چنانچہ اس کی نظمیں پڑھتے ہوئے خیال کبھی فیض کی طرف اور کبھی منیر نیازی کی طرف بے اختیار چلا جاتا ہے، جدیدیت کا ایک زاویہ اس کا رخ وزیر آغا کی طرف اور ترقی پسندی ساحر لدھیانوی کی طرف بھی موڑتی ہوئی نظر آتی ہے، تاہم خوشی کی بات یہ ہے کہ چندر بھان کی ایک اپنی پہچان بھی ہے اور اکثر نظموں میں اس نے نہ صرف جذبے کے بہاؤ کو قائم رکھا ہے بلکہ انہیں ایک الگ اسلوب میں پیش کرنے کی سعی بھی کی ہے۔ محمود ہاشمی نے اسے بجا طور پر "نجی معصومیت" قرار دیا ہے اور ڈاکٹر شمیم حنفی نے لکھا ہے کہ "شعلوں کا شجر" اس طلسمی شجر کا عکس ہے جو شاعر کے باطن کی مٹی سے نمودار ہوا ہے۔ چنانچہ جب وہ کہتا ہے کہ

"میری پسلی میں جما ہے کئی شہروں کا سکوت"

تو صاف نظر آتا ہے کہ وہ اس تجربے کو بیان کر رہا ہے جس کا ذائقہ چندر بھان خیال کی زبان نے چکھا ہے اور جسے صرف چندر بھان خیال ہی "نجی معصومیت" سے بیان کر سکتا ہے۔

غزل کی گہما گہمی میں نئے شعرا نظم کی طرف بہت کم متوجہ ہو رہے ہیں۔ چندر بھان خیال خالصتاً نظم کا شاعر ہے۔ اُردو نظم میں اس کی آمد خوش آئند ہے۔ مجھے یقین ہے کہ "سمندر کا سکوت"، "نئی روشنی کے خواب"، "شورِ شبستاں"، "خاموشی کا ورد"، "پہیلی جو صبح" وغیرہ نظمیں لکھنے پر اسے ضرور داد ملے گی۔

یہ کتاب سٹار پبلی کیشنز ۱۲۷۴ دہلی گیٹ، نئی دہلی سے شائع ہوئی ہے۔ قیمت دس روپے

انور سدید

دائرہ سے باہر | شفیع جاوید

شفیع جاوید اُردو افسانے کا ایک نیا نام ہے اور یہ ادب کے افق پر اس وقت طلوع ہوا جب کہانی کی ہیئت میں کئی تبدیلیاں رونما ہو چکی تھیں، ادبی طور پر شفیع جاوید نے اپنے تخلیقی سفر کا آغاز ماہنامہ "افق" اور "بیسویں صدی" سے کیا لیکن اس کے فن کی صحیح جہت "شبخون" نے متعین کی، چنانچہ اب اس کے ہاں افسانہ صرف کہانی بیان کرنے کا ہی وسیلہ نہیں رہا بلکہ یہ اس تفکر کا اظہار بھی ہے جو گذشتہ ربع صدی میں پروان چڑھا اور اب مختلف مسائل و افکار کی صورت میں پورے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے رہا ہے۔ شفیع جاوید نے بھی کائنات کو سوچتی آنکھوں سے دیکھا ہے اور ان سوالات کو اُبھارا ہے جن کا حل اس دور کے انسان کی ایک بنیادی ضرورت ہے۔ "وقت کے اسیر"، "ایپ ٹاف"، "دائرہ سے باہر"، "اینگل لے ای"، "کٹھ پتلیاں" وغیرہ چند ایسے افسانے ہیں جن میں افسانہ نگار اپنی سوچ کو ہی راہنما بناتا ہے اور مادہ، روح اور سماج کی تثلیث میں آہنگِ معنوی پیدا کرنے کی سعی کرتا ہے۔ اس زاویے سے دیکھئے تو شفیع جاوید کے افسانے جمالیاتی حظ مہیا کرنے کے بجائے سوچ کو مہمیز لگاتے ہیں، یہی شفیع جاوید کی تخلیق کاری کا مقصد ہے اور وہ اس میں خاصا کامیاب نظر آتا ہے۔ یہ کتاب پندرہ روپے میں مکتبہ جامعہ نئی دہلی سے دستیاب ہے۔

انور سدید

زیرِ بار | شاہد کلیم

"زیرِ بار" ایک اُبھرتے ہوئے نوجوان شاعر شاہد کلیم کے رشحاتِ فن کا پہلا مجموعہ ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاہد کلیم ناآگہی کے جنگل کا اسیر ہے اور اندھیرے کی گرد سے روشنی کی کرن کو تلاش کر رہا ہے۔ مثال کے طور پر اس کے ہاں یہ احساس غالب ہے کہ

میں کھو گیا ہوں اندھیروں کے جنگلوں میں کلیم　　　مرے وجود کا پرتو سیاہ رنگ میں ہے

اور آرزو یہ ہے کہ

کورے کاغذ پہ مرا نقش اتارے کوئی　　　ایک مبہم سا میں خاکہ ہوں ابھارے کوئی

دلچسپ بات یہ ہے کہ غزل میں شاہد کلیم پر ایک واضح خوف طاری نظر آتا ہے لیکن جونہی وہ نظم کی وادی میں قدم رکھتا ہے تو خوف کی فضا چھٹ جاتی ہے اور آسمان کی پھیلی ہوئی نیلگوں چادر دُور دُور تک روشنی بکھیرنے لگتی ہے۔ مناظر مجسّم اور متشکل ہو کر سامنے آتے ہیں اور سرّیت اور تہہ داری کے باوجود اس کے ہاں کشادگی نظر آتی ہے۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ شاہد کلیم ابھی تک اپنے آپ کو تلاش کر رہا ہے اور توقع کی جا سکتی ہے کہ جب وہ ناآگہی کے اندھیرے سے نکلے گا تو کندن بن چکا ہو گا۔ کتاب کا خوبصورت سرورق سلطان سبحانی نے بنایا ہے اور اسے شبستانِ ادب گیا (بہار) نے شائع کیا ہے۔ قیمت دس روپے ہے۔

انور سدید

شعلۂ نیم سوز | فضا ابن فیضی

فضا ابن فیضی بھارت کے ان قادر الکلام شعرا میں سے ہیں جن کے فن کی داد تمام اساتذۂ ادب نے دی ہے، وجہ یہ کہ انہوں نے شاعری کا فریضہ محض جذبے کی اساس پر ادا نہیں کیا بلکہ اس کے لئے ریاضِ فن بھی پوری جانکاہی سے کیا اور اسے فارسی اور عربی کے گہرے مطالعے سے تقویت بھی بہم پہنچائی، چنانچہ "شعلۂ نیم سوز" کی شاعری میں الفاظ جذبے کے تابع فرمان ملتے ہیں اور شاعر ہر خیال کو نزاکت اور رعنائی سے شعر عطا کرنے پر قادر نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر نورالحسن انصاری نے درست لکھا ہے کہ "ان کے کلام میں معلقات کی شوکتِ لفظی، متنبّی کی معنی آفرینی اور حریری کی اُنا ہے"۔

فضا ابن فیضی کی فنی تربیت چونکہ فارسی اور عربی کے گہوارے میں ہوئی ہے اس لئے ان کی شاعری کا مجموعی مزاج کلاسیکی ہے، وہ ایک مضمون کو سو رنگ میں باندھتے ہیں اور ہر رنگ کے لئے لفظیات، تراکیب، علامات اور رموز کے نئے نئے پیکر سجاتے ہیں۔ شوکتِ الفاظ ان کی اعلیٰ نو بیانی کو تحرک بھی عطا کرتا ہے اور گویائی بھی، چنانچہ جب وہ طویل نظم لکھتے ہیں تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے ایک موجِ تیز رو طغیانِ خیال کو مہمیز لگا رہا ہے اور ان کا راہوارِ فکر بصیرت و آگہی کی منزلوں کو کامیابی سے طے کرتا ہوا اُڑتا چلا جا رہا ہے۔ اگرچہ شاعری کی جدید روایت نے نظم کا مزاج یکسر بدل ڈالا ہے لیکن فضا ابن فیضی نے کلاسیکی انداز قائم رکھا اور ذات کو اہمیت دینے کے بجائے کائنات کے خارج کو اہمیت دی اور معاشرتی موضوعات پر اپنا ردِ عمل بلا کم و کاست بیان کر دیا۔ ان کے لہجے میں سرگرمی، اظہار میں بے باکی اور گفتار میں صداقت ہے اور وہ ایک بڑے طبقے کو آج بھی متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اہم بات یہ کہ جب وہ معاشرے پر طنز کے تیر برساتے ہیں

تو حالیؔ اور اکبرؔ کے قبیلے کے فرد دکھائی دیتے ہیں اور ان کی مقصدی شاعری کمالِ فن کو چھوتی ہوئی نظر آتی ہے۔

"شعلۂ نیم سوز" فیض پبلی کیشنز، مئو ناتھ بھنجن (یوپی) سے شائع ہوئی ہے۔ طباعت اور گٹ اپ معیاری ہے۔ قیمت ۲۵ روپے

انور سدید

نظرات | وقار احمد رضوی

ہمارے ہاں عرصے سے اس خیال کو ترویج دینے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ "اُردو ادب میں تنقید کا وجود موہوم ہے" وجہ یہ کہ ہمارے بیشتر ناقدین نے عملی تنقید کے نمونے تو وافر مقدار میں مہیا کئے ہیں لیکن تنقیدی اصولوں پر اجتماعی نظر ڈالنے کی کوشش بہت ہی کم کی ہے۔ چنانچہ اُردو تنقید میں الطاف حسین حالی اب بھی ایک مینارۂ نور کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کا مقدمۂ شعر و شاعری اب بھی اصولِ نقد کی اوّلیں اہم اور مربوط کاوش نظر آتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ فراق گورکھ پوری، سید احتشام حسین، آلِ احمد سرور، مجنوں گورکھ پوری، ڈاکٹر سید عبداللہ اور ڈاکٹر وزیر آغا نے مختلف ادبی مباحث کو اپنے منفرد نظریات کی روشنی میں جلا بخشی اور بین السطور تنقید کے ایسے اصول بھی وضع کئے جن سے عملی تنقید میں معاونت ملی اور نئے نقادوں نے انہیں اصولوں کی روشنی میں ادب کی وضاحت کی۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے اصنافِ ادب کا داخلی مزاج اور تخلیقی عمل کی ماہیت تلاش کی لیکن ان کی نوعیت الگ ہے، متذکرہ صدر ادبا کی خدمات بلاشبہ قابلِ قدر ہیں تاہم اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ ان کے نظریات بکھرے ہوئے ہیں چنانچہ اصولِ تنقید پر ایک مربوط کتاب کی کمی عرصے سے محسوس کی جا رہی تھی سید وقار احمد رضوی نے "نظرات" لکھ کر اس کمی کو مقدور بھر پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔

اصولِ نقد کی کتاب "نظرات" کل پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں "ادب کیا ہے" پر بحث کی گئی ہے۔ دوسرا باب ادبی تنقید کا مفہوم متعین کرتا ہے، تیسرے باب میں شعر کی ماہیت دریافت کی گئی ہے، چوتھے باب میں قدامہ بن جعفر کے نظریات کا اجمالی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ آخری باب جذبہ، خیال، مواد، ہیئت اور اسلوب کے مسائل پر تفصیلی روشنی ڈالتا ہے۔ اِس اجمال سے واضح ہو جاتا ہے کہ وقار احمد رضوی نے خاصے بڑے کینوس پر کام کیا ہے۔ ان کی انفرادی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے کسی مخصوص دبستان کی پیروی کرنے کے بجائے تنقیدِ ادب کے اصول غیر جانبداری سے متعین کئے ہیں اور پیرویٔ مغرب کے اس دور میں مشرق کے تنقیدی پیمانوں کی وضاحت نسبتاً زیادہ کی ہے۔ اس لحاظ سے یہ کتاب مشرق اور مغرب کے سرچشموں کو استعمال میں لاتی ہے اور قاری کو واضح نتیجے تک پہنچنے میں مدد دیتی ہے۔ وقار احمد رضوی کا معروضی زاویہ نظر اس کتاب کی ایک اور اضافی خوبی ہے اور ان کی محنت پر بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ یہ کتاب مکتبہ دانیال کراچی سے بیس روپے میں دستیاب ہے۔

انور سدید

سوچتی آنکھ کا ارژنگ | سید یٰسین قدرت

ارضِ ساہیوال میں مجید امجد مرحوم کے دولت خانۂ خیال پر میں پہلی بار سید یٰسین قدرت سے ملا تو مجید امجد نے تعارف کچھ اس انداز میں کرایا کہ سید یٰسین قدرت کے من کی جوالا ان کے چہرے پر اور اس کی تیز آنچ ان ... لو دیتی ہوئی نظر آتی ہے، بلاشبہ اس روز بھی انہوں

نے فیلٹ اوڑھ رکھی تھی اور عینک کے محدب شیشوں سے وہ دور کی چیزوں کو زیادہ غور سے دیکھ رہے تھے تاہم وہ مجھے کسی زاویے سے بھی ڈنکرک کے محاذ سے بھاگے ہوئے شخص نظر نہیں آئے۔ میں ان کی غزلوں کا بہت پرانا قاری ہوں اور رسائل جرائد اور اخبارات کے ادبی ایڈیشنوں میں ان سے متعدد بار ملاقات کر چکا ہوں۔ وہ ہمیشہ مجھے ایک ایسے باہمت شاعر نظر آئے جو اپنے پروں کو پھیلا کر اڑنے اور جلوسِ جہاں میں اپنی پہچان صرف اپنے فن سے کروانے کی سعی کر رہے ہیں۔ "سوچتی آنکھ کا ارژنگ" ان کی شاعری کا نادرہ کار روپ سامنے لاتی ہے۔ اس کتاب میں سید یٰسین قدرت رس گھولتی کرن کو پکڑنے کی سعی ہی نہیں کرتے بلکہ مآلِ زمانہ سے بھی نبرد آزما نظر آتے ہیں۔ یہ دو زاویے سید یٰسین قدرت کی انفرادیت کا مظہر ہیں اور انہوں نے بوقلمونیِ اظہار کا جو سماں باندھا ہے "سوچتی آنکھ کا ارژنگ" اس کی ایک خوبصورت تمثیل اور پوری کتاب روپ، رنگ اور رعنائی کا پیکرِ لطیف ہے، خوبصورت اتنی کہ ہاتھ لگائے میلی ہو۔ مکتبۂ ادبِ لطیف لاہور سے بتیس روپوں میں دستیاب ہے۔

انور سدید

اقبال از مولوی احمد دین | مرتّبہ مشفق خواجہ

زیرِ نظر کتاب نامور محقق مشفق خواجہ کی علمی جستجو اور تحقیقی کاوش کا بے حد قیمتی ثمر ہے، یہ کتاب اس زمانے میں لکھی گئی جب اقبال کی شہرت اکنافِ ہند میں پھیل چکی تھی اور ان کے مداحوں کا حلقہ وسیع تر ہو چکا تھا۔ مولوی احمد دین کا شمار بھی ان لوگوں میں ہوتا ہے جو اقبال کے ہم عصر اور مداح تھے، چنانچہ انہوں نے اس دور میں جب "بانگِ درا" ابھی شائع نہیں ہوئی تھی، اقبال کا اُردو کلام رسائل سے جمع کیا اور اس کے فکری اور فنی محاسن پر ایک گہری نظر ڈال کر کتاب چھپوا دی۔ شواہد بتاتے ہیں کہ مولوی احمد دین کی اس کاوش کو علامہ اقبال نے استحسان کی نظر سے نہیں دیکھا چنانچہ فاضل مؤلف نے اس کتاب کو شائع کرنے کے بجائے اس کے تمام نسخے تلف کر دیئے۔ "بانگِ درا" کی اشاعت کے بعد دوبارہ شائع ہوئی تو اس کی صورت بدل چکی تھی، مشفق خواجہ نے طبع اوّل کا بوسیدہ اور آب رسیدہ نسخہ تلاش کیا، اس کا مقابلہ ترمیم شدہ ایڈیشن سے کیا اور اب جو نیا ایڈیشن شائع ہوا ہے اس میں دونوں نسخوں کو بڑی خوبی سے یکجا کر دیا گیا ہے۔ کتاب کا ایک اور قیمتی حصہ اس کا خیال افروز مقدمہ ہے جو نہ صرف مولوی احمد دین کو حیاتِ نو عطا کرتا ہے بلکہ اس دور کی پوری ادبی زندگی کا احاطہ بھی کرتا ہے اور اقبال کے علاوہ اطرافِ اقبال پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔ مولوی احمد دین کی زیرِ نظر کتاب میں اقبال پر پہلی مربوط نظر ڈالی گئی تھی، اس لئے اس کی تاریخی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ اہلِ ادب مشفق خواجہ کے ممنون ہیں کہ انہوں نے اس گم شدہ کتاب کو تلاش کیا اور فکر و فنِ اقبال کے بعض اوّلین صورتوں تک رسائی کا موقع عطا کیا۔ اس علمی کتاب کی اشاعت کا فریضہ انجمن ترقی اُردو پاکستان نے ادا کیا ہے۔ قیمت چالیس روپے ہے۔

انور سدید

جدیدیت یا مغربی گمراہیوں کی تاریخ کا خاکہ | محمد حسن عسکری

اُردو ادب میں محمد حسن عسکری ایک متنازعہ فیہ نقاد اور ادیب کی حیثیت میں پہچانے گئے ہیں۔ ایک دور میں ان کے بارے میں مشہور تھا کہ ادب میں جو شوشہ بھی اُٹھتا ہے اس کا ماخذ محمد حسن عسکری ہوتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ عسکری صاحب کا فکری اور ادبی سفر کسی ایک پڑاؤ پر رُکے بغیر مسلسل سرگرم رہا ہے، چنانچہ وہ افسانے سے تنقید کی طرف آئے، اور پھر اچانک ان کا رُخ دین کی طرف ہو گیا۔ عمر کے

آخری حصے میں انہوں نے ایک مفکر کی حیثیت میں مغربی گمراہیوں کا خاکہ مرتب کرنے کی سعی کی اور اس میں زیادہ تر راہنمائی الفیلسوف اعلم .... رینے گینوں سے جن کا اسلامی نام عبدالواحد یحییٰ ہے حاصل کی۔ عسکری صاحب کے پیشِ نظر مولانا اشرف علی تھانوی کا یہ قول تھا کہ "اب اسلام کی حفاظت کرنے والے مغرب سے اٹھیں گے"۔ چنانچہ جب انہوں نے رینے گینوں کا مطالعہ کیا تو انہیں احساس ہوا کہ مغرب سے اسلام کی حفاظت کرنے والے لوگوں میں رینے گینوں کا شمار بھی ہو سکتا ہے۔ رینے گینوں نے من جملہ دیگر امور کے اس حقیقت کو زیادہ واضح کیا ہے کہ مغرب کے بعض جدید فلسفی بظاہر مذہب پسند نظر آتے ہیں لیکن درحقیقت وہ سب مادیت پسند ہیں۔ عسکری صاحب نے بھی اس خطرے کو زیرِ نظر کتاب میں نمایاں کیا ہے اور یوں برگساں، فرائیڈ اور ینگ وغیرہ پر گہری تنقید کی ہے۔

زیرِ نظر کتاب دو طویل مقالوں پر مشتمل ہے لیکن ان کی حیثیت پوری کتاب کی نہیں بنتی، یہ مقالے بعض بلیغ اور گہرے اشاروں کی صورت میں لکھے گئے ہیں۔ اس سے عسکری صاحب کے بنیادی فکر کی طرف راہنمائی تو ملتی ہے لیکن ان سب امور میں عسکری صاحب سے اتفاق کامل ضروری معلوم نہیں ہوتا، مثال کے طور پر مشرق کے رُوحانی مزاج کی فوقیت بجا لیکن مغرب کے عقلی رویّے اور سائنسی دریافتوں سے منہ موڑنے کا جواز بظاہر نظر نہیں آتا۔ چنانچہ ڈاکٹر محمد اجمل نے پیشِ لفظ میں درست لکھا ہے کہ ان اشاروں میں تفصیلات بھرنے کی ضرورت ہے۔ یہ تفصیلات اگر فراہم ہو جائیں تو جدیدیت ایک ایسی تحریک بن جاتی ہے جو خطِ مستقیم میں سفر کر رہی ہے اور ارتقائے انسانی کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ عسکری صاحب کی یہ کتاب ان کے کرختداری اسلوب کی نمائندگی بھی نہیں کرتی۔ تاہم یہ قاری کو سوچ کا مواد بہم پہنچاتی ہے اور اسے ذہن کی کھڑکیاں کھول کر پڑھنا ضروری ہے۔

اُجلی کتابت و طباعت میں یہ کتاب عصمت مینشن، امیر روڈ، راولپنڈی سے دستیاب ہے۔ قیمت ۲۲ روپے

انور سدید

ردِّ کفر | علیم صبا نویدی

جناب علیم صبا نویدی کی نئی کتاب "ردِّ کفر" کی ابتدا مرزا غالب کے اس شعر سے ہوئی ہے ؎

بقدرِ شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل   کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لئے

علیم صبا نے وسعت کے اس تقاضے کو غزل کے بعض آزاد روّیوں سے ہمکنار کر کے پورا کیا ہے۔ آزاد غزل کا تجربہ کچھ عرصہ قبل مظہر امام نے بڑی وجاہت اور اہتمام سے سرانجام دیا تھا۔ تاہم اسے قبولِ عام شاید حاصل نہ ہو سکا۔ اب علیم صبا نویدی نے آزاد غزلیات کی متذکرہ بالا کتاب پیش کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ یہ تجربہ ابھی سرگرم عمل ہے۔ اور بعض شعرا اسے سنجیدگی سے اظہار کا وسیلہ بنا رہے ہیں۔ اس زاویے سے یہ کتاب ان لوگوں کے لئے دلچسپی کا باعث ہو گی جو یہ سمجھتے ہیں کہ غزل کی ہئیت میں تبدیلی ممکن نہیں۔ علیم صبا نویدی نے غزل کے ہر شعر کی منفرد حیثیت کو تو برقرار رکھا لیکن بحور کے ارکان میں مناسب تبدیلی کر دی اور یوں جذبے کے آگے جو بند سا بندھ جاتا ہے اس میں وسعت کے امکانات پیدا کر دیئے۔ یہ تبدیلی اس لئے اجنبی نظر نہیں آتی کہ علیم صبا نویدی نے قافیہ اور ردیف کی پابندی سے انحراف نہیں کیا۔ اس لحاظ سے ان کی آزادی غزل کی پابندیوں کو بھی قبول کرتی ہے اور "ردِّ کفر" نظر نہیں آتی۔

یہ کتاب اُردو کے ایک دور افتادہ خطّے تامل ناڈو مدراس سے شائع ہوئی ہے۔ قیمت دس روپے۔ ملنے کا پتہ۔ ساؤتھ انڈیا اُردو اکادمی مدراس

غبارِ کارواں | محمد حیات خان سیال

تخلیقِ ادب کے ساتھ ساتھ اگر اس کا انتخاب اور تالیف سلیقے سے پیش کئے جائیں تو ادب کی ترقی و ترویج کا باعث ہوں گے بشرطیکہ انتخاب اور تالیف کے پیچھے ایسا ذہن ہو جو نہ صرف ادب کا شاق شناور ہو بلکہ تہہ تک اُترنے کا حوصلہ اور سچے جھوٹے موتیوں کی پہچان بھی رکھتا ہو۔ مقامِ مسرت ہے کہ اس معیار پہ محمد حیات خان سیال ہر اعتبار سے پورے اُترتے ہیں۔ ادب کے قاری جانتے ہیں کہ اس سال حیات سیال صاحب نے اس کتاب سے پہلے دو مجموعے اور بھی مرتب کیے تھے۔ ان میں سے ایک مجموعہ پروفیسر تقی الدین انجم کی شاعری کا تھا اور دوسرا مجید امجد کی شاعری کا انتخاب تھا جسے مکتبہ میری لائبریری نے "گلاب کے پھول" کے عنوان سے شائع کیا۔ اوّل الذکر مجموعہ کو حال ہی میں سرگودھا بورڈ نے سالِ رواں کی بہترین کتاب قرار دے کر اوّل انعام دیا ہے۔ مؤخر الذکر انتخاب کی پذیرائی اس سے بڑھ کر کیا ہوگی کہ اس کی گونج دُور دُور تک سنائی دیتی ہے۔

"غبارِ کارواں" ان شعری تخلیقات کا انتخاب ہے جو جھنگ کالج کے سابقہ طلباء نے دورانِ تعلیم کہیں یا بعد میں لکھ کر خود شہرت پائی اور اس درسگاہ کے لئے باعثِ فخر و مباہات بھی بنیں۔ ان طلباء میں جہاں سید جعفر طاہر، شیر افضل جعفری، مجید امجد، خضر تمیمی اور ڈاکٹر وزیر آغا ایسی قدآور ادبی شخصیت ہیں وہاں صاحبزادہ رفعت سلطان، افضل حسین اظہر، رحمان فراز، صفدر سلیم سیال اور خواجہ محمد ذکریا ایسے مورازیب بھی ہیں۔ ان سے بعد میں آنے والے طلباء میں ریاض رام، محمود شام، نصر اللہ اور اثر ترمذی جدید شعراء میں جانے پہچانے نام ہیں۔ اساتذہ جو جھنگ کالج سے متعلق ہیں یا متعلق رہے ہیں ان میں تقی انجم ——— حمید عسکری انور، ابوبکر صدیقی اور سمیع اللہ قریشی کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ دیگر شعرائے جھنگ میں ساحر صدیقی، طاہر سروصنوی، غلام حبیب پیرنگ، عبدالعزیز خالد، مظفر علی ظفر، وزیری پانی پتی وہ شاعر ہیں کہ جن کی تخلیقات اپنا مقام اور درجہ رکھتی ہیں۔ نوجوان شعراء میں شارب انصاری، معین تابش، خادم رزمی، احمد تنویر اور علی اکبر عباس وہ نام ہیں جو نئی غزل کے لئے باعثِ افتخار ہیں۔ محمد حیات خان سیال اس کامیاب تالیف پر مبارکباد کے مستحق ہیں۔

"غبارِ کارواں" صاف ستھری کتابت و طباعت میں سنگ میل پبلی کیشنز لاہور سے بارہ روپے میں دستیاب ہے۔ ضخامت ۱۲۰ صفحے ہے۔

سجاد نقوی

وہ بات | رفعت نواز

رفعت نواز ان افسانہ نگاروں کی صف سے تعلق رکھتے ہیں جنہوں نے برصغیر کی تقسیم کے بعد افسانہ لکھا اور بہت جلد نام اور شہرت پائی۔ ہر چند رفعت نواز نے بہت کم لکھا مگر جو لکھا اسے پہلے اپنی ذات کا حصہ بنایا اور پھر اسے کسی تصنّع یا بناوٹ کے بغیر فن کا مادہ حسنِ خلوص کے ساتھ ایک روحانی تجربہ بنا کر پیش کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے سادہ بیانیہ میں بھی سادگی کی پُرکاری کے ساتھ ساتھ تاثیر کی دلکشی پائی جاتی ہے۔ وہ چھوٹی سی چھوٹی بات کو اس آسانی سے پُرتاثیر بنا دیتے ہیں کہ مدت تک قاری اس کے سحر سے نکل نہیں پاتا۔ یہ خوبی بہت کم افسانہ نگاروں کو حاصل ہے کہ چھوٹے سے کینوس پہ چند رنگوں سے تصویر مکمل کر لی جائے۔ رفعت نواز میں یہ خوبی انہیں اپنے معاصرین سے منفرد کرتی ہے۔ اس خوبی کا انہیں بھی احساس ہے چنانچہ "پہلی بات" میں لکھتے ہیں:

"کہانیاں درخت ہیں جو زندگی کی زمین سے پھوٹتی ہیں
تجربہ ان درختوں کی آبیاری کرتا ہے کہ یہ ہر دم ترو تازہ رہیں۔
اور مناسب و موزوں طرزِ اظہار انہیں بدلتے موسموں کی دست بُرد سے محفوظ رکھتا ہے"۔

اس مجموعے میں کم از کم 'ماسٹر جی'، خالی جگہ'، 'وہ بات' اور 'مٹی' رخت نواز کی یقیناً ایسی کہانیاں ہیں جو زندگی کی زمین سے پھوٹتی ہیں، تجربے نے ان کی آبیاری کی ہے اور موزوں طرزِ اظہار نے انہیں وہ تازگی عطا کی ہے جسے بدلتے موسم بھی گہنا نہیں سکتے۔ ان کہانیوں میں 'مٹی' ایک ایسی کہانی ہے جسے بلاشبہ اُردو کی زندہ رہنے والی کہانیوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

"وہ بات" کی اشاعت میں مہاراشٹر اُردو اکادمی کا مالی تعاون شامل ہے۔ اس کے ناشر نفیس پبلی کیشنز، ۲ اورنگ آباد ہیں۔ ضخامت سو صفحے ہے اور قیمت پانچ روپے ہے۔

سجاد نقوی

چند تعلیمی تصوّرات | پروفیسر شبیر علی کاظمی

سید شبیر علی کاظمی نے اپنی زندگی کے تیس برس درس و تدریس میں گزارے ہیں۔ ان میں سے پچیس برس انہوں نے مشرقی پاکستان میں تالیف و تصنیف کے نذر کیے۔ ان خدمات کے اعتراف میں انہیں ۱۹۶۵ء کا داؤد ادبی انعام اور حکومتِ پاکستان کی طرف سے تمغۂ امتیاز کا صدارتی اعزاز بھی ملا۔ "چند تعلیمی تصوّرات" کاظمی صاحب کے اس مطالعہ کا نتیجہ ہے جو انہوں نے ۱۹۷۱ء سے اب تک اپنے کراچی کے قیام میں کیا ہے۔ ہر چند یہ سات آٹھ برس ان کی زندگی کے بڑے کڑے سال ہیں کہ ہر دم ان کے سامنے اپنے تین جوان بیٹوں اور داماد کا غم جو سقوطِ ڈھاکہ کے وقت مشرقی پاکستان میں رہ گئے تھے، مستقل چھایا رہا ہے مگر اس سانحہ نے انہیں یہ سوچنے پر مجبور کیا ہے کہ آخر دنیا کے عظیم اسلامی ملک کے اس قومی حادثہ کا کیا سبب تھا؟ ان کے الفاظ میں "میں یہ اپنے ذاتی علم سے کہہ سکتا ہوں کہ مشرقی پاکستان کا حادثہ پاکستانی نظام تعلیم کے ساختہ پرداختہ نوجوانوں کے دوش پر آگے بڑھا۔ اغیار کی ریشہ دوانیاں کامیاب ہوئیں کیونکہ پاکستانی تعلیم قومی کردار سازی سے معذور رہی تھی۔ پاکستان کے نظریاتی دفاع میں ہماری تعلیم ناکام اور کمزور ثابت ہوئی۔ باقی ماندہ پاکستان میں بھی اس کی ناکامی کے آثار بیّن طور پر نمایاں ہیں یعنی قومی یگانگت کی عدم موجودگی ہمارے تعلیمی نظام کا نتیجہ ہے"۔ یہ کتاب اس تجربے کا پُرخلوص اور دردمندانہ اظہار ہے۔ ہر چند اس کتاب کا بیشتر حصہ سرجان آدم کی تصنیف 'رہنمائے متعلم' اور پی این کی کتاب 'رہنمائے معلم' کے ترجمے پر مشتمل ہے مگر اسے حسب حال اور مفید مطلب بنانے کے لیے جو ابواب مصنف نے اپنی طرف سے اضافہ کیے ہیں ان سے کتاب کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے۔ لطف کی یہ بات بھی ہے کہ ترجمے کیے ہوئے ابواب اور طبعزاد ابواب میں زبان و بیان کی کوئی مغائرت نہیں پائی جاتی۔ یہ خوبی اس بات کی دلیل ہے کہ مصنف نے جو بھی پڑھا ہے اسے پہلے اپنی ذات میں رچنے بسنے کی اجازت دی ہے لہٰذا بعد میں جب اسے اردو میں منتقل کیا ہے تو لب و لہجہ کی وہ مخصوص بو باس از خود پیدا ہو گئی ہے جو طبعزاد تحریر ہی میں محسوس کی جا سکتی ہے۔ اس خوبی کی وجہ سے یہ خالصتاً فنی موضوع کی حامل کتاب ان لوگوں کے لئے بھی جو شعبۂ تعلیم سے وابستہ نہیں ہیں، دلچسپی سے خالی نہیں ہے اور وہ لوگ جو درس و تدریس سے وابستہ ہیں ان کے لئے تو یہ نہ صرف مثبت سوچ کی طرف رہنمائی کرتی ہے بلکہ منزل کی بشارت بھی دیتی نظر آتی ہے۔

یہ کتاب نیشنل بک فاؤنڈیشن نے خوبصورت ٹائپ میں شائع کی ہے۔ ۲۲۴ صفحے کی کتاب کی قیمت ۳۲ روپے ہے جو غیر مجلد ہونے کی صورت میں یقیناً بہت زیادہ ہے۔

سجاد نقوی

تبسّم | رام لعل نابھوی

رام لعل نابھوی یقیناً ان خوش نصیبوں میں سے ایک ہیں جن کا بڑھاپا بھی جوانوں ایسا ہوتا ہے۔ اس کی وجہ ان کا اُردو زبان و ادب سے عشق ہے۔ اس پر مستزاد اللہ تبارک کی عطا کردہ حسِ مزاح ہے جس نے انہیں جوانوں سے بھی زیادہ جوان بنا دیا ہے۔ 'تبسّم' ان کے انہی جوان جذبوں سے عبارت ہنستے چہکتے مضامین کا گلدستہ ہے۔ میں نے ان مضامین کو ایک ہی نشست میں پڑھا ہے۔ ان میں دو خاص خوبیاں مجھے نظر آئی ہیں۔ ایک تو یہ کہ رام لعل نابھوی کا شگفتہ بیانی کا اپنا اسلوب ہے۔ عام طور پر کسی خاص صنف میں لکھنے والے پر دوسرے لکھنے والوں کے اثرات بھی نظر آجاتے ہیں مگر رام لعل نابھوی کا مزاج کسی دوسرے سے اثر کے بجائے خود اُن کی ذات سے پھُوٹتا ہے۔ ان کی ذات میں انسان کے لئے محبت اور محبت بھی ایسی جو رنگ، نسل اور ذات کے فرق سے نا آشنا دوسرے کی خوشی اور غم میں برابر شریک ہونے کو اپنا ایمان سمجھتی ہے، نابھوی صاحب کے ان مضامین میں بھی اپنی لو دیتی نظر آتی ہے۔ ذات کی اس کوملتا کی وجہ سے رام لعل نابھوی کے مضامین میں جہاں کہیں طنز بھی در آئی ہے اس کی زہرناکی پہ ان کی فطری کوملتا اور شیرینی حاوی ہو گئی ہے۔ شاید یہ وہی مقامات ہیں جنہیں ڈاکٹر وزیر آغا نے پل صراط سے تعبیر کیا ہے اور لکھا ہے کہ "درمیان میں وہ چند ایک مقامات پر ڈانوا ڈول سے ہوئے اور ایک آدھ جگہ لڑکھڑائے بھی مگر وہ گرے نہیں اور مزاح کی مملکت میں تلوار کی دھار پر سے خود کو گرنے نہ دینا کوئی معمولی بات نہیں"۔ ان مضامین کی دوسری خوبی 'خود کلامی' ہے جو ہر مضمون میں قاشوں کی صورت مگر اعداد سے ملاقات میں تمام تر موجود ہے۔ اسی خود کلامی نے بعض مضامین میں مکالمے کی صورت بھی پیدا کر لی ہے۔ مثال میں لفافہ، مہمان اور ملاقات مکالماتی اسلوب میں لکھے گئے خوبصورت مضامین مزاح کا بلند معیار پیش کرتے ہیں۔

اس کتاب کے ناشر خود مصنف ہیں۔ ۱۲۴ صفحات پر مشتمل کتاب کی قیمت پندرہ روپے ہے۔

سجاد نقوی

بے برکت دُعائیں | اعجاز راہی

میں اعجاز راہی کا شمار ایسے ادیبوں میں کرتا ہوں جو اپنی ادبی شخصیت آہستہ روی سے اور بتدریج منواتے ہیں اور پھر اپنا سکّہ تادیر جاری رکھتے ہیں۔ ادب میں اعجاز راہی کی اوّلیں نمود افسانے میں ہوئی۔ "تیسری ہجرت" اس کے افسانوں کا پہلا مجموعہ تھا۔ تاہم اسی دوران میں جب اس کی نظمیں "کالے موسموں کی آخری رات"، "سوال سوال سیاہ کشکول" اور "زندہ رہنے کا اسمِ اعظم" وغیرہ شائع ہوئیں تو اہلِ ادب نے اس مضطرب رُوح کا مشاہدہ بھی کیا جو افسانے کے علاوہ شاعری میں بھی اظہار کے لئے بے تاب تھی، یوں افسانے سے شاعری کی طرف مراجعت اعجاز راہی کی شخصیت کو دو مختلف خانوں میں نہیں بانٹتی، بلکہ یہ اس حقیقت کا اظہار ہے کہ بہت سے لطیف جذبے جب اعجاز راہی کے افسانے میں سمو نہیں پاتا تو وہ انہیں آسانی سے شاعری میں پیش کر دیتا ہے۔ شاعری چونکہ نامعلوم سے زیادہ قریبی برالطہ استوار

کرلیتی ہے اس لئے اس میں جذبے کی صداقت بھی زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے۔ اعجاز راہی نے اپنے افسانوں کے ذریعے قاری کی عقل کو اور اپنی شاعری سے قاری کے تخیل کو متاثر کرنے اور یوں اس نے اپنے تخلیقی اظہار کا دائرہ مکمل کرنے کی سعی کی ہے۔ اعجاز راہی کا فنی سفر اس کی نجی زندگی سے بھی مماثل ہے چنانچہ اس نے سڑک پر چلتی ہوئی ادمنی بس سے فضاؤں کو محیط کرتی ہوئی پی آئی اے تک پرواز مکمل کی ہے اور فن میں شعور کی تنگنائے سے لاشعور کے بیکراں میدان کی طرف سفر اختیار کیا۔ "بے برکت دعائیں" میں اعجاز راہی اپنے زمانے کا ایک خوفزدہ معاصر کے روپ میں سامنے آیا ہے۔ وہ اپنی کلاہ پر نقلی پھول سجا کر یا اپنے چہرے پر بگاڑ پیدا کر کے زمانے کو اپنی طرف متوجہ نہیں کرتا بلکہ وہ اس کالی اندھی شام کا نوحہ خوان ہے جس نے اس کی نس نس میں زہر ملا دیا ہے۔ اس زاویے سے دیکھئے تو اعجاز راہی کی شاعری ایک موڈ کی شاعری ہے اور یہ لخت لخت کیفیت کے بجائے ایک مجموعی تاثر مرتب کرتا ہے۔ اس سے اعجاز راہی کی شعری شخصیت اور شاعری کا مزاج سامنے آیا ہے۔ مجھے اس کی شاعری پر منیر نیازی اور وزیر آغا کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں۔ منیر نیازی کے ہاں خوف کی تجسیم ہو جاتی ہے لیکن اعجاز راہی اس خوف کو اپنا اوڑھنا اور بچھونا بنا کر اس کے ساتھ زندگی بسر کرتا ہے۔ یہ رجائیت کا زاویہ ہے اور اس کی ایک شعاع وزیر آغا کی طرف مڑتی ہوئی نظر آتی ہے چنانچہ یہ بات بالخصوص متاثر کرتی ہے کہ خوف سے مغلوب ہونے کے بجائے اعجاز راہی اس روزِ سعید تک جینے کی آرزو کرتا ہے جب یہ سیاہی چھٹ جائے گی۔ اندھو گھپا سے سنہرا روشن سورج طلوع ہوگا اور سمندر کی صدا اعجاز راہی کے کانوں میں رس گھولنے لگی۔ شاید یہی قبول دعا کا وقت ہو اور اعجاز راہی اسی وقت کا منتظر نظر آتا ہے۔

شاعری کی یہ کتاب جس میں نظمیں، غزلیں اور فردیات شامل کی گئی ہیں۔ آج کے بے ضمیر عہد کو فنی پرکاری سے پیش کرتی ہے۔ کتاب کا معنی خیز سرورق حمید ساغر نے بنایا ہے اور "کھلے ہیں ہاتھ مرے بے اثر دعاؤں کے بیچ" کی معنویت آشکار کرتا ہے۔ قیمت دس روپے ہے اور ملنے کا پتہ ہے۔ دستاویز پبلشرز راولپنڈی۔

انور سدید

نغمے کا سفر | جیلانی بانو

اُردو افسانے میں جیلانی بانو کا طلوع ایک ایسے شہاب ثاقب کی صورت میں ہوا جو فضا میں اچانک روشنی بکھیرتا ہے اور پھر ٹوٹ جانے کے بجائے فضا میں معلق ہو جاتا ہے اور ہمیشہ روشنی بکھیرتا رہتا ہے۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں نے جب ان کا افسانہ "موم کی مریم" پڑھا تو اس کا اثر اتنا دیرپا تھا کہ میں اب بھی اس افسانے کو جیلانی بانو کی پہچان کا اوّلیں وسیلہ شمار کرتا ہوں۔ زیرِ نظر کتاب "نغمے کا سفر" چار اثر انگیز افسانوں کا مجموعہ ہے۔ یہ افسانے اتنے طویل ہیں اور ان میں زندگی کی جزئیات یوں سما گئی ہیں کہ انہیں ناولٹ کہنا بھی مناسب ہے۔

"نغمے کا سفر" کے ناولٹ "اکیلا"۔ "پتھر کا جگر"۔ "کیمیائے دل" اور "نغمے کا سفر" (جس سے کتاب کا عنوان اکتساب ہوا ہے) زندگی کے چار متنوع مطالعے ہیں۔ جیلانی بانو نے انہیں حیدر آباد کی داخلی زندگی سے اخذ کیا اور تخیلی جزئیات سے ان کی جزو بندی یوں کی کہ خیر و شر کا ازلی اور ابدی تصادم اپنی تمام تر تیزابیت کے ساتھ سامنے آجاتا ہے۔ جیلانی بانو کے یہ افسانے حقیقی زندگی کی قاشیں ہیں اور مجازی یا رمزی کیفیت پیدا کرنے کے بجائے قاری کو سوچنے اور مسلسل غور کرنے پر آمادہ کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر ان کا ناولٹ "اکیلا" تلخ حقیقت نگاری سے شروع ہوتا ہے اور انجام کار زندگی کا المیہ اجاگر کر کے عبرت کی مثال بن جاتا ہے۔ "پتھر کا جگر" معاصر زندگی کا ایک اور

دائرہ بناتا ہے اور اس حقیقت کو آشکار کر دیتا ہے کہ "ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ ــــ" الکیمیائے دل میں تھکا ہوا مضمحل وجود بقائے حیات کے لیے سرگرداں ہے۔ ان افسانوں میں جیلانی بانو نے ایک ایسی عورت کو پیش کیا ہے جو نمایاں ہونے اور معاشرے میں اپنی حیثیت منوانے کی آرزومند ہے لیکن تلاطم میں اپنی پہچان بھی گم کر دیتی ہے۔ اس عورت کی کہانی چونکہ عورت نے خود بیان کی ہے اس لئے ان میں شکستِ خواب کا منظر دیدنی ہے۔

کتاب اُردو مرکز حیدرآباد نے شائع کی ہے۔ قیمت پندرہ روپے

انور سدید

آواز | رفعت سُلطان

"آواز" رفعت سُلطان کا دوسرا مجموعۂ کلام ہے۔ "آواز" کے تخلیقی پس منظر میں جو بات سب سے پہلے متوجّہ کرتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ حضرت سلطان العارفین باہوؒ کی پاکیزہ روایت کے حامی ہیں۔ چنانچہ انہوں نے شاعری کو فوٹوگرافی کے لئے استعمال نہیں کیا بلکہ اس سے پاکیزگی، طہارت اور خیر کی قدروں کو پروان چڑھانے کا کام لیا ہے۔ رفعت سلطان کی شاعری کا ایک بنیادی زاویہ عشق ہے۔ وہ حُسن کے مزاج داں بھی ہیں اور اس کے قدرداں بھی۔ یہ حُسن جب ذرّے میں سمٹتا ہے تو ذاتِ واحد کے جمال کی علامت بن جاتا ہے اور جب پھیلتا ہے تو پوری کائنات کو محیط میں لے لیتا ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ رفعت شاعری میں نہ تو الفاظ کا کھیل کھیلتے ہیں نہ اپنی ذہنی انا کو اتنی ڈھیل دیتے ہیں کہ اُن کا جذبہ بدمست ہو جائے اور جوانی دیوانی کو برسرِ عام ننگا کرنے کی کوشش کرے۔ ان کے ہاں تو ایک ایسی والہانہ کیفیت ہے جس میں جذبہ کبھی ہمہ تن رقص بن جاتا ہے اور کبھی مجسم ترنّم۔ وہ جذبے کو شعر کی خارجی سطح کے ساتھ چپکانے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ تاثر کی ایک خاص کیفیت کو پیدا کرتے ہیں جیسے بجلی کی رَو تاروں میں دوڑتی ہوئی نظر تو نہیں آتی بلکہ اس کی خیرگی دلوں کے قمقموں کو روشن کر دیتی ہے۔

رفعت سلطان مصرعوں کی لخت لخت کیفیتوں کے شاعر نہیں ہیں بلکہ ان کے ہاں پہلا مصرعہ دہلیز کا کام دیتا ہے جس سے درِ دل پہ دستک ہوتی ہے اور دوسرا مصرعہ تکمیل کی اس کیفیت تک لے جاتا ہے جہاں دروازہ کھُل جاتا ہے، روشنیوں کی جوالا پھوٹ پڑتی ہے اور قاری روشنیوں کی اس جوالا میں سرابور ہو جاتا ہے۔ پھر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہ جذبہ رفعت سلطان پر وارد نہیں ہوا بلکہ یہ اُن کا ذاتی جذبہ ہے اور شعر کی یہ آیت خود ان کے وجدان نے ان پر اُتاری ہے۔ یہ سہل ممتنع کی کیفیت رفعت کی ساری شاعری میں موجود ہے۔ یہی ان کی انفرادیت ہے اور اسی کیفیت نے انہیں مشاعروں میں کامیابی عطا کی ہے۔

حُسن و عشق کی چاشنی سے بھرپور رفعت سلطان کا مجموعۂ کلام "آواز" ایک ایسا مجموعہ ہے جس سے روشنیوں اور رنگوں کی جوالا پھوٹتی ہے اور قاری کو سحر میں مبتلا کر دیتی ہے۔ یہ مجموعہ ۱۲۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ کاغذ، کتابت اور طباعت اچھی ہے اور اس کی قیمت صرف پندرہ روپے ہے۔

ملنے کا پتہ:۔ باہو پبلشرز۔ دربار حضرت سلطان العارفین باہوؒ ضلع جھنگ۔

راغب شکیب

نظیر نامہ | شمس الحق عثمانی

مرتب نے بی اے اور ایم اے کے اُردو طلبہ کے لئے خصوصی سلسلۂ تفہیم کے تحت ایسے فنکاروں اور اُن اصنافِ سخن پر کارآمد اور معیاری مضامین کے انتخابات کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا ہے جن پر اچھے مواد کی فراہمی طلبہ کے لئے ایک مہم بن جاتی ہے۔ اس سلسلے کی پہلی کڑی کے طور پر نظیر اکبر آبادی کو منتخب کیا گیا ہے اور یہ انتخاب بہر اعتبار مناسب ہے۔ نظیر اکبر آبادی ہمارے ادب میں ابتدا ہی سے ایک بحث طلب شخصیت کی حیثیت سے پہچانے گئے اور اکابرینِ شعر و ادب نے ان کے بارے میں انتہا پسندانہ رویّہ اختیار کیا چنانچہ کچھ لوگوں نے انہیں محض عامیانہ شاعر کا درجہ دیا تو کچھ کی نگاہ میں وہ آسمانِ ادب کا تنہا ستارہ تھے۔ ایسی متضاد آرا کی گرد آلود فضا میں ——— ایک طالب علم کو نظیر کے ادبی مرتبے اور اُن کی شاعری کی قدر و قیمت کے تعین میں بڑی دشواری پیش آتی تھی اور ضرورت تھی کہ اس فن کار کے سلسلے میں متوازن اور غیر جانبدارانہ تنقیدی مضامین کا ایک اچھا انتخاب شائع کیا جائے۔ مرتب نے نہ صرف یہ فریضہ انجام دیا ہے بلکہ بطورِ خاص اس مجموعۂ مضامین کے لئے عہدِ حاضر کے نمائندہ ناقدین سے کچھ نئے مقالے لکھوانے میں بھی کامیاب ہوئے ہیں۔

کتاب کو چار حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ حصّہ اوّل میں "نگار" کے نظیر نمبر (جنوری ۱۹۴۰ء) میں شائع ہونے والے مضامین کا انتخاب شامل ہے۔ حصّہ دوم مذکورہ بالا نمبر کے بعد نظیر کی شاعری پر شائع ہونے والی منتخب تحریروں پر مشتمل ہے، جس میں نظیر اکبر آبادی، اُن کا عہد اور شاعری" (ڈاکٹر ابواللیث صدیقی) کی تلخیص بھی شریک ہے۔ اکثر مضامین میں تکرار اور اعادے سے بچنے کے لئے مرتب نے کچھ حصّے حذف کر دیئے ہیں۔ حصّہ سوم میں وہ مضامین ہیں جو مرتب کی درخواست پر بطورِ خاص اسی کتاب کے لئے قلمبند کئے گئے ہیں اور چوتھے حصّے میں نظیر کی منتخب نظمیں شائع کی گئی ہیں اور اس انتخاب میں اس امر کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ ایسی تمام نظمیں یک جا کر دی جائیں جو مختلف سطحوں پر مختلف دانش گاہوں کے نصابات میں شامل ہیں۔

کتاب کے حصّہ اوّل اور دوم میں شامل مضامین پر اپنے اپنے دور میں کافی گفتگو ہو چکی ہے، ان پر تبصرہ بعد از وقت ہوگا اس موقع پر صرف اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ ان میں سے کم از کم نیاز فتح پوری، مجنوں گورکھپوری، آلِ احمد سرور، ابواللیث صدیقی اور کلیم الدین احمد کی تحریروں کا مطالعہ نظیر کے ہر سنجیدہ طالب علم کے لئے ناگزیر ہے اور کم و بیش یہی وہ تحریریں ہیں جن کے توسط سے کلامِ نظیر کی افہام و تفہیم اور ان کے ادبی مرتبے کی تعیین کے دروازے کھلے ہیں۔

اس مجموعۂ مضامین کا اہم ترین جزو دراصل اس کا تیسرا حصّہ ہے جس کا پہلا مضمون "تہذیبی دیوانہ: نظیر" پروفیسر گوپی چند نارنگ کے قلم سے نکلا ہے۔ نارنگ ہندوستان کے ان معدودے چند ناقدین میں سے ایک ہیں جن کی تحریروں کی بازگشت، نہ صرف ہندوستان بلکہ پاکستان اور ان تمام ممالک میں جہاں اُردو شعر و ادب سے دلچسپی رکھنے والے پائے جاتے ہیں، تا دیر سنائی دیتی ہے اور جن کے تقریباً ہر مضمون پر ادبی حلقوں میں مدتوں

بخشش ہوتی ہیں۔ زیرِ تبصرہ مضمون میں انہوں نے نظیر کے مزاجِ شعری کو اس فنکارانہ مہارت کے ساتھ بے نقاب کیا ہے جو انہیں کا حصّہ ہے اس مضمون میں نظیر کے تمام قابلِ ذکر امتیازات سے بحث کی گئی ہے خصوصاً نظیر کی شاعری میں جنسی کیفیات کی شدت اور اس کے کھلنڈرے مزاج کی بازیافت اور محسوسات کی سطح پر مجموعی زندگی سے اخذ و کسب کے بعد اُسے عام فہم شعری قالب عطا کرنے کے لیے خصوصی وصف کی نشاندہی مقالہ نگار نے کامیابی کے ساتھ کی ہے۔ "ماضی کا پورا آدمی، نظیر" اس کتاب کا دوسرا اہم مضمون ہے جس میں جدید ادب کے منفرد اور بالغ نظر نقاد محمود ہاشمی نے اپنے مخصوص اسلوب میں نظیر کو غزل کے خصوصی حوالے سے کسی ایک طرز کی جگہ کئی اسالیب کا شاعر ثابت کیا ہے اور اس کے اسی اسلوب کو "ماضی کے پورے آدمی کا طرز" قرار دیا ہے۔ ہاشمی کی یہ رائے ماشہ اور رتی تک درست ہے کہ "نظیر نے زندگی کے آغاز سے انتہا تک اپنے شعری کردار کو وقت کے ایک ایک لمحے میں پیوست رکھا ہے اور ہر لمحے کی لذت اور مسرت کو تخلیق کی تابانی سے منوّر کیا ہے" (ص ۳۹۰) شمس الرحمٰن فاروقی کا "نظیر اکبر آبادی کی کائنات" اس حصے کا تیسرا مضمون ہے ۱۹۶۵ء کے بعد منظرِ عام پر آنے والے ناقدوں میں فاروقی کو میں سب سے اہم مانتا ہوں۔ اُن کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ مغربی ادب کے ساتھ ساتھ اُردو کے کلاسیکی سرمائے اور فارسی ادبیات پر بھی اچھی نگاہ رکھتے ہیں اور جدید اصولِ نقد کے ساتھ ساتھ مشرقی مزاجِ شعر کے نبض شناس بھی ہیں۔ تنقیدی تحریروں میں وضاحت اور غیر آراستہ زبان کا استعمال بھی اُنہیں اپنے دَور کے فلسفہ طرازوں سے منفرد بناتا ہے۔ وہ اپنی رائے کے بے باک اور جرأتمندانہ اظہار پر قادر ہیں، فنی محاسن و معائب، عروضی پیچیدگیوں اور فن پاروں کے لسانیاتی پہلوؤں کا تجزیہ یہ فاروقی بڑی چابکدستی سے کرتے ہیں۔ اُن کی بیشتر تنقیدی آراء سے اختلاف کیا جاسکتا ہے لیکن ان کی اہمیت، انفرادیت اور اخلاص پر شبہ نہیں کیا جاسکتا۔ زیرِ بحث مضمون بھی ان کا ایک ایسا ہی خیال انگیز اور بحث طلب مضمون ہے جو نظیر کی شاعری کے جنسی پہلو کا بڑا عمیق تجزیہ ہے اور اس تنقیدی تحلیل نفسی سے گذر کر فاروقی نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ نظیر نفسیاتی طور پر نامرد تھے اور بالغ، تجربہ کار لوگوں کی طرح جنس کا تصوّر نہیں کر سکتے تھے۔ بات کسی حد تک سچ ہے لیکن یہ پوری سچائی نہیں ہے، جنسی شاعری نظیر کے کلام کا ایک جزو ہے کل نہیں اور کسی شاعر کے پورے کلام کو سامنے رکھے بغیر اس کے فکر و فن کی بابت سچے فیصلے نہیں کیے جاسکتے خصوصاً نفسیاتی تنقید کے بارے میں تو یہ بات تقریباً طے شدہ ہی ہے کہ اس کے وسیلے سے فن کار کے تخلیقی سرچشموں تک رسائی تو ممکن ہے لیکن اس کے سہارے فن کار کے ادبی مرتبے کا تعین نہیں کیا جاسکتا۔ نظیر کی شاعری میں جنسیت کے تعلق سے میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ وہ اپنی جنسی شاعری میں اپنے عہد کے نسلی رویّے اور مجموعی اخلاقی کردار کی ترجمانی کرتے ہیں ظاہر ہے کہ انہوں نے اپنے عہد اور اس کی معاشرت کے ہر گوشے کو اپنے ہاتھوں سے چھُو کر دیکھا تھا پھر اس کا جنسی پہلو کس لیے نظر انداز کر جاتے۔ اگر یہی طریقِ کار اختیار کیا جائے تو حسرت، شاد عارفی اور نظیر ہی کیوں منٹو، عصمت، راشد ——————— وغیرہ بہتیروں کو جنسی مریض ثابت کیا جاسکتا ہے۔

بحیثیتِ مجموعی "نظیر نامہ" ایک دلچسپ اور کار آمد کتاب ہے جو طلبہ کے ساتھ ساتھ اردو ادب سے دلچسپی رکھنے والے تمام حلقوں میں قدر کی نگاہوں سے دیکھی جائے گی۔ مجموعے کا ہر صفحہ مرتب کی ذہانت آمیز محنت کا غماز ہے۔ ڈیمائی سائز کے ۵۱۲ صفحات پر خوبصورت چھپی ہوئی یہ کتاب چالیس روپے میں انجمن ترقی اُردو نئی دہلی سے خریدی جاسکتی ہے۔

ڈاکٹر مظفر حنفی

آپس کی باتیں

جگن ناتھ آزاد

آپ نے اس شمارے میں گوشۂ خلیل الرحمٰن اعظمی شامل کر کے بڑی عمدہ بات کی ہے۔ جزاک اللہ! شہریار نے اپنی تحریر "آخری لمحات" خونِ دل سے لکھی ہے۔

"کھوئے ہوؤں کی جستجو" کا سلسلہ جاری رکھیئے۔ شہرت بخاری گزرے ہوئے لمحات کو دوام بخش رہے ہیں۔ ظہیر صدیقی کا مقالہ احتشام حسین کے بارے میں ایک خیال انگیز مقالہ ہے لیکن ظہیر صاحب نے اس میں تصویر کا ایک ہی رُخ پیش کیا ہے۔ ہرچرن چاولہ کا البم ایک صد رنگ البم ہے۔ اس البم کے باقی حصے بھی ہمارے سامنے آنا چاہئیں۔ "اوراق" ہی کے ذریعے سے جوگندر پال، رشید امجد، مشتاق قمر اور اصغر ندیم سید کی کہانیاں ہمارے مختصر افسانے میں ایک نئے باب کا اضافہ کر رہی ہیں۔

خورشید رضوی، افضل منہاس، فضا ابن فیضی، مرتضیٰ برلاس، شیر افضل جعفری، اکبر حمیدی، آزاد گلاٹی، نوازش علی، ساحل احمد، راغب شکیب، زاہد فخری اور جمال احسانی کی غزلیں بہت پسند آئیں۔

رشید نثار

آپ نے حلقۂ اربابِ ذوق، راولپنڈی میں جو "خطبہ" پڑھا تھا اس میں آپ نے "ادب" کو مقدس شے قرار دیا ہے۔ میں اس کا حامی ہوں۔ میں ادب کو شرفا کی شے کہا کرتا ہوں مگر اس آبگینے کو سیاست اور حماقت نے ہمیشہ ٹھیس پہنچائی ہے ورنہ ادب تو خالص اور سُچا موجود ہے۔ اُسے کھٹائی کے ذریعے دہی بنانے والے کبھی نظریئے کی عینک سے، کبھی لوزڑ وائی آنکھوں سے اور کبھی تابُلی رویئے سے ادب کو مجروح اور معاشرے کو متعفن بناتے رہتے ہیں۔ ایسے لوگ حلقۂ اربابِ ذوق میں اس لئے آتے ہیں کہ معاشرے میں اب انہیں کوئی اور ٹھکانہ نہیں ملتا۔ البتہ ادب کو مقدس شے سمجھنے والے واقعی حلقے میں باادب ہو کر آتے ہیں اور وہی اپنی خوشبو دار گفتگو سے محفل کو معطر اور ذہنوں کو روشن کئے رکھتے ہیں۔ آپ نے اپنے مخلص اور دردمند لہجے میں حلقے والوں کو خوبصورت مشورے دیئے ہیں کہ نئی نسل کو "آدابِ سحرگاہی" سکھائے جائیں کیونکہ سونے والے ہمیشہ گھاٹے میں رہتے ہیں۔

ڈاکٹر انور سدید نے "سوال یہ ہے" کے صفحات میں اپنی تحقیق کی روشنی میں سوالات مرتب کئے ہیں اور انہوں نے "ادبی تحریک" کا تجزیہ کرتے ہوئے خود ہی اس کا جواب دے دیا ہے کہ ادبی تحریک ایک اجتماعی عمل ہے اور اس کی رہنمائی کے لئے کسی قائد کی ضرورت نہیں۔

اس دفعہ غزلیات کے حصّے میں بہت سے نئے نام دیکھنے میں آئے۔ ان نئے ناموں کو آپ نے کھلے دل سے خوش آمدید کہا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ "ثقہ بند" شاعروں کے ساتھ نئی نسل کو اوراق کی زینت بنانا اس لئے ضروری ہے کہ تازہ خون کے بغیر اوراق کی زندگی میں تازگی اور تنوع پیدا نہیں ہو سکتا۔ انشائیوں میں سب ہی دلکش اور خوبصورت ہیں۔ "ٹھنڈا برف پانی" نفسیات کے تناظر میں اچھوتا انشائیہ ہے کہ جس میں تفکر شخصی ذات اور اسلوب کی جدت موجود ہے۔

غزلوں کا حصہ بہت جاندار ہے۔ کچھ لوگوں نے جدت کی طرف جست لگائی ہے جو ایک تخلیقی حرکت ہے مگر اس سے پہلے ان کا اسلوب بیانیہ اور رجعت پسندانہ تھا اور وہ لوگ جو جدیدیت کو امریکی سازش قرار دیتے تھے جدیدیت کے شوق نے انہیں مجبور کر دیا ہے کہ وہ اپنی رائے تبدیل کر دیں۔ بہرحال یہ جست خوش آئند ہے۔

افسانوں میں ہرچرن چاولہ کا البم، شمس نعمان کا بے نام کہانی، مشتاق قمر کا بڑے سائز کے لوگ اور کلام حیدری کا الف لام میم اچھوتے اور خوبصورت ہیں۔

تنقیدی حصّے میں بہت اچھے مقالات شامل ہیں۔ ان میں اقبال آفاقی اور مرزا حامد بیگ قابلِ ذکر ہیں۔ اقبال آفاقی بڑی استدلالی قوت رکھتے ہیں اور ان کا مطالعہ بھی خاصا وسیع ہے۔ انہوں نے اپنے مقالے میں جو نتائج اخذ کئے ہیں، وہ خاصے اہم ہیں۔ انہوں نے بورژوا عہد میں ادب کے حوالے سے مابعدالطبیعات کے مقابلے میں، حُسن، تازگی اور قوت کو اہم قرار دیا ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے بہت سے فلسفہ دانوں پر کڑی تنقید کی ہے۔ ان کی یہ تنقید اس لئے جائز ہے کہ ہمارے بہت سے بزرگ فیصلہ دیتے وقت گھپلا کر جاتے ہیں۔

آفاقی صاحب نے محمد تقی کے حوالے سے بھی ایک بات کہی ہے اور وہ ہے "منطقی" قضیئے کی بات اور توازن کا معاملہ۔ جہاں تک توازن کا تعلق ہے اسے آپ ریاضیاتی نسبت کہہ سکتے ہیں، مگر ان کا تاثرات حسّی سے کیا تعلق ہے اس کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا۔ تاہم آفاقی صاحب نے افلاطون اور ارسطو کا ذکر کیا ہے اور ان کے شاعرانہ ڈکشن کی بات کی ہے تو آفاقی صاحب بھی جانتے ہیں کہ بڑا ادب شاعروں نے پیدا کیا، آپ فردوسی، کالیداس، غالب، اقبال وارث شاہ، میاں محمد کا پیغام بھی شاعری میں ہے، ڈانٹے، ایلیٹ اور حسرت موہانی، کی بات چھوڑیئے، ایک انگریزی شاعر کا قول ہے۔

"ایک فردوسی آہنگ سے اس کائنات کے ڈھانچے کی ابتدا ہوئی۔" چنانچہ ازل کے دن کی ابتدا بھی شاعرانہ تھی بلکہ جادو، منتر، ٹوٹکے اور آج کے نت نئے انکشافات، ان دیکھی دنیاؤں کے بارے میں انکشافات کا ذکر شاعری کے زمرے میں آتا ہے۔ وید کے اشلوک، اوستا کے فرگرد کنفیوشس کے ملفوظات سلیمان بن داؤد کے امثال، انجیل کی بشارتیں، سب کے سب دانش اور معرفت کی چیزیں ہیں، چونکہ شاعری اور ادب، سحر افسوں کی بالغ صورتیں ہیں اس لئے سائنس اور بورژوا عہد اپنی بربریت کے باوصف فن کاری، ادب اور حسن کو دھچکا نہیں لگا سکتے۔

مرزا حامد بیگ نے زبان کے "دربار سے" میں جن لوگوں کی مثالیں دی ہیں وہ بہت محدود ہیں۔ وہ ابوالفضل صدیقی، سید خلیل احمد، ——— مشتاق قمر قدرت اللہ شہاب، مسیح آہوجہ، غلام عباس کے بعض افسانے پڑھ لیتے تو انہیں کچھ اور مواد مل جاتا۔ البتہ افسانے کا لسانی پیرایہ شاعرانہ ڈکشن میں نہیں کہ افسانہ شاعری سے الگ تخلیق شے ہے۔ اور شاعرانہ اسلوب جو آج نثری شاعری کے قریب جا پہنچا ہے اس نے افسانے کی تحریک کو نقصان پہنچایا ہے کیوں کہ یہ افسانہ مصنوعی ہو کر رہ گیا ہے بلکہ ڈرامائیک مانولاگ بن کر رہ گیا ہے۔ اس بے محل مانولاگ ہی نے افسانے کی تحریک کے سامنے بھاری پتھر کھڑے کر دیئے ہیں۔ اس لئے افسانہ اپنی افسانوی زبان ہی کے ذریعے سحر پیدا کر سکتا ہے اور کہانی کے عنصر کو از سرِ نو مربوط کر سکتا ہے۔

فیض پر مطالعہ بڑا اہم ہے۔ اس سے بہت پیشتر پروفیسر فتح محمد ملک نے "فیض کی دو آوازیں" ایک مقالہ لکھا تھا۔ اس مقالے کے بعد اب دوسرا مقالہ فیض کی شخصیت اور شاعری کو بھرپور انداز میں پیش کر رہا ہے۔

رشید امجد

اوراق کا تازہ شمارہ نئی فکری اور فنی توانائیوں کے ساتھ اپنی پہچان کراتا ہے۔

پہلا ورق کی ایک ایک سطر معنوی دبازتوں کے ساتھ نئی بحثوں کے دروازے واکر رہی ہے۔ آپ نے حلقہ کے حوالے سے آج کی ادبی صورت حال کا خوبصورت جائزہ لیا ہے اور بہت اہم سوال اٹھائے ہیں۔ حلقہ نے نئی نسل کی ذہنی فکری اور فنی نشوونما میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ آپ کی یہ بات بالکل درست ہے کہ سیاست نے تجربے میں جذباتی شرکت کی بجائے نظریئے میں جذباتی شرکت کے میلان کو توانائی بخشی ہے۔ سیاست حلقہ یا ادب کے لئے شجرِ ممنوعہ نہیں ہے۔ خرابی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب نظریہ فنی مراحل سے گذر کر تخلیق کا حصہ بننے کی بجائے نعرے کی سطح تک محدود رہ جاتا ہے۔ اس قسم کی صورتِ حال ان لوگوں کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے جو تخلیقی سطح پر اپنی پہچان کرانے سے معذور ہیں، اس لئے ایسے لوگ ادبی سیاست کو ملکی سیاست سے وابستہ کر کے مصنوعی گروہ بندیاں پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پرانے ترقی پسندوں کا المیہ بھی یہی تھا، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ نئی نسل کے بہت سے لوگ اپنی واضح نظریاتی کومٹمنٹ کے باوجود فنی تخلیق پر ایمان رکھتے ہیں۔ حلقہ کی یہ عطا ہے کہ اس نے ادب کو ادب کے فنی اور تخلیقی معیار کے پر جانچنے کی روایت قائم کی ہے۔ حلقہ میں کسی بھی نظریاتی حوالے سے کوئی چیز پڑھی جائے، بنیادی بات یہ ہے کہ وہ ادب ہے یا نہیں، تاہم بعض جگہ خاص طور پر لاہور کے حلقہ میں ایک عرصہ تک سیاسی تقریروں کا منظر رہا ہے۔ پنڈی اور اسلام آباد کے حلقوں میں ایسی صورت کبھی بھی نہیں رہی۔ ادب کے جس تقدس کا ذکر آپ نے کیا ہے، اسے صرف ایک صحیح تخلیق کار ہی محسوس کر سکتا ہے۔ ایسے لوگوں کے نزدیک، جو ادب کو ذاتی شہرت یا مالی منفعت کا ذریعہ سمجھتے ہیں اس کے کوئی معنی نہیں۔ تعصب زندگی کا ایک حصہ ہے لیکن اگر یہ تعصب شخصیت کا حصہ بن جائے تو مکاشفہ نہیں ہو سکتا۔ نئی نسل کے انتہا پسند تعصب کے بل پر ہی اپنے آپ کو منوانے نکلے تھے، لیکن ہوا کیا؟ سارے انتہا پسند رویئے بالآخر اعتدال کی راہ پر ہی اپنی پہچان کرا سکے۔ مجھے آپ کا ایک اور مضمون "ادب اور سیاست" بھی یاد آ رہا ہے۔ اتفاق ہے کہ یہ مضمون بھی آپ نے حلقہ اربابِ ذوق راولپنڈی میں پڑھا تھا اور یہ وہ زمانہ تھا جب کچھ لوگ ادب کو پروپیگنڈے کی سطح پر لے آئے تھے اگر آپ نے اس وقت بھی توازن کی اہمیت کی بات کی تھی، تازہ اداریہ بھی اس معروضی صورت حال میں اقدار کے تقدس اور حفاظت کی ایک مثال ہے۔

دوسری اہم بات ادب کے اساتذہ کے حوالے سے ہوئی ہے۔ مجھے آپ سے اتفاق ہے کہ ہمارے اساتذہ میں سے بہت کم ایسے ہیں جو شاگردوں میں صحیح ادبی ذوق پیدا کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ وجہ یہ کہ تعلیم میں بیشتر لوگ وہ ہیں جنہوں نے اپنی مرضی سے اس پیشہ کو نہیں اپنایا بلکہ مجبوراً یا ضرورتاً استاد بن گئے ہیں۔ ان کے نزدیک کسی دفتر میں بیٹھ کر فائلیں دیکھنا اور کلاس میں بیٹھ کر درس دینا ایک سا عمل ہے۔ اس المیہ کے پس منظر میں بہت سے سیاسی، معاشرتی اور سماجی پہلو بھی شامل ہیں، مسئلہ یہ ہے کہ ایسی صورت میں ادب کی حفاظت اور روایت کے لئے کیا ذریعہ رہ جاتا ہے۔ میری رائے میں اوراق جیسے رسالے یہ فرض سرانجام دے رہے ہیں۔ جیسے کا لفظ میں نے اس لئے استعمال کیا کہ بہت سے رسالے ترقی پسندی کے نام پر کیا کر رہے ہیں، یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں، آپ جیسے لوگوں کی کوششیں ستائش کے قابل ہیں کہ آپ اس منافق دور میں بھی ادب کو عبادت کا درجہ دیتے ہیں، یہ آپ کا خلوص، سچائی اور ادب کے ساتھ گہری کومٹمنٹ کا اظہار ہے۔

کرشن ادیب

تازہ اوراق کا حصہ نظم پڑھ چکا ہوں۔ یوں تو مجھے تمام تر غزلیں پسند آئی ہیں لیکن خدا جانے میں کس منزل پر ہوں جہاں دعائیہ قسم کے

اشعار پسند آنے لگے ہیں۔ میرے نزدیک یہ کلام الہام کا درجہ رکھتا ہے۔ زاہد فخری کی غزل کا مطلع مجھے اتنا پسند آیا ہے کہ صبح کا آغاز اسی سے ہونے لگا ہے۔

کاش ایسا ہو کہ اک حرفِ دعا زندہ رہے
میرا تجھ سے لے خدا یہ رابطہ زندہ رہے

مطلع تا بہ مقطع غزل خوبصورت ہے۔ ایک ایک شعر جی کو چھوتا چلا گیا۔

زاہد فخری کے علاوہ مندرجہ ذیل اشعار برسوں میرے ذہن میں محفوظ رہیں گے۔

ہاں مجھے بھی چند سانسوں کی ضرورت ہے مگر
اس کی یادوں کے عوض سودا بڑا مہنگا لگے،
سر پہ چادر کی جگہ بابل کا بوڑھا ہاتھ ہو
کیوں نہ وہ دلہن زمانے بھر کو آوارہ لگے۔ — اسلم کوثری

ٹوٹتے پتے گواہی دیں گے موسم کے خلاف
سوکھتی شاخوں پہ منشورِ ہوا رہ جائے گا۔ — سلیم کوثر

تم بلاؤ گے تو آئے گی صدائے بازگشت
وہ بھی دن آئیں گے جب سوکھا مکاں ہو جائے گا — آزاد گلاٹی

رات آئی ہے بچوں کو پڑھانے میں لگا ہوں
خود جو نہ بنا اُن کو بنانے میں لگا ہوں،
کچھ پڑھنا ہے کچھ لکھنا ہے کچھ رونا ہے شب کو
ہیں کام سرِ شام چکانے میں لگا ہوں — اکبر حمیدی

حصہ نظم اس قدر بھرپور نہیں تاہم محمود علی محمود، سرمد صہبائی، سحر صدیقی۔ ممتاز کنول۔ محمد اکرم نصر اور محترمہ ثمینہ راجہ کی نظمیں بہت پسند آئیں۔

سلیم آغا کا نشائیہ 'برگد' لطف دے گیا۔ برگد ہر شخص کو اس کے ظرف کے مطابق ہی انعام سے نوازتا ہے۔ سدھارتھ اس کے سائے تلے بیٹھے تو نروان پاتا ہے میرا اعزیز اس کے پاس جائے تو ایک نئی قوت اور حوصلے سے لیس ہو کر آتا ہے۔ مگر جب میں کبھی اس کے سائے تلے جا بیٹھوں تو مجھے کیا ملتا ہے۔ ایک سرقہ ابے انت، لامتناہی سرقہ، برگد کی جڑوں کی طرح پیچ دار اور گہری۔ زیرِ زمین بھی اور بالائے زمین بھی!!'

واہ واہ سبحان اللہ!

تقی حسین خسرو

"اوراق" کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ اس کی تحریریں دعوتِ فکر دیتی ہیں۔ شمارہ خاص جولائی اگست ۱۹۹۰ء اور بھی اسی خصوصیت کا حامل ہے۔ پہلا ورق "حلقہ اربابِ ذوق" سے مدیر اوراق کے بے پناہ تعلقِ خاطر کو ظاہر کرتا ہے۔

حلقے کی قلبِ ماہیت کے لئے جو تجاویز پیش کی گئی ہیں ان کی حقانیت سے کوئی بھی صاحبِ فہم انکار نہیں کر سکتا۔ ایک وقت تھا۔ حلقے میں پیش کی جانے والی تخلیقات کی گونج دُور دُور تک سنی جا سکتی تھی۔ ان تخلیقات کے حوالے سے ادب کی رفتار اور سمت کا بھی بڑی حد تک تعین کیا جا سکتا تھا۔ اس طرح حلقہ دُور دُور تک ادبی فضا پر اثر انداز نظر آتا تھا اور اب ایسا کیوں نہیں ہے۔؟ اس مختصر سے سوال کا جواب کیا ان رویّوں کو بے نقاب نہیں کرتا جن کی "پہلا ورق" میں بہت موثر نشان دہی کی گئی ہے۔ مجھے حلقے کی کسی مجلس میں اپنی کوئی تحریر پیش کرنے کا شرف حاصل نہیں ہوا۔ لیکن اس کے باوجود میں اس فضا کا بخوبی اندازہ کر سکتا ہوں جس کا بڑے شدید تاثر کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ شاید یوں ہے کہ حلقہ آج بھی ماضی ہی کی طرح فعال ہے اور ملک کی فضا پر اسی طرح اثر انداز بھی، صرف اس فرق کے ساتھ کہ ماضی میں اس کا اثر تخلیقی کام کے لئے راہیں کھولتا تھا اور آج ... کاش حلقے کی قلبِ ماہیت ہو جائے! اور اس طرح ملک کی ادبی فضا بدلے اور ایک بار پھر نظریاتی اور شخصی سطح سے بلند ہو کر سوچنے کی جرات پیدا ہو جائے۔

سوال یہ ہے کہ تحت ڈاکٹر انور سدید نے جس وسعت اور گہرائی سے تحریک کی مختلف نوعیتوں کا جائزہ لیا ہے وہ قابلِ رشک ہے پھر جس معیار کی بحث نے جنم لیا وہ ایک ایسی روشنی کی لکیر ہے جو ذہنی افق کو دُور تک منور کرتی چلی گئی ہے۔ عجیب اتفاق ہے کہ جنگل جو پہلا ورق میں ایک تمثیل ہے وہی "ٹھنڈا برف ہاتھ" میں ایک تعبیر کی صورت جلوہ گر ہے جس سے ایک عجیب معنویت پیدا ہو گئی ہے۔ بہرحال میرے لئے یہ ایک موقع تھا جب میں جنگل میں دبے پاؤں ہی داخل ہوا اور پھر یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ واقعی جنگل بولنے لگا تھا۔

اس انشائیے میں جو تجربہ پیش کیا گیا ہے وہ حقیقت پر مبنی ہے۔ شدید مشکل حالات میں دفعتاً احساس ہوتا ہے کہ ہماری شخصیت کا پیرہن تو کاغذی تھا جسے ہم زرہ بکتر سمجھے ہوئے تھے۔ اس کے بعد جو کیفیت گزرتی ہے اس کا اظہار انشائیہ میں بہت خوبصورت انداز میں کیا گیا ہے۔ موضوع مشکل تھا لیکن اس کو بڑی فن کاری سے انشائیہ کا جامہ عطا کیا گیا ہے "آخری جملہ" ہے اس کی خوبصورتی کا اعتراف مجھ سا حقیر افسانہ نگار ہی نہیں، اعلیٰ پایہ کے انشائیہ نگار بھی کریں گے۔

طاہر نقوی

"اوراق" ملا۔ غلام الثقلین نقوی کے ناول "آنگن اور کھلیان" کا ہر باب اپنی جگہ ایک افسانہ ہے لیکن اس کے باوجود تشنگی کا احساس باقی رہتا ہے جو رہنا بھی چاہیئے کہ یہ ناول کے خاتمے پر ہی جائے گا۔ اندازِ بیان میں خلوص اور زبان میں سادگی ہمیشہ رچی بسی ہوتی ہے۔ گاؤں کا سارا ماحول اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ ابھر کر آ جاتا ہے۔ کتابی صورت میں آنے کے بعد ہی اس ناول کو پڑھنے کا صحیح لطف لیا جا سکے گا۔ بیرونی اور اندرونی مسائل اسقدر ہو گئے ہیں کہ ان سے نکل کر جب افسانہ نگار کسی موضوع کو لے کر چلتا ہے تو کہیں سے کہیں نکل جاتا ہے۔ یہ کیفیت آج کے انسان کی ہے افسانہ نگار کا متاثر ہونا بھی قطعی فطری ہے۔ مہر چرن چاولہ کا اپنی یادوں پر مشتمل "البم" جسے میں نے افسانہ سمجھ کر ہی پڑھا، جوگندر پال کا "بازدید" اور رشید امجد کا "میلا جو سیلاب میں ڈوب گیا" پڑھ کر ایسی ہی کیفیت سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ جوگندر پال نے پرانے موضوع کو بڑے بھرپور انداز میں پیش کیا ہے شروع میں افسانہ نگار کے لہجے کا اپنا الگ انداز ہے۔ آخر میں یوں لگتا ہے جیسے دل کی دھڑکنیں رُک جائیں گی مغرب کی حقیقت پسندی اور مشرق کی سچائی و خلوص دونوں ہی اس افسانے میں اُبھر کر سامنے آتے ہیں اور ایسے لوگوں کا منہ چڑاتے ہیں جو یہاں کے

خلوص و پیار کو ٹھکرا کر وہاں کی مشینی زندگی میں جا بستے ہیں۔ ماں باپ کے پُرسکون اور ٹھنڈے سائے سے دُور رہ کر اولاد کی زندگی میں جو کرب ہر لمحے کروٹیں لیتا رہتا ہے وہ اس افسانے میں نمایاں ہے۔ سرچرن چاولہ نے اپنی قوّتِ بیان کا مظاہرہ تو کر دیا لیکن قاری کے لئے بھی کوئی بات سوچنے کے لئے باقی رہنی چاہیئے تاکہ وہ بھی افسانہ نگار کے فن میں شریک ہو سکے۔ رشید امجد کے ساتھ قاری سوالیہ نشان بن کر چلتا ہے۔ جب افسانہ نگار اُس کی طرف دیکھتا ہے تو قاری کا چہرہ سوال کر ڈالتا ہے۔ افسانہ نگار اس کی طرف سے منہ پھیر لیتا ہے۔ اس مرحلے پر دو باتیں ذہن میں آتی ہیں ایک تو یہ کہ افسانہ نگار کے پاس کہنے کے لئے کوئی چیز نہیں جس سے گھبرا کر وہ چہرہ چھپانے کی کوشش کرتا ہے یا پھر دوسرے یہ کہ وہ قاری کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے کہ سوال کیوں کیا جا رہا ہے۔ اس کیفیت میں افسانہ نگار قاری کی اہمیت کے پیشِ نظر اسے اپنے ساتھ رکھنے پر بھی مجبور ہے مگر ساتھ ہی قاری اور افسانہ نگار میں آگے نکلنے کی کشمکش بھی ہے۔

مشتاق قمر کا افسانہ "بڑے سائز کے لوگ" پڑھتے وقت اگرچہ دماغ کی رگیں کھنچنے لگتی ہیں مگر اندازِ بیان اور زبان دونوں مصنّف کی گرفت میں ہیں۔ جملے الفاظ سے جڑے ہوئے لگتے ہیں جس لفظ کی جہاں ضرورت تھی وہ وہیں ہے۔ اِدھر اُدھر کیا گیا تو ساری عمارت الٹ جانے کا خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔ جو بات کہنی تھی وہ کہہ دی اور قاری کا ساتھ بھی نہیں چھوڑا۔ ہاں کہیں کہیں نثری نظم کے ٹکڑوں سے چھلانگ چھلانگ کر ضرور گزرنا پڑتا ہے تقی حسین خسرو کا افسانہ "چھٹی کا دن" شمس نغمان کا "بے نام کہانی" رحمٰن شاہ عزیز کا "جاگ" "خوشبوؤں کا جال" عشرت ظہیر کا افسانہ اور ۱۹۷۷ء کا ایک غیر اہم واقعہ" اصغر ندیم سیّد کا ایسے افسانے ہیں جن کے چرکھٹے درمیان سے خالی نہیں ہیں۔ ان میں چلتے پھرتے کرداروں کی زندگی کی سچائی ہے جس سے قاری آنکھیں نہیں موڑ سکتا۔ تقی حسین خسرو اپنے افسانے میں کچھ زیادہ ہی جزئیات میں چلے گئے ہیں جس کی وجہ سے شروع میں افسانہ، افسانے کی بجائے چھٹی کے دن پر محض ایک مضمون لگتا ہے مگر آگے جا کر افسانہ جب اپنے اصل راستے پر لگ جاتا ہے تو افسانے کے اتار چڑھاؤ ابھرتے چلے آتے ہیں۔ آخر میں وہ ایک غیر معمولی بات کہہ گئے ہیں جو جا کر دل میں بیٹھتی ہے۔ ایک جذبہ جسے عام طور سے نظر انداز کر دیا جاتا ہے وہ قاری کے سامنے کھول کر رکھ دیا گیا ہے۔

کلام حیدری کے افسانے "الف لام میم" میں افسانہ نگار کی لاشعوری رَو اس افسانے کو لکھواتی چلی گئی ہے جو اس نے محسوس کیا یا دیکھا وہ بلا کم و کاست لکھتا چلا گیا۔ اس لئے شاید اس میں خود کلامی زیادہ ہے اور افسانہ نگار اپنی ذات کو ٹٹولتا ہوا نظر آتا ہے۔ محمود واجد کا افسانہ "بند دروازے کھلی کھڑکیاں" اور اقبال متین کا "شعلہ پوش" قاری کے لئے تھکن کا باعث نہیں بنے۔ وہ اندرونِ نفس کی گہرائیوں تک اُترتے ہیں۔

اوراق نے جدید افسانے اور انشائیے دونوں کے لہجے اور آہنگ کو نمایاں کرنے کے لئے مربوط کوشش کی ہے اور اسی بنا پر انشائیہ کا پودا اردو ادب کے کھیت میں توانائی سے اُگ رہا ہے اس کی کونپل سے لیکر کٹائی تک کی درجہ بدرجہ ترقی میں اوراق کی جانفشانی اور عرق ریزی شامل حال ہے۔ انشائیہ نے اب اردو ادب میں باقاعدہ ایک علیحدہ صنف کی صورت اختیار کر لی ہے۔ انشائیہ خیالات کی ایک رَو ہوتا ہے جو بہتی چلی جاتی ہے یہ کہیں سے بھی شروع ہو کر کسی بھی نقطے پر جا کر رُک سکتی ہے۔ انشائیے کو پڑھتے وقت درمیان میں نہ کوئی رکاوٹ آتی ہے نہ ذہن کہیں رُکتا ہے اور نہ کہیں جھٹکا لگتا ہے۔ انشائیے میں ذہن ایک ہی رفتار سے چلتا رہتا ہے۔ اسی لئے میں نے زیرِ نظر شمارے کے چاروں انشائیے ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالے۔ یہ چاروں نہ تو کسی طرح گراں گزرے نہ دماغ میں الجھن پیدا ہوئی۔ انشائیہ نگار کے ساتھ ساتھ میں بھی بہتا چلا گیا مشتاق قمر کا "مسئلہ یہ ہے"۔ جمیل آذر کا "کچھ لکھنے کے بارے میں" سلیم آغا قزلباش کا "برگد" اور وزیر آغا کا "ٹھنڈا برف ہاتھ" چاروں خوبصورت انشائیے ہیں۔ ان چاروں میں لکھنے والے اپنے نکتے پر قائم رہے۔ بلاوجہ اِدھر اُدھر نہیں بھٹکے۔ ان میں سلیم آغا کا "برگد" اور خاص طور سے وزیر آغا

صاحب کا "ٹھنڈا برف ہاتھ" افسانے کے زیادہ قریب ہیں۔ ان انشائیوں میں بقول جمیل آذر لکھنے والے کے ذہن کے گہرے آسمان پر لاتعداد خیالات بادلوں کے سبک بجروں کی طرح تیرتے رہتے ہیں ان انشائیوں کو پڑھ کر میں اس سے آگے بات کو بڑھاتے ہوئے یہ کہتا ہوں کہ یہی بادلوں کے بجرے قاری کے ذہن پر نرم نرم پھوار برساتے ہیں جس سے قاری کا ذہن معطر اور خوشگوار ہو جاتا ہے اور ذہن پر تازگی برقرار رہتی ہے۔ انشائیہ لکھنے والا جس سفر پر روانہ ہوتا ہے وہ نہ تو اس کے لئے اور نہ پڑھنے والے کے لئے کسی طور پر دشوار گزار ہوتا ہے۔ ان چاروں انشائیوں میں انشائیہ نگار اپنی ذات میں محصور ہونے کے باوجود خارج سے بے خبر نہیں رہتا۔ اب شعوری اور لاشعوری کسی بھی طور پر یہ ممکن نہیں رہا کہ افسانہ نگار یا انشائیہ نگار اپنے گردو پیش یا اپنی ذات سے بے خبر رہ کر زندہ رہ سکے۔ حقیقت آج کے افسانے اور انشائیے دونوں کی بنیاد ہے!

مرزا حامد بیگ

حلقہ ارباب ذوق کے بارے "پہلے ورق" میں آپ نے انجمن سے اپنی جذباتی وابستگی کے پیش نظر بیتے ہوئے چالیس برسوں کا جائزہ خوب لیا ہے۔ یہ خود کلامی یا خود احتسابی لمحۂ فکریہ بن کر اُبھری ہے۔ بے شک تخلیق کے ساتھ اپنے تعلق پر نظرِ ثانی کی ضرورت آج اس لئے پیش آئی کہ ہم رفتہ رفتہ مکاشفے سے مناظرے کی سمت چل نکلے۔ شاید یہی صورت دیکھ کر ٹی ایس ایلیٹ یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ تخلیق کی بہتر پرکھ کرنے پر خود تخلیق کار ہی قادر ہو سکتا ہے۔ دیگر لوگوں کے تو محض "تعصبات" بولتے ہیں اور فن پارے کے بطون میں مضمر تجربات اور تاثرات کی وسیع کائنات تک رسائی ان کے بس کی بات ہی نہیں۔ لیکن یہ تو غیر فن کار کی بات تھی، کیا ادیب بھی اپنے بارے میں یہی سننا گوارا کریں گے؟ اس لئے کہ حلقہ ارباب ذوق جیسی ادب کی تربیت گاہ بھی ارباب ذوق میں فنی پارے سے لطف اندوز ہونے کا ذوق پیدا کرنے میں ناکام ہو رہی ہے۔

میں تو W E D PEARSON کا ہمنوا ہوں کہ پرکھ پرچول کے معاملے میں فن پارے کی تہ میں رواں تجربات، تاثرات اور مشاہدات کی انہی منازل سے گزرنا بہر حال ضروری ہے جن سے فن کار گزرا، لیکن مناظرے میں ایسا کیونکر ممکن ہے؟

تحریک کے بارے میں کرامت علی کرامت اور "ترقی پسند تحریک" پر عملی تنقید میں ظہیر صدیقی نے متاثر کیا۔

بزرگ شعراء میں شہریار، ناصر شہزاد، فضا ابن فیضی اور حرمت الاکرام کی غزلیں پسند آئیں۔ نظموں میں بلراج کومل، سرمد صہبائی اور ساجدہ زیدی نمایاں ہیں۔

انشائیہ "ٹھنڈا برف ہاتھ" شاہکار کہنے میں کئی دن موضوع بنا رہا۔ میرے پسندیدہ انشائیوں "فٹ پاتھ"، "حقہ" اور انور سدید کے "دسمبر" میں یہ اضافہ ہے۔

عادل فریدی

پہلا ورق میں وزیر آغا نے لکھا ہے کہ "حلقہ ارباب ذوق کو قائم ہوئے تقریباً چالیس برس ہو چکے ہیں، کسی ادبی انجمن یا حلقے کا اتنے طویل عرصہ تک زندہ رہنا اس بات کا ثبوت فراہم کرتا ہے کہ وہ (انجمن یا حلقہ) آئندہ بھی اپنا وجود برقرار رکھے گا۔ اور آنے والی نسلوں کی رہنمائی کرتا رہے گا۔

چالیسواں سال ذہنی بلوغت کی علامت ہے اس عمر کو پہنچ کر انسانی سوچ میں ایک قسم کا ٹھہراؤ اور توازن پیدا ہو جاتا ہے۔ یہی توازن اور

ٹھہراؤ سوچ کے ہر منفی پہلو کو مثبت پہلو کے حلقۂ اثر میں رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس لئے اس عمر کو پہنچ کر جو کچھ کہا یا لکھا جاتا ہے۔ وہ سب کچھ ماضی کے تجربات کا نچوڑ ہوتا ہے۔

مدیر نے "پہلا ورق" میں جہاں اور باتوں کی طرف توجہ دلائی ہے وہاں اُن خطرات کی نشاندہی بھی کردی ہے جو اکثر و بیشتر انجمنوں اور حلقوں (ادبی) کو پیش آتے رہتے ہیں۔ ان کا یہ کہنا شاید غلط نہ ہوگا کہ

> اگر حلقے کو زندہ رہنا ہے اور محض پامال کھائیوں میں اپنا سفر جاری نہیں رکھنا ہے۔ تو پھر موزوں ترین وقت یہی ہے کہ وہ کسی نمایاں تبدیلی سے خود کو ہمکنار کرے ورنہ اگر حلقہ اسی ڈگر پر کچھ برس اور چلتا رہا تو عہد پیری کا رجعت پسند اور بے لچک رویّہ اُسے اپنی گرفت میں پوری طرح لے لے گا اور پھر.... !

اور پھر وہی ہوگا جو ہمیشہ ہوتا آرہا ہے۔ اس لئے بوڑھے جسم کی حرارت برقرار رکھنے کے لئے صرف خون کی تبدیلی سے کام نہیں چلے گا بلکہ اس کے لئے نئے جسم کا ہونا بھی لازمی ہے تاکہ وہ اس نئے خون کی حرارت کو برداشت کر سکے۔ اس بات سے کسے انکار ہوگا کہ نئے جسم کی سوچ بھی نئی ہوگی۔ یہ الگ بات کہ وہ منفی پہلوؤں پر زیادہ اور مثبت پہلوؤں پر کم سفر کرے گی لیکن یہ اس کی عمر کا تقاضا ہوگا۔ اس کو اعتدال پر رکھنے کے لئے اسے پرانے خون کی راہنمائی حاصل کرنی ہوگی۔ نئے اور پرانے خون کے ٹکراؤ سے اختلاف کا پیدا ہونا لازمی امر ہے لیکن اس کا تدارک ماضی اور حال کے تجربات کی روشنی میں آسانی سے کیا جاسکتا ہے۔

سوال یہ ہے کے تحت ڈاکٹر انور سدید صاحب نے تحریک کیا ہے! پر جو سوال اٹھائے ہیں وہ قابلِ توجہ ہیں۔ ان سوالوں کا جواب دیتے ہوئے شرکائے بحث نے اپنے اپنے نقطۂ نظر کی بہتر طور پر وضاحت کی ہے۔ ڈاکٹر سیّد عبداللہ نے جس خوبصورتی سے سوالوں کے جواب دیئے ہیں وہ قابلِ تعریف ہے۔ ان کے اس جملے سے شاید سبھی اتفاق کریں کہ

"ادب کا تخلیقی عمل کسی تحریک کا محتاج نہیں"

اس شمارہ کے انشائیے پسند آئے ہیں خاص طور پر سلیم آغا کا انشائیہ "برگد" ایک خوبصورت انشائیہ ہے۔ سلیم شہزاد۔ صابر وسیم سلیم کوثر۔ اعتبار ساجد۔ راغب شکیب۔ کشور ناہید۔ ناصر شہزاد۔ جعفر شیرازی۔ شاہین بدر۔ آزاد گلاٹی نے اچھی غزلیں کہی ہیں۔ سیّد ضمیر جعفری۔ تخت سنگھ۔ کرشن ادیب۔ حامد برگی۔ افتخار عارف کی نظمیں پسند آئیں۔

مشتاق قمر۔ تقی حسین خسرو۔ اصغر ندیم سیّد۔ جوگندر پال کے افسانے بہترین افسانے ہیں۔

یوسف جمال

آپ نے خلیل الرحمٰن اعظمی کے لئے اوراق کے چند صفحات وقف کرکے اپنے جن جذباتِ عالی کا اظہار کیا ہے۔ کم از کم اس سے میں بڑا متاثر ہوا ہوں۔ دکھ اس پر ہے کہ ہمارے ملک میں مرحوم کی بے مثال ادبی خدمات کے اعتراف میں بخالت سے کام لیا جارہا ہے۔ اسی چشم پوشی کے رویّہ نے ہمارے اچھے فن کاروں کو گمنام کرکے ان کے ادبی وقار کو منجمد کرکے رکھ دیا ہے۔ آج ایسے کتنے فن کار ہیں جنہیں ہم بھولے جارہے ہیں۔ جب ہمارا یہ حال ہے تو ہماری آنے والی نسل کا کیا ہوگا۔ کیا اس سوال کا جواب ہمارے ادب کے وہ بابو لوگ دیں گے جنہوں نے ادب کو اپنی اپنی جاگیر سمجھ کر اس پر جابرانہ قبضہ جما رکھا ہے۔ کچھ سال پہلے تک یہی ہنگامہ تھا کہ ہمارا ملک مردہ پرست ملک ہے اور یہ کہ مرنے کے بعد فن کاروں کی قدر کی جاتی ہے۔ اب تو وہ بات بھی نہیں رہی

شہباز نقوی

اس بار انور سدید صاحب نے "سوال یہ ہے" میں تحریک کی توضیح اور اس کے جملہ پہلوؤں سے متعلق بڑے اہم سوالات اٹھائے ہیں اور شرکائے بحث نے بڑی خوبصورتی سے بحث کو سمیٹا ہے۔ جہاں تک ڈاکٹر صاحب کا یہ فرمان ہے کہ ادبی تحریک معاشرے تحریک سے اس لئے مختلف ہوتی ہے کہ یہ ایک غیر تحریری منشور پر عمل پیرا ہوتی ہے تو عرض ہے کہ ادبی تحریک کے منشور کو اگر غیر تحریری مان بھی لیا جائے تو وہ تخلیقات جو اس ضمن میں قاری کو ہم خیال بنانے کے منصۂ شہود پر آتی ہیں، کس زمرے میں آئیں گی۔ کیا ادبی تحریک سے متعلق تخلیقات فی نفسہٖ اس کے تحریری دستور کا کام نہیں دیتیں۔

جہاں تک ادبی تحریک کے باقاعدہ قائد ہونے کا تعلق ہے تو وہ پہلا شخص جو روایت سے انحراف کرکے لکھاریوں کو نئی ڈگر پر چلانے کی کوشش کرتا ہے اسی تحریک کا قائد کہلائے گا۔ جیسا کہ کرامت علی کرامت صاحب نے فرمایا کہ موجودہ دور میں انشائیہ کی تحریک کا سہرا محترم ڈاکٹر وزیر آغا کے سر ہے اور وہی اس تحریک کے قائد کہے جاسکتے ہیں۔ اس ضمن میں اقبال کی مثال پیش کی جاسکتی ہے جو اپنی ذات میں مکمل ادبی تحریک بھی تھے اور اس کے قائد بھی۔

خلیل الرحمٰن اعظمی برصغیر کی ایک بہت بڑی علمی اور ادبی شخصیت تھے انہیں جتنا بھی خراجِ تحسین پیش کیا جائے کم ہے۔ انور سدید کا مضمون "ایک اور کتبہ" خلیل الرحمٰن اعظمی سے خلوص اور محبت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

سلیم آغا قزلباش نے برگد پر خوبصورت انشائیہ تحریر کیا ہے اپنے اردگرد بکھری ہوئی غیر اہم زندگی کو برگد کی مرکزیت کے حوالے سے کافی اہمیت عطا کی ہے مشتاق قمر اور جمیل آذر کے انشائیے بھی اپنی اپنی جگہ نہایت خوب تھے۔

"ٹھنڈا برف ہاتھ" خوف کے موضوع پر خوبصورت انشائیہ ہے اس میں بڑے نفسیاتی نکتے پنہاں تھے۔

شمس نغمان کی "بے نام کہانی" مختصر ہونے کے باوجود اچھی تھی۔

جوگندر پال کی "بازدید" نئی اور پرانی معاشرتی قدروں کے تصادم کی ایک خوبصورت علامتی کہانی ہے۔ نقی حسین جعفری، محمد منشا یاد، مشتاق قمر اور رحمٰن شاہ عزیز کے افسانے قابلِ مطالعہ تھے۔

ہرچرن چاولہ کا البم کافی طویل تھا لیکن اتنا دلچسپ کہ پہلی ہی نشست میں پڑھ ڈالا۔

غلام الثقلین نقوی ہر مرتبہ مجھے اپنے بچپن کی سیر کراتا ہے بچپن جو ایک نہ بھولنے والا معصوم سفر ہے۔

اقبال متین کی کہانی شعلہ پوش بہت پسند آئی۔

رشید امجد، کلام حیدری اور محمود واجد کے تجریدی افسانے بڑے شہروں میں رہنے والے مسائل زدہ انسان کی ذہنی پریشانی کے عکاس ہیں۔

عشرت ظہیر کا افسانہ خوبصورت کوشش ہے۔

رشید نثار نے جدید اردو غزل کا بڑا بھرپور جائزہ لیا ہے مختصر ہونے کے باوجود مضمون بہت جامع تھا اور اس میں تقریباً ہر اچھے اور جدید شاعر کی نمائندگی موجود تھی۔

اصغر ندیم سید نے گتے کے ڈبے کو نظروں میں رکھ کر پورے معاشرے کو گتے کے ڈولتے ڈبے میں تبدیل کر دیا۔

محترم اقبال آفاقی صاحب کا مقالہ ادب سے متعلق ہر جہتی خدشات اور پہلوؤں کو لئے ہوئے تھا۔ یہ مقالہ بڑی محنت سے لکھا گیا ہے۔

درِ شہوار ابراہیم نے فیض صاحب کی شاعری اور اس کے پس منظر پر بڑی خوبصورتی سے روشنی ڈالی ہے اور تقریباً تمام پہلوؤں پر تفصیل

سے گفتگو کی ہے۔ان کی محنت کی داد دیتا ہوں۔

مرزا حامد بیگ نے اردو افسانے کے نئے اور پرانے لکھاریوں کے اسلوب سے متعلق بڑی قیمتی باتیں قارئین تک پہنچائی ہیں۔ مقالہ بڑا وسیع اور بھرپور تھا۔

جیلانی کامران اور شہرت بخاری کی کوششیں بھی اپنی اپنی جگہ نہایت خوب تھیں۔

ظہیر صدیقی صاحب نے احتشام حسین کے بارے میں جو خیالات ظاہر کیئے ان سے احتشام حسین کے نئے نئے پہلو سامنے آتے ہیں۔

یوسف جمال نے فاضل نقاد کرامت علی کرامت کے اصولِ تنقید پر سیر حاصل بحث کی ہے اور ان کی انفرادیت اجاگر کی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے اپنی "آزاد غزل" کا تحفظ بھی کرامت علی کرامت کے حوالے سے ہی کیا۔ جہاں تک آزاد غزل کا تعلق ہے تو یہ قطعاً کوئی نئی چیز نہیں اختر شیرانی نے اپنی نظموں میں یہی ڈیڑھ مصرعے والا شتر گربہ تجربہ کیا تھا اسے کسی لحاظ سے بھی آزاد نہیں کہا جا سکتا کیونکہ اس میں ردیف اور قافیہ کا التزام موجود ہے۔اسے چھوٹی بڑی بحروں کا تجربہ ہی کہا جا سکتا ہے۔ انہوں نے نثری نظم کے بارے میں فرمایا ہے کہ نثری ادب میں تاحال کوئی شے ایسی نہیں جسے "ادب" کہا جا سکتا ہو اگر کل یہی بات "آزاد غزل کے بارے میں کسی نے کہہ دی تو ؟

یہ اعتراض شاید اس لئے کیا جاتا ہے کہ ہمارے قارئین کے متاثر ہونے کے پیمانے ابھی تک نہیں بدلے۔

صابر وسیم

تازہ اوراق پڑھا۔ اس کے پہلے ورق میں آپ نے بہت اہم گفتگو کی ہے۔ آپ کا یہ تجزیہ بہت صحیح ہے کہ ادبی انجمنوں میں میری نسل نے خوبصورت جملے بازی کی تربیت تو حاصل کی ہے مگر جمالیاتی احساس تک اس کی رسائی کم ہوئی ہے۔ اس کوتاہی میں آپ نے ضمناً درسگاہوں اور اساتذہ کا ذکر بھی کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس سلسلے میں بنیادی کوتاہی کی ابتدا درسگاہوں سے ہی ہو رہی ہے۔ اعلیٰ درسگاہوں سے لٹریچر کی ماسٹر ڈگری لے کر نکلنے والے تقریباً تمام ہی طلبہ آج سے ایک صدی پہلے کے ادب کو ہی ادب جانتے ہیں۔ انہیں CURRENT LITRA-TURE کے بارے میں قطعی علم نہیں ہوتا اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آج کا "جمالیاتی احساس" اور ایک صدی پہلے کے ادب کا بُعد نئی نسل کو ادب کی طرف راغب ہی نہیں کرتا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہمارے قدیم ادب یا کلاسکس میں جمالیاتی احساس کی کمی ہے یا وہ ہماری روح کو تسکین نہیں پہنچاتا۔ بلکہ میرا مطلب یہ ہے کہ قدیم ادب موجودہ عہد کے انسانی رویوں کا عکاس نہیں ہوتا۔ لہٰذا ہمارے ادب کے اساتذہ نہ تو ادب کی خدمت کا حق پورے طور پر ادا کر رہے ہیں اور نہ طلبہ کی تربیت پوری کر رہے ہیں۔ وہ طلبہ کو آدھا ادب پڑھا رہے ہیں یعنی صرف کلاسکس پڑھاتے ہیں اور MODERN SENS-ABALITY سے انہیں قطعی آگاہ نہیں کرتے۔

ان حالات میں ذاتی رجحان اور کوششوں سے نئی نسل کے جو افراد ادب کی طرف آ جاتے ہیں تو انہیں ادبی انجمنیں اور سیاستیں فقرے بازی کی راہ پر لگا دیتی ہیں لہٰذا تخلیق کا تقدس برقرار نہیں رہتا۔ جب کہ آپ کے ہی الفاظ میں "فن پارہ ایک دعا کی طرح ہے کہ موجود کو ماورا سے منسلک و مربوط کرتا ہے" اور جب تک ادب و تخلیق کو اتنا محترم و مقدس نہ سمجھا جائے اس وقت تک بڑا ادب تخلیق نہیں ہوتا۔ یہی سبب ہے کہ ہمارے عہد میں بڑے ادب کی بشارتیں کم ملتی ہیں۔

فیروز شاہ

آپ نے "پہلا ورق" میں تلخ سچائیوں کو میٹھے زم پیچے دیئے ہیں۔

واقعتہً ادب میں سیاست، میرے عہد کا سب سے بڑا ادبی المیہ ہے۔ ادب زندگی کی صداقتوں کو محبت کی خوبصورت زبان دیتا ہے۔ ایک سچے ادیب کا منصب یہ ہے کہ وہ معاشرے میں نفرت کے ناسوروں پر خوبصورت جذبوں اور قلبی وابستگیوں کے مرہم رکھے اور اہلِ جہاں کے غم اپنے سینے میں سمیٹ کر عنبریں خوشیوں اور مسرتوں کے گلاب کھلائے۔ وہ نفرتوں کا علمبردار نہیں، محبتوں کا تقسیم کار ہوتا ہے۔ اس کے سینے میں پیار کا گہرا ساگر اور لفظوں میں اپنائیت اور خلوص کی آب جُو رواں دواں ہوتی ہے۔!

لیکن آج کے دور میں جسمانی خوراک کی طرح ذہنی غذا میں بھی آمیزش ہونے لگی ہیں۔ نتیجہ یہ نکلا ہے کہ جسم تو ناطاقتی کا شکار تھے ہی۔ اب ذہن بھی بنجر ہونے لگے ہیں۔ چنانچہ آپ دیکھ رہے ہیں کہ فکر نو، جدید شعور اور تازہ احساس کے ننھے بِن کھلے مرجھا رہے ہیں اور اذنِ نمو صرف انہی پودوں کے لئے ہے کہ جو بڑے بڑے تناور پیڑوں کے سائے میں سر اٹھا رہے ہیں۔

ادب میں سیاست داخل ہو جائے تو گروہ بندیاں وجود میں آتی ہیں، اور پھر یہ گروہ بندیاں ہی کسی تخلیق کے معیاری یا غیر معیاری ہونے کی کسوٹی ٹھہرتی ہیں۔ ادب پارہ چاہے کیسا ہی خوبصورت، جاندار اور موثر کیوں نہ ہو۔ اگر مخالف ادبی گروہ یا کم از کم آزاد خیال اور غیر جانبدار فن کار کا بھی ہے تو تنقید بلکہ تنقیص کی وہ گولہ باری ہوگی کہ الامان والحفیظ۔! اور فن کار سر چارہ جائے گا کہ اس کے جرمِ بے گناہی کی سزا اس کی تخلیق کو کیوں ملی؟ میں ادب میں گروہ بندیوں یا اختلافات کا مخالف نہیں بلکہ میرے نزدیک تو اختلافی گروہ بندیاں چمنستانِ ادب میں مختلف رنگوں کے پھول کھلانے کا موجب بنتی ہیں۔ مقابلے کا رجحان ادبی منڈیوں میں گرانقدر اور بیش بہا تخلیقات کی پیش کش کی بنیاد بنتا ہے۔ مگر یہ گروہ بندیاں۔ یہ اختلافات۔ یہ مقابلے اگر صحت مندانہ روش کی بجائے محض اپنی ذات کے بُت کھڑے کرنے اور ان کی پوجا کرانے کا عمل بن جائیں تو ادب کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچتا ہے اور تخلیقات کا بہتا ہوا دریا رُک جاتا ہے۔ پھر اس کھڑے پانی میں تعصب کی وہ سڑاند پیدا ہو جاتی ہے کہ اس کے کنارے کھڑا رہنا بھی دشوار ہو جاتا ہے۔ میں اس رائے سے کلیتہً اتفاق کرتا ہوں کہ ادب نے کبھی اور کسی دور میں بھی نفرتوں کی تقسیم کی ذمہ داری نہیں سنبھالی۔ بلکہ اس نے ہمیشہ سخت سے سخت اور کٹھن سے کٹھن مقامات پر بھی محبت کا نور بانٹا ہے۔

ادبی انجمنیں اگر اپنے اصل منصب سے ہٹ جائیں تو اور بات ہے ورنہ ان کا مدعا و مقصد ہی ہمدردی کی مہک بانٹنا ہوتا ہے۔ اور محبت کی تقسیم کا یہ عمل ہی دراصل عبادت ہے (اور یہی سچے ادیب کا منصب بھی ہے۔) سو ادبی انجمنیں اپنے نصب العین کے حوالے سے عبادت گاہوں کا درجہ رکھتی ہیں کہ لوگ تعصبات کی گٹھڑیاں پھینک دینے کے بعد وہاں جا کر ازلی و ابدی صداقتوں کو تسلیم کرتے ہوئے محبت کی شفیق دلوی کے چرنوں میں اپنی زندگیوں کے پھول رکھ دیتے ہیں۔! لیکن آج کی بیشتر ادبی تنظیموں نے تنقید کو ذاتی یافت کے طور پر استعمال کرنا شروع کر دیا ہے اور اس سے اپنے مفادات شکار کئے ہیں۔

ان انجمنوں کے حوالے سے ادب لطف اندوزی کی بجائے محض مناظرہ بازی کے عمل کا نام بن گیا ہے مگر میں سمجھتا ہوں جب تک ادبی حلقے عبادت گاہیں نہیں بنیں گے، ادب کی جھیل میں تازہ اور شگفتہ خیالات کے حسین کنول کبھی نہیں کھلیں گے۔

ساجدہ فرحت

اوراق کا جولائی اگست کا شمارہ دیکھا، بے حد پسند آیا۔

غزلوں میں اعتبار ساجد، کرامت علی کرامت، مرتضیٰ برلاس، حزیں لدھیانوی، خادم رزمی، فضا ابن فیضی اور سیدہ انیس معین کی غزلیں بڑی خوبصورت لگیں۔ انشائیے تمام خوبصورت تھے۔

گلیاں دھوپ دروازے پر تبصرہ بہت دلچسپ تھا۔ کتابوں پر ڈاکٹر انور سدید کی تنقید بلکہ تعارف پسند آیا۔

مشتاق قمر، شمس نغمان اور اصغر ندیم سید کے افسانے قابلِ داد ہیں۔

پہلا ورق، کو اگر ہوا کے معطر جھونکے سے تشبیہ دی جائے تو کچھ غلط نہ ہوگا۔

راغب شکیب

اوراق کی ہمیشہ سے یہ روایت رہی ہے کہ وہ ادب کے نئے موضوعات کو زیرِ بحث لاتا ہے۔ زیرِ نظر شمارہ میں سوال یہ ہے کے تحت ڈاکٹر انور سدید محرکِ بحث کے طور پر پیش ہیں۔ انہوں نے اپنے مؤقف کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے "ادبی تحریک سکے ہوئے منشور پر بالعموم عمل نہیں کرتی اور اس کا عمل تخلیق کی طرح پُراسرار، بالواسطہ اور دیرپا ہے۔ لہٰذا ادبی تحریک میں کسی مخصوص قائد کی ضرورت نہیں ہوتی"۔ یہی وہ مقام ہے جہاں شرکائے بحث میں سے کرامت علی کرامت نے محرکِ بحث سے نظریاتی اختلاف دلائل کے ساتھ کیا اور مجھے ان کا یہ انداز پسند آیا۔ کرامت علی کرامت نے ادبی تحریک کے لئے قائد کی اہمیت کو مثالوں کے ذریعے اجاگر کرتے ہوئے لکھا "سنسکرت کے نقاد وشوناتھ کوراج نے ادب میں "رس" کی اہمیت کو اجاگر کیا لہٰذا "رس اسکول" کے فن کاروں کی قیادت وشوناتھ کوراج ہی کو حاصل ہے"۔ وزیر آغا اگر اپنی تنقیدی تحریروں کے ذریعہ اردو ادب میں انشائیہ کی خصوصیات کو اجاگر کرنے کی کوشش نہ کرتے تو آج انشائیہ کی شکل وصورت ہمارے ادب میں مبہم اور غیر واضح ہوتی۔

اوراق کے زیرِ نظر شمارہ میں ایک گوشہ خلیل الرحمٰن اعظمی کے لئے وقف کرکے آپ نے حق دوستی ادا کیا ہے۔ اس سلسلہ میں شاذ تمکنت اور شہریار کی تاثر کی گہرائی سے معمور نظموں نے بڑا متاثر کیا۔ ڈاکٹر انور سدید نے "ایک اور کعبہ" میں خلیل الرحمٰن میں کے فن کے سمندر اور شخصیت کے دریا کو کوزہ میں سمیٹ دیا ہے۔ اسی گوشہ میں ایک اور اہم چیز اعظمی کے چند یادگار خطوط کی اشاعت ہے۔ ان خطوط سے اعظمی کے عصرِ حاضر کے فکر و فن اور ان کے احباب کے بارے میں ان کی پُرخلوص رائے کا اظہار ہوتا ہے۔ شہریار نے اعظمی کے "آخری لمحات" کو جس انداز سے قلمبند کیا ہے اس سے اعظمی کی موت کے بعض عوامل کی طرف بالواسطہ اشارہ بھی ملتا ہے۔

انشائیوں کا حصہ اگرچہ بھرپور ہے لیکن جمیل آذر کا انشائیہ "کچھ لکھنے کے بارے میں" قدرے فلسفیانہ ہوگیا ہے۔ البتہ مشتاق قمر نے اپنے انشائیہ "مسئلہ یہ ہے" میں زندگی کے چھوٹے چھوٹے مسائل کو بالواسطہ اظہار سے روشنی عطا کی ہے۔ سلیم آغا قزلباش زندگی کے مختلف رنگوں کو موضوعی انداز سے اکٹھا کرتے اور پھر ان جزئیات کو سلسلہ در سلسلہ ہمارے سامنے بکھیر دیتے ہیں "برگد" ان کے اس اندازِ تحریر کا بہت اچھا نمونہ ہے اس میں خیال کی رو ذات سے کائنات کی طرف اور پھر کائنات سے ذات کی طرف مڑتی ہوئی نظر آتی ہے اور قاری کے سامنے حقائق و معارف عریاں کردیتی ہے۔

افسانوں میں جوگندر پال کا افسانہ "بازدید" بڑی خوبصورتی سے قدروں کی شکست و ریخت کو منظر پر لاتا ہے۔ اس افسانہ میں جوگندر پال نے مرتے ہوئے گاؤں اور پھیلتے ہوئے شہر کو بڑی خوبصورتی سے علامتی انداز دیا ہے اور اس کی کیفیت کو اجاگر کیا ہے کہ گاؤں افسانہ نگار کے باطن میں ہمیشہ زندہ رہتا ہے اور شہر کی وسعت اسے ہڑپ نہیں کرسکتی۔

اسلم کمال

اُداس لمحوں میں

(۱)

وہ جس کے چہرے پہ
کامرانی کا نُور پڑھنے
مسرتوں کا ظہُور پڑھنے
کی مُجھ کو عادت سی ہو گئی تھی
وہ میرا بچہ جو کھو گیا ہے
زمیں کا پیوند ہو گیا ہے
مری حسیں پاک سرزمیں کا

مرے وطن کی حسین مٹی
امانتوں کی امین مٹی
مرے نشیمن، مرے گلستاں
ترا ستارہ رہے فروزاں
ہلال روشن

(۲)

فوکُّام میرے بچے
ترے دوست، تیرے ساتھی
اسکول جا رہے ہیں
میں سُن رہا ہوں گھنٹی
اسکول لگ چُکا ہے
تیری کتاب، کاپی
بستہ، جراب، جرسی
سب تجھ کو ڈھونڈتے ہیں
سب تیرے منتظر ہیں
فوقی کہاں ہو فوقی

لہ فاروق کمال